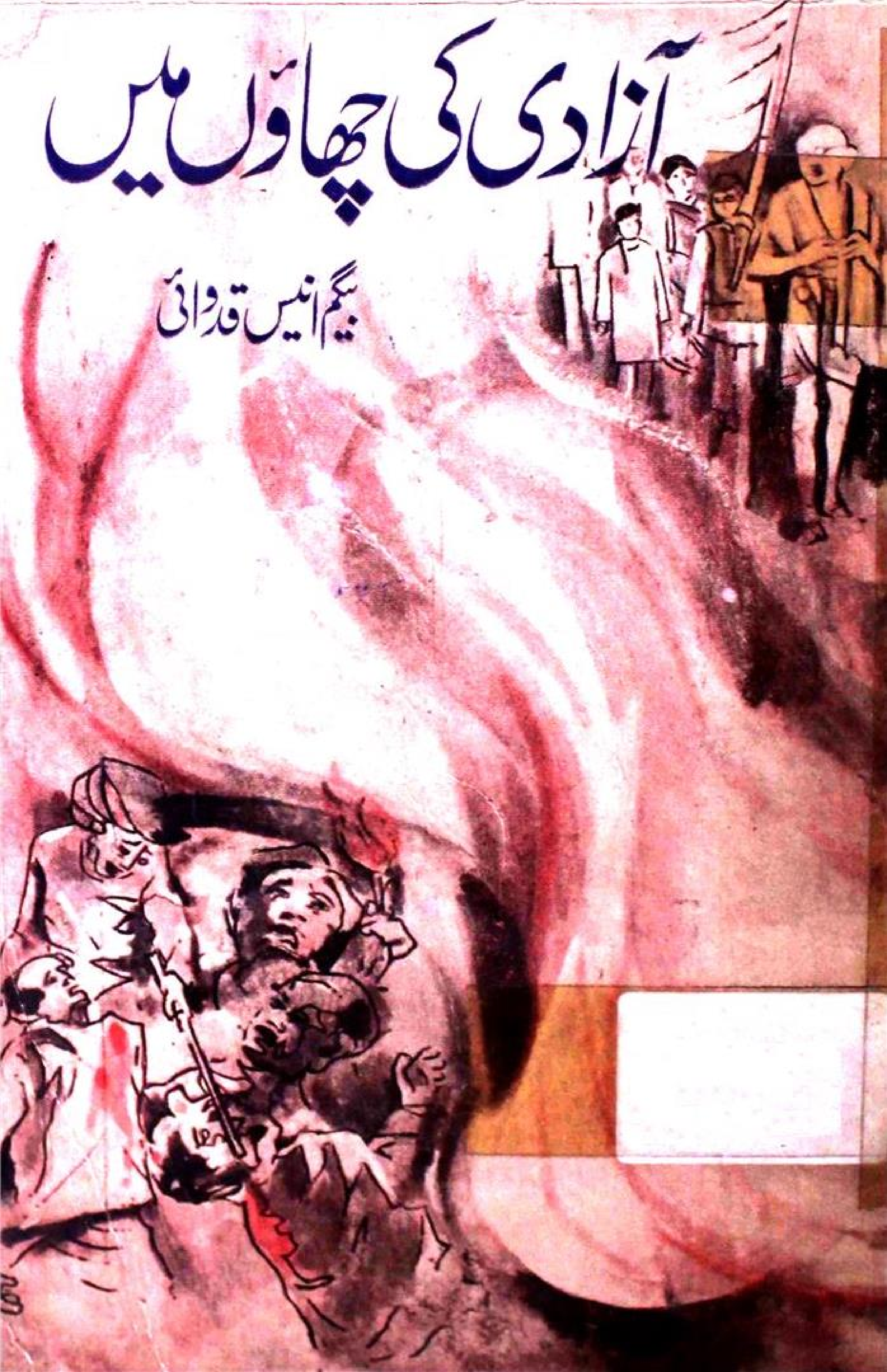

آزادی کی چھاؤں میں
بیگم انیس قدوائی

آزادی کی چھاؤں میں

آزادی کی چھاؤں میں

بیگم انیس قدوائی

نیشنل بک ٹرسٹ - انڈیا
نئی دہلی

1980 (ساکا 1902)

© بیگم انیس قدوائی

(نیا ایڈیشن مصنفہ کے حذف و اضافہ کے ساتھ)

(AZADI KI CHHAON MEIN)

قیمت :- 13.50

PUBLISHED BY THE DIRECTOR, NATIONAL BOOK TRUST INDIA, A-5, GREEN PARK, NEW DELHI-16 AND PRINTED AT J. K. OFFSET PRINTERS 315, JAMA MASJID, DELHI-6

ابواب

ص

عرضِ مصنف

عرضِ مصنّف

۷۸۶

بہ نام جہاں دار جاں آفریں

یقیناً ہر کام کی ابتدا اور انتہا کا قادر مطلق نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ لاکھ جتن کرو جب تک تکمیل کا لمحہ نہیں آتا ہر کوشش اور تدبیر رائیگاں ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہوا۔

بھلا خیال تو کیجیے۔ 1947ء اور 48 تک سارا ڈرامہ دیکھا۔ سوچتی رہی نوٹ بک پر لکھتی رہی 1949ء میں وہ سارے اوراق منتشر یک جا کیے اور کہیں 1974ء میں جا کر ان کے چھپنے کی نوبت آئی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ مسودہ کافی پرانا ہو چکا تھا۔ نہ تو میں اس پر نظرِ ثانی کرنے کی ہمت کر سکی اور نہ میری بدخطی کو ناشر صاحب سنبھال سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتابت و طباعت میں کافی غلطیاں رہ گئیں اتنا ہی نہیں ایک کاتب صاحب نہ جانے کہاں بھاگ گئے۔ دوسرے نے مکمل کیا اور کتابت کے حسن میں دو کاتبوں کے رسم الخط نے اور بھی اضافہ کر دیا۔

پھر بھی میں ایکتا ٹرسٹ، مسٹر گوئل اور سبھدرا جوشی کی مشکور ہوں کہ کم از کم ایک بار انھوں نے اسے ناظرین کے سامنے اچھے کورا ور خوبصورت جلد کے ساتھ پیش تو کر دیا۔

اس بچاری تحریر پر پہلا حادثہ تو وہ گذرا تھا جب حیات اللہ صاحب کی دور رس نگاہ نے اس کو "عنوانات" کے تحت لانے کے لیے اس میں کچھ قطع برید کی، جو مجھے پسند نہ آئی اور میں نے انھیں منتشر اوراق کی مدد سے ان ابواب کو پھر پہلے جیسا لکھ لیا۔

انھیں دنوں عبادت بریلوی سے ملاقات ہوگئی اور میں نے سوچا کتاب اب انکی نگرانی میں چھپوا دونگی گر وہ جلد ہی پاکستان سدھار گئے۔

کچھ عرصہ بعد ساغر نظامی جو اسوقت میرٹھ سے ایک رسالہ "ایشیا" نامی نکال

رہے تھے مجھ سے ملے اور انھوں نے ایک باب لے کر "ایشیا" میں شائع بھی کیا۔ پھر مصر ہوئے کہ کتابت و طباعت کی ذمہ داری بھی لینے پر تیار ہیں۔

حالانکہ رفیع بھائی مرحوم (رفیع احمد قدوائی) نے یہ جملہ بھی کہا کہ ایسی کتابیں لکھی ضرور جاتی ہیں، مگر فوراً شائع نہیں کی جاتیں بلکہ کسی مصنّف کا انھوں نے حوالہ دیا کہ اس کی کتاب پچاس سال کے بعد چھپی تھی۔ باوجود اس کے میں نشر و اشاعت کے لئے تیار ہوگئی۔ انھوں نے کچھ امداد بھی کی۔ وہ بھی کسی کام نہ آسکی کیونکہ ساغر صاحب کی مالی مشکلات کی وجہ سے ایشیا بند ہوگیا اور دو سال بعد بہت ہی افسوس کے ساتھ وہ پورے مسوّدہ کی کتابت شدہ کاپیاں اور بلاک وغیرہ مجھے واپس کر گئے۔ اب نہ مصنف کے پاس پیسہ تھا نہ ناشر کے پاس، کتاب چھپے تو کیسے؟

اسی دوران چند صفحات شفیق الرحمان قدوائی مرحوم کو دکھا کر میں نے یہ اطمنان کر لیا تھا کہ تحریر غیر دلچسپ اور ناقابل برداشت نہیں ہے۔ پھر ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ رفیع بھائی بھی رخصت ہوگئے اور امید ہی قطع ہوگئی۔

"آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند"

سچ تو یہ ہے۔ کچھ رفیع بھائی کی بات بھی جی کو لگ گئی تھی۔ اس لیے کئی سال تک پھر مسوّدہ کو کھول کر نہ دیکھا دو تین سال بعد کاغذات کی الٹ پلٹ میں پھر اس پر نظر پڑ گئی۔ اور جی چاہا کہ کسی اور اہل نظر کی اس پر رائے لے لوں۔ یہ سوچ کر مسوّدہ ڈاکٹر عابد حسین کی خدمت میں پیش کیا۔ میں مشکور ہوں کہ عابد صاحب نے اسے لفظ بہ لفظ پڑھا اور پوری کتاب میں سے صرف ایک جملہ حذف کیا۔ چند الفاظ سہو اًقلم زد ہو گئے تھے، وہ درست کیے۔ مسوّدہ مجھے انکی اس رائے کے ساتھ واپس ملا کہ کسی ترمیم و تنسیخ کی ضرورت نہیں اس کو اسی طرح چھپنا چاہیئے۔

اس کے بعد پھر ایک بار مکتبہ جامعہ سے اشاعت کی خواہش نے غلام ربّانی تاباں صاحب تک پہنچایا جو ان دنوں مکتبہ جامعہ کے منیجر تھے۔ مسوّدہ کتابت شدہ کاپیاں بلاک سب ان کے سپرد کر کے پھر دن گننے لگی کہ کسی دن کتاب چھپ کر آرہی ہوگی۔ لیکن تین سال بعد مجھے واپس صرف اپنی بدخط تحریر ملی۔ کتابت اور بلاک سب گم ہو چکے تھے۔ خیریت ہوئی مسوّدہ بچ گیا تھا۔

ان حالات سے مایوس ہو کر میں نے اسے پیک کر کے ایسی جگہ ڈال دیا کہ پھر

کبھی منظر نہ پڑے، نہ افسوس ہو۔ ۱۹۷۰ء میں ایک دن سبھدرا جوشی اور گوئل صاحب ملنے آئے اور انھوں نے خواہش کی کہ میں نے اس افراتفری کے دور میں جو کچھ لکھا تھا، اس کا کچھ حصہ "سیکولر ڈیموکریسی" میں اشاعت کے لئے دیدوں۔ میں نے معذرت کی کہ وہ ایک طویل رپورتاژ ہے۔ اس میں سے اکا دکا واقعات لے کر تم لوگ شائع کر سکتے ہو مگر بہتر یہی ہوگا کہ اس کو کتابی شکل میں چھپنے کے لئے پڑا رہنے دو۔ شاید کبھی اس کا وقت آ ہی جائے۔ گوئل صاحب دیکھتے ہی اس کی اشاعت پر تیار ہو گئے۔ ان کا اصرار بڑھا تو ناچار ساری پوتھی ایک بار پھر ان کو سونپ دی۔

مسودہ جیسا بھلا برا تھا، کتاب ویسے ہی چھپ گئی۔ جلد اور کور کی وجہ سے غنیمت بھی ہو گئی لیکن مجھے خیال بھی نہ تھا کہ یہ ملک کے دانشوروں کی نظر میں بھی اتنی اہم قرار پائے گی اور اس پر جگن ناتھ آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، ریوتی سرن شرما، قرۃ العین حیدر، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر آصف قدوائی ایڈیٹر عزائم، عشرت علی صدیقی ایڈیٹر قومی آواز، رضوان احمد ایڈیٹر عظیم آباد اکسپریس جیسے لوگ تبصرہ بھی کر ڈالیں گے اور اتر پردیش اردو اکیڈمی کے سخن شناس اسے انعام کا مستحق قرار دیں گے۔

میں مذکورہ بالا حضرات کی تہہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے میری کوششوں کو سراہا اور اس خدائے عز و جل کی بھی شکر گذار ہوں جس کا نام لے لے کر اس دعا کے ساتھ لکھتی رہی تھی کہ خدایا جو لکھوں سچ لکھوں۔

مجھے احساس ہے کہ زیر نظر کتاب تاریخ، تاثرات، تاریخ اور واقعات کی ترتیب نہیں بلکہ کسی قدر بے ہنگم سا مجموعہ ہے۔ لیکن خون جگر سے لکھی ہوئی ایسی تحریر ضرور ہے جسے پڑھ کر قارئین کو وہ نشتر زہر آگیں، ضرور یاد آجائے گا جسے ہم دل و دماغ کے قریب رکھکر بھول گئے ہیں۔

ان اٹھائیس برسوں میں ان آنکھوں نے جبل پور، علی گڑھ، چندوسی، میرٹھ، احمد آباد اور بنگلہ دیش کی ہلاکت خیزیاں اور ترکمان گیٹ کی بربریت بھی دیکھی۔ زہر کو اترتے اور چڑھتے بھی دیکھا مگر کوئی حادثہ بھی اس یقین کو متزلزل نہ کر سکا کہ قوم کی بقا کا انحصار اخلاقی اقدار کی سلامتی کے ساتھ جمہوریت اور اتحاد میں ہے۔ نہ اس امید کا دامن ابھی ہاتھ سے چھوٹا ہے کہ "شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے"۔ انسانیت کا مطالبہ، حب وطن کا تقاضہ، امن عالم کا انحصار اور خود اس ملک کا استحکام اس پر منحصر ہے کہ اخلاق

و مذہب کا قدیمی معیار نئی نسل اور نئی دنیا کو طاقت عطا کرے کیونکہ افراد کا کردار حکومت کا کردار بن جاتا ہے اور ان کا اخلاقی زوال ملک و قوم کا تنزل۔

ہمارا زمانہ بیت گیا۔ ایک دور ختم ہوا۔ میں اور میری نسل کے بہت سے لوگ پابہ رکاب یا گوشہ نشین ہیں۔ اس تحریر کے ذریعہ نوجوان نسل سے صرف یہی کہہ سکتی ہوں:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے

نئی دنیا کے معمارو! اس زہر سے بچو جسے پی کر ہم نے خودکشی کی تھی اور اخلاقی قدروں کی نیو پر اگر نئی تعمیر کرو گے تو مضبوطی، شان اور عزت تمہارا حصہ ہوگی۔

میں نیشنل بک ٹرسٹ کے ذمہ داروں کی ممنون ہوں کہ انھوں نے کتاب کی دوبارہ اشاعت اور ملک کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمہ کا ارادہ کیا ہے۔ امید ہے، اس طرح میری آواز صدا بصحرا نہ ثابت ہوگی بلکہ دیس کے ہر گوشہ میں پہنچے گی۔ ایک بار ان سب کا پُرخلوص شکریہ

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

بیگم انیس قدوائی
۷ر جنوری ۱۹۷۸ء

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو

ستمبر شروع ہوا اور اپنے ساتھ بیسیوں بلائیں اور پریشانیاں لے کر آیا۔ یوں تو ۱۹۴۷ کے شروع ہوتے ہی جگہ جگہ سے ہندو مسلم فسادات کی خبریں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ کلکتہ کے ڈائریکٹ ایکشن (راست اقدام) سے لے کر نواکھالی، بہار، راولپنڈی ملتان اور گڑھ مکتیشر تک کے دل ہلا دینے والے واقعات ابھی تازہ تھے۔ ہزاروں آدمی بھاگ کر ہندوستان آ چکے تھے اور خانماں برباد وں کا کئی میل لانبا قافلہ لحہ بہ لحہ رینگتا ہوا ہندوستان سے پاکستان کے قریب پہنچنے ہی والا تھا۔

اس وقت وہ خوشیاں بھی یاد آ رہی ہیں جو ان ہنگاموں کی خبریں سن کر دونوں مذہبوں کے پیرو مناتے تھے۔ مجھے اس وقت ایک دوست یاد آ رہے ہیں جنھوں نے بہت ہی خوش ہو کر کہا تھا کہ کلکتہ میں تو خیر چوک ہو گئی مگر نواکھالی میں ہم نے بڑا اچھا سبق دیا ہے۔

میں حیرت کے ساتھ ان کا منہ تک رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس ملک کا کیا حشر ہونے والا ہے؟ جس میں ایسے ایسے سورما پیدا ہو چکے ہیں۔ میں نے ان سے کہا۔ میاں، دوسروں کی تباہی اور بربادی پر اتنی خوشی نہ مناؤ۔ دو دن کی مسرت کے بعد کئی دن کلکتہ کے لیے رونا پڑا تھا۔ اب ملتان اور راولپنڈی کے لیے کہیں خون کے آنسو نہ بہانا پڑیں۔

۱ے ملتان اور راولپنڈی میں زبردست قتل عام ہندوؤں سکھوں کا ہوا تھا۔ ایک پاکستانی دوست نے اپنی بد قسمتی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ میں لندن سے راولپنڈی پہنچا تو بیسیوں لاشیں بالوں سے درخت پر بندھی پائیں۔ وہاں سے گھبرا کر مسوری بھاگا تو یہاں کشت و خون دیکھا اور ایک ماہ مسوری کیمپ میں پڑا رہا اسی کیمپ میں بیوی کے پہلا بچہ پیدا ہوا۔ اگر شفیع احمد قدوائی خبر نہ لیتے رہتے تو نہ جانے کیا حال ہوتا۔ رفیع صاحب کی مدد سے چھٹکارا ملا۔

مجھے تو ابھی تک گڑھ مکتیشر کے لاشوں سے پٹے ہوئے کنویں اور بہار کے زندہ جلتے ہوئے بچے یاد ہیں۔ تم کیسے ان کو بھولے جا رہے ہو۔

اسی طرح اخبارات کی سنسنی خیز خبریں پڑھ کر ایک بزرگ نے اظہار مسرت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ نوا کھالی میں آدمی تو صرف تین ہی چار سو مارے گئے مگر سنا ہے چار ہزار عورتیں مسلمان بنالی گئیں۔ چار ہزار، اور یہ کہتے ہوئے ان کے چہرہ پر فخر و غرور کی سرخی دوڑ گئی۔

اور پھر مجھے ایک مشہور جرنلسٹ بھی یاد آتا ہے جس نے حکومت پر کمزوری کا الزام لگاتے ہوئے غصہ سے کہا تھا۔ جی چاہتا ہے ان مسلمانوں میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑوں۔ جو کچھ بھی ہمارے ساتھ وہاں (پاکستان میں) ہوا ہے اگر ہم نے اس کا بدلہ یہاں نہ لیا، تو کچھ بھی نہ کیا۔ یہاں بھی ان سب کا رہنا مشکل کر دیا جائے گا۔ اتنا ہی نہیں۔ اس نے در پردہ راشٹریہ سیوک سنگھ کی امداد اور حمایت بھی شروع کر دی تھی۔

کتنی درندگی پیدا ہو گئی تھی ان دنوں۔ ایسی ایسی کمزور طبیعت کے لوگ جو ایک پھانس بھی چبھ جاتی تو رو دیتے، دوسروں کی مصیبت پر خوشیاں منا رہے تھے اور تو اور اچھے بھلے تعلیم یافتہ سمجھدار آدمی بھی نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکانے والوں میں شامل تھے۔ اب سے پہلے ہم شاید ان کی سوجھ بوجھ کی قسم کھاتے اور تب میں سوچتی تھی ہائے کیا حال ہوا ہوگا، جب بچے ماؤں کی گود سے چھین کر جلتی آگ میں جھونکے گئے ہونگے، جب بیٹیاں ماں باپ سے چھین کر، بیویاں اپنے شوہروں سے چھڑا کر جبراً تبدیلی مذہب پر مجبور کی گئی ہونگی۔ وہ مائیں اور بہنیں جن کے سینے چھلنی ہو چکے تھے، کیا ہندو یا مسلمان بن سکی ہوں گی؟ لعنت ہے ایسے ہندو اور مسلمان بنانے والوں پر!

یہ دیکھ کر مجھے پچھلا امن و امان، یعنی بدنام فرنگی حکومت کے جوتے تلے امن پسند نیک دل ہندوستانی عوام بھی یاد آتے ہیں جو کم از کم دیکھنے میں تو شریف آدمی، قابل اعتبار لوگ، بہو بیٹیوں کی عزت کرنے والے لگتے تھے۔

ابھی دن ہی کتنے ہوئے جون ۱۹۴۷ء تک مسوری کے سینما، تھیٹر، اور دوسری تماشا گاہیں رات کے ایک ایک دو دو بجے تک کھلی رہتیں، ہر طرف چہل پہل رہا کرتی تھی۔ یہاں ایک بار میں ضد کر کے اپنی ایک دوست کے ساتھ زبردستی ٹھہر گئی تھی اور پھر رات کے دو بجے

ہم دو عورتیں ریو راسے تنہا پاپیادہ شارلیول گیٹ تک اطمینان سے چلی آئی تھیں۔ نہ کوئی ڈر معلوم ہوا نہ دہشت۔

مسوری کی مال روڈ پر، لائبریری کے نیچے ہزاروں آدمیوں کا مجمع انڈین نیشنل آرمی کا بینڈ سننے جمع ہوا کرتا تھا۔ ان میں برقع پوش عورتیں اور گرانڈیل سکھ سب ہی ہوتے تھے۔ لوگ بے کھٹکے شام کے وقت بچوں کو پہاڑیوں کی ٹوکری میں بٹھا کر ان کے سپرد کر دیتے اور وہ انھیں گھما پھرا کر دو ڈھائی گھنٹے بعد حفاظت سے سیدھے گھر پہنچا جاتے۔ گھوڑے اور رکشا والے بھروسے کے آدمی سمجھے جاتے تھے۔ ایک دس سالہ لڑکی اپنے چار برس کے چھوٹے بھائی کی انگلی پکڑے شارلیول سے کلکڑی بازار تک بے خطر ٹہل آتی تھی۔

ہندوستان کا بٹوارہ طے ہو چکا تھا۔ بعض وقت دل میں ہول اٹھتی تھی۔ بڑے بڑے وہم آتے تھے۔ لوگ کہتے تھے دیکھ لینا، یہ نئے آنے والے فساد کرائے بغیر نہ رہیں گے۔ ہندو مسلمان کے تعلقات میں کافی کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا پھر بھی زندگی اپنے معمول پر چلی جا رہی تھی۔

جون میں دہلی کی بھنگی بستی میں ایک دن باپو کی پرارتھنا سبھا میں میری بہن[1] نے جو اپنی جوشیلی طبیعت کی وجہ سے بعض وقت بہت بے چین ہو جایا کرتی ہیں، یہ طے کر لیا کہ آج باپو کو پکڑ کر پوچھوں گی ضرور کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ ہندوستان ہم سب کا ہے، ہم کو تو یہیں جینا اور مرنا ہے۔ یہ آبادی کا تبادلہ اور بٹوارہ کیا؟ ایک ٹکڑے سے ان دلوں کو کیا تسکین مل سکتی ہے جو متحدہ عظیم، ناقابل تسخیر ہندوستان کا خواب دیکھتے رہے ہیں۔

جونہی پرارتھنا ختم ہوئی "باپو اٹھے" وہ تیزی سے لپکی کہ بھیڑ کو چیرتی ہوئی ان تک پہنچ جائے اور دل کی بات کہہ سنائے مگر ان کے میاں[2] نے پیچھے سے روک لیا "ہاں ہاں، کیا کرتی ہو۔ یہاں کونسا موقع ہے پھر کبھی دیکھا جائے گا۔" وہ کہتے رہے اور جب تک وہ اسے چھوڑیں، گاندھی جی جا چکے تھے۔ انھیں آج تک قلق ہے کہ وہ اس دن بھرے مجمع میں جی کی بھڑاس نہ نکال پائیں۔

---

[1] بلقیس مسز وراثت علی قدوائی

[2] وراثت علی قدوائی

اندیشہ سب کو یہی تھا، کہ بٹوارہ ہوتے ہی کہیں انگریزی کا داؤں نہ چل جائے۔ یہ بھی ڈر تھا، کہ آبادی کا ادھر سے ادھر آنا جانا، کہیں مصیبت بن کر نہ نازل ہو جائے۔ بس رہ رہ کر لیڈروں پر غصہ آتا تھا۔

آزادی کا دن

اب اس وقت مجھے ۱۵ اگست بھی یاد آرہا ہے کلکتہ سے لے کر مشرقی اور مغربی پنجاب تک کی آہوں، چیخوں اور دھوئیں میں لپٹا ہوا، آزادی کا نام نہاد خون میں لتھڑی ہوئی آزادی، جس کے قدموں میں راجدھانی کی لاش پامال ہو رہی تھی اور عورتوں کی عزت لٹ رہی تھی۔ دکھیوں کی پکار اور مظلوموں کی آہ و فریاد گورنمنٹ ہاؤس میں گونج اٹھی لیکن ہم سب پھر بھی خوش تھے۔ زبردستی خوش ہونے کی کوشش کر رہے تھے کہ چلو خیر، برسوں کی محنت ٹھکانے لگی۔ پُر امید تھے کہ جو ہوا سو ہوا، غلامی کا جوا تو گردن سے اترا۔ آزادی ملنے کے بعد فرقہ واریت کا بھوت بھی سر سے اتر جائے گا۔ بیشک ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ خوش تو رہ سکیں گے۔

مگر نہیں اس دن بھی ہم میں سے بہنوں کی قسمت میں مایوسی و نامرادی لکھی تھی۔ اس روز بھی ہمیں غیریت اور غلامی کا احساس ہونا بدا تھا۔ ایسے خوشی کے وقت میں بھی ہماری آرزوں کو مٹی میں ملنا تھا۔ شہر کا بیشتر حصہ میں نے اپنی ایک دوست[1] کے ساتھ رکشا، پیدل اور موٹر پر دیکھ ڈالا لیکن میں جیسی گئی تھی ویسی لوٹ کے آگئی۔ خوشی کہیں بھی نہ ملی۔

میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا، کوئی خوشی کا گلا گھونٹے رہا ہے ارمانوں پہ اوس پڑی جا رہی ہے۔ آج ترنگے جھنڈوں کی بہار میں بھی دل کشی نہ تھی۔ "انقلاب زندہ باد" کے نعرے اور جے کارے آج روح سے نہیں ٹکرا رہے تھے۔ رگوں میں آج گرم خون نہیں دوڑ رہا تھا۔ ہندی میں لکھے ہوئے سائن بورڈ، نعرے اور پوسٹر۔ سب ایسا لگتا تھا جیسے ہمارا منہ چڑھا رہے ہیں، مضحکہ اڑا رہے ہیں۔

اس وقت ہندوستان ماضی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ ماتھے پر تلک لگ رہے تھے۔

---

[1] بیگم حیات اللہ انصاری

اور میں سوچ رہی تھی کہ بنارس سے برہمن کس لیے بلائے گئے ہیں؟ قاری کیوں ڈھونڈھا جارہا ہے؟ چندکیوں گھولا جارہا ہے؟ بدھ بھکشو آخر گورنمنٹ ہاؤس میں کیا بنائیں گے؟ گورنمنٹ ہاؤس کے چکنے فرش پر کیا اب لکڑی کی کھڑاویں چٹاخ پٹاخ چلتی نظر آئیں گی۔ اُوہ میرا تو جیسے دم گھٹا جاتا ہے۔ میں سوچتی سوچتی، جلتی بھنتی، رات کو گورنمنٹ ہاؤس پہنچی۔ ایک بار تو غرور سے سر اونچا ہوگیا۔ یہ بلند دروازہ آج عوام کی گذرگاہ تھا اور اُس پر اپنے دیس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہاں کا سب کچھ آج اپنا تھا اور اس میں رہنے والے اپنے ساتھی تھے۔

لیکن جلد ہی دل بجھ گیا۔ یہاں تو آج وہ زبان بولی جارہی تھی جو انگریزی سے زیادہ کانوں کے لیے اجنبی تھی۔ بقول جوش سے

جس کو دیووں کے سوا کوئی سمجھ ہی نہ سکے
زیرِ مشق اب ہے وہ اندازِ بیاں اے ساقی

چوکیوں پر داہنے بائیں بدھ بھکشو، براہمن، قاری، پادری، پتا نہیں کون کون براجمان تھے۔ بہت سی زبانوں میں بہت کچھ ہوا۔ انگریزی، سنسکرت، عربی، ثقیل ہندی ہر ایک میں لیکن کچھ نہ ہوا تو اپنی بولی میں وہی پیاری بولی

جس کی ہر بات میں سو پھول مہک اٹھتے تھے

اتنا کچھ ہوا مگر ہمارے پلے کچھ نہ پڑا میری طرح اور بہت سی عورتیں بھی رندھے گلوں اور حیرت زدہ آنکھوں سے سارا سین دیکھ کر جو گھر پلٹی ہیں تو ایسا لگا جیسے کمر ٹوٹ گئی ہو۔ خود پہلی آزاد ہندوستان کی گورنر سروجنی نائیڈو باوجود کوشش کے حلف نامہ صحیح نہ پڑھ سکیں۔

کیا اسی مستقبل کے لیے ہم نے سالہا سال انتظار کیا تھا؟ ہم میں سے کون یہ چاہتا تھا کہ گڑے مردے اکھیڑے جائیں؟ اور جمہوریت کی جگہ دھرم اور مذہب کی ٹھیکیداری حکومت لے لے؟

یہ سماں تکلیف دہ تھا دل شکن تھا۔ برہمنیت کا یہ نظارہ دیکھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ہم نے مستقبل کی جھلک دیکھ لی۔ وہ لوگ جو پچھلے بیس برس محض تماشائی بنے رہے تھے، خوش ہو ہو کر ہمیں طعنے دے رہے تھے" دیکھا! ہم نہ کہتے تھے، کہ اختیار ملا نہیں اور ہندوستان میں ہندو راج ہو جائے گا۔ اسی لئے پاکستان بنا نا ضروری ہوا بلکہ اُسی

ذہنیت نے پاکستان بنوایا ہے۔"

ایک بزرگ[1] نے فرمایا، میں تو اس پر ایک مضمون لکھ چکا ہوں کہ برہمنیت ہمیشہ ہندوستان پر غالب رہی ہے۔ بدھ مت کیسا پھیلا، کتنا عروج حاصل کیا، مگر برہمن ازم نے ایسا دبایا کہ ہندوستان سے نام و نشاں مٹا دیا۔ اسلام کیسا چمکا، لیکن برہمن کے پھندے میں پھنس کر اسی کے رنگ میں ایسا رنگ گیا کہ اپنی انفرادیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا عیسائیت برہمن ازم کے چکر میں ایسی گرفتار ہوئی کہ تھیا سوفیکل سوسائٹی کے روپ میں اسے بھی برہمن کا لوہا ماننا ہی بنی۔ یہ برہمنیت ہندوستان پر چھا کر رہے گی۔ گاندھی جی ہزار سر ٹپکیں اور تم لوگ کتنا ہی واویلا کیوں نہ کرو، ہندوستان اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔

یہ سب کچھ سننا بھی بڑے صبر کا کام تھا۔ ہم سب دم بخود تھے نہ کوئی امید نظر آتی تھی نہ روشنی۔ ہم میں سے کچھ سوچ رہے تھے کہ آخر یہ مزدور پیشہ عوام، یہ کسان، یہ متوسط طبقے والے، یہ غریب لوگ، ان سب کے لیے بھی اس گورکھ دھندے سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟ وہ راستہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ کانگرس کا برقع اوڑھ کر جو جھلک ہمیں دکھائی گئی ہے اور جو سوانگ رچایا گیا ہے، اس کی حقیقت سے پردہ اٹھانا ہی پڑے گا۔

تاڑنے والے تاڑ گئے کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے، اور یہ پانی کہاں برسے گا۔۔

لیگ والے خوش تھے کہ اب اس حمام میں اکیلے ہم ہی ننگے نہیں ہیں، کچھ اور بھی ہمارے ساتھی نکل آئے۔ مگر ترقی پسند اس فکر میں تھے کہ وہی پرانے آزمودہ بازو جو برٹش گورنمنٹ کے مقابلہ میں میدان سر کر چکے ہیں، کیا یہاں بھی کام آئیں گے یا نہیں؟ ان کی طاقت کو گھٹانا اچھا ہو گا یا اور بڑھانا؟

نوجوان، اور سر پھرے نوجوان سوچنے لگے کہ جنگِ آزادی کے سپور ما اب نئے معرکہ کی تیاری کریں۔ اب غیروں سے نہیں، اپنوں سے مقابلہ ہو گا۔ اور سارا ملک نہیں، مٹھی بھر انسان خاک و خوں میں لوٹ کر نیا ہندوستان بنائیں گے۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ سب سے بڑی قربانی خود ہندوستان کے باپ کو دینی پڑے گی۔

---

[1] چودھری محمد علی ردولوی

آزادی کی چھاؤں میں

پھر ستمبر آگیا۔ ہندوستان کو آزاد ہوئے ابھی پندرہ دن نہ بیتے تھے کہ دلّی میں مار دھاڑ شروع ہو گئی۔ مکانوں، دکانوں، گلی کوچوں میں لہراتے ہوئے ترنگے جھنڈے ابھی میلے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ان پر خون کی چھینٹیں پڑنے لگیں۔ انتشار، بدامنی، فتنہ و فساد کا ایک سیلاب تھا جو پنجاب سے چلا آرہا تھا۔ اس میں دہلی مسوری اور ڈیرہ دون سب غرق ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار محفل میں ہندو مسلم فساد کا ذکر ہو رہا تھا کسی نے کہا فسادوں کی گنگا تو سارے ہندوستان میں بہہ رہی ہے۔ باپو[1] ہنسے اور بولے۔ مگر اس کی گنگوتری تو پنجاب میں ہے اور سچ مچ گنگوتری وہیں سے نکلی۔

ٹیلیفون غائب، ڈاک بند، ریلیں بند، پل ٹوٹے ہوئے، اور انسان تھے کہ کیڑے مکوڑوں کی طرح، سڑکوں پر گلیوں اور میدانوں میں رینگ رہے تھے، مر رہے تھے، کچلے جارہے تھے۔ لوٹے جارہے تھے۔ لیکن بھگدڑ تھی کہ خدا کی پناہ۔ اِدھر سے اُدھر خدا کی بے آواز لاٹھی ان کو ہنکا رہی تھی۔ کشت و خوں کا اتنا بڑا طوفان شاید ہی کبھی ہندوستان کی تاریخ میں آیا ہو۔ سنتی ہوں بخت نصر یروشلم کی آبادی کو غلام بنا کر بابل لے گیا تھا۔ حضرت موسیٰ چالیس ہزار یہودیوں کو لے کر مصر سے نکل گئے تھے۔ قرطاجنہ والے جس ملک کو فتح کرتے تھے اس کے باشندوں کو غلام بنا کر لے جاتے تھے اور ان سے اینٹیں پتھوانے تھے۔ ہندوستان میں بھی مہابھارت جیسی جنگِ عظیم ہوئی اور پھر نادر شاہ نے بھی تین دن دلّی میں قتلِ عام کیا تھا۔

مگر یہ تو سب پرانی کہانیاں تھیں جب تو ایک صوبہ اور ایک ضلع بھی ملک کہلاتا تھا۔ انتہائی ظلم پر بھی دس بیس ہزار سے زیادہ آدمی نہ مرتے ہوں گے۔ لیکن یہ جو کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ دنیا کے شروع سے آج تک کہیں نہیں ہوا ہوگا۔

لکھنؤ میں عورتیں، مرد، بچے، روتے و بلکتے میرے پاس آتے تھے کہ دہلی ٹیلیفون کر کے

---

[1] گاندھی جی

ہمارے عزیزوں کی خیر خیریت کی خبر منگا دو۔ خدا کے لیے مسوری سے ہمارے گھر والوں کے نکالنے کا بندوبست کرادو۔ ڈیرہ دو ن میں اگر کوئی زندہ بچا ہے تو للّٰہ اس کا پتہ منگا دو۔ اور میں بھائی صاحب کو خط لکھتے لکھتے اور ٹیلیفون کر کرکے حیران کو دیتی تھی۔

میری عادت تھی کہ صبح سویرے نماز کے بعد لامارٹی نیر روڈ کے ساتھ ساتھ میل دو میل کا چکر لگایا کرتی تھی۔ میں ہمیشہ تنہا جاتی تھی۔ بھلا اتنے سویرے کوئی کیوں میرا ساتھ دیتا۔ پھر نہ کوئی ڈر تھا نہ خوف۔ لیکن ستمبر شروع ہوتے ہی فضا بوجھل ہونی شروع ہوگئی۔ چار چار پانچ پانچ آدمی اکٹھے پنجاب اور ہندوستان کی سیاست پر بحث کرتے ہوئے پاس سے گذر جاتے ان میں وکیل، پروفیسر، کسان، طالب علم سب ہی ہوتے تھے۔ بعض دفعہ بہت ہی گرما گرم بحث ہوتی اور کبھی کبھی اظہار تاسف کرنے والے بھی ملتے۔ حالات کی یہ تبدیلی مطلع کے غبار آلود ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔

پھر ایک دن چہل قدمی کرنے والوں کے ہاتھوں میں چھڑیاں، ڈنڈے اور چھاتے دیکھ کر اور لوگوں کے بدلے ہوئے تیور اور غضبناک گفتگو سن کر میں نے بھی محسوس کر لیا کہ واقعی لکھنؤ کا امن و سکون بھی درہم برہم ہو رہا ہے۔ گھر والے پہلے ہی سے منع کرتے تھے لیکن میں سنی ان سنی کر دیا کرتی تھی۔ اب یہ رنگ دیکھ کر مجھے سیر بند کر دینی پڑی۔

شہر میں امن کمیٹیاں بن گئی تھیں۔ جگہ جگہ مردوں اور عورتوں کے جلسے ہو رہے تھے۔ مخلوط دعوتیں ہو رہی تھیں۔ تمام مقامی باشندوں کی کوشش یہ تھی کہ لکھنؤ میں کوئی فساد نہ ہونے پائے اور یہاں امن قائم رہے۔ شکر ہے وہ اپنے مقصد اور ارادے میں کامیاب رہے۔ ہندو مسلمانوں کی متفقہ کوششیں رنگ لائیں اور لکھنؤ نے اپنی تہذیب و شائستگی کی لاج رکھ لی۔ لیکن گھر کے اندر جو خبریں آ رہی تھیں وہی دل کا سکون غارت کر دینے کو کیا کم تھیں۔ دن تڑپ تڑپ کر اور راتیں ٹہل ٹہل کر گذرنے لگیں۔ دہلی کے اعزہ کی فکر اس لیے کچھ کم تھی کہ وہاں کچھ نہ کچھ تو حفاظت کا بندوبست ہے، مگر مسوری کی فکروں نے راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ یہ یقین تھا کہ شفیع[1] صاحب اپنی روائتی ضد کی بدولت مسوری سے نکلنا پسند نہ کریں گے۔ یہ احساس کہ ان کو جبراً مسوری چھوڑنے پر مجبور کیا جا رہا ہے انھیں اور بھی مستقل کر دے گا۔

---

[1] شفیع احمد قدوائی

اور پھر اس وقت جیسا کہ ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا تھا، وہ مظلوموں کی جان توڑ مدد کر رہے تھے ایسی حالت میں تو ہرگز آنے کے لیے نہیں تیار ہونگے۔ لیکن گھر والوں کی کوششیں جاری تھیں، بھائی پریشان تھے۔ اِدھر سرکاری کاموں کے سلسلہ میں اُن کا ۱۲ر ستمبر کو لکھنؤ پہنچنا ضروری تھا۔ مگر جلد ہی خط آگیا کہ اب میں ۱۲ر ستمبر کو نہ پہنچ سکوں گا، اس لیے تاریخ بڑھادی جائے اور پھر وہ تاریخیں بڑھتی ہی رہیں۔ وہ ڈیرہ دون کے فساد میں اپنے چند اعزّہ، دوستوں اور ملازموں کے لیے بہت پریشان رہے۔ لیکن جب مسوری میں بھی بلوہ ہوگیا تو بالکل مطمئن تھے۔ "مشکلیں اتنی پڑی مجھ پر کہ آساں ہوگئیں"۔ اپنی حالت نہ لکھتے اور زمانہ بھر کی خیریت پوچھ ڈالتے۔ ایک دن لکھا کہ مجھے بڑی لڑکی[1] کی بہت یاد آرہی ہے اس کا پتہ لکھو تو خط لکھوں۔ اور پھر لکھا کبھی۔ میری تندرستی، بچوں کی خیریت، دوسروں کا حال سب اس انداز سے پوچھتے جیسے خطرہ میں ہم سب لوگ ہیں اور وہ خود محفوظ ہیں۔

البتہ ایک دن جو خط آیا، اس میں وہاں کی ساری داستان تھی لکھا تھا میں اپنے آفس[2] میں بیٹھا ہوا تمہیں خط لکھ رہا ہوں اور نیچے سے مجمع کا شور، بندوقوں کے فائر اور مصیبت زدوں کی چیخ پکار کی آوازیں آرہی ہیں گھر جل رہے ہیں، دوکانیں لوٹی جارہی ہیں اور پولیس تماشہ دیکھ رہی ہے۔ دن دہاڑے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔"

پھر دوسرا خط آیا کہ آفس میں نے بند کر دیا ہے۔ تین دن سے گھر پر ہوں۔ بارش سخت ہو رہی ہے۔ بچارے گھوڑے خچر والے تک حملہ آوروں کی درندگی سے نہیں بچ سکے۔ جمعداروں سے ان کی لاشوں پر میں نے خس و خاشاک ڈلوادی ہے۔

اور اگلا خط ہنگامے کے بعد کا تھا۔ ان واقعات نے ان کا دل توڑ دیا تھا۔ لکھا تھا "میں نے سنہ ۱۹۲۱ء سے کر اب تک مختلف دور دیکھے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کا وہ روح پرور زمانہ بھی دیکھا اور کانگریس کی وقتاً فوقتاً مختلف تحریکوں میں حکومت برطانیہ

---

[1] لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ تھی شفیع احمد قدوائی جو ان دنوں مسوری کے ایڈمنسٹریٹر تھے رفیع صاحب سے دو سال چھوٹے اور ان کی سرگرمیوں میں سنہ ۳۲ء میں ایک سال جیل بھی رہ چکے تھے۔ سنہ ۳۱ء میں ملازمت سے استعفےٰ دیکر تحریک میں شامل ہوئے سنہ ۴۶ء میں گونڈہ سے اسمبلی کا الکشن لیگ سے لڑے

[2] آفس کلڑی بازار سے اوپر ایک پہاڑی پر واقع تھا۔

مظالم بھی دیکھے۔ ۱۹۴۲ کا ہنگامہ خیز دور اور حصول آزادی کا جوش و خروش بھی دیکھا اور پھر الیکشن کے دنوں میں مسلم لیگ کا آپے سے باہر ہونا بھی دیکھتا رہا۔ اب اکثریت کی یہ خودی اور دماغ کی خرابی بھی دیکھ رہا ہوں۔ سب دن گذر گئے، یہ بھی گذر جائیں گے مگر حکام کی یہ بے حسی او جانبداری یاد رہے گی۔"

۲۷ ستمبر کے خط میں تھا "تار کی لائن ٹوٹی ہوئی ہے۔ ایک تار گورنمنٹ کا ۱۷ کو چلا ہوا ۲۴ ستمبر کو یہاں پہنچا ہے۔ دوسرا ۱۲ کا چلا ہوا ۲۲ ستمبر کو مسوری پہنچا تھا۔ ٹیلی فون دہلی کے لیے ملتا ہی نہیں۔ آج چار پانچ دن ہوئے مجھے خیال ہوا تھا کہ یہاں کی حالت کا کچھ تذکرہ پنت جی[1] سے کروں مگر لکھنؤ کے لیے لائن ہی نہ ملی۔ اب تو تار ٹیلی فون سب بیکار ہے۔"

آفس جاتے ہوئے اکثر راستے میں لاشیں پڑی ملتیں۔ ان کی تجہیز و تکفین کرنے والا وہاں کون بیٹھا تھا۔ مسوری کی سڑکوں پر چلنے والے تنہا مسلمان تو وہ خود ہی تھے... لاشیں گھسیٹنے کے لیے ان کے پاس صرف جمعدار تھے۔ وہی یہ رسم انجام دیتے کہ لاشوں کو کھڈ میں ڈال کر ان پر مٹی پتھر یا کوڑا پھینک دیں تاکہ چیلوں اور گدھوں کی یورش سے نجات ملے۔ کھڈ میں سڑی ہوئی لاشوں پر کوڑے کرکٹ کے انبار ڈلوا کر شہر کی ہوا کو صاف رکھنا بھی تو انہیں کا کام تھا۔ کسی میونسپلٹی کے ایڈمنسٹریٹر کو شاید کبھی ایسی ذمہ داریوں سے واسطہ پڑا ہو۔

اور جب یہ سب کچھ سوچتی ہوں تو دل چاہتا ہے، خودکشی کر لوں۔ یہ سارے کام ان کو اکیلے ہی کرنے پڑے۔ میں تو اطمینان سے لکھنؤ[2] میں بیٹھی تھی۔ گھبرا کر ایک دن مسوری جانے کے ارادے سے کسی کو خبر کیے بغیر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ نظر باغ تک پہنچی تھی کہ چھوٹے بھائی جا کر پکڑ لائے۔ میری زندگی کی انہیں بڑی فکر تھی وہ نہیں آپ نہ جائیے کوئی ریل سلامت پہنچتی ہی نہیں ہے ابھی نہیں پھر چلی جانا۔" کاش میں اسی دن چلی گئی ہوتی۔

مگر وہ لکھتے تھے "میری طرف سے مطمئن رہو۔ بارش کی وجہ سے ایک دن کے سوا

---

[1] وزیر اعلی یوپی

[2] ان دنوں رفیع بھائی کے والد امتیاز علی صاحب سخت علیل اور صاحب فراش تھے اور میں ان کی تیمارداری کے لیے لکھنؤ آئی ہوئی تھی۔

برابر دفتر جاتا رہا ہوں۔" حالانکہ دفتر کے مسلم ملازم کیمپ میں تھے۔ ہندو آنا ضروری نہ سمجھتے تھے مگر وہ اپنی دھن کے پکے تھے۔ فساد کے ختم ہوتے ہی آفس کھولنا ضروری سمجھا اور جانے لگے۔ کچھ امدادی کاموں کے سلسلے میں بھی دفتر کھولنا ضروری ہوگیا۔ ۲۸ ستمبر کو ایک طویل خط بھائی کے نام اور دوسرا ایک دوست کے نام لکھا۔ دونوں کا مضمون ملتا جلتا تھا۔ وہ مفصل خط بھائی کی غلطی سے ضائع ہوگیا۔ شفیع صاحب کی شہادت کے چند دنوں بعد تحقیقات کے سلسلے میں کسی نے پوچھا، اور بھائی نے وہ خط اٹھا کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ تحریر ہمیں واپس نہیں ملی اور نہ جانے کیوں خط دیکھنے کے بعد حادثے کی تحقیقات بھی ڈپٹی کمشنر کو ملتوی کر دینا پڑی۔ کیوں؟ اس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ لیکن دوست کے نام جو خط تھا وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں لکھا تھا:

"میں برابر آفس جاتا ہوں۔ لوگ احتیاط کے خلاف سمجھتے ہیں مگر میرا خیال ہے، خوف کو غالب آنے دیتا، تو اب تک کوئی واقعہ ہو چکا ہوتا۔" اور اس "واقعہ" کی خواہش بہتوں کو ہوگی۔"

دوسرے خط میں تھا "میرے سب مسلمان اہل کار کیمپ میں ہیں۔ ان کی تنخواہ کا روپیہ پہنچانا اور ان کو زندہ رکھنے کے لیے روپیہ کا انتظام کرنا ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے جب تک حفاظت سے لانے لے جانے کا انتظام نہ ہو جائے، وہ رخصت پر سمجھے جائیں۔ ان کو موجودہ مصیبت کے لیے علاوہ تنخواہ کے پراویڈنٹ فنڈ سے بھی روپیہ دیا جائے۔ . . . ایجوکیشن سپرنٹنڈنٹ ایک کانگرسی ہیں وہ اس وقت بہت کام کر رہے ہیں اور امداد کرتے ہیں۔"

"جب تک میری جان میں جان ہے، میں خدمت کروں گا۔ جو ظلم ان پر ہو رہا ہے، مجھے اس سے بہت تکلیف پہنچی ہے۔"

یکم اکتوبر کو پانچ دن سے نہ کوئی ٹرین ڈیرہ دون پہنچی۔ نہ وہاں سے گئی تھی موٹر لاریوں کا آنا جانا بھی بند تھا اور انھیں افسوس تھا۔ لکھتے ہیں۔

"ریڈیو سے خبریں وغیرہ سن لیا کرتا تھا، اس نے بھی تین دن سے رفاقت چھوڑ دی ہے۔" ایسا کیوں تھا؟ وجہ نہ معلوم ہو سکی۔ پنڈت جی کو ٹیلیفون بھی نہ کر سکے دہلی میں بھائی صاحب سے بھی بات نہ کر سکے۔ اور میرے بھائی کے اور اس دوست کے تینوں خطوط میں انہوں نے لکھا۔

"خدا کو حاضر و ناظر جاننے کے یہی مواقع ہوتے ہیں میرے لیے دعا کرو کہ قلب میں کمزوری نہ پیدا ہو" "موت کا ایک دن معین ہے"، "مرنا برحق ہے ہر شخص کے لیے موت آنی ہے مگر دعا کرو کہ خدا میرے قلب کو مضبوط کر دے اور موت کا خوف کسی ایسی بات کے کرنے میں مانع نہ ہو جس کو میں کرنا صحیح سمجھتا ہوں۔" ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"کوئی پرخلوص دوست یا ہمدرد دلگداز نہیں ہے، مگر اس کے باوجود خدا ہی ہمت روز افزوں رکھے"۔ "۲ اکتوبر کے بعد کا کوئی خط مجھے نہیں ملا۔ لکھا ضرور ہوگا۔ ان دنوں روزانہ ایک خط میرے لیے ڈاک میں ڈلواتے تھے۔ کوئی عجب نہیں غائب کر دیا گیا ہو۔

اکتوبر میں روزانہ انھیں دھمکیاں دی جا رہی تھیں کہ اگر ڈیرہ دون سے نہ گئے تو قتل کر دیے جاؤ گے۔ کہنے والا ٹیلیفون سے بھی دھمکیاں دیتا تھا اور خطوط بھی بھیجتا تھا۔ ایک تحریر تو ان کے کاغذات میں بھی ہمیں ملی ہے۔

عزیز حیات[1] خاں صاحب جو کیمپ کے پناہ گزینوں میں شامل تھے، بیان کرتے ہیں کہ قدوائی صاحب روزانہ آفس جاتے اور آتے ہوئے ہم سب سے ملنے کیمپ میں آیا کرتے تھے۔ ہماری مشکلات سنتے اور دکھ درد دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ شہادت سے ایک روز پہلے آئے تو کہا۔ آج مجھ کو پھر "وارننگ" ملی ہے۔ عزیز صاحب نے پوچھا: "تو پھر کیا ارادہ ہے"، ہنسے اور جواب دیا: "میں تو ہرگز نہ جاؤں گا"

رامپور ہاؤس[2] کی آبادی اس وقت تین ہزار تھی۔ اس میں کوئی آٹھ سو کشمیری اور بالتی بھی تھے۔ کچھ مزدور تھے، کچھ ٹھیکیدار وغیرہ۔ ان کا ہزاروں روپیہ میونسپلٹی کے ذمہ باقی تھا اسی دن وہ سب آکر قدموں پر گر پڑے کہ ہمارا روپیہ دلوا دیجیے۔ تو ہم وطن واپس چلے جائیں۔ اور شفیع صاحب نے وعدہ کر لیا، کہ کل ہی دلوا دوں گا۔

لیکن وہ قیامت خیز "کل" جب آئی تو کشمیری سر پیٹ پیٹ کر رو رہے تھے، اور کہہ رہے تھے کہ ہماری قسمت پھوٹ گئی۔ اور واقعی یہی ہوا۔ وہ سب مسوری سے گئے مگر مفلس، قلاش، بھوکوں مرنے کے لیے اس خبر نے کیمپ میں کہرام مچا دیا۔

شفیع صاحب اس وقت حکام کی لاپروائی یا جانب داری اور عوام کی غنڈہ

---

[1] شوکت حیات خاں۔ کے بیٹے یا بھتیجے تھے۔ اور اقبال مشیر قدوائی کے داماد۔
[2] رامپور ہاؤس میں مسلم پناہ گزینوں کو رکھا گیا تھا۔

گردی دونوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ سب کی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ روڑا راستے سے ہٹ جائے۔ اِدھر وہ سمجھتے تھے کہ ان کا فرض ہے مقابلے پر جمے رہنا۔ بدی کی بڑی بڑی طاقت کے سامنے سر نہ جھکانے کا انہوں نے عزم کر رکھا تھا۔ آخر اس کشمکش میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ تخریب پسندوں کو ان کی سرگرمیاں بھلا کیسے پسند آسکتی تھیں۔ بہنوں کو یہ کبھی ڈر تھا کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ کچھ اور تھے جوان کو مار کر دھرم کے رکھشک بننا چاہتے ہوں گے۔ کتنے دنوں سے آرہے تھے کتنی بار لکھ چکے تھے۔ کتنی خواہش گھر آنے کی تھی مگر مشیتِ الٰہی، وہ تو کچھ اور طے کر چکی تھی۔ تقدیر پر کیا زور۔ ڈیرہ دون کے دوستوں کا اصرار، ہم سب کے خطوط، گھر بھر کی پریشانیاں، کوئی بھی وقت معین کو نہ ٹال سکا۔

اب اکثر خیال یہ آتا ہے کہ شاید خود میں نے ہی لکھنؤ آنے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ میرے بھائی پہلے ہی مجھ پر الزام دیتے تھے، اگر تم زور دے کر لکھو تو ضرور چلے آئیں گے مگر تم کو تو جیسے فکر ہی نہیں ہے۔ لیکن مجھ سے زیادہ کون ان کا مزاج شناس ہو سکتا تھا۔ میں زور کیسے دیتی، کس منہ سے اصرار کرتی۔ اپنی بزدلی سے ان کی بہادری کا موازنہ کرکے تو مجھے خود شرم آرہی تھی۔

خطرہ سے بھاگنا۔ مخالفت سے پیچھے ہٹنا۔ جان مال یا کسی نقصان کے ڈر سے ضمیر کے خلاف قدم پیچھے ہٹانا، ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ سمجھتے تھے، ہندوستان ان کا گھر ہے۔ ان کا ملک ہے۔ ان کی جنم بھومی ہے۔ اس سرزمین پر زندہ رہنے، چلنے پھرنے، اور کاروبار کرنے کا انھیں بھی اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کسی اور کو۔ جو کچھ ہورہا ہے، یہ دشمنی ہے، دوستی نہیں۔ اور ملک کی بربادی ان کی اپنی بربادی ہے۔ انھیں حق حاصل ہے کہ اپنی عزت اور پیدائشی حق کے لیے مقابلہ کریں تو مظلوموں کی امداد وہ کیسے نہ کرتے؟

جس بات کو وہ ٹھیک سمجھتے ہوں، اسے کرنے سے تو کوئی ان کو کبھی روک نہیں سکا تھا اور میں نے تو کبھی ایسی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اور اب سے کچھ پہلے خود میں ایک بار یہ الفاظ بھی لکھ چکی تھی کہ "میرا خیال ہے کسی ذمہ دار آدمی کو ایسے وقت اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں چاہیئے۔ ممکن ہے اس کی ذات سے دس غریبوں کی جانیں بچ جائیں یا سو پچاس کی حفاظت ہو جائے یا دوسروں کی مصیبت میں وہ اپنی شخصیت کے اثر سے کچھ کرا سکے۔"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب یہی جی چاہتا تھا کہ خدا کرے وہ چلے آئیں۔ نہ آئیں تو کسی طرح میں ان کے پاس پہنچ جاؤں جس آگ سے وہ کھیل رہے تھے اسی آگ میں ساتھ ہی جل مرنے کی حسرت جی میں تھی لیکن کچھ بھی تو نہ کر سکی۔

اندر ہی اندر دُعائیں مانگتی تھی۔ بھائیوں کو تار دینے یا فون کرنے سے کبھی منع نہیں کرتی تھی۔ خود بھی دو ایک بار نہیں کئی بار لکھا کہ "گھر میں سب بہت پریشان ہیں اور کیونکر کہوں کہ خود میری بھی انتہائی خواہش ہے۔ اب لکھنؤ آ جاؤ تو اچھا ہے۔ لوگ مجھے آنے نہیں دیتے ہیں ورنہ اب تک کب کی آ چکی ہوتی ......"

۲۱ر اکتوبر کو ان کا جو جواب آیا اس میں اپنی معذوریوں کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا: "انیس، مجھ میں کمزوری نہ پیدا کرو۔ میں یہاں سے ہٹوں گا نہیں، ہنگامہ ختم ہونے دو تو میں ان سب کو بلاؤں گا۔ ورنہ جو مقدر میں ہے بس خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے ثابت قدم رکھے۔"

اس جواب نے ان کی قدر میرے دل میں اور بڑھا دی۔ وہ بھاگ کر بچ سکتے تھے بلکہ یہ تو ان سے کہا ہی جا رہا تھا۔ لیکن گاندھی جی کے عدم تشدد کو وہ ظلم و جبر کے مقابلہ کے لیے سب سے بڑا ہتھیار سمجھتے تھے اور تنہا اس سرزمین پر ٹھہر کر اس بربریت اور ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا چاہتے تھے۔ میں ان کے عزم راسخ کو کیسے توڑ سکتی تھی جب کہ خود ہی اس کی صداقت کی قائل ہو چکی تھی۔

سب کچھ سوچ کر دل کو تسکین دینے کی ناکام کوششیں کرتی رہی۔ لیکن وہاں تو آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کے اگلے چار پانچ دن کس روحانی کشمکش میں گذر رہے ہوں گے۔ نہ کوئی اپنا نہ پرایا۔ دشمنوں کا نرغہ، دھمکی آمیز خط اور ٹیلیفون، تنہائی اور ہر لحظہ موت کے قدموں کی چاپ ...... میرے خدا...... مجھے یاد آتا ہے کہ میں ایک دن مسوری میں ان کے ایک شعر پڑھنے پر لڑ پڑی تھی۔ صبح صبح نہاتے میں انہوں نے شعر پڑھا ؎

کسی کے منہ سے نہ نکلا یہ میرے دفن کے وقت
کہ ان پہ خاک نہ ڈالو یہ ہیں نہائے ہوئے

اس بدشگونی پر مجھے بہت غصہ آیا۔ کافی دیر تک میں جھگڑتی رہی۔ وہ ہنستے رہے مگر اتنا کیا کہ پھر جب تک میں رہی یہ شعر نہیں پڑھا۔ آج سب کچھ یاد آ رہا ہے جو نہ یاد کرنا چاہو۔ وہ بھی۔

ڈیرہ دون میں مسٹر خورشید لال[1] وغیرہ دوستوں نے ازخود ۸، اکتوبر کے لیے ان کی سیٹ ریزرو کرادی اور یہ طے ہوگیا کہ اب لکھنؤ چلے جائیں گے۔ مگر قدرت نو کچھ اور مقرر کر چکی تھی۔ ۷، اکتوبر کو یعنی اس سے ایک دن پہلے ہمیشہ کے لیے لکھنؤ آنا ختم ہوگیا۔ نو اور دس بجے کے درمیان دفتر جاتے ہوئے، بہارستان کے نیچے شہید کر دیے گئے۔

چپراسی ساتھ تھا۔ مارنے والے کون تھے؟ کہاں سے آئے؟ وہ پولیس مین جو دوستوں نے ازخود کوشش کر کے ان کی حفاظت پر دو روز سے مامور کرا دیا تھا گھر پر کیوں رکا رہا؟ ایسے بہت سے سوالات لوگ کرتے رہے۔ جن کا نہ ہمارے پاس کوئی جواب تھا، نہ چپراسی کے۔ کچھ معلوم ہی نہ ہوسکا۔

اور وہ پستول جو آزاد[2] صاحب اور خورشید لال صاحب کے کہنے سننے سے جیب میں رکھ لیا تھا بدستور رکھا ہی رہا۔

سنہ ۱۹۲۱ء سے تو میں نے کبھی ان کو ہتھیار ہاتھ میں پکڑتے دیکھا نہ تھا شفیع صاحب نے کہا بھی کہ مجھ کو چلانا تو آتا نہیں، اس کو رکھ کے کیا کروں گا۔ انہوں نے چلانا بھی سکھا دیا اور تاکید کی کہ اس کو ہر وقت جیب میں رکھیے مرتے دم تک جیب میں رہا ضرور لیکن نکالنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ خون آلودہ پستول ان کی جیب سے نکال کر کئی ماہ بعد ہمیں ملا جو صاف ہوچکا تھا مگر اب بھی اس پر دھبے باقی تھے۔ بیگناہی کی مہر اس پر خون سے ثبت تھی ؎

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

اور اپنی زندگی کا سنگ گراں اتار پھینکنے کے بعد وہ یقیناً بہت خوش ہونگے۔ بے حد جفاکشی و عسرت کی زندگی انہوں نے بسر کی بمشکل سے آمدنی کا بیسواں حصہ ان کی ذات پر صرف ہوتا تھا اس لیے کہ دوسرے زیادہ سے زیادہ آرام سے رہ سکیں صبح سے لے کر شام تک ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں وہ اپنی ذات پر دوسروں کی ضرورت خواہش اور اہمیت کو مقدم رکھتے تھے

---

[1] ڈیرہ دون کانگرس کمیٹی کے صدر تھے اور مشہور وکیل، اجو کو رفیع صاحب کے ساتھ ڈپٹی منسٹر بھی نے۔ پھر پاکستان ہائی کمشنر ہوکر جارہے تھے کہ شاید ایک ہفتہ پہلے انتقال ہوگیا۔ [2] مسٹر آزاد سوری کے کلکٹر تھے

اور جب یہ سب کچھ ہو گیا تو دل کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ ایک بار تو انتقام کی آگ نے میرے دل و دماغ کو پھونک ہی ڈالا تھا مگر کچھ ہی دیر بعد میں نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔

جہاں ہزاروں انسان مارے گئے وہاں یہ بھی سہی تسکین کے لیے یہ بھی تو کافی ہے کہ بے گناہ شہید ہوئے۔ کسی کو مارا نہیں کسی پر ظلم نہیں کیا، کسی کو تباہ نہیں کیا۔ خدا اور اس کی مخلوق کا جو مطالبہ تھا اسے پورا کیا، انسانیت کا جو حق تھا۔۔ وہ ادا کیا۔

ایک صاحب کہنے لگے۔ آپ لوگوں کی طرف سے نہ تحقیقات کا کوئی مطالبہ ہوا نہ مجرموں کی تلاش اور سزا کے لیے کوئی کوشش کی گئی۔ میں بھلا اس کا کیا جواب۔۔ دیتی میری کوئی خواہش ہی باقی نہ تھی۔ کھوئی چیز ہمیں مل نہیں سکتی۔ کمان سے چھوٹا ہوا تیر واپس نہیں آسکتا۔ دل پر لگا ہوا زخم اب ناسور ہی بن کر رہے گا۔ اور اس ویرانے میں اب رہتی دنیا تک بہار آنے کی نہیں۔

قاتل کو پکڑوا کر میں کیوں اس کی عورت کو بیوہ کروں۔ کیوں اسکے بچوں کی یتیمی کا باعث بنوں۔ شاید اس کی ماں ہو تو اس کے تڑپنے کا سامان میرے ہاتھوں کیوں ہو۔ خدا ہی پر کیوں نہ چھوڑ دوں۔ وہ تو سب کو جزا و سزا دینے والا ہے یہ فیصلہ اسی کو کیوں نہ سونپ دوں۔ اور پھر میں کیا جانوں وہ ہے کون؟ پھر یہ بات بھی ہے کہ تحقیقات کرانا، سزا دینا گورنمنٹ کا کام ہے۔ آخر قانون اور حکومت کو کسی قتل کی تحقیقات کے لیے ہمارے مشورے اور اجازت کی ضرورت ہی کیوں ہے؟

جو مجھ پر پڑی ہے یہ کچھ نئی نہیں ہے۔ اور بھی ہزاروں لاکھوں اس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ صبر و سکون کی خاطر میں نے کس کس طرح اپنے آپ کو سمجھایا کیسی کیسی تاویلیں کیں اور کتنی دعائیں خدا سے مانگیں کہ بار الٰہا جس استقلال کی دعا شفیع صاحب مانگ رہے تھے وہ اب مجھ کو عطا کر دے۔

ایک ہفتہ تو خیر اس عالم میں رہی کہ اپنی بھی خبر نہ ملی۔ لیکن کہاں تک، زندہ تھی اور دنیا کی نظر میں بھی مجھے زندہ دلی کی طرح رہنا تھا۔ اس لیے اپنے ہوش و حواس مجتمع کرنے شروع کر دیے۔ آہستہ آہستہ چار دن سوچ کر میں نے ایک رائے قائم کر لی کہ اگر مسوری نہیں جا سکی تھی تو نہ سہی، اب دہلی پہنچ کر اپنے آپ کو دکھوں کے اس ساگر میں

ڈبو دوں جس میں دلی غرق ہو رہی ہے۔ وہاں گاندھی جی ہیں اور ان کی عملی روحانیت۔

دلی جس کا ہر گلی کوچہ ماضی کی کھلی ہوئی کتاب ہے۔ جو بیسیوں مرتبہ آباد ہوئی اتنی ہی بار اجڑی اور اجاڑی گئی۔ لیکن ہر مرتبہ پھر بسی۔ کبھی غیروں کے ہاتھوں لٹی۔ کبھی اپنوں نے نوچا کھسوٹا۔ کبھی مہمانوں نے اس کی درگت بنائی اور کبھی گھر والوں نے۔

تاریخ کی اس پرانی کتاب میں ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء سے ایک نئی خونی باب کا اضافہ ہوا ہے۔ میں یہاں اس افسانہ کو پڑھنے کے لیے نہیں، اس طوفانی سمندر میں اپنی زندگی کے سب سے بڑے غم کو غرق کرنے کے لیے آئی کہ شاید اسی میں مستقبل کا کوئی اور چھور مل جائے! ؏

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

2

شہیدِ اعظم گاندھی جی کے حضور میں

مدتوں سے جی میں ارمان تھا کہ چند ہفتہ موجودہ زمانہ کے اس سب سے بڑے انسان کے قدموں میں گذار دوں۔ دُنیا کا محسن۔ اس صدی کا مصلح۔ مادّیت کے اس دور میں روحانیت کا علمبردار۔ اپنے ملک میں موجود، اور بدقسمتی دیکھو کہ آج تک چند لمحے بھی اس کی صحبت نصیب نہ ہو سکی۔ اپنی اس محرومی کا خیال کر کے ہمیشہ جی دُکھتا تھا۔

لیکن ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اور یہ ظرف پیدا ہوا زندگی کی سب سے بڑی چوٹ سے۔ ایسی چوٹ جس کے بعد نہ کوئی دُکھ ہی محسوس ہوتا ہے نہ تکلیف، تکلیف۔ مجھے بھی قدرت نے اسی کسوٹی پر کسا اور اسی بھٹی میں تپایا جس میں ہر لحظہ کھرے کھوٹے کی پرکھ ہو رہی تھی اور جس میں اس وقت سارا ہندوستان تپ رہا تھا۔ خدا جانے نتیجہ کیا رہا مگر دل میں اتنا گداز ضرور پیدا ہو گیا کہ میں نے باپو کے سامنے جا کر خلوصِ دل سے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

اتنا افسوس ضرور ہے کہ یہ دیرینہ آرزو پوری ہوئی تو اُس وقت جب ان کا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا تھا لیکن میں تو اتنے پر بھی خدا کا شکر کرتی ہوں کہ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں چند منٹ ہی کے لیے سہی، میں اپنے ٹھٹھرے ہوئے دل کو گرمی پہنچا سکی یعنی اور مادّیت کے اس مصنوعی دور میں حقیقی روحانی بلندی کا ایک نظارہ میں نے بھی دیکھ لیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی متاعِ بے حقیقت لے کر میں بھی مسیحائے وقت کے دربار میں حاضر ہو گئی۔

برلا ہاؤس میں آدمیوں کی بھیڑ تھی۔ گیلریوں میں بے شمار لوگ آ جا رہے تھے۔ ہر طرف چہل پہل تھی، لیکن باپو کے کمرے میں ایک پُر وقار سکون چھایا ہوا تھا۔ یہ امن

وسیج لی کا دیونا سپید کھاریں ملبوس، لکڑی کے تخت پر بیٹھا تھا جس پر دودھ جیسی سپید چادر بچھی تھی۔ قریب ہی ابھا[1] اور منو[2] وغیرہ تھیں۔ میں نے سنبھلنے کی بہتیری کوشش کی، مگر بے کار۔ ان کے دیکھتے ہی میرا ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور میں بے قرار ہوگئی، جیسے کوئی مصیبت زدہ لڑکی اپنی ماں کو دیکھ کر پھوٹ پڑے۔ آنسو تھے کہ اُمڈے چلے آرہے تھے۔ منہ سے ایک لفظ تک نہ کہہ سکی۔ آواز نکلتی ہی نہیں تھی۔

گاندھی جی خود ہی بولے۔ "میں سمجھ گیا۔ انھیں کے لئے تو مجھے صبح[3] سے تیار کیا گیا تھا۔ آؤ بیٹھو"۔ ان کے چہرہ پر پُرسکون مسکراہٹ تھی۔ پاس ہی چھوٹی سی چوکی پر شاید دلیہ اور کوئی کچی ترکاری رکھی تھی جسے وہ آہستہ آہستہ کھا رہے تھے اور اتنے ہی آہستہ آہستہ بول رہے تھے کہنے لگے:

"رو نہیں۔ ان کے لئے کیا رونا۔ وہ مرے تھوڑی ہیں۔ زندہ ہیں۔ وہ تو اپنا کام کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ ایسی موت کسے نصیب ہوتی ہے اور ایسے لوگ مرتے کب ہیں۔ یہ موت تو کسی خوش قسمت ہی کو ملتی ہے۔"

میں نے کہا "باپو، قاعدے کے مطابق تو مجھے ابھی کئی مہینے گھر سے نہیں نکلنا چاہئے تھا۔ لیکن میں سارے بندھن اور حدیں توڑ کر اس لئے جلدی آپ کے پاس چلی آئی کہ کہیں آپ پاکستان نہ چلے جائیں۔ باپو! میں بھی اسی طرح خدمت کرتے ہوئے اور کام کرتے ہوئے مرنا چاہتی ہوں جس طرح شفیع صاحب نے جان دی۔ میری بیکار زندگی کو بھی کسی مصرف کا بنا دیجئے۔"

مُسکرائے اور کہا "میں کیسے جا سکتا ہوں، یہاں تو ابھی بہت کام پڑا ہے۔ کلکتہ تو دلی کے سامنے ایک کھیل تھا، کھلونا۔ اور جب تک یہ سب نہ ختم ہولے، جب تک ہر ایک مسلمان بچہ پہلے کی طرح باہر نہ پھرنے لگے۔ میں کیسے جا سکتا ہوں۔ ان دنوں تو لوگ بس پاگل ہو رہے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد باپو نے مجھ سے کہا "سوشیلا[4] کے پاس چلی جا۔ وہ وہاں مسلم کیمپ میں کچھ کرتی ہے۔ وہ بتائے گی۔ سیوا کرنا تو اچھی بات ہے۔ اس سے مل تو، اور پھر آنا۔ رونے کی بات نہیں سیوا کرو اور خوش رہو۔"

---

[1] گاندھی جی کی پوتی [2] گاندھی جی کے پوتے کی بیوی [3] میں صبح فون سے آنے کی اجازت لے چکی تھی۔
[4] سبھدرا جوشی جو اس وقت مس سبھدرا دتہ تھیں

کیا پتہ، کیا کچھ کہا۔ اور تو کچھ یاد بھی نہیں آتا۔ میں اٹھ کر چلی آئی اور شاید سیدھی کیمپ پہنچی سوشیلا سے ملی، تو انھوں نے مریضوں کو کھانا پہنچانے اور تیار کروانے کا طریقہ مجھے سمجھایا۔ زندگی کے اس خطرناک موڑ پر آ کر گاندھی جی کی رہبری مجھے یہاں نہ لے آتی تو کیا ہوتا؟ یہ سوال اب بھی رہ رہ کر اپنے آپ سے کرتی ہوں۔ اس نئی پگڈنڈی پر چلتے چلتے شاید میں اس سڑک کو پا سکوں جو سیدھی منزل تک پہنچتی ہے۔ باپو نے سہارا نہ دیا ہوتا تو شاید میں حیرت زدہ اس چوراہے پر کھڑی کی کھڑی رہ جاتی اور قدم کسی طرف نہ اٹھتے۔

جب دوسری بار گاندھی جی کا سامنا ہوا تو آنسو تھم چکے تھے، سکون طاری ہو گیا تھا۔ اس وقت باپو کے ارد گرد منی بہن پٹیل، سبھدرا ٹنڈن۔ اور کئی اجنبی لوگ تھے سبھدرا کسی مسلم آفیسر کا مقدمہ پیش کر رہی تھیں اور باپو سن رہے تھے۔ منی بہن نے سب کچھ سن کر کہا:

"اس مسلمان سے بولو۔ سردار سے ملے، اور سب بات بتائے۔"

سبھدرا نے مایوسی سے جواب دیا "سردار تک اس کی پہنچ کہاں ہو سکتی ہے، وہ بے چارہ کیسے ہمت کرے۔"

میرا بدلا ہوا انداز دیکھ کر باپو مسکرائے اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ میں نے بتایا۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ اب میں سوشیلا[1] کے ساتھ پرانے قلعہ میں مریضوں کو کھانا پہنچاتی ہوں اور اپنے کام سے مطمئن ہوں۔ یہ سن کر خوش ہوئے۔ بولے یہ تو اچھی بات ہے۔

تھوڑی دیر اور بیٹھ کر میں نے محسوس کیا کہ زیادہ وقت لینا ٹھیک نہ ہوگا اس لئے اٹھ کر چلی آئی۔ اب اکثر میں پرارتھنا سبھا میں شریک ہونے لگی کیونکہ اس وقت گھر پر ہوتی تھی۔ صبح تو مجھے کیمپ پہنچنے کی جلدی ہوتی تھی جہاں سے ۲ بجے کے پہلے فرصت ملنا محال تھی۔ کیمپ میں جب کوئی مشکل پیش آتی تو فوراً پہنچتی مگر زیادہ تر برج کشن جی سے کہہ کر باپو تک بات پہنچوا دیتی۔ سوشیلا نائر کے ذریعہ کہلوا دیتی۔ صرف اس خیال سے میں ان کے پاس روزانہ نہیں جاتی تھی کہ ان کا قیمتی وقت لینے کے زیادہ مستحق ان کے پرانے کارکن، ان کے ساتھی ہیں۔ مجھے بلا وجہ ان کو پریشان نہیں کرنا چاہئے۔ کہیں برا نہ مانیں کہ یہ تو ہر روز سر پر سوار رہتی ہے۔ حالانکہ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ باپو برا نہیں مانتے تھے۔ پھر بھی میری بزدلی اور پاس ادب مانع رہا۔

---

[1] ڈاکٹر سوشیلا نائر۔ گاندھی جی کی چیلی۔ بعد کو ہندوستان کی وزیر صحت بنیں

ایک دن گئی تو باپو ڈاکٹر ذاکر حسین سے کہہ رہے تھے:

"ڈاکٹر صاحب، جاؤ، سامان سنبھال لو۔ میرے پاس لوگ آئے تھے، اور ایسا کہہ رہے تھے کہ وہ تمہارے قرول باغ والے اسکول کا کچھ سامان بچا سکے ہیں اور واپس کرنا چاہتے ہیں"

باتیں شاید دیر سے ہو رہی تھیں اس لئے میں پوری طرح نہ سمجھ سکی لیکن بعد کو معلوم ہوا، فسادات میں جامعہ کے اسکول، مکتبہ، اور لائبریری کو کئی لاکھ کا نقصان پہنچا تھا، بعض بھلے لوگوں نے کچھ سامان بچا لیا، اور ان کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب آکر دیکھ لیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اس منزل پر پہنچ چکے تھے کہ اب دیکھنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے تھے۔ چوٹ بڑی سخت تھی، اسکول کی بلڈنگ کا افسوس نہ تھا، اپنی قیمتی کتابوں اور برسوں کی محنت کا افسوس تھا، وہ ٹال رہے تھے۔

گاندھی جی ڈاکٹر صاحب سے آہستہ آہستہ بات کر رہے تھے لیکن میں کچھ سن تھوڑی رہی تھی، میں تو کسی اور ہی سوچ میں تھی۔

ماضی کے ۲۷ سال میری نظروں میں گھوم رہے تھے جب میں نے پہلے پہل باپو کا نام سُنا جب پہلی بار عدم تشدد اور سچے روحانی اصولوں پر سیاسی پارٹی بنانے کا چرچا سن کر میں نے اپنے کو تولا تھا۔ ۱۹۲۱ سے لے کر اب تک ساری امیدیں مجھے یاد آئیں۔ مہاتما جی کے اونچے آورش، ان کے میٹھے بول، ان کی سادہ زندگی پر مخالفین کا طنز۔ کبھی ننگا فقیر۔ دجال گاندھی۔ کبھی مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن۔ ہندوؤں کا ناش کرنے والا۔ کبھی مہاتما جی۔ اور اس وقت ؏

رند کہتا ہے ولی مجھ کو، ولی رند مجھے

سارے ہی سین آنکھوں میں پھر گئے۔ یہ انسان کمزور، منحنی، مٹھی بھر ہڈیوں کا ڈھیر، اور اس کے اندر یہ بلا کی طاقت۔ یہ انتھک کام کرنے کی قوت۔ یہ صبر وضبط۔ آخر کہاں سے آگیا؟ ۲۷ سال کی محنت برباد ہو رہی ہے۔ اپنے ہاتھوں بنائی ہوئی عمارت ڈھائی جا رہی ہے۔ اس گھپ اندھیرے میں اس آندھی اور طوفان میں یہ اب تک کیسے جوت جگائے رہے۔ یہ شمع بجھ تو نہ جائے گی۔ یہ سہارا ابھی تو نہ ٹوٹ جائے گا خدا یا کیا ہوگا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر میں اٹھ آئی۔ سوچتے سوچتے میں کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔

دلی میں ....

اکتوبر، نومبر کی دلی۔ ایک خون میں لتھڑی ہوئی لاش تھی جس پر سینکڑوں گدھ اور چیلیں منڈلا رہی تھیں کہ اس "بڑھے نگہبان" کی ذرا نظر بچے، یا وہ یہاں سے ہٹے اور وہ اس لاش کی تکا بوٹی کر ڈالیں۔

کوئی جگہ محفوظ نہ تھی۔ کوئی دل مطمئن نہ تھا۔ کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔ محبت کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ ہر طرف نفرت کا بول بالا تھا۔ ادھر مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا زمین سخت تھی، آسمان دور۔ ادھر پاکستان کے ہندو مصیبت زدہ بے سہارا بے کس لٹے پٹے قافلہ در قافلہ چلے آرہے تھے۔ نہ کہیں شانتی ملتی تھی، نہ سکون۔ ایسے میں صرف مہاتماجی کا کمرہ ایک امن اور پناہ کی جگہ تھی جہاں خوف زدہ دکھیارے مسلمان۔ تباہ حال، غم و غصہ کی آگ میں پھنکتے ہوئے ہندو شرنارتھی، بے سہارا عورتیں، لاوارث بچے، بڑی بڑی داڑھیوں والے سکھ اور تلک دھاری پنڈت۔ لانبے چغے پہنے ہوئے عیسائی راہب اور عربی اور ہندی ملے جلے لباس اور وضع والے علما، یہ کمرہ سب ہی کا ٹھکانا تھا۔ یہاں پہنچکر سب ہی محسوس کرتے تھے کہ

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

وہاں تو انھیں کوئی ٹوک نہیں سکتا تھا۔ نہ کوئی ڈر۔ نہ دباؤ۔ بھلا اپنے باپ سے کوئی کھل کر بات نہ کرے گا، تو پھر کس سے کرے گا۔ ہر شخص یہی محسوس کرتا تھا کہ باپو اپنی اولاد کو دامن میں چھپا کر ہر مشکل اور آفت سے بچا لیں گے۔

آنے والے اپنا دکھ درد کہتے اور ان سے کہہ کر ایسی تسکین ہو جاتی جیسے دکھ کی دوا مل گئی۔ گتھی سلجھ گئی، اور سر سے بوجھ ہٹ گیا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ سب کچھ ہو جاتا تھا۔ گورنر سے لے کر بھکاری تک، کون ایسا تھا جو باپو کی آشیرواد یا دعا لینے نہ آتا ہو۔

آج بھی کانوں میں وہ کلام پاک، رام دھن اور بھجن کا نغمہ گونج رہا ہے۔ وہ سریلی راگ، وہ سادہ پرسکون منظر۔ وہ خاموش مجمع اور پھر باپو۔ بے جان پتھر کی مورتی کی طرح خاموش، آنکھیں بند، استغراق اور سچے مراقبے کا عالم، دنیا و مافیہا سے بے خبر جیسے چوکی پر جڑ دیے گئے ہوں۔

پرارتھنا ختم ہوئی اور وہ چونک پڑے۔ مورتی میں گویا جان پڑ گئی۔ آنکھیں کھولیں اور میٹھے میٹھے بول فضا میں بکھرنے لگے۔ اتنے سادہ لفظ۔ ٹوٹی پھوٹی زبان۔ پوپلا منہ۔ نہ کوئی خطابت نہ شعریت، نہ رنگینی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ ہر لفظ کانوں کے راستے دل میں اترا جارہا

ہتھوڑے سے دل پر چوٹیں لگائی جارہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے میرے مالک .... ۔۔۔
کاش یہ حقیقت جاودانی بن جاتی ۔

پرار تھنا کے بعد کی تقریریں کتنوں کے دل کا مرہم بنتیں، اور بعض کی نفرت اور عداوت کا سبب بھی ہو جاتیں ۔ کسی کو تنبیہہ ہوتی، کسی کو تادیب ۔ تنبیہہ الغافلین کا یہ عصائے مقدس تین ماہ تک دہلی کی فضا میں لہراتا رہا مگر غافل! وہ تو ازل کے غافل تھے ۔

کبھی کبھی ایسا اثر قلب پر ہوتا کہ لوگ رونے لگتے ۔ میں نے نظر اٹھائی تو ایک بڈھے سکھ کو دیکھا، کھڑے رو رہے ہیں ۔ خود اپنے آپ کو دیکھا تو آنسو نکل آئے تھے ۔ چوٹ کھائے ہوئے دلوں کو یہاں مرہم بھی ملتا تھا، اور تسکین بھی اور کبھی نہ مٹنے والی تڑپ اور بیقراری بھی .... اے کاش، میں نے اس سے زیادہ دیکھا ہوتا!

رونے سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے ۔ رونا بزدلی اور کمزوری کی نشانی ہے میں اب بھی رونا نہیں چاہتی تھی، لیکن بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا کہ شاید اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں رہ گیا ہے ۔ اپنے کو نہ روؤں مگر اپنے سے بدتر زندگیوں پر آنسو نہ بہانا بس کی بات نہ تھی، لیکن مہاتما جی کے سامنے تو رونے ہوئے بھی شرم آتی تھی ۔ میں اکثر انھیں رنجیدہ دیکھتی ۔ لوگوں کے پاگل پن کا ذکر بڑے دکھ سے کرتے لیکن ظلم اور ناانصافی کے خلاف لوہے کی دیوار بنے کھڑے تھے ۔

بڑے بڑے تناور درخت ان دنوں جڑ سے اکھڑ چکے تھے ۔ عالی شان محلوں کی بنیادیں ہل گئی تھیں اس طوفان کے تھپیڑے کھا کر جانے کتنی کشتیاں ڈوب چکی تھیں اور کن کن میں سوراخ ہو گئے تھے، بھارت کا نو تعمیر جہاز ڈوب رہا تھا، اور ناخدا ہتھیلی پر جان لئے جہاز کو بھنور سے نکال کرلے جانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا ۔ چند اللہ کے بندے اپنی بساط بھر اُس کا ساتھ دے رہے تھے اور کچھ دور ساحل پر کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے ۔

بار خدایا، یہ ٹوٹی کشتی جو چھلنی ہو چکی ہے کیسے ساحل تک پہونچے گی؟ ۔۔۔۔۔ بجلی کی طرح یہ خیال آتا اور سارے صبر و سکون اور امید کو جلا کر خاک کر جاتا ۔

ایک کانگریسی ورکر نے بتایا کہ باپو نے کانگریسیوں سے پوچھا ہے کہ اپنا اپنا دکھڑا تو تم بہت سنا چکے، اب یہ بتاؤ کہ کتنے آدمی مرے ۔ انھوں نے اندازہ بتایا ۔ تو پھر پوچھا، "ان میں سے کانگریس والے کتنے تھے؟" اب تو وہ لوگ بہت سٹپٹائے اور کہا "جی ہمارے علم میں تو ایک بھی نہیں مرا

باپو نے کہا، "تو پھر تم لوگ کیسے کہتے ہو کہ ہم نے فساد روکنے کی بہت کوشش کی۔ کوشش کرتے ہوئے جب کوئی مارا نہیں گیا تو ہیں کیسے مان لوں کہ تم نے کوئی کوشش کی بھی؟"

یہ تھی عمل کی اِنتہائی منزل، جس تک وہ خود جانا، اور اپنے ساتھیوں کو بھی لے جانا چاہتے تھے، بُرائی کو مٹانے کے لئے، پاپ کو معدوم کرنے کے لئے، اُن کے نزدیک اُس حد تک جانا چاہیئے تھا۔

نیا نیا کام پڑا تھا اور نئی نئی چوٹ، میں بہت جلد بیمار ہو گئی۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو یاد آیا کہ کئی دن ہو گئے باپو سے نہیں ملی ہوں، کیونکہ تیسرے چوتھے . . . دن جایا کرتی تھی اور اس سرچشمۂ علم و عمل سے نئی طاقت لے کر پلٹ آتی تھی۔ آج جو گئی تو کھانسی آرہی تھی۔ آواز بھاری تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھا:

"تُو اچھی تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا، "بیمار ہو گئی تھی۔ کئی دن سے کیمپ بھی نہیں جا سکی، نہ آپ کے پاس آئی۔"

بدستور مُسکراتے ہوئے کہا، "یہ تو بہت بُرا ہے۔ بیمار کیسے ہوئی؟ سیوا کرنے والے کو بیمار تو نہیں ہونا چاہیئے۔ جب دل سے سیوا کرو تو بیماری کیسی؟ جلدی ٹھیک ہو جا، نہیں تو کام کیسے چلے گا؟"

ایک ہندو لڑکی مسلم کیمپ میں مل گئی جو اپنے مسلمان مالک ساتھ مدراس سے دہلی آئی تھی۔ فساد میں اس سے جدا ہو کر اسپتال گئی، اور وہاں سے کیمپ پہنچی، اسے بھی مہاتماجی کے پاس پہنچانے کے سوا کوئی چارہ نہ نظر آیا۔ ایک ہندو بہن کے ذریعہ شاید وہ اپنے عزیزوں کے پاس مدراس پہنچ گئی۔

ایک دن پہاڑ گنج کے تباہ حال سکرٹری[1] کانگرس کمیٹی کو لے کر جب باپو سے ملانے

---

[1] پہاڑ گنج ختم ہو چکا تھا۔ نئے لوگ وہاں بس گئے تھے اور پُرانی آبادی کچھ کیمپ میں تھی، کچھ منتشر ہو چکی تھی۔ کانگرس کا سکرٹری بھی مسلم کیمپ میں تھا۔ ٹھٹھیرا برادری کے محمد ایوب پہاڑ گنج کانگرس کمیٹی کے سکرٹری تھے۔ فساد میں اپنے پیتل کے ردّل میں بارود بھر کر اور لوٹے کی ٹونٹیوں میں آتشبازی کا مصالحہ بھر کر انکے خاندان نے بلوائیوں کا مقابلہ کیا تھا تقریباً ۸۰ فیصدی افراد برادری کے مارے گئے۔ خود انکے گھر کے شاید ۱۲ آدمی کام آئے

گئی تو یہی خیال آیا کہ خود مجھے تو اس وقت کوئی خاص کام نہیں ہے، بیکار کیوں باپو کو پریشان کروں۔ چاندی والے سے کہہ کر سکرٹری محمد ایوب کو اندر بھجوا دیا اور میں کیمپ واپس چلی آئی۔

بچارا سکرٹری چیتھڑوں لگا ہوا، مہینوں کی فاقہ زدہ صورت اور سینہ پر جان مال اور عزت کی تباہی کے داغ لئے جب باپو سے ملا ہو گا تو وہ دل جو دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی مصیبت پر تڑپ اٹھتا تھا، جو دشمن کے لئے بھی بے پناہ محبت اپنے اندر رکھتا تھا، اپنے کانگریسی کی یہ درگت دیکھ کر کس انداز سے تڑپا ہو گا۔ میں دیکھ تو نہیں سکی لیکن سوچ کر میری آنکھ میں آنسو آ گئے۔

ایوب صاحب نے بتایا کہ میں بھی رویا اور مہاتما جی بھی متاثر ہوئے اور میں نے اپنی پوری داستان مختصراً ان کو سنا دی۔

باپو نے کوئی اُمید نہیں دلائی، کوئی وعدہ نہیں کیا مگر وہ خوش تھا اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا وہ اس لئے تو گیا ہی نہیں تھا۔ اسے تو صرف اپنا بوجھ اٹھانے کے لئے طاقت چاہیئے تھی اور یہ اُسے مل گئی تھی۔

ایک دن ہم نے ایک گاؤں کے ہندو مسلمانوں کو لے جا کر ان سے ملایا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہتے تھے اور مقامی حکام بضد تھے کہ آہستہ آہستہ گاؤں سے دونوں کو نکال کر نئے آنے والوں کو بسا دیں۔

یہ ایسے واقعات تھے جن سے باپو کے دُکھ اور تکلیف میں اضافہ ہوتا تھا لیکن ہم لوگ بالکل مجبور تھے۔ ان گتھیوں کو سُلجھانا ہمارے بس کا نہ تھا۔ ہماری سُننے والا بھی تو اُن کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ لے دے کر ایک وہی تو ہمارا سہارا تھے، یا پھر وزیر اعظم۔ مگر باپ اور حاکم کی کیا برابری؟ وہاں الفاظ ناپ تول کر کہنے پڑتے تھے، یہاں دل کھول کر رکھ دیا جاتا تھا، جو جی میں آیا اناپ شناپ کہہ دیا۔ صحیح معنوں میں ہزاروں مظلوموں کا آسرا صرف باپو تھے۔

ایک دن گئی تو گاندھی چرخہ کات رہے تھے۔ میں نے کہا، اوہ آپ کتنا پیارا سُوت کاتتے ہیں۔ ذرا سا مجھے دیدیجیے۔ مجھے کاتنا آتا ہے مگر اتنا خوبصورت نہیں ہوتا۔ کہنے لگے: "کاتتی تھی تو کیا اب نہیں کاتتی۔" یہ واقعہ ہے کہ بہت دنوں سے میں نے چرخے کو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔ گھر ہی پر چھوڑ آئی تھی اس لئے ان کے یہ کہنے پر شرمندہ ہو گئی۔

ایک گاؤں کے اُجڑنے اور جائداد کے تبادلہ[1] کی کہانی جب ہم نے باپو کو سُنائی تو کہا:

"اچھا میں پوچھوں گا اور کل بتاؤں گا۔"

دوسرے دن انھوں ہمیں بتایا کہ میں نے اس ذمہ دار مقامی افسر سے پوچھا ہے۔ وہ کہتا ہے، میں نے حکومت کے ایک رکن[2] سے پوچھ کر ایسا کیا تھا۔

سبھدرا نے کہا۔ مگر باپو۔ ایک افسر کو تو جائداد کا لین دین اُس وقت تک نہیں کرنا چاہیئے تھا جب تک دونوں حکومتیں[3] فیصلہ نہ کر لیتیں، ایسے افسر کو ہٹا دینا چاہیئے۔

باپو رنجیدہ ہو کر بولے۔ یہ ٹھیک ہے، اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، مگر اس نے کیا اور ہٹانے کی جو بات تُو کہتی ہے، تو فرشتے کہاں سے آئیں گے۔ آج کل تو لوگ بس پاگل ہو رہے ہیں۔

اجمیر سے بلوے کی خبر آچکی تھی۔ باپو بہت متاثر تھے۔ ابھی تک خبریں صرف سرکاری ذریعہ سے آئی تھیں۔ پھر اجمیر سے کچھ کانگریسی آئے اور انھوں نے حقیقت حال گاندھی جی کو سنائی۔ وہ لوگ خود دہلی آکر ۳ر جنوری کو پنڈت جواہر لال کو اجمیر لے گئے۔ صحیح تاریخ تو مجھے یاد نہیں۔ شاید اس کے بعد ہی اجمیر سے مرزا عبد القادر بیگ دہلی آئے۔ میں بھی اتفاق سے موجود تھی۔ اجمیر شریف کی دردناک حالت، پولس اور فوج کی زیادتیاں، راشٹریہ سیوک سنگھ کے مظالم، اور حکام کی نا اہلی۔ سب کچھ بیان کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ سارے مسلمان اس وقت درگاہ میں جمع ہیں۔

باپو نے پوچھا "کتنی بڑی ہے درگاہ جو اس میں سب آگئے۔ میں نے وہ جگہ دیکھی ہے۔

مرزا صاحب نے جواب دیا۔ "سات، آٹھ ہزار آدمی اس میں سما سکتے ہیں، بہت جگہ ہے اس میں۔"

باپو نے کہا۔ "مگر اجمیر کی ساری آبادی صرف اتنی تو نہ تھی، باقی لوگ کہاں گئے؟"

ع۱ ہمیں یہ خبر ملی تھی کہ دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تہاڑ گاؤں میں بدر عالم صاحب کی ہزاروں بیگھہ زمین سے اپنی پاکستان میں چھوڑی ہوئی پراپرٹی کا تبادلہ کر لیا ہے۔ اس اراضی پر بسے ہوئے اور کاشتکار مسلمان اور ہریجن تھے، زمین ان سے خالی کرا کر ریفیوجیز کو دی جا رہی تھی، گاؤں کی آبادی تقریباً ۷ ہزار تھی، ۵ ہزار مسلمان دو ہزار ہریجن۔ مسلمان کے سامان کیمپ میں آچکے تھے اور ہریجن گاؤں کے باہر نکال دیے گئے تھے۔

ع۲ سردار پٹیل سے

ع۳ ہندوستان پاکستان

مرزا بولے۔ "کچھ پاکستان گئے، کچھ حیدرآباد، کچھ مارے گئے۔ کچھ اور جگہوں پر منتشر ہو گئے کچھ ٹونک بھی گئے ہیں۔"

باپو نے سکون سے کہا "یہی میں پوچھتا ہوں۔"

چونکہ گفتگو میرے پہنچنے سے پہلے شروع ہو چکی تھی اس لیے میں پورا حال نہیں سن سکی تھی۔ بعد میں تمام حالات کی میں نے خود تحقیق کی۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اور پھر ۱۲ جنوری کا دن آگیا۔ رات ہی کو خبر مل گئی تھی کہ کل گیارہ بجے برت شروع ہو جائیگا۔ صبح سویرے گھر کے سب لوگ برلا ہاؤس پہونچ گئے۔ وہاں کچھ لوگ صحن اور چبوترہ پر ٹہلتے ملے۔ کچھ دور کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ مہاتما جی کھلے سائبان کے نیچے حسب معمول گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے تھے۔ ارد گرد کرسیاں تھیں، صبح کی دھوپ ہمیشہ وہ سائبان اور صحن میں بیٹھ کر لیتے تھے، کھانے کے وقت کمرہ میں آجاتے تھے۔

آج سردار پٹیل ان سے باتیں کر رہے تھے۔ ہم سب کو صحن میں ٹھہرنے کے لیے کہا گیا کیونکہ بات چیت ابھی جاری تھی۔ مجمع آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ سردار[1] کی ملاقات طویل ہو گئی۔ حاضرین میں سب ہی پریشان تھے، متفکر تھے۔ مہاتما جی کا ننھا پوتا[2]، ماں کی انگلی پکڑے حیرت کے ساتھ اس مضطرب مجمع کو دیکھ رہا تھا۔

آخر کار کھانے کا وقت ہو گیا پوتے نے دادا کے ساتھ کھانے میں شرکت کی حالانکہ اس کی ماں نہیں چاہتی تھی کہ وہ شریک ہو کیونکہ باپو کا کھانا ہی کتنا ہوتا ہے اور یہ جب بھی آتا ہے ان کے سنگترے اور ترکاری میں ساجھی بن جاتا ہے۔

اتنے میں ایک صاحب نے آکر کہا: آپ لوگوں کو بھی باپو سے کچھ کہنا ہو تو آجائیے۔ ہمیں اس کے سوا اور کیا کہنا تھا کہ باپو ہم پر رحم کیجیے۔ دیا کیجیے۔ مرن برت نہ رکھیے۔ مگر کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی پاس ادب مانع تھا۔ بمشکل ڈرتے ڈرتے، میں نے اپنے آپ کو تیار کیا، اور چند قدم کے فاصلے سے حسبِ معمول سلام کیا۔

گاندھی جی خوش دلی سے مسکرائے اور کہا۔ "اتنی دور سے نظر تو ٹھیک کام نہیں کرتی لیکن میں پہچان گیا جب تو نے اس طرح سلام کیا۔ میں سب جان گیا۔"

میں نے عرض کی۔ باپو۔ ہم سب چاہتے ہیں۔ سارے کام کرنے والوں کی آرزو ہے کہ ہمیں

---

[1] سردار پٹیل بہت مکدر باہر نکلے [2] دیوی داس کا لڑکا

آپ پندرہ دن کی مہلت اور دیدیجیے۔ اگر جب تک حالت نہ ٹھیک ہو، تو برت رکھ لیجیے گا۔ اور اب تو دیکھیے۔ حال بہت کچھ ٹھیک ہو چلا ہے، شہر میں بھی امن ہے۔

مسکرائے اور جواب دیا، "اگر میں تجھ سے پہلے پوچھتا تو، تو یہ بات نہ کہتی جو آج کہہ رہی ہے، مجھے پھسلانے آئی ہے۔"

میں نے کہا۔ نہیں باپو، یہ سچ ہے، حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔

سنجیدگی سے بولے۔ "کیا سچ ہے۔ کیا مسجدیں سب خالی ہو گئیں، کیا مسلمان پھر باہر پھرنے لگے۔ دیکھو گجرات[1] کی ایسی خبر آئی ہے۔ اگر دلی کو پھر کچھ ہو گیا؟ قطب صاحب کا مزار دیکھا ہے؟"

میں نے کہا نہیں مگر سنا ہے۔

کہنے لگے۔ اچھا تو پھر جا کر دیکھنا۔ اس کو توڑا گیا ہے، اور اب اگر اجمیر میں خواجہ صاحب کی درگاہ کو بھی کچھ کیا گیا تو میں جی کر کیا کروں گا، لوگ تو بس ان دنوں پاگل ہو رہے ہیں۔

اتنے میں اور بہت سے لوگ آ گئے، ان میں مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا آزاد بھی تھے۔ مولانا آزاد سامنے بیٹھ گئے اور کہنے لگے:

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں کہ جب ضرورت ہوگی، میں آپ کو بتا دوں گا۔"

باپو نے کہا۔ آپ نہیں بتاؤ گے، مولانا صاحب۔

مولانا نے، اب یاد نہیں کچھ اور کہا۔ اس کے بعد گاندھی جی پھر مخاطب ہوئے اور کہا:

"اچھا تو اب سمے ہو گیا۔ جاؤ۔ پہلے سے زیادہ جی لگا کر کام کرو۔ کام تو کرنے ہی سے ہوگا۔ رونے سے تو کام نہ چلے گا!"

(میں رو رہی تھی۔)

وہ کہتے رہے۔ "کوئی دنیا میں سدا نہیں رہا اور مجھے تو مرنا ہی ہوگا۔ پھر میں ایسے حالات میں جی کر کیا کروں گا —— سردار نے بات تو خراب کہی[2]۔ لیکن وہ تو ہوم منسٹر ہے اور

---

[1] پاکستان سے آنے والی پناہ گزینوں کی ایک ٹرین کو پاکستان ہی کے گجرات اسٹیشن پر ٹھہرا کر پٹھانوں نے بری طرح قتل عام کیا تھا۔ سیکڑوں لڑکیاں اغوا کر لی تھیں اور دہلی میں ان کے رشتہ داروں میں کہرام مچا ہوا تھا۔

[2] لکھنو والی تقریر کی طرف اشارہ تھا جس کی شکایت عام طور پر مسلمانوں کو تھی۔ اس میں سردار پٹیل نے کہا تھا۔ جو مسلمان یہاں پڑے ہیں ان کو پڑے رہنے دو۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مسلمانوں کو تو اس کے پاس جانا ہی ہوگا، اور بات کہنی ہوگی۔"

اس کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن سے مخاطب ہو کر کہا۔"میں تو ان کے پاس ہو کر ان پر پورا بھروسہ اور وشواش رکھتا ہوں، اور اس سچائی میں میرے اور ان کے کچھ بھید نہیں ہے۔ مولانا صاحب جاؤ، میرا پیغام سب تک پہنچا دو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ جاؤ۔" وہ کچھ اور بھی کہتے رہے، نہ میں مسلسل سن سکی، نہ یاد ہی رہا ہے۔ کچھ ٹکڑے ذہن میں محفوظ رہ گئے۔

ستے ہوئے چہرے، متفکر اور ڈبڈبی ہوئی آنکھیں لیے، نہ جانے کتنے لوگ ارد گرد جمع تھے، جو ان کا ایک ایک لفظ بغور سن رہے تھے، میں شاید کچھ اس وقت اور زیادہ کمزور ہو رہی تھی۔

باپو کی پشت کی طرف ہم سب سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ آبھا۔ منو۔ سوشیلا نائر اور سارے خدمت گذار داہنے بائیں آ گئے، اور پرارتھنا شروع ہو گئی۔ حسب معمول قرآن۔ گیتا۔ بائیبل اور بھجن سب ہونے لگے،

باپو کی آنکھیں بند تھیں۔ ہم سب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، دل دھڑک رہے تھے، اور آنکھیں نم تھیں۔ روحانیت ایک بار پھر مادیت کے خلاف برسرپیکار تھی، انسانیت کا نمائندہ درندگی، وحشت، ظلم، اور بدامنی کو مٹانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا رہا تھا۔

عظمتِ انسانی نے خدائے برتر کے قدموں میں جان جیسی بیش قیمت چیز ڈال دی تھی، کہ اے میرے مالک۔ اگر اس دنیا سے نیکی، سچائی اور آدمیت ہی اٹھ گئی تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گا، یا تو مردہ انسانیت کو پھر سے زندہ کر دے! اے محبت کے خالق، محبت کی بارش کر، یا پھر یہ دن دیکھنے سے پہلے مجھے اٹھا لے!

گاندھی جی دست بدعا تھے، ہم سب سرنگوں تھے، لب پر دعائیں تھیں، اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے صرف ہم ہی نہیں، ساری کائنات اس وقت ہماری اس دعا میں شریک ہو۔

عجیب منظر تھا وہ بھی۔ گہری خاموشی کے بعد آنکھیں کھلیں، ایک دوسرے کو دیکھا، تو بھاری دل ہلکے ہو چکے تھے۔ مایوس نگاہیں مطمئن تھیں۔ میرے قریب ہی پولیس کے انسپکٹر جنرل مسٹر مہرا[1] کھڑے تھے، وہ ابتدا سے آخر تک موجود رہے اور بہت ہی متاثر نظر آتے تھے۔ مگر اب ان کے

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) مارتے کیوں ہو زمین خود ہی اتنی گرم ہو جائے گی کہ وہ چلے جائیں گے۔

[1] مسٹر مہرا مخلص اور ہمدرد انسان تھے۔ کچھ ہی روز ہوئے ان کا تقرر دہلی میں ہوا تھا اور ناشکری ہوگی اگر ان کے انصاف، ہمدردی اور خلوص کا اعتراف نہ کیا جائے۔

چہرہ سے بھی غم کی کیفیت کم ظاہر ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم سب نے اپنا بوجھ باپو کے کاندھے پر رکھ دیا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ مجمع منتشر ہونا شروع ہو گیا۔ ہم لوگ سیدھے شہر گئے۔ پانچ دن گلی کوچوں میں پھرتے بچوں اور بوڑھوں، چھوٹوں اور بڑوں کی منتیں کرتے گزرے۔ اس دوران میں ایک دن برلا ہاؤس گئی تو باہر کی سڑک سے لے کر اندر صحن تک آدمیوں کا ٹھٹھ لگا تھا۔ ہزاروں لوگ درشن کے مشتاق۔ ایک بات سننے کے شیدائی۔ چشم براہ تھے۔ میں بھی جا کر ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں باپو برآمد ہوئے لیکن ان کا پریشان چہرہ، کمزور آواز، اور غمگین سکوت دیکھ کر مجھ سے زیادہ ٹھہرا نہ گیا، چند لفظ کہے اور اٹھ آئی۔

پھر اس دن تک نہ گئی جب تک ان کا برت ٹوٹ نہیں گیا۔ جا کر بھی کیا کرتی۔ رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ ہم کیا منھ لے کر ان کے سامنے جائیں۔ ہمارے ہی پاپوں نے تو یہ دن دکھایا۔ یہ بھی خیال تھا کہ باپو نے ہمیں جی لگا کر کام کرنے کو کہہ رکھا ہے۔

پانچویں دن ۱۸ر جنوری کو برت ٹوٹ گیا۔ میں نے شہر ہی میں یہ خبر سنی کہ مولانا آزاد نے سنگترہ کا رس پیش کیا اور باپو نے اسے پی کر برت توڑا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ خلقت اُمڈ کر دیوانوں کی طرح برلا ہاؤس کی طرف دوڑ پڑی۔

جس دن برت شروع ہوا ہے۔ صبح تک شہر کی حالت خراب تھی، مگر آج فضا پرسکون تھی۔ فتنہ کے سیاہ بادل چھٹ گئے تھے، اور سورج کی کرن نظر آ رہی تھی۔ دلوں کی سیاہی دور ہو رہی تھی اور اس کی جگہ اعتماد کی روشنی براجمان ہو رہی تھی۔

میں بھی پرارتھنا کے وقت پہنچی۔ اتنے میں واقعی بارش ہونے لگی۔ ایسے میں باپو مقررہ جگہ تک نہ آ سکے اور کمرے کے اندر رہی سے انھوں نے خطاب کیا۔ باہر مجمع پانی میں بھیگتا رہا تھا لیکن کسی نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ پرارتھنا اور ان کی خفیف آواز سن کر ہی سب لوگ ٹلے۔ اتنے میں ایک صاحب نے مجھے دیکھ لیا۔ زبردستی پکڑ کر مکان کے اندر لے گئے۔ میں نے کہا۔ بھئی کسی طرح باپو کے کمرے میں پہنچا دو تو جاؤں۔ وہ ہمیں وہاں لے گئے۔ بولنے کے باعث مہاتما جی بہت تھک گئے تھے۔ کچھ آدمی اندر ان کے پاس کھڑے تھے۔ کچھ آدمی آجا رہے تھے۔ باپو کو غالباً لیموں کا رس ملا پانی پیش کیا گیا تھا۔ ابھی صرف ایک گھونٹ لیا ہوگا کہ جواہر لال جی سامنے آ گئے۔ ان کو دیکھ کر ایسی معصومانہ بیقرار مسرت چہرہ پر ظاہر ہوئی ہے کہ وہ انداز مجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔ جیسے بچہ کوئی بڑی اچھی خوش رنگ چیز پا کر کھلکھلا اٹھے۔ گلاس ہاتھ میں تھا۔ خوشی کے مارے منھ پھیلا ہوا تھا۔ لوگوں نے کہا، بس اب تو تخلیہ ہی کر دینا مناسب ہوگا!

کمزوری کئی دن رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جسم کی کھال جھلس گئی ہو۔ وہ پہلی بچوں کی سی ملائمت جاتی رہی تھی اور چہرہ بھرّایا ہوا تھا۔

اور پھر ۲۰ جنوری کو پرارتھنا سبھا میں کسی نے بم پھینکا۔ ملزم گرفتار ہوگیا مگر دشمنوں کے خوفناک ارادوں نے خلقت کو لرزہ براندام کر دیا۔ کیا مخالف اس حد تک بھی جا سکتے ہیں؟ کیا یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے؟ کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی ہندوستانی اس سطح پر اتر آسکتا ہے۔ پھر قطب صاحب کا عرس آگیا۔ میرے ساتھیوں نے طے کیا کہ مہاتما جی کے ساتھ تو ان کے خاص لوگ جائیں گے، ہم سب پہلے سے مہرولی پہنچ جائیں۔ ایک دن پہلے جا کر میں درگاہ کی مرمّت اور انتظام وغیرہ دیکھ آئی تھی۔ یہی ڈر تھا کہ کہیں اس دن کی طرح سوال کر بیٹھے تو کیا جواب دوں گی۔

درگاہ کے صحن میں دورویہ احراری والنٹروں اور سرحد کے سرپوشوں نے صف بنا رکھی تھی۔ ان کے بیچ سے باپو لاٹھی ٹیکتے، خمیدہ کمر، آہستہ آہستہ چلے آرہے تھے۔ وہ آج بہت دنوں کے بعد ایسے مجمع سے گذر رہے تھے جس میں ہندو۔ سکھ۔ مسلمان دوش بدوش کھڑے تھے۔ ۱۵ اگست کے بعد یہ پہلا موقع تھا۔ محبت پیار اور یکتا کا یہ منظر دیکھ کر انھیں کتنی مسرت ہوئی ہوگی۔

وہ سماں آج بھی میری آنکھوں میں ہے جب گاندھی جی ہندو مسلمانوں کے جھرمٹ میں سے مسکراتے ہوئے، ہاتھ جوڑے، قطب صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے، تو میں نے "ساوتری" سے کہا۔ لو دیکھو۔ آج ایک "زندہ رشی" "مردہ رشی" سے ملاقات کرنے آیا ہے۔ سب ہنس رہے تھے، سب خوش تھے۔ تبرک تقسیم ہوا تو پہلے کی طرح بلا تفریق مذہب لوگ ایک کے اوپر ایک ٹوٹے پڑتے تھے۔

مہاتما جی چبوترے پر گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئے اور ہر سمت سے پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ کمزور ضرور تھے، مگر خوش اور مطمئن۔ درگاہ کے سجادہ نشین ہلال صاحب[1] اٹھے اور انھوں نے قطب صاحب کی زندگی اور وصال کے حالات سنائے، کچھ تاریخی واقعات کا ذکر کیا۔ مولانا احمد سعید[2] اور سردار سنت سنگھ[3] نے تقریریں کیں۔ آخر میں خود باپو نے بہت کچھ کہا لیکن میں اس وقت

ع۱ مجھے نہیں معلوم وہ پہلے بھی سجادہ نشین تھے یا نہیں؟ مگر اس وقت تو وہ سجادہ وخدام کے واحد نمائندہ تھے۔

ع۲ مولانا احمد سعید مشہور عالم کانگرس کے مقتدر لیڈر اور دہلی کی محبوب ترین شخصیت۔ کوثر میں دھلی ہوئی زبان سب سے پہلے انھیں سے سنی۔

ع۳ پرانے کانگریسی گاندھی بھگت اور اصلی سنت۔

نہ جانے کہاں تھی۔ اگرچہ ان کے بالکل پاس کھڑی تھی، لیکن اس کے سوا اور کچھ نہ سمجھ سکی، نہ سن سکی کہ انھوں نے کہا، محبت اور سلیقہ۔ یہی قطب صاحب کا مشن تھا، یہی میں بھی کہتا ہوں، اور میں گہری سوچ میں غرق تھی۔

میں سوچ رہی تھی حضرت قطب صاحب نے کیسے اب سے صدیوں پہلے اپنے زمانہ کے حیوان صفت انسانوں کو اسی طرح محبت اور سچائی کی طرف بلایا ہوگا۔ کیسے ان بے رحم جابر۔ خود غرض لوگوں کو ان خدائی صفات کے اسرار ورموز اور فضائل سمجھائے ہوں گے۔ شاید تاریخ اپنے آپ کو پھر دہرا رہی ہے۔ اس وقت پھر ماضی کے ورق الٹائے جا رہے ہیں۔ صدیوں کی الٹ پھیر میں ایسے بہتر سین ہوں گے جن پر پردہ پڑ چکا ہے، اور گزرے ہوؤں کی آنکھیں ہمیں دیکھ رہی ہوں گی۔ کاش یہ سبق کبھی نہ بھولنے والا سبق ہو جاتا۔

اور پھر قوال نے غزل چھیڑ دی ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم، را...

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

اس شعر نے صدیوں پہلے اگر حضرت قطبؒ کو تسلیم جاں کا درس دیا تھا تو یہ موجودہ زمانہ کے مصلح کو بھی قربانگاہ حق پر " ہے رام، ہے رام " کہتے ہوئے اپنی زندگی بھینٹ چڑھا دینے کا بلاوا دے گیا۔ اس کے چند ہی دن بعد باپو نے بھی حیاتِ جاودانی حاصل کر لی۔

" ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی "

لیکن قوالی کے وقت باپو چلے گئے۔ ایک سکھ جوڑے نے بھی قوالی اور بھجن سنائے۔ میں نے مولانا حفظ الرحمٰن سے کہا۔ " مولانا آپ کو تو قوالی سننے کا پہلا اتفاق ہوگا؟ " بولے جی ہاں، مگر سنوں گا۔ یہ سیاست ہے، اور حکم۔ مجھے تو آخر تک ٹھہرنا ہے حالانکہ انتہائی لطف اندوز ہو رہے تھے۔

باہر نکلی تو خدائی خدمت گار ایک سرخ کپڑے کا اعلان لیے کھڑے تھے، جن پر بڑے بڑے سفید حروف میں لکھا تھا " سرحد کے خدائی خدمت گار، ہندو مسلم، سکھ اتحاد چاہتے ہیں " —— عارضی رستوران میں ہندو مسلمانوں کو چائے پلا رہے تھے اور مسلمان ہندوؤں کو۔ یہاں ہم سب لوگوں نے بھی چائے پی۔

دہلی پہنچ کر ایسا معلوم ہوا، جیسے ہوا بالکل ہلکی ہو گئی ہے۔ قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ رُت بدل

ع ۱ گاندھی جی نے مولانا سے کہا تھا۔ کہ جاکر قطب صاحب کا عرس کراؤ۔

گئی۔ میں نے کھلی ہوا میں اطمینان کی سانس لی۔ آج اس میں نہ خون کی بُو تھی نہ انتقام کی گرمی۔ سب کے چہروں پر سکون تھا۔ مسلمان سڑکوں پر اکّا دکّا چلتے نظر آئے۔ پناہ گزینوں کی تیوریاں بھی کھل گئی تھیں، ان کی آنکھوں سے وہ پہلی سی وحشت اور غصہؔ کی چمک غائب ہو گئی تھی۔

مگر باپوؔ وہ خوش نہ تھے، مطمئن نہ تھے، البتہ رنجیدہ بھی نہ تھے، جیسے کوئی طبیب مریض کے افاقے کو گہری نظروں سے دیکھ رہا ہو، اور ذرا سے سنبھالے پر تیمارداروں کی خوشی میں شرکت سے احتیاط کرے۔

ہم سب نے خبر سنائی۔ باپوؔ، اب تو دنیا ہی بدل گئی۔ ایسا امن ہو گیا ہے، جہاں چاہو چلے جاؤ۔ مسجدیں بھی خالی ہو رہی ہیں، اور باپوؔ نے کہا "ہوں" جیسے بچّہ کی حماقت بھری باتوں کو ماں سنی ان سنی کر دیتی ہے۔ اس "ہوں" میں وہی بات تھی کہ ابھی تم بچے ہو، تمھیں نہیں معلوم میری انگلی ہندوستان کی نبض پر ہے، ابھی صحت کہاں!

ایک دن خبر یں سُن کر دوڑی گئی کہ مہاتما جی! کیا آپ پاکستان جا رہے ہیں۔ میں بھی چلوں گی!

مسکرائے "تو بھی چلے گی، میرے ساتھ جانے والوں سے تو ٹرین بھر جائے گی۔ سب ہی کہتے ہیں مگر میں کیسے پاکستان جا سکتا ہوں، ابھی تو یہاں بہت کام پڑا ہے۔" کچھ دیر ٹھہر کر میں واپس چلی گئی اور غالباً ان سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔

▲

3

پرانے قلعہ کا مسلم کیمپ

ان دنوں مسلم پناہ گزینوں کے دو کیمپ تھے۔ میں دونوں کا حال الگ الگ اس لیے لکھ رہی ہوں کیونکہ میرے خیال میں ان دونوں میں اتنا بیّن فرق تھا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پُرانے قلعہ کا کیمپ کسی نے قائم نہیں کیا تھا۔ پہاڑ گنج، قرول باغ اور شیدی پورہ، سبزی منڈی اور قریب کے دوسرے علاقوں سے بھاگ کر زخمی، مریض، بوڑھے تباہ حال بے شمار لوگ آئے انھوں نے پُرانے قلعہ میں پناہ لی۔ بوڑھے، بچّے اور عورتیں، سب ہی بھوک، پیاس سے دیوانے ہو رہے تھے۔ پاس ہی ٹیلے پر مٹکے شاہ[ع1] کا مزار تھا۔ وہاں شاید قدرت اسی دن کے لیے معتقدین سے مٹکے جمع کرا رہی تھی۔ مجاور دوں[1] نے بڑی فراخ دلی سے یہ مٹی کے برتن مانگنے والوں کو دے دیے۔ جو گیا لے آیا۔ پانی پیا اور جب راشن تقسیم ہوا تو ان ہی گھڑوں، مٹکوں کو توڑ کر ان کے پیندے میں کھچڑی یا چاول بھی پکا لیے۔ اسی کے ٹکڑوں سے گلاس کٹوری کا کام بھی نکلا۔ انسان چاہے تو اس کی ضرورت کتنی آسانی سے رفع ہو سکتی ہے۔

نواب علی نامی ایک ٹھیکہ دار کی لاکھوں روپیہ کی اچھی خرادی ہوئی عمارتی لکڑی پُرانے قلعہ میں ڈھیر تھی، لوگوں نے چار لکڑیاں تیلی پتلی لے کر چاروں کونوں پر گاڑ دیں اور ان پر اپنی ایک چادر یا دوپٹہ، یا ٹاٹ کا ٹکڑا، جو ملا باندھ لیا۔ خاصی چھت بن گئی۔ دھوپ اور سردی سے، شبنم سب سے بچاؤ کا سامان ہو گیا ہاتھوں سے جھاڑ، جھنکاڑ، کھیڑے، لکڑی کے تختے زمین پر ڈالے۔ یہی تخت تھے اور یہی پلنگ۔

ع1 - ٹیلہ پر بنی ہوئی اس درگاہ میں صرف ایک دیوانہ خادم باقی رہ گیا تھا۔ جس نے چند دن پہلے ٹیلہ پر لکڑیاں گاڑ کر گھڑے ٹانگنے شروع کر دیے۔ لوگ دیکھ دیکھ کر ہنستے رہے مگر وہ اپنے کام میں تندہی سے مصروف رہا جب ۵ ستمبر کو فساد ہو گیا تو بھاگنے والوں کے کام آئے۔ مجاور غریب کو کسی نے وہیں قتل کر دیا تھا۔ اس سے مانگنے کی ضرورت نہ پڑی۔ ذخیرہ کوٹھریوں سے نکل کر وہ پہلے ہی باہر رکھ گیا تھا۔

یہ تھے ان کے مکان اور خیمے، اور یہ تھیں ان کی لوازمات زندگی، اور وہ سب بظاہر اسی پر قانع تھے۔ ضرورتوں کو بڑھاؤ تو شیطان کی طرح بڑھتی جاتی ہیں اور گھٹاؤ تو یہ اتنی مختصر ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے، ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں۔ یہی لکڑیاں ان کے مکان تھے، اور یہی ضرورت کے وقت تاپنے، پکانے کے لیے ایندھن کا کام بھی دیتی تھیں، اور لطف یہ کہ تین مہینے کی پھونک، تاپ کے بعد بھی اتنی بچ گئیں کہ کیمپ ختم ہونے پر پولیس اور ملٹری کی لوٹ کے بعد کسٹوڈین پراپرٹی بنیں۔

پُرانے قلعہ کی چار دیواری میں کچھ دالان اور طاق بنے ہوئے ہیں۔ یہ طاق ایک ہی آدمی کے بیٹھنے یا لیٹنے کے لیے بنائے گئے ہوں گے۔ کچھ کوٹھریاں بھی تھیں۔ ایک بابر کی بنوائی ہوئی مسجد بھی تھی جو پناہ گزینوں کے چند معزز خاندانوں نے اپنی جائے رہائش بنائی تھی۔ پھاٹک کے قریب دالان میں ایک شفاخانہ قائم ہوگیا۔ قلعہ کے پھاٹک کے متصل زینے کے اوپر کا حصہ بالکل شکست ہوچکا تھا۔ یہاں بڑے طاقوں میں دوپٹہ کا پردہ باندھ کر عورتیں بیٹھ گئیں۔ خیمے پیچھے آئے، دوائیں بعد کو آئیں۔ نرس اور ڈاکٹر بھی ابھی نہیں آنے پائے تھے لیکن بچوں نے آنا شروع کر دیا۔

وہ بچہ جس کی پیدائش پر گھر میں مہینوں ڈھولک بجتی جس کے بغیر سلطنت ویران گھر بے رونق اور خاندان کا چراغ گل ہو جایا کرتا ہے۔ جس کے لیے مندروں، مسجدوں اور درگاہوں کی خاک چھانی جاتی ہے۔ دولت کے ڈھیر بے مصرف اور علاقوں، زمینداریوں کی تکابوٹی ہو جاتی ہے، وہی بچہ اس کیمپ میں بن بلائے مہمان کی طرح ہر روز آوارد ہونے لگا۔ نہ کوئی نرس تھی نہ دائی لیکن بغیر کسی طرح کی طبی مدد کے ایک ایک دن میں پندرہ پندرہ بچے، اور ایک ایک رات میں دس دس بچے روتے، چیختے دنیا میں نازل ہونے لگے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا کوئی حل نہیں سوجھتا تھا۔ نہ والدین کی پریشانی مفید تھی، نہ ہم اوپر سے دیکھنے والوں کی ہمدردی۔ ذمہ داریوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور ہم سب عاجز آکر کہتے اے خدا، ہم پر رحم فرما۔

نہ کوئی ان کو پُوچھنے والا، نہ بہلانے والا۔ رات کی ڈیوٹی پر صرف ایک دائی۔ وہ کوس کوس کر نال کاٹتی اور پٹک پٹک کر نہلاتی اور مائیں اپنا کلیجہ تھام تھام کر رہ جاتیں، لیکن دم نہیں مار سکتی تھیں۔ آخر کار ڈاکٹر بھی آگئے اور دائیاں بھی۔ مہاتما جی دہلی آگئے اور سوشیلا نائر اپنے ساتھیوں کے سمیت مریضوں کو دیکھنے کے لیے آنے لگیں، دوائیں بھی آگئیں مگر سب کچھ یہاں اونٹ کے منھ میں زیرہ کی مثال تھی۔

چھوٹی چھوٹی لڑکیاں سوکھے کے مارے بچوں کو کاندھوں سے لگائے، چہروں پر حسرت، بے بسی، اور فاقہ کی داستانیں لیے قطار در قطار، دو چھٹانک دودھ کے انتظار میں صبح سے دوپہر

تک کھڑی رہتیں۔ ہر ماں یہ چاہتی کہ اس کے بچہ کو دودھ زیادہ مل جائے تاکہ اس کی خشک چھاتیوں کو تھوڑا سا آرام نصیب ہو۔ ہر لڑکی یا لڑکا اصرار کرتا کہ ذرا سا اور دیدیجیے تاکہ اس کی بھوکی انتڑیاں بھی اس میں شریک ہوسکیں، لیکن مستعد اکفایت شعار والنٹر انھیں دھکے دیکر نکال دیتے، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو صبح کی چائے کیسے بنتی اور وہ سوکھی روٹی کس چیز میں بھگوکر اپنے حلق سے نیچے اُتارتے۔

انسانوں کا یہ جنگل جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لوگ ہاتھوں میں لے کر یا کاغذوں اور ٹھیکروں میں کھانا کھاتے اور ٹھیکروں پر مٹی ملے ہوئے آٹے کی سیاہ روٹیاں پکاتے۔ توا، دیگچی، اور گلاس سب کا کام پتوں، اور مٹی کے ٹکڑوں سے لیتے تھے۔ دو اینٹیں رکھ کر رفع حاجت کرتے اور کبھی کبھی انہی دو اینٹوں سے باورچیخانہ بھی تعمیر ہوجاتا۔

ہیضہ، سکھیا، پیچش، بخار، غرض کونسی بیماری تھی جو یہاں نہیں پھیلی ہوئی تھی۔ موتے کو ملے شاہ مدار، رہی سہی کسر سانپوں نے پوری کر دی۔ انھوں نے بیسیوں انسانوں کو اس مصیبت کی زندگی سے چھٹکارا دلادیا۔ ستمبر میں خدا کا قہر بارش کی صورت میں نازل ہوا۔ لوگ گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں آسمان کی چھت کے نیچے، ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے موت کا انتظار کرنے لگے۔

کیمپ کا کمانڈر اپنے اسٹاف سمیت صدر دروازہ کے پاس ایک کوٹھی میں رہتا تھا۔ وہ اس ویرانہ کا سب سے بڑا حاکم تھا۔ کسی غریب کے لیے اس تک پہنچنا، جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ مسلمان، اور پر سیٹھ۔ کڑوا کریلا اور نیم چڑھا۔ صرف خدمت خلق کے جذبے نے اسے مجبور کیا تھا کہ پاکستان جانے سے پہلے اس نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا، مگر اسے جلدی تھی کہ کسی طرح ختم ہو اور وہ کارگذاری کی سند جیب میں ڈالکر پاکستان سدھارے۔

کیمپ میں ہر ایک داخل ہونے والے اور نکلنے والے کو اس [1] سے اجازت لینا پڑتی تھی، پاکستان جانے کا پرمٹ بھی اسی کے توسط سے ملتا تھا۔ جب کوئی اسپیشل ٹرین پاکستان جانے والی ہوتی، تو ایسے موقع پر بڑی ریل پیل ہوتی۔ حاجت مندوں کے گروہ بھکاریوں کی طرح اس کی نگاہِ کرم کے امیدوار قطار در قطار کھڑے رہتے۔ کئی حاجت مند نکالے اور دھتکارے بھی جاتے، مگر کتنی ہی خوش نصیبوں کو پروانہ مل بھی جاتا۔ سنا ہے اس کیمپ کا انتظام پاکستان سفارت خانہ کے ہاتھ میں تھا۔ ان کی سفارش پر راشن۔ ریل۔ دواؤں، اور ہوائی جہاز کا انتظام حکومت ہند کرتی تھی۔ پاکستان سے بھی یہاں حکومت کی مدد آتی تھی۔ راشن کی تقسیم بھی یہی لوگ کرتے تھے۔

---

[1] کیمپ کمانڈر

کیمپ کا اسپتال

صرف پرانے قلعہ کے پناہ گزینوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی' اور لوگ کہتے تھے' ستمبر میں ۸۰ ہزار رہ چکی ہے۔ بڑے طاق، شکستہ سہ دری اور چبوترے پر لگے ہوئے خیمے سب زخمیوں اور مریضوں سے بھرے پڑے تھے۔ ان میں سے ایک پر چار دائیاں بیٹھی لڑا کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ دعویٰ کرتی کہ اس ڈیڑھ مہینے میں جتنا کام میں نے کیا ہے، کوئی اور کر دکھائے تو جانیں؟ لیکن کون قدر کرتا ہے اب دیکھ لیجیے پاکستان جانے کا پاس مل گیا ہے مگر کسی سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ میونسپلٹی سے ہی تنخواہ؎۱ دلوا دیتا۔ ایک دن میں، میں نے پچاس بچے جنائے ہیں، اس کے باوجود ڈاکٹر کی زبان سے تعریف کا ایک لفظ نہیں نکلتا۔ اور اس کے بعد فوراً ہی دوسری دائی اپنی فضیلت جتانے لگ جاتی میں نے کیا کچھ کم کام کیا ہے۔ ذرا ڈاکٹر سے تو پوچھو؟ تم تو بخدا اس وقت آئی بھی نہ تھیں یہ باہیں شل ہو گئی ہیں۔ اکیلے ہی ہفتہ گذارا ہے اور پھر تیسری اپنا راگ چھیڑ دیتی' اور پھر چوتھی۔ مگر کوئی مالی یافت نہ ہونے کا دکھڑا ابھی ساتھ ساتھ روتی جاتیں۔

ایک دن میں نے پوچھا۔ "کیمپ ختم ہونے پر کیا تم لوگ اپنی ملازمت پر واپس جاؤ گی؟"

کہنے لگیں۔ "ہم لنڈورے ہی بھلے ایسی آزادی سے۔ ہمیں تو بس تنخواہ دلوا دیجیے۔ میونسپلٹی نے تو ہمیں بھیجا ہے۔ تنخواہ کیوں نہ دے گی۔ کسی طرح پیسہ ملے اور پاکستان چلدیں۔"

ایک نے شکایت کی۔ "یہ ہندو عورتیں ہمارا مذاق اڑانے کیوں آتی ہیں۔ دیکھ دیکھ ہنستی ہیں اور اس طرح ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یقیناً تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے تو ایسی کوئی عورت نہیں ملی جو اتنی بے رحم ہو کہ تمھاری مصیبت پر خوش ہو۔" "بس پھر ہی تو گئیں۔ آپ کو کیا معلوم' ہم پر کیا کچھ بیت گئی۔ اب تو ان کی صورت دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ انھیں سب کا تو کیا دھرا ہے۔"

جلد ہی ان سب کو تنخواہ مل گئی' اور وہ پاکستان روانہ ہو گئیں۔ مگر جب تک رہیں ہندوؤں کے خلاف پروپیگنڈا کرتی رہیں، حالانکہ لیڈی ڈاکٹر ہندو' نرسیں ہندو اور عیسائی مگر انھیں سوچنے کی فرصت کہاں تھی؟

گندگی۔ کیچڑ۔ اور تعفن سے ہمارا دماغ پریشان ہوا جا رہا تھا۔ چونکہ اسپتال نسبتاً اونچی جگہ پر

؎۱ وہ پہلے دہلی میونسپلٹی کی ملازم تھیں۔

تھا اس لیے یہ بہت کچھ محفوظ رہا۔ اسپتال ہی کی سہ دری میں راشن کی بوریاں بھی رکھی تھیں' اور سامنے صحن میں دو چولھے بنے تھے جن پر دودھ اور کھچڑی کی دیگ چڑھا کرتی تھی۔ دوائیوں اور ٹین کی چیزوں کا اسٹور بھی یہیں تھا۔ داہنی طرف جو خیمہ تھا اس میں دائیاں۔ اسپتال کا اسٹاف۔ مرد کام کرنے والے باورچی اور تماشائی سب ہی جمع رہتے تھے۔ دوسری طرف کونے میں لیڈی ڈاکٹر کی کرسی اور میز تھی۔ یہاں ایک پلنگ پر لال قلعہ سے بھاگا ہوا ایک لفٹیننٹ چت لیٹا ہوا سارا وقت بائیں کرتا رہتا تھا۔ پاس ہی ایک خیمہ میں قنات لگا کر اسے زچہ خانہ بنالیا گیا تھا اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے چار خیمے مریضوں سے بھرے پڑے تھے۔

نیچے حدِ نظر تک خیموں اور ٹین کی چادروں کی چھتوں کے بے ترتیب ڈھیر تھے جن میں ننگے بچے، میلی کچیلی عورتیں، ننگے سر لڑکیاں اور غیرت وغصہ سے بھنائے ہوئے مرد مستقل آتے جاتے رہتے تھے۔

پہلے دن جب میں نے مریضوں کو کھانا دلوایا تو سارے بول اٹھے کہ آج تو اس کھچڑی میں گھی کی خوشبو بھی ہے۔ میں نے پوچھا۔ کیا اس سے پہلے گھی نہیں پڑتا تھا؟ گودام کے مہتمم نے کہا، کیوں نہیں، ہر روز دیا جاتا ہے (مگر وہ گھی اکثر اسٹاف کے پراٹھوں کے کام آجاتا۔ یہ مجھے بعد کو معلوم ہوا)

بچوں کے لیے دودھ کے ٹین کھول کر دیگ میں انڈیل دیے جاتے اور یوں ایک پوری دیگ دودھ کی تیار ہوجاتی۔ پتہ نہیں پہلے کون تقسیم کر رہا تھا مگر جب پہلے دن میں نے اپنی لڑکی اور ایک پناہ گزیں ایرانی لڑکی ماہ گل کو دودھ کی تقسیم سپرد کی تو معلوم ہوا کہ آج چھوٹے بچوں کو ایک ایک پاؤ دینے کے بعد ان کے بڑے بھائی بہنوں کو بھی ملا ہے۔ سوشیلا نے سنا تو بہت خوش ہوئیں۔ کہنے لگیں۔ خیر اب بچوں اور مریضوں کو کھانا اور دودھ تو ٹھیک سے مل جایا کرے گا۔

لوگوں نے بتایا، کہ آپ سے پہلے ایک دن مہاتماجی کیمپ آئے تو پناہ گزینوں نے ان کی موٹر گھیر لی۔ سخت سست بھی کہا۔ مخالفانہ نعرے بھی لگائے اور بہت ہی اشتعال انگیز گفتگو کی! اب بھی لوگ غصہ میں بھرے بیٹھے تھے۔ عورتوں کو ذرا اچھیڑ دو۔ بس چیخنے لگتیں، "یہ بھی کوئی مقابلہ تھا۔ یہ بھی کوئی مردانگی تھی۔ پیٹھ میں چھرا گھونپ کر اکڑے ہوئے گھومتے ہیں۔ بڑے بہادر بنے ہیں۔ پنجاب سے پٹ کر آئے، یہاں نہتوں کو مار کر سورما بنے پھرتے ہیں۔"

بے شمار صندوقوں، ٹرنکوں کے درمیان بیٹھی ہوئی ایک قزلباش بیگم ملیں۔ ریشمی کپڑے ہلکا

پھلکا نفیس زیور چادروں کی قنات لگائے، فرش بچھائے بیٹھی تھیں اور زور زور سے کہے جا رہی تھیں:

"بڑے مرد بنے ہیں، نامرد کہیں کے عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھا کر سورمائی کے دھونس جمانے چلے ہیں۔ ذرا کھلے میدان میں ہم عورتوں کے منھ تو آ کر دیکھ لیں۔ انھیں جوتیوں سے نہ پیٹ ڈالیں تو کہنا۔ یہ بھی کوئی مقابلہ تھا۔ ان کے ہاتھ میں تو کرپان تھی، ہمارے پاس کیا دھرا تھا۔ ہمارے بھی چھری ہاتھ میں ہو تب مقابلہ دیکھ لیں۔"

میں نے اپنے دل میں کہا" وہ کیا جانے پیڑ پرائی، جس کی نہ پھٹی ہو بوائی"، اگر یہ ٹرنک تمھارے ساتھ نہ ہوتے تو تم بھی اتنا گرجنے کے بجائے گریبان بند کرنے کے لیے اس نوجوان عورت کی طرح دو ٹمین مانگ رہی ہوتیں جو پاس کی جھونپڑی میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس میں گریبان چاک عورت اور سر برہنہ دو جوان لڑکیاں تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ تم باہر نکل کر کچھ کام کیوں نہیں کرتیں، تمام دن بیٹھی رہتی ہو، وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔ کیسے نکلیں۔ دیکھتی نہیں ہو۔ ہمارے سر پر دوپٹہ تک تو ہے نہیں۔ ایک مہینہ میں کرتہ بھی کھیل کھیل ہو گیا ہے۔ کہیں سے کپڑے مل جائیں تو باہر نکلیں۔

اور یہ حقیقت تھی کہ دو چار کو چھوڑ کر جو اپنا سامان لے کر آئے تھے بقیہ کے جسم پر وہی ادھورے کپڑے تھے، جو وہ گھر پر پہنے بیٹھے تھے، ڈیڑھ ماہ ہو چکا تھا۔ صابن تک نصیب نہ ہوا تھا جو دھونے ہی سے کچھ کثافت دور ہو جاتی۔

خدا بھلا کرے عیسائی مشنریوں کا کہ اس موقع پر بھی اپنی صفائی اور ہمدردی اور رحم دلی لیکر آگئیں بہت جلد آدھی قیمت پر خریدے ہوئے صابون سے بہتوں کی سڑاند دور ہو گئی۔ انھوں نے ضرورت کی اور چیزیں بھی سستے داموں بیچنا شروع کیں، جو آدھے دام دینے کی بھی استطاعت نہ رکھتے تھے، ان کے لیے جو کچھ مل سکا، میں لے آئی۔ اس طرح ہزار میں سے پچاس کے کپڑے دھل گئے۔ قلعہ کی فصیل سے لگے ہوئے دالانوں میں سبزی منڈی کا شکست خوردہ داعیوں کا گروہ بھرا ہوا تھا۔ ایسے لوگ جن کے ساتھ صرف بوڑھی یا ادھیڑ عورتیں اور بچے تھے، وہ اپنے نوجوان بیٹیوں اور مال و دولت کے علاوہ اپنی زندہ بیٹیوں کو بھی رو رہے تھے، اور غم و غصے سے بیتاب ہو کر کہتے تھے، کاش، سرکار اپنی ملٹری پولیس الگ کر لیتی اور ہمیں مقابلہ کا ایک موقع دیدیتی تو دل کی بھڑاس نکل جاتی۔

اس بھرے ہوئے جان سے بیزار مجمع کو تسکین، دلاسا دینا ناممکن تھا۔ یہاں کوئی کانگریسی قدم نہ رکھتا تھا۔ مسلم لیڈر پاکستان جا چکے تھے، جو باقی رہ گئے تھے، وہ بھڑکانے اور گالیاں دینے میں معروف تھے۔

البتہ جمعیۃ کے علماء اور احراری آتے تھے۔ صلواتیں سنتے، گالیاں کھاتے مگر روزانہ آتے۔ پکے ہوئے کھانے کی دو دیگیں پہنچاتے، دکھ درد کی خبر لیتے، مگر صورت دیکھتے ہی پناہ گزین ان کو غدّار، بے ایمان، ہندو کا غلام اور سب کچھ کہہ ڈالتے، لیکن ان کو اپنے کام سے کام تھا۔ شہر میں ایک مشہور خود ساختہ لیڈر کی ماتحتی میں ریلیف کمیٹی بنی ہوئی تھی، یہاں بھی اس کا خیمہ لگا ہوا تھا اور کفن کی تقسیم، اور قبریں کھدوانا انھوں نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔

پھر جامعہ کے طالب علم تھے، وہ ایک دوسرا کیمپ بھی سنبھالے ہوئے تھے، یہاں بھی آتے اور محنتی مزدور کی طرح، زیادہ بات چیت کیے بغیر ہر قسم کا کام کرتے رہتے۔ کچھ مسلم کانگریسی نوجوان بھی بلے لگائے ہوئے، اِدھر سے اُدھر چھوٹے بڑے مختلف کام کرتے رہتے تھے۔

لوگ کہتے تھے۔ یہ کیمپ پاکستان نے بنایا ہے۔ اسپتال اور اس کا کل سامان بھی وہیں سے آیا ہے۔ راشن اور روٹیاں پاکستان کی ہیں اور ہم سب پاکستانی ہیں۔ ہم کو تو اس ہندو حکومت نے مروا دیا۔ اب یہاں کوئی مسلمان زندہ نہیں رہ سکتا، جو ہندو بن جائیں گے، وہی رہیں گے۔

یہ پروپیگنڈا تھا جو برابر ہو رہا تھا کہ اگر پاکستان نہ بن گیا ہوتا، تو جتنے زندہ بچے یہ بھی نہ بچتے اور اگر پاکستان گورنمنٹ مدد نہ کرتی تو بھوکوں مر جاتے اور اب جو یہاں رہے گا ہندو بن کر رہ سکے گا۔

لوگوں نے بتایا، پاکستان سے ہوائی جہاز سے روٹیاں آئی تھیں۔ روپیہ آیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "پھر کیا اِن دنوں تو مزے رہے ہوں گے؟"

کہنے لگے۔ "خاک، آٹھ آٹھ آنہ میں روٹیاں بکیں، یہ بڑی ڈبل روٹیاں تھیں جن کے پاس پیسہ تھا، انھوں نے خوب کھائیں، ہمیں کیا ملتا؟ غریبوں کے لیے اس دنیا میں کچھ نہیں ہے۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان دنوں پانچ روپے تولہ سونا اور روپیہ میں ایک درجن پلیٹیں بک رہی تھیں، اور یہاں مریض ردی اخباروں پر کھچڑی کھا رہے تھے، اور سگریٹ کے خالی ٹین (جو میں اکٹھا کر کے لے جایا کرتی تھی) پانی پینے کے کام آتے تھے، آخر کار وہ روپیہ درجن والی پلیٹیں منگوائی گئیں، مگر کئی درجن منگانے کے بعد اندازہ ہوا کہ ہمیشہ ناکافی رہیں گی۔ اچھے ہونے والے مریض اپنی پلیٹ اور ٹین سمیت چلے جاتے اور دوسروں کے لیے پھر اخبار کے ٹکڑے پھاڑنے پڑتے۔ جمعیۃ کے

عـ١ - بعد کو مجھے معلوم ہوا۔ واقعی اس کیمپ کا بہت کچھ انتظام پاکستانی افسروں سے متعلق تھا اور کیمپ کمانڈر بھی انھیں کا مقرر کیا ہوا تھا۔

علماء کپڑے فراہم کررہے تھے۔ دوسرے تمام کام کرنے والے بھی اسی کوشش میں لگے تھے، مگر کچھ آتا، ایک کونے کی بھی کفایت نہیں کرسکتا تھا۔

انھیں دنوں نواب صاحب رامپور نے کئی ہزار کمبل بھیجے۔ ریاست کے چیف منسٹر[1] اور دوسرے عہدیدار آئے اور رامپوریوں کی ذرا ڈھارس بندھی، طے یہ ہوا کہ ذرا ادھر اُدھر پھر کر ہم لوگ اندازہ کرلیں کہ زیادہ مستحق کون لوگ ہیں تاکہ پہلے ان کی خبر لی جائے۔

مجھے تو اسپتال سے فرصت نہ ملی، میری بہن اور لڑکیوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ غل غپاڑہ کی آواز سن کر میں بھی لپکی تو دیکھا کہ ایک رام پوری خاں صاحب اور سبزی منڈی کا راعی بری طرح الجھ رہے ہیں۔ بات یہ تھی کہ خاں صاحب کے نزدیک کمبل صرف رامپوریوں کے لیے تھے' — اور راعی کہہ رہا تھا کہ مصیبت تو سب پر پڑی ہے۔ مگر ان دیالو لوگوں کو اس وقت بھی رامپوری اور غیر رامپوری کا فرق یاد رہا۔ آج خدا نے اس حالت کو پہنچا دیا کہ ایک کمبل مانگ رہا ہوں۔ یہ میری عورت بیٹھی ہے، اس سے پوچھ لیجیے، کبھی پینتیس ۳۵ روپیہ سے کم کی چادر اسے نہیں اُڑھائی ہے۔ اس وقت گیا گزرا ہوں۔ ہمیشہ ایسا نہیں تھا۔

بمشکل سمجھا بجھا کر ان سب کو اس پر راضی کیا کہ رامپوریوں کو دینے کے بعد جو بچیں گے، وہ دہلی والوں میں تقسیم ہوں گے۔ ایک سے زیادہ کسی کو نہ ملے گا۔ اور تقسیم پرچیوں کے ذریعہ ہوگی۔

جمعیۃ کی کوششیں بار آور ہوئیں اور بہار و یوپی سے استعمالی کپڑوں کے گھٹڑ آ گئے۔ لکھنؤ سے بھی کئی سو روپیہ اور کپڑوں کی بہت سی بوریاں آئیں۔ بعض مخیر بیگمات نے ضرورت کی ہر چیز حتیٰ کہ جوتے، کوٹ، اور چادریں تک بھیجیں۔ مجھے انتظار ہی تھا اور اُمید تھی کہ میری اپیل رائیگاں نہ جائے گی۔ لکھنؤ والیاں بھی دل کھول کر مدد کریں گی اور یہی ہوا۔ خیر، ہزار میں سے دو سو کے تو تن ڈھک گئے۔

لکھنؤ میں بیٹھے بیٹھے سنا تھا کہ دلّی میں باقاعدہ توپوں، مشین گنوں اور بندوقوں کی لڑائی ہوئی مگر اس کیمپ میں مجھے کوئی ایسا نہ ملا جو اپنے کارنامے سناتا کہ توپ اس نے کہاں پائی تھی، مشین گن کیسے حاصل کی تھی۔ البتہ بندوق چلی، کیونکہ اکثر کے پاس لائسنس تھے، بندوقیں تھیں، اپنی حفاظت میں انھوں نے استعمال کیں۔

راعیوں نے بیان کیا، ہمارے پاس ترکاری کاٹنے کے تبر تھے اور بلم۔ قصائیوں نے کہا۔

ع۱ ۔ کرنل بشیر حسین زیدی

ہمارے پاس گوشت کاٹنے کے بڑے چھُرے تھے۔ دونوں کہتے تھے کہ ہم نے جم کر مقابلہ کیا۔ لڑے، مارے گئے،، اور ہارے۔ مگر ہتھیار یہی تھے۔

پیتل کے کارخانہ والوں نے بتایا۔ جنگ عا[1] کے خاتمہ پر خالی کارتوس کی پیٹیاں، پیتل گلاکر برتن بنانے کے لیے ہم نے خریدی تھیں۔ اس میں ملٹری کی غفلت یا بے پروائی سے دو چار اچھے کارتوس بھی باقی رہ جاتے تھے، جنھیں ہم علیحدہ رکھتے گئے۔ اتفاق دیکھئے کہ وہ اس جھگڑے میں ہمارے کام آئے۔ بندوقیں تو دو ہی چار تھیں۔ پیتل کی کھوکھلی نلکی بناکر ہم نے ایسی ترکیب کی کہ کارتوس کام آسکیں اور اس طرح کئی گھنٹہ پہاڑ گنج میں ہم نے مقابلہ کیا۔ مگر پولیس اور فوج نے اس بے دردی سے دھاوا بول دیا کہ ہمارا استھراؤ ہوگیا۔ ۸ سَو آدمیوں کی ٹھٹھیرا برادری میں سے بمشکل تین سو بچ کر کیمپ آئے تھے، باقی وہیں کھیت رہے، چند ایک کو چھوڑ کر باقی سب کانگریسی تھے۔ کانگرس کمیٹی کا سکریٹری بھی انھیں میں تھا۔

لیکن اس حالت میں بھی جب ان کی مصیبتیں اور افلاس انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ان کی آنکھوں میں ابھی شرم وغیرت باقی تھی۔ وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہچکچاتے تھے۔ ابھی صرف ڈیڑھ مہینہ ان واقعات کو گذرا تھا۔ ابھی تنگ آنے والوں کا سلسلہ بھی جاری تھا اس لیے ان میں غصہ بھی زیادہ تھا۔ ہندوؤں پر غصہ خدا کی بیرحمی کا تذکرہ۔ اولیاء اللہ کی بےبسی۔ حکومت کا ظلم اور بے انصافیاں بھی تذکرے تھے، یہی مشورہ، لوگ ایک دوسرے سے ملتے۔ خوفناک ہنسی ہنس کر ایک دوسرے کا حال پُوچھتے۔ جیسے زندگی، قدرت اور موت، سب کی تضحیک کر رہے ہوں۔ ایک کہتا اللہ کا شکر ہے جان بچ گئی۔ دوسرا اپنے گھر اور بال بچوں کی تباہی کی داستان صرف چند لفظوں میں سُنا دیتا۔ ارے میاں کیا پُوچھتے ہو۔

"رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو"

چین کی نیند سوتا ہوں۔ اب غم ہی کیا باقی رہ گیا ہے، اور اس وقت اس کی دردناک ہنسی سن کر دل کانپ جاتا۔ مگر ان میں ایسے بہت ہی کم تھے جنھوں نے توبہ واستغفار کی طرف رجوع کیا ہو، ان کے اندر ابھی وہ درد اور عاجزی بھی نہیں پیدا ہوئی تھی جو مومن کی شان بتائی گئی ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنے کا جذبہ بھی مفقود تھا۔ خاص کر عورتیں تو کچھ کرتی ہی نہ تھیں، صرف روتی اور کوستی رہتیں، کام کرنے والے ایک ایک کر کے پاکستان رخصت ہو رہے تھے اور نئے ابھی آئے نہیں تھے۔

---

[1] عا۔ دوسری جنگ عظیم

یہ تو روز ہی کا قصہ تھا کہ لاشوں کو نظر انداز کر کے ہم زندوں کی دیکھ بھال میں لگ جایا کرتے تھے، ایک دن میں یہ دیکھ کر کہ ایک لاش ایک مریض کے پاس ہی، دوسری چارپائی پر پڑی ہے۔ اسپتال کی طرف چل دی، ویسے بھی یہ ہمارا کام نہ تھا۔ ریلیف کمیٹی یا جمعیۃ علماء ہی کے لوگ تجہیز و تکفین کرانے کے ذمہ دار تھے، یا مرحوم کے اعزا کو اطلاع کر دیتے۔ کافی دیر کے بعد جو پلٹی تو دیکھا کہ لاش اب تک وہیں پڑی ہے۔ میں نے کہا، ارے! اب تک اس کے کفن دفن کا بندوبست کسی نے نہیں کیا۔ معلوم ہوا، اس کا کوئی عزیز ہی نہیں۔ صرف یہ لڑکی ہے اور نواسا جو بیٹھے رو رہے ہیں۔ میں نے کہا اگر عزیزوں میں کوئی نہیں ہے تو کسی اور مسلمان کو آنا چاہیے۔ جمیلہ[1] بیگم نے کہا آئیے ہم دونوں بلا لائیں۔

ہم دونوں پہلے ریلیف کمیٹی کے خیمہ میں گئے اور بالکل بھک منگوں کی طرح دیر تک کھڑے رہے مگر مولوی صاحب نے نظر تک نہ اٹھائی۔ آخر خود ہی مخاطب کیا۔ داستان سنائی تو کہنے لگے۔ قبر کھودنے والے اور نہلانے والے سب پچھلی ٹرین سے پاکستان چلے گئے۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہم نے زور دیا کہ یہ تو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یہ کام آپ کو کسی نہ کسی طرح کرانا چاہیے۔ بے پروائی کے ساتھ کہا۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ صرف کفن دے سکتے ہیں۔ میں نے پھر اصرار کیا کہ یہ تو علماء کا کام ہے۔ کہ انتظام کریں۔ جواب دیا۔ یہاں نہلانا یا قبر کھودنا کوئی نہیں جانتا۔ لاکھ کہتی رہی مگر ان کی بیرخی اور برافروختگی بڑھتی ہی گئی۔

جھلا کر ہم لوگ جامعہ کے خیمے میں آئے۔ وہاں کے لڑکے ابھی ابھی جا چکے تھے، ورنہ سارا کام انہی سے لے لیتے، اگرچہ یہاں جامعہ والوں کی پوچھ نہ تھی، نہ کوئی خاص کام انکے ذمہ تھا۔ دو چار کانگریسی اور چند جامعہ کے لڑکے آتے اور دو چار گھنٹہ میں جو کام ضروری سمجھتے کر کے واپس چلے جاتے۔ کانگریسی ورکر وہی تھے جن کا تعلق جمعیۃ سے تھا۔ پراونشل یا ڈسٹرکٹ کمیٹی کا کوئی کانگریسی میں نے نہیں دیکھا یہاں کام کرتے ہوئے۔

ہم نے معلوم نہیں کتنے مسلمانوں کے سامنے دست سوال دراز کیا کہ خدارا ہماری مدد کرو،

---

[1] ۔ سر سید فیملی کی ایک خاتون جن کے اعزا پاکستان جا چکے تھے مگر وہ نہیں گئی تھیں اور آخر تک کیمپ میں کام کرتی رہیں۔ جب کیمپ ختم ہو گیا تو اپنے مکان واپس گئیں۔ وہ مریضوں کو اسپتال پہنچاتی، اور اچھے ہونے والوں کو واپس لاتی تھیں۔ خود میونسپلٹی میں میڈیکل سپروائزر رہ چکی تھیں۔ آجکل تسلیم بیرم خان میں سر سید کی بیٹھک میں رہتی ہیں۔

اور اس لاش کو ٹھکانے لگاؤ۔ یہ مرد ہے، ہم عورتیں، اس کو نہلا نہیں سکتیں۔ چلو قبر کھودنے میں ہم تمھاری مدد کریں گے، مگر ہر جگہ یہی جواب ملا۔ ہم کو کیا پتہ، کیسے غسل دیا جاتا ہے۔ کیسے قبر کھودی جاتی ہے۔ ایک ملّا نے کہا، جناب، یہ کام ہر شخص نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے شرع میں کچھ اصول اور قواعد مقرر ہیں۔ ان کی پابندی کیے بغیر غسل درست نہ ہوگا، مگر مولانا خود ہاتھ لگانے کو تیار نہ ہوئے۔

مجبوراً ہم نے متوفی کی بیٹی سے کہا کہ تم اٹھو، ہم سب ساتھ دیں گے۔ وہ خدا کی بندی جگہ سے نہ ہلی صاف انکار کر دیا اور ۱۳۔۱۴ سال کے لڑکے کو بھی ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ اٹھنے نہ دیا۔ دور بیٹھی روتی رہی۔ اتنے میں دو بوڑھیاں آگئیں اور انھوں نے کہا: طریقہ وریقہ تو ہم جانتے نہیں، مگر خیر، جو کچھ سن رکھا ہے اس کے مطابق کر ہی لیں گے، یہ دن تو سب کے لیے ہے۔ "آج وہ، کل ہماری باری ہے"۔

غرض غسل عورتوں نے دیا، قبر کھودنے ہم دونوں چلے۔ جمیلہ نے تھوڑی سی مٹی ہٹائی بھی، مگر اتنے میں دو تین بھلے مانس آگئے اور انھوں نے بہ اصرار ہمیں وہاں سے ہٹا دیا۔ تجہیز و تکفین تک کے سارے مدارج انھوں نے طے کرا دیے۔ اس ہزاروں کے مجمع میں وہ چند انسان نکلے۔ خدا انھیں جزائے خیر دے۔

آخر کار، وہ دن رات ڈکھڑا رونے والی دائیاں بھی پاکستان سدھار گئیں، اور اب صرف دو نرسیں صبح اگر دو گھنٹہ مریضوں کی دیکھ بھال کر جایا کرتیں، باقی سارے دن کے لیے ایک پناہ گزیں ڈاکٹر تھا اور سارے کیمپ کے مریض!

ایک روز میں خیموں کی طرف چلی گئی تھی۔ اسپتال میں صرف میری لڑکی[1] تھی۔ اتنے میں ایک زچہ آگئی۔ لڑکی دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائی۔ باہر کی نرسیں دوپہر کو جا چکی تھیں۔ جمیلہ بیگم شہر کے اسپتالوں میں مریضوں کی خبر لینے چلی گئی تھیں۔ غرض نہ کوئی دائی موجود تھی نہ نرس۔ لڑکی سب طرف دوڑی دوڑی پھری کوئی نہ ملا، نہ میں ہی اسے مل سکی، اور کوئی عورت بھی مدد کرنے کو تیار نہ ہوئی۔ وہ گھبرائی ہوئی پلٹی تو بچہ بھلا کا ہے کو استقبال کرنے والوں کا انتظار کرتا۔ وہ خیمہ سر پر اٹھائے ہوئے تھا۔ چیخ پکار سن کر ڈاکٹر بھی پریشان ہو گیا، اور لڑکی ڈر کے مارے کانپنے لگی۔ مگر ہوشیار ڈاکٹر نے لڑکی کو دلاسا دیا، زچہ کو تسکین دی اور منہ پھیرے ہوئے، آہستہ آہستہ سب کچھ اس ناتجربہ کار قابلہ کو سمجھاتا رہا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے ڈاکٹر کے ہدایت کے مطابق زچہ و بچہ کو درست کیا۔ ضروری کاموں میں ڈاکٹر خود بھی حصہ لیتا رہا۔ میں بھی اس دوران میں پہنچ گئی۔ دیکھا تو ماں بچہ دونوں مطمئن تھے البتہ

---

[1] ۔ کشور عمر تقریباً ۱۸ سال

لڑکی بیحد بدحواس اور پریشان، مجھ سے کہنے لگی، ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گئی۔ کہاں چلی گئی تھیں۔ ڈاکٹر مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا، یہ لڑکی بہت اچھی ہے، میں نے سب کام اسی سے لیا۔ میں نے کہا، چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ اسے دوسرے کی مشکل میں تنہا مدد کرنا تو آ گیا۔

سارے خیمے مریضوں سے بھر گئے۔ خشک خون میں لتھڑے ہوئے کپڑے پہنے مریض اپنے زخمی اعضا کو سڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ایک بارہ سالہ لڑکا جگہ نہ ہونے کی وجہ سے، گودام کے قریب چوکی پر پڑا آہستہ آہستہ قبر کی طرف کھسک رہا تھا۔ پیپ اس کی ہڈی تک پہنچ چکی تھی اور جانبر ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ سیکڑوں بچے ہیضے اور سوکھے کے شکار ہو چکے تھے۔ وہ میلے کثیف بندر جیسی شکلیں، کھپاچیوں کی طرح ہاتھ، پیر اور نکلے ہوئے پیٹ سے بالکل بینڈھک کے بچے لگتے تھے مگر صبح سے دوپہر تک وہ اس شیریں لمحہ کے انتظار میں پڑے رہتے جب ان کی بھوک سے بلبلاتی ہوئی انتڑیاں دودھ کے چند قطروں سے تسکین حاصل کریں گی، لیکن ان کے دشمن تو باورچی اور اسپتال کا عملہ تھا جو زیادہ سے زیادہ بچا لینے کی فکر میں رہتے، یا پھر ان کے بڑے بھائی بہن جو دو گھنٹے کوٹھے پر لادے پھرنے کی مزدوری میں خیمہ تک پہنچنے سے پہلے آدھا دودھ خود پی جاتے اور وہاں پہنچ کر ماؤں سے لڑ جھگڑ کر پھر اپنا حصہ لے لیتے۔

میں نے ادھر ادھر کہا۔ گھر میں فریاد کی۔ راجکماری امرت کور[1] تک خبر پہنچائی اور باپو سے حال بیان کیا، تب کہیں جا کر دو نرسیں اور ایک لیڈی ڈاکٹر کا انتظام ہوا جو سارے دن رہتی تھی۔ دوائیں بھی آئیں اور نسبتاً کچھ بہتر حالت ہوئی۔ صبح کے وقت سوشیلا بہن آ ہی جاتی تھیں۔

کیمپ کمانڈر سے دوبارہ مجھے بھی ملنا پڑا۔ مگر میری لڑکی کشور سے تو روز ہی جھگڑا رہتا تھا۔ پناہ گزینوں کو شکایت تھی کہ گورنمنٹ سے گھی۔ دودھ۔ چینی۔ راشن اور دوائیں سب کچھ ملتا ہے، مگر ان کی قسمت کا کچھ نہیں، یہاں بھی امیروں کی بن آئی ہے اور عہدہ دار کھا رہے ہیں، میں نہیں جانتی اصلیت کیا تھی، شاید یہ ان کی بدگمانی ہو مگر لڑکی سنتے ہی لڑنے پہنچ جاتی۔ کئی بار سمجھایا، کیوں جھگڑا بڑھاتی ہے، لیکن اسے تو غریبوں کی وکالت کرنے میں لطف آتا تھا اور ایڈے بینڈے سے سوالات کر کے کمانڈر اور اس کے اسٹاف کو متنبہ کرنا وہ ضروری سمجھتی تھی۔ ادھر لوگ خوش تھے کہ چلو ہماری آواز اوپر پہنچ تو جاتی ہے۔

چیزوں کی تقسیم بھی ہمارا نیا تجربہ تھا اس لیے اکثر مستحقین رہ جاتے، وہ شرم کے مارے

---

[1] ۔ راجکماری امرت کور ہیلتھ منسٹر تھیں۔

سامنے نہ آتے، اور دیدہ دلیر لڑ جھگڑ کر لے جاتے۔

نومبر میں رام پوریوں کا گروہ خوش خوش نواب صاحب کو دعائیں دیتا ہوا ان کی بھیجی ہوئے اسپیشل ٹرین سے رام پور روانہ ہو گیا۔ مشرقی پنجاب والوں کو جو اس وقت بہت قلیل تھے پروانہ مل گیا۔ ٹونک کے رہنے والوں کی بھی ان کی ریاست سے مدد آگئی، معلوم ہوا جلد ہی ان کی روانگی کا بھی بندوبست کرایا جائے گا، اور دلی والے سوچنے لگے، کاش، ہم بھی کسی ریاست کے باشندے ہوتے۔ ادھر جمیلہ بیگم زخمیوں اور مریضوں کو بڑے اسپتالوں میں پہنچانے اور لے جانے کیلئے تمام دن ایمبولینس پر چڑھے شہر کا گشت کیا کرتی تھیں۔ پاکستان کے لیے اسپیشل لگ جاتی تو اعزہ واویلا مچاتے کہ ہمارے رشتہ دار کو فوراً لاؤ۔ ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ جن کے عزیز کھوئے ہوئے تھے یا اسپتال میں مر جاتے تھے، ان کی فہرست بھی ان کو اپنے پاس رکھنا پڑتی تھی کہ نام پڑھ پڑھ کر سنائیں۔ کتنے مرے۔ کیا ہوئے۔ شہر سے بھی بہت سے آدمی زخمی ہو کر بھاگ آتے تھے۔ کبھی کبھی پولیس اور ملٹری والے بھی زخمیوں کو لا کر کیمپ کے اسپتال میں ڈال جاتے تھے اور پھر ٹرین پر سے پھینکے ہوئے بھی اکثر اپنی ٹوٹی ہڈیاں اور چور چور جسم لے کر آجاتے تھے۔ غرض شہر اور کیمپ کے اسپتالوں میں ہر جگہ ایک سی بھیڑ تھی۔

ایک دن صبح میں بھی جمیلہ بیگم کے ساتھ چلی گئی۔ ادھر کئی دن سے ہم دونوں کو ایک فکر تھی کہ مشن والیاں بہت آگئی ہیں، وہ بچے سمیٹ رہی ہوں گی۔ آخر ہم خود کیوں نہ ان لاوارث بچوں کا انتظام کریں؟۔

حالت یہ تھی کہ جس دن ریل پاکستان جاتی بے شمار بچے اس میں سوار ہو جاتے، ان کے ماں، باپ اکثر یہیں رہ جاتے اور وہ سفر کے شوق میں چل دیتے۔ کبھی ماں، باپ چلے جاتے۔ بچے اسٹیشن پر چھوٹ جاتے۔ خدا جانے پاکستان میں ان بچوں کا کیا حشر ہوا۔ اپنے والدین تک پہنچے یا راستے میں ہی ضائع ہو گئے۔ بہر حال ہم اسی ارادہ سے ارون اسپتال پہنچے۔ زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے سرسری نظر سے سارا حال دیکھ لیا۔ بچوں کی تعداد نوٹ کر لی۔ ایمبولنس ہمیں چھوڑ کر جا چکی تھی اور ایک گھنٹہ بعد دوسرے اسپتال میں مریضوں کو چھوڑ کر واپس ہمیں لینے کے لیے آنے والی تھی، اس لیے نیچے آفس میں بیٹھ کر انتظار کرنے اور حالات کے مطابق پروگرام بنانے کی سوجھی لیکن ابھی ہم نے بات شروع بھی نہ کی تھی کہ دوسری ایمبولنس آگرڑکی اور بہت سے آدمیوں نے گھبرا گھبرا کر پوچھنا شروع کیا۔ کب؟ کیسے؟ ہمارے پوچھنے پر اسپتال کے ایک نوکر نے بتایا کہ پہاڑ گنج کا گشت کرتے ہوئے، ڈاکٹر مفتی (ہیلتھ آفیسر) کو قتل کر دیا گیا ہے، اور یہ ان کی اعضا بریدہ

لاش ہے جو ایمبولنس سے اتاری گئی ہے۔

میں فوراً بیٹھ گئی۔ کچھ بھولا ہوا' مجھے بھی یاد آیا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی اور جمیلہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔" مار دیا، گورنمنٹ آف انڈیا کے ملازم کو بھی مار دیا۔ حد ہے۔ انتہا ہے۔"

پتہ نہیں وہ کیا کیا کہتی رہی، میں کچھ سن نہ سکی مگر اب ٹھہرنا ناممکن تھا۔ میں نے خوشامد کی۔ جمیلہ خدا کے لیے میرے گھر فون کر کے گاڑی منگاؤ۔ ایمبولنس نہ معلوم کب آئے گی۔ مجھ سے اب نہیں رکا جاتا۔ گھبراہٹ میں اس وقت نمبر بھی غلط ہو ہو جاتا تھا۔

خیر خدا خدا کر کے فون ہوا۔ گاڑی آئی اور ہم دونوں واپس ہوئے لیکن اس واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر کئی دن تک میری ہمت نہ پڑی، جو بچوں کی خبر لوں۔ دوسرے ایک بڑی مشکل ہمارے سامنے یہ بھی تھی کہ ان کو لا کے رکھیں گے کہیں ؟ جمیلہ بیگم کا مکان خالی تھا، اور انھوں نے یہی صلاح دی کہ حکومت سے فوجی گارد مانگا جائے اور بچے وہاں رکھے جائیں مگر نہ ہمارے پاس کوئی فنڈ تھا اور نہ کوئی دوسری عورت جس کے سپرد بچے کیے جاسکتے۔

کیمپ کے اسپتال میں دوائیں اب بھی کم تھیں اور مریضوں کی کثرت تھی۔ خوش قسمتی سے بھائی صاحب[۱] کے پاس بھی اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے ہمیشہ کچھ دواؤں کا ذخیرہ رہا کرتا تھا۔ کچھ گھر میں وقتاً فوقتاً بیماروں کے لیے آئی ہوئی بچی ہوئی پڑی تھیں۔ کچھ ڈاکٹروں نے پرچہ پر مجھے لکھ کر دیدیں، وہ بازار سے منگائیں۔ سب سمیٹ کرلے گئی۔ مگر کہیں اوس چاٹنے سے پیاس بجھتی ہے۔ پتہ نہیں حکومت دیتی تھی یا افسروں کے تعصب اور عمال کی حرص کی نذر ہو جاتی تھیں۔ جو ہو۔ بڑی مصیبت تھی۔

اِن دنوں ایک صاحبزادہ حامد نامی اپنے خاندان سمیت پرانے قلعہ میں مقیم تھے، چونکہ کار ان کے پاس تھی اس لیے روزانہ شہر جاتے تھے۔ کیمپ میں بھی کام کرتے تھے اور بہت ہی محنت و تندہی سے کرتے تھے۔ ایک روز کہنے لگے کہ قدوائی صاحب کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں، جب علی گڈھ میں فساد ہوا ہے اور خبر سن کر قدوائی[۲] صاحب گئے ہیں تو میں بھی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا لڑکوں میں بڑا جوش پھیلا ہوا تھا۔ خوب پروپیگنڈا ان کے خلاف تھا اور یہی طے تھا کہ آج ان کو زندہ واپس نہ جانے دیا جائے۔

میں نے پوچھا اور تم کس جگہ تھے؟ کہنے لگے۔" میں بھی اسی پارٹی میں تھا۔ اب وقت گزر چکا

---

[۱] ۔ رفیع احمد قدوائی کیمونیکشن منسٹر

ہے اس لیے بتا رہا ہوں۔ بہر حال قدوائی صاحب آئے تو مخالفانہ نعرے لگ رہے تھے۔ آوازے کسے جا رہے تھے اور شور تھا کہ مار دو۔ لیکن انھوں نے کیا کیا؟ تن تنہا پولیس کو پیچھے چھوڑ کر ہمارے مجمع میں گھس آئے۔ اس ہنگامہ سے صرف اتنا متاثر ہوئے کہ رنجیدہ ہو گئے اور کہا۔ "تم لوگ شاید مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہو حالانکہ میں بھی اسی علیگڈھ کا پڑھا ہوا ہوں۔" اور پھر نہ جانے کیوں سب کے ہاتھ رک گئے، شور کم ہو گیا۔ لوگوں نے کہا جانے دو۔ بلکہ ان کی باتیں اور نصیحتیں ہم سب نے سکون سے سُن لیں بعد میں ہمارے درمیان بہت جھگڑا ہوا۔ ایک دوسرے پر ہم نے بزدلی اور غداری کا الزام بھی لگایا۔

لڑکا جلد ہی چلا گیا مگر جب تک رہا خلوص سے کام کرتا رہا۔ اب بھی پکا لیگی تھا لیکن مجھ سے کھل کر بات کرتا تھا۔ میں نے چاہا کہ پرانے قلعہ کے آوارہ گرد بچوں کو جو دودھ اور کھانا لینے آیا کرتے ہیں اور اپنے والدین کو ڈھونڈھتے رہتے ہیں، کسی اور اسکول یا جامعہ ملیہ میں ڈال دوں۔ حالانکہ ابھی میری جامعہ کے ذمہ داروں سے بات چیت بھی نہیں ہوئی تھی، لیکن مجھے یقین تھا، وہ لوگ انکار نہ کریں گے، مگر مسلمان بھائیوں کے لیے اس وقت تک پاکستان کا تصور جنت الفردوس کے تصور سے کم نہ تھا، اور اس تخیلی جنت میں لوٹ کر ملنے کی بالکل امید نہ تھی۔ اس لیے بچّوں کو "داشتہ آید بکار" کے خیال سے اپنے ساتھ لے گئے۔ شاید یہ بھی خیال ہو کہ مسلمان کا بچہ کفرستان میں نہ چھوڑا جائے۔

آخر کار لوگوں کے رونے فریاد کرنے کے باوجود کیمپ ٹوٹ گیا۔ بھر بھر کر ریلیں پاکستان روانہ ہو گئیں۔ وہ لوگ بھی گئے جو شوقِ دید سے بے تاب تھے، اور وہ بھی گئے جو نہیں جانا چاہتے تھے۔ کچھ ہنستے اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔ "انشاء اللہ اس دن کے بعد دلّی میں پیشاب کرنے بھی نہ آئیں گے۔" اور کچھ در و دیوار سے پسٹ کر روتے اور جناح صاحب کو، پاکستان کو گالیاں دیتے سوار ہو گئے اور بقیہ کو مقبرہ ہمایوں بھیجدیا گیا۔ ان میں اسپتال کا اسٹاف، وہ بھگوڑا لفٹنٹ۔ جمیلہ بیگم اور ڈاکٹر صدیق بھی تھے۔ جن کو کیمپ ختم ہونے، اور سارے پناہ گزینوں کے چلے جانے تک ہندوستان میں رُکنا تھا۔

ہمایوں کا مقبرہ

ہمایوں کا مقبرہ کچھ پرانے قلعہ سے زیادہ دور نہ تھا۔ بہت جلد پناہ گزینوں کے ٹرک اور میری موٹر کار مقبرہ پہنچ گئی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں، یہ کیمپ پرانے قلعہ والے کیمپ سے کئی باتوں

میں مختلف تھا۔ یہ خود رو نہ تھا بلکہ قائم کیا گیا تھا۔ جامعہ کے والنٹیروں نے اس کا انتظام سنبھال لیا اور اس کی ضروریات گورنمنٹ ہند پوری کرتی تھی۔ یہاں دو عملی نہ تھی۔ نہ ہندوستان پاکستان کا جھگڑا تھا۔

صفائی ستھرائی بھی کافی تھی۔ سب کے پاس خیمے تھے۔ اسپتال کے دو صاف ستھرے خیمے جدا تھے۔ مردانہ الگ، زنانہ الگ۔ ڈاکٹر کے بیٹھنے کا ٹھکانہ اور مریضوں کی رہائش اور ان دونوں میں کافی فاصلہ تھا۔ نرسیں اور دائیاں بھی تھیں۔ پشت کی طرف پردہ کی جگہ دیکھ کر نالیاں کھود دی گئی تھیں۔ اور ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے بیک وقت کئی آدمی آبادی سے تھوڑے فاصلہ پر آجا سکتے تھے۔ خیمے بھی ترتیب سے لگے تھے۔ باورچی خانہ اسپتال سے بہت دور تھا اور گودام پھاٹک میں تھا۔ کسی کو لیٹ کر کھانے کی اجازت نہ تھی[1]۔ پکا ہوا کھانا صرف اسپتال کے مریضوں اور از کار رفتہ بوڑھوں کو ملتا تھا۔ نومبر میں یہاں زخمی کم تھے اور مریض زیادہ جو گروہ دہلی کے فساد زدہ محلوں سے لٹ کر اور تباہ ہو کر آیا تھا وہ اب پاکستان اور یوپی کے اضلاع میں منتشر ہو چکا تھا۔ ان میں کچھ لوگ اب بھی باقی تھے۔ غربا کی تعداد زیادہ تھی اور امرا کی کم۔ پرانے قلعہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو اپنا لاکھوں[2] روپیہ سنبھالے ٹرین یا ہوائی جہاز کے انتظار میں تیار بیٹھے تھے، مگر یہاں اس وقت بہتیرے ایسے لوگ تھے جن کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائیں اور کیا کریں۔ اگرچہ یہ یقین دونو جگہ مشترک تھا کہ انڈین گورنمنٹ ان کو نکال رہی ہے۔

یہاں بگڑے دل کم تھے اور عبادت گذار زیادہ۔ اینٹوں اور لکڑیوں سے حد بندی کر کر کے جگہ جگہ نماز کے لیے صاف جگہ بنائی گئی تھی اور اکثر صبح کے وقت خیموں میں عورتیں کلام پاک پڑھتی نظر آتی تھیں۔ ہر تیسرے چوتھے دن میواتی مولویوں کا گروہ بنگلہ والی مسجد سے نماز و کلمہ کی تلقین کے لیے آتا تھا۔ یہاں گالیاں کم تھیں اور دعائیں زیادہ، غصہ کے بجائے عاجزی تھی اور نفرت کی جگہ ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ۔

دونوں میں اتنا زبردست فرق کیوں تھا۔ کیا یہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں کے خلوص کا اثر تھا؟ یا نماز و کلمہ کی تلقین کا؟ گورنمنٹ اس کیمپ کے لیے زیادہ فیاض ہو گئی تھی؟ یا کارکن

---

[1] ۔ راشن لے کر کھانا خود پکانا ہوتا تھا۔

[2] ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے مجھے بتایا کہ ایک ایسا آدمی بھی ان پناہ گزینوں میں تھا۔ جس نے ایک لاکھ کے نوٹ اپنے جسم پر دھاگے اور رسیوں سے کس رکھے تھے اور چلتے وقت ایک ہزار روپیہ پناہ گزینوں کے لیے دے گیا۔ وہ ایک ماہ یہاں ٹھہرا چلتے وقت اس نے یہ راز ڈاکٹر صاحب پر ظاہر کیا۔

بے لوث خدمت کرنے والے تھے؟ میں اسے اکثر سوچا کرتی ہوں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین سے پہلی بار بقر عید کے دن یہیں ملاقات ہوئی اور ان کے ڈھالے ہوئے انسانی نمونے یعنی طالب علم میں نے یہیں دیکھے۔

خون خرابے کے بعد پہلی عید۔ ہزاروں انسانوں کی قربانی کے بعد عید قرباں! عجیب دردناک منظر تھا۔ آنکھوں میں آنسو، میلے کچیلے کپڑے، فاقہ زدہ چہرہ لیے ہوئے عورت مرد اپنے کٹے ہوئے ہاتھ اور لنگڑاتی ٹانگیں گھسیٹ گھسیٹ کر خالق حقیقی کے حضور میں حاضر ہوئے۔ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی ہوگی۔ ''صورت بہ بیں حالش مپرس!''

کشور[1] کو بچوں کی مٹھائی سے بہت دلچسپی تھی۔ پرانے قلعہ میں بھی اکثر دودھ کے ساتھ وہ لائم جوس بچوں کو کھلایا کرتی تھی۔ مجھے تو کچھ یاد نہ آیا مگر آج بقر عید کے دن بھی وہ ایک ٹین لے کر پہنچ گئی اور بچوں کو پیسے اور مٹھائیوں سے خوش کر آئی۔ پرانے قلعہ میں جب کوئی چیز تقسیم ہوتی تو زیادہ تر ہاتھوں ہی سے چھن جاتی۔ بچے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے مگر مقبرے کے اوپر چھت پر قطار در قطار بچے بٹھا دیے گئے اور باری باری انھوں نے اپنا حصہ بغیر کسی شور و غل کے لے لیا۔ لیکن مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ ان کی منتظر آنکھیں، مسکین چہرہ، اور حسرت دیکھ کر میرا دل بھر آیا اور وہاں سے ہٹ کر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ اتنے میں ڈاکٹر ذاکر حسین[2] آ گئے۔ اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ لاوارث بچے جتنے بھی مل سکیں آپ سب جامعہ بھیج دیں، ہم ان کے لیے الگ انتظام کر دیں گے۔ کتنی بڑی مشکل ان کے چند الفاظ نے حل کر دی۔

بچے خوش خوش نیچے اتر رہے تھے اور نوجوان آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھیوں سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ بوڑھے روتے ہوئے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ اس دن پلاؤ اور میٹھے کی دیگیں بھی مجلس احرار اور جمعیۃ العلماء کے اہتمام سے آئیں اور یہ یادگار تاریخی عید ختم ہو گئی۔ ہزاروں آنسوؤں، آہوں، فریادوں میں لپٹی ہوئی عید۔

یہاں ایک خاص بات اور تھی کہ تین خیمے صرف از کار رفتہ بوڑھوں کے لیے ہمیں لگوانے پڑے تھے۔ ان بوڑھی عورتوں کے لیے باقاعدہ انتظام کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ان کی تعداد

---

1 - میری لڑکی۔

2 - ڈاکٹر ذاکر حسین کئی دوستوں کے ساتھ ایک بار رفیع بھائی سے ملنے سولی آئے تھے لیکن میں اس وقت سخت پردہ کرتی تھی اس لیے مل نہ سکی۔

بہت بڑھ گئی تھی۔ پاکستان جانے والے سپوت بیٹے اپنی ماؤں۔ نانیوں اور دادیوں کو چھوڑ کر چل دیے تھے۔ ایک دلاور نے جب دیکھا کہ اندھی بڑھیا نہ مرتی ہے نہ جیتی، اب اس کو پیٹھ پر لادنا ہی پڑے گا تو جیتی جان کو قبرستان میں پھینک آیا۔ مگر زندگی تو پھر زندگی ہے وہ اس نے کراہ کر چیخ کر راہ چلتوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور والنٹیر اسے اٹھا لائے۔

پرانے قلعہ میں ایک روز ٹرک لدر ہے تھے۔ اسپیشل ٹرین اسی دن چھُٹ رہی تھی۔ لوگ جوق درجوق پاکستان پاکستان رٹتی ہوئی بوڑھیوں کو چھوڑ کر سوار ہو رہے تھے۔ میں نے یہ حال دیکھا تو پوچھا کہ آخر انھیں کیوں نہیں ساتھ لے جاتے۔ کہنے لگے۔ یہ وہاں جا کر کیا کریں گی۔ چلنا پھرنا تو مشکل ہے۔ مجھے غصہ آگیا۔

نہیں تم کو لے جانا پڑے گا۔ کیا سڑے گلے بڈھے ہندوستان ہی کے لیے رہ گئے ہیں۔ اٹھاؤ، میں نے والنٹیر سے کہا۔ ان کو اٹھا کر ان کے رشتہ داروں کے ساتھ کر دو۔ انھوں نے تین بوڑھی عورتیں گود میں لے کر ٹرک پر چڑھا دیں۔ ایک بڈھے کو دو آدمیوں نے پکڑ کر سوار کرا دیا۔ لیکن اسٹیشن سے بڈھا پھر واپس آگیا اس کے عزیز اس کو چھوڑ گئے تھے۔ عورتیں بھی رہ جاتیں اگر والنٹیر ان کی مدد نہ کرتے۔

بہرحال پرانے قلعہ کی بوڑھیوں کو بھی ملا کر اس کیمپ میں ضعیف عورتوں کی تعداد بہت ہو گئی تھی۔ کشور کو بھی فکر انھیں کی ہوئی۔ اس نے تین خیمے لگوائے۔ جامعہ کے ورکر جو کام کرتے تھے سلیقہ سے، وہاں سے ٹاٹ کے گدّے پیال بھر دا کر سلے ہوئے لے آئے اور جن لوگوں کے پاس بچھانے کو بڑے یا پلنگ نہ تھے۔ ان کو پہنچا دیے گئے۔ کشور نے انھیں سے بہت سے گدے لیکر بوڑھیوں کے اوڑھنے اور بچھانے کا انتظام کیا۔ ان کے کپڑے بدلوائے اور میں نے دیکھا کہ وہ اس کے قدموں کی آہٹ کا انتظار کیا کرتی تھیں کیونکہ کھانا اور پانی بھی وہی پہنچاتی تھی۔

اور پھر وہ بڑے میاں جو اسٹیشن سے واپس آئے تھے، انھوں نے دیکھا موقع اچھا ہے۔ پاکستان نہ جا سکا نہیں سہی، یہیں کچھ دن آرام کر لوں اپنے چہرہ کی بڑی تیوری دکھا کر کشور کو اپنی سخت بیماری کا یقین دلا دیا اور اسپتال کے پلنگ پر گدا بچھا لحاف اوڑھ آرام سے لیٹ گئے۔

یہاں کام کرنے والے جامعہ کے علاوہ اور بھی کئی نوجوان لڑکے تھے۔ جو سب مل کر بھنگی سے لے کر نرس تک کا کام کیا کرتے تھے۔ انھیں میں افسر نام کا ایک ذہین بی۔ ایس۔ سی کا طالب علم بھی تھا۔ وہ تازہ تازہ برما سے آیا تھا اور پناہ گزینوں میں شامل ہوتے ہوئے بھی اسپتال میں فسٹ ایڈ کیا کرتا تھا۔ اس نے جو دیکھا کہ بڑے میاں کو کشور اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہیں بوڑھیوں

کے بستر بچھاتی ہیں تو اس نے کہا۔ آپ کو بہت سے کام ہیں۔ لایئے ان کو کھانا میں کھلا دوں۔ بڑے میاں بڑھ بڑھ کر لقمہ مار رہے تھے کہ میں پہنچ گئی۔ میں نے پوچھا یہ کیا۔ تم ان کو کھانا کیوں کھلا رہے ہو۔ کیا یہ کچھ بیمار ہیں ؟ افسر نے کہا۔ جی ہاں۔ یہ تو کئی دن سے اسپتال میں لیٹے ہیں۔ کشور ان کو کھلاتی تھیں۔ آج میں نے یہ کام لے لیا۔ تب تو میں نے بڑے میاں کو خوب ڈانٹا کہ اگر یہ چند بیوقوف لڑکے لڑکیاں تم کو نہ مل جاتے تو دلی کی کوئی گلی بھیک مانگنے سے نہ چھوڑتے۔ ان بچوں کو کیوں الّو بنا رہے ہو۔ اٹھو اور بستر چھوڑ دو۔ بستر تو خیر انھوں نے نہیں چھوڑا۔ فروری تک اس پر پڑے رہے مگر کھانا پانی اپنے ہاتھ سے کھانے پینے لگے۔

کیمپ کی مصروفیت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اور مجھے کئی کئی دن باپو کے پاس جانے کی مہلت نہ ملتی۔ کسی دن شام کو جاتی، پرارتھنا میں شریک ہو کر واپس چلی آتی۔ جب تھک جاتی، جب دل کی دھڑکن بڑھ جاتی اور جب یہ تمام حالات دیکھتے دیکھتے جی الجھ جاتا تو مہاتما جی کے پاس پہنچتی اور اور وہاں سے نئی طاقت لے کر پلٹتی۔ ذرا ذرا سی بات لے کر برلا ہاؤس دوڑتی اور مشکل حل ہو جاتی۔ کتنا بڑا سہارا تھے وہ۔

ایک دن مجھے ایک آدمی ملا جس کا بایاں ہاتھ آدھا کٹا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم پاکستان جا رہے[1] ہو۔ وہ مسکرایا۔ اعتماد۔ بے خوفی اور طنز والی مسکراہٹ اس کے چہرہ پر دوڑ گئی۔ اس نے کہا میں بھلا پاکستان جا کر کیا کروں گا۔ میرا وہاں کیا رکھا ہے۔ ایک ہاتھ کٹوا چکا۔ بیوی بچے مارے جا چکے۔ اب کہیں جا کر کیا کروں گا۔ میں تو شہر جا رہا ہوں اور یہ کہتے وقت اس کی آنکھوں میں کسی خوفناک ارادہ کی چمک آ گئی۔ عجیب سا استقلال میں سوچنے لگی۔ یہ شہر جا رہا ہے۔ وہاں کیا کرے گا۔ اس کے اندر تو انتقام کی آگ دہک رہی ہے۔ دیکھو اپنے اس ایک ہاتھ سے یہ کتنے خون کرے۔ کس کا گلا گھونٹے۔ اور مجھے وہ سکھ نوجوان یاد آ گیا۔ جو ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک دوست سے ملا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ گھر کے انیس[2] آدمی مارے جا چکے ہیں اور میں بیسواں صرف اس لیے زندہ ہوں اور زندہ رہنا چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ قاتلوں کی قوم سے بدلہ لے سکوں اور پھر یا تو پھانسی پاؤں گا۔ نہیں تو خودکشی کر لوں گا۔

ع ۱ ۔ ٹرین شاید اسی دن چھٹ رہی تھی۔

ع ۲ ۔ وہ سکھ لڑکا شرنارتھیوں کے ساتھ پاکستان سے دہلی پہنچا تھا۔

میں دلی کے نواب زادوں، بیگمات اور رؤسا کو ڈھونڈھتی رہی۔ نہ وہ پناہ گزین تھے، نہ پناہ گزینوں کی مدد کرنے والے۔ نہ وہ آنے والوں میں ملتے، نہ جانے والوں میں۔ دونوں کیمپوں میں بساطی، کرخندار، سادہ کار، زاعی، نیاریے۔ ملازمت پیشہ سب ہی تھے مگر دلی کا اعلیٰ طبقہ اپنی شستہ تہذیب اور کوثر میں دھلی ہوئی زبان لے کر معلوم نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ بہتوں سے سوال کیا تو پتہ چلا کہ وہ لوگ دو دو، ایک ایک دن کیمپ میں ٹھہر کر ستمبر ہی میں پاکستان چلے گئے۔ عوام رہ گئے تھے۔ وہ اب جا رہے ہیں۔

لوگ کہتے تھے کہ ستمبر میں پرانے قلعہ کی آبادی ایک لاکھ یا اسّی ہزار تک پہنچ گئی تھی اور مقبرہ میں ساٹھ ہزار انسان برساتی مینڈکوں کی طرح تلے اوپر پڑے تھے۔ اب تو خیر یہ حال نہیں تھا۔ نہ اتنی آبادی تھی۔

لیکن نومبر ۱۹۴۷ء میں مقبرے کے اسپتال میں بہت سے زخمی ایسے بھی آئے۔ جنھیں چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیا گیا تھا اور وہ مہینوں اپنی ٹوٹی ہڈیوں کے درست ہونے کے انتظار میں پڑے رہے۔

ادھر کیمپ کی آبادی پھر بڑھنا شروع ہوگئی کیونکہ پنجابی پناہ گزینوں نے مکانات پر قبضہ کرنے کی مہم شروع کر دی۔ جیسے جیسے سردی بڑھ رہی تھی، لوگوں کی سرد مہری میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

اِدھر کیمپ کی یہ حالت تھی اُدھر شہر میں بھی حالت کچھ بہتر نہ ہوئی تھی۔ میں نے ابھی تک شہر نہیں دیکھا تھا اس لیے ایک دن میں نے جامعہ کے ایک نوجوان سے کہا کہ بھئی اب تک میں نے شہر نہیں دیکھا ہے۔ ذرا مجھے فساد زدہ علاقہ اور عام حالت تو دکھا دو۔ میں نہ راستے سے واقف ہوں نہ میرا ڈرائیور ہی یہاں کا رہنے والا ہے اسی لیے مجھے ایک راہ نما کی ضرورت ہے۔

میری ایک ملنے والی مسز سادھنی[عا] بھارگوان دلوں کالکا اور شیخ سرائے کے پناہ گزینوں میں امداد اور بحالی کا کام کرتی تھیں۔ وہ اکثر مجھے بتاتیں کہ شہر کی گلیوں میں گھومتے ہوئے گولیاں موٹر کار کے اوپر سے سنسناتی ہوئی گذر جایا کرتی ہیں اور ابھی محلوں کی حالت اس لائق نہیں ہے کہ

عا۔ لکھنؤ کی ایک خاتون جو تین ماہ سے سنٹرل ریلیف کمیٹی کے ساتھ کام کر رہی تھیں۔

کوئی آسانی سے گذر سکے۔ کئی بار انھوں نے مجھے کالکا چلنے کی دعوت دی لیکن باپوُ مجھے مسلم کیمپ بھیج چکے تھے اور یہاں کوئی نہ کوئی ضروری کام روز ہی لگا رہتا تھا اس لیے کالکا جانا ستواتر آج کل پر ٹلتا ہی رہا اور میں پنجابی پناہ گزینوں کے متعلق سوائے سنی سنائی باتوں کے کچھ بھی نہ جان سکی۔ جو داستانیں سن رہی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں اور وہاں حالات و جذبات کے اعتبار سے بہت ہی تھوڑا فرق ہے۔ وہ یہ کہ اُن کی امداد اور بحالی ہو رہی ہے اور ان کا اخراج۔ اُن کے نوجوان لڑکے لڑکیاں کمر ہمت باندھ کر اپنے علم و عمل سے یہ مصیبت کاٹ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور یہاں جہلا کا مجمع ہے۔ جو اور مشکلات میں اضافہ کا باعث بن رہے ہیں۔ اکا دکا پناہ گزینوں سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنی دل ہلا دینے والی داستانیں سنا کر مجھے بتایا کہ دلی میں تو کچھ ہوا ہی نہیں۔ بس مہاتما جی شور مچا رہے ہیں اور پنڈت نہرو اس کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔ اگر کوئی انصاف والی گورنمنٹ ہوتی تو مسلمانوں کے ساتھ بھی وہی کرتی جو ہمارے ساتھ پنجاب میں ہوا ہے۔ ان لوگوں کو جلد سے جلد پاکستان بھیج کر ان سب کے مال اسباب اور جائداد پر ہمارا حق تسلیم کرنا چاہیئے مگر وہ تو اور مسلمانوں کی محبت میں ان کو جانے سے روک رہی ہے۔

ادھر مسلمان کہتے۔ "یہ جھوٹے ہیں۔ بے ایمان ہیں، مسلمانوں نے ان پر کچھ ظلم نہیں کیا۔ یہ تو ویسے ہی بھاگ آئے ہیں۔ صرف مار کاٹ اور لوٹ مار کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اپنا مال و دولت سب سمیٹ کر لے آئے ہیں۔ دیکھتے نہیں کیسے اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہیں یہ۔ ادھر سرکار ہے کہ ان کی محبت میں مری جا رہی ہے۔ ہندو حکومت ہم کو تو مروا ہی رہی ہے اور ان کی مدد کر رہی ہے۔ حکومت کی مدد نہ ہوتی۔ تو یہ فوج ہم پر گولیاں کیوں چلاتی؟"

دونوں طرف کی ایسی ایسی باتیں سنکر جی چاہتا کہ آنکھوں دیکھ کر اندازہ کروں مگر کوئی موقع ملتا ہی نہ تھا۔ آخر کار کوشش کر کے میں ایک دن شہر گئی۔

پہاڑ گنج، قرول باغ، ملتانی ڈھانڈا، سبزی منڈی، چاندنی چوک، اور چونا منڈی۔ سب کا گشت کیا۔ موٹر کہیں رُکی نہیں مگر آہستہ آہستہ ہر محلہ سے گذرتی رہی۔ جلے اور کھدے ہوئے مکانات، منہدم قبرستان، مورتیاں رکھی ہوئی مسجدیں۔ دیکھتی ہوئی جب جامع مسجد پہنچی تو سامنے پارک میں خیمے نظر آئے اور آزادانہ آتے جاتے مسلمان نظر پڑے۔ معلوم ہوا۔ یہاں الور اور پٹیالہ کے قافلے آکر اترے ہیں۔ جامع مسجد کے برآمدے اور سامنے کا پارک سب انھیں لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔

اتنی دیر تک میں نے گشت لگائی۔ لیکن کسی سڑک پر چلتے مجھے مسلمان نظر نہیں آئے۔

بھانت بھانت انسان دہلی میں بھر گیا تھا مگر سب کے چہروں پر اندرونی بے چینی و خلفشار کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

اس سے پہلے کبھی سڑک پر چلتے ہوئے کسی کے دل میں ہندو مسلمان کا خیال بھی نہ آتا ہوگا۔ لیکن یہ واقع تھا کہ آج میں بغور چہرہ دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی خاص قسم کی ترشی ہوئی داڑھی اور اکثر گول ٹوپی سے دہلی کے مسلمان پہچانے جا سکتے تھے۔

جب شہر کا بڑا حصہ دیکھ چکنے کے بعد کوئی ایک مسلمان بھی مجھے نظر نہ آیا تو میرے دل سے آہ نکلی۔ خدایا۔ کیا تیری وسیع زمین مسلمانوں پر اتنی تنگ ہو چکی ہے اور تیرا قہر و غضب اس حد تک ان پر نازل ہوا ہے کہ وہ اب صرف منہ چھپائے ہی پھر سکتے ہیں ؂

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل   خشت بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

مجھے سب کچھ سچ کہنا ہے اس لیے آپ محسوس کریں گے کہ کہیں میں انسان کو ڈھونڈھتی تھی اور کبھی مسلمان کو ردتی تھی۔ یہ خیالات و جذبات ہیں۔ جن پر قابو نہیں پایا جا سکتا اور جو حالات کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔

مگر جامع مسجد پر اب بھی غالب آبادی مسلمانوں کی تھی۔ شاہجہاں کی بنوائی ہوئی مسجد تاج محل نہیں تھی جس سے عشق و محبت کی کوئی روایت وابستہ ہو۔ پھر کیوں اس سے نفرت کی نہیں، محبت کی لپٹیں آرہی تھیں۔ کیوں؟ اس کے دامن سے مسکین، غریب، مظلوم چمٹے ہوئے تھے۔ کیا اس کی بنیاد میں بھی وہی وارفتگی اور والہانا عشق شامل تھا؟ کیا تاج کی مجازیت یہاں الوہیت و حقیقت میں تبدیل ہو گئی ہے؟ یہاں کے رہنے والے ہندو مسلمان ابھی تک زندہ ہیں۔ انسان ہیں۔ کیا اب بھی اس مٹی کے خمیر میں انسانیت کا کوئی جزو باقی ہے؟

ایسے بہت سے سوال تھے۔ جو ایک ساتھ دل و دماغ سے اٹھتے تھے اور جن کا کوئی جواب نہ میرے پاس تھا نہ کسی اور کے۔ جامع مسجد سے گزر کر جامع مسجد سے آگے ہندو آبادی قائم تھی دریبہ اور چاوڑی بازار میں مسلمان کاریگر گھروں میں چھپے ہوتے اپنے ہندو بیوپاریوں کے لیے چیزیں بھی بنا رہے تھے۔ کناٹ سرکس اور نئی دہلی تک سارا علاقہ مسلمانوں سے خالی تھا۔ میرے راہ نما کی عمر مشکل سے ۲۴ سال کی ہوگی۔ مگر تجربے نے اسے بڈھوں سے زیادہ سنجیدہ بنا دیا تھا۔ وہ آنکھوں دیکھا حال ان سارے حملوں کا مجھے سناتا رہا۔ وہ خود اس وقت قرول باغ میں تھا جب گھر جل رہے تھے۔ لٹ رہے تھے اور لوگ جان بچانے کے لیے جھاڑیوں اور پتھروں کی اوٹ میں پناہ ڈھونڈھ رہے تھے۔ اسی قرول باغ میں جامعہ کا اسکول مکتبہ سب تباہ ہوا۔

اور شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم اپنے چند ساتھیوں سمیت ایک مکان میں موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ایک کر کے جب سارے ساتھیوں کو بچا کر نکال چکے تب زبردستی خود نکالے گئے۔

ہمایوں کے مقبرے سے پھر مسلم آبادی شروع ہو کر نظام الدین تک جاتی تھی۔ ایک چھوٹی سڑک تھی۔ جو مقبرہ اور نظام الدین کے درمیان چل رہی تھی۔ اس پر ہر وقت مسلمانوں کی آمد و رفت تھی۔ اس سے آگے بڑھو تو پھر مہرولی تک ان کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔

دو ٹھکانے تھے، محبت کے دو نشان، عشق کی دو درسگاہیں۔ اور منزل کے دو راستے بلکہ یوں کہیے مصیبت زدوں کی دو پناہ گاہیں تھیں جہاں رحمت و محبت کے دو چشمے جاری تھے۔ دیہاتوں، محلوں اور ریاستوں کے دور دراز فاصلوں سے سمٹ سمٹ کر مصیبت کے مارے آ رہے تھے اور یہاں پناہ لیتے تھے۔ اُدھر اونچی شاندار جامع مسجد کے سفید مینار دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے امن و محبت کا پیغام سنا رہے تھے۔ اِدھر نظام الدین میں کوئی غیبی غیر محسوس ہاتھ تسبیح کے بکھرے دانوں کو دامن میں سمیٹ رہا تھا۔

میرے دماغ میں جیسے دھچکا سا لگا تخیئل کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ میں گھر پہنچ گئی تھی اور قیصر کہہ رہے تھے۔ اب اتر یے۔ اور میں یہ سوچتی ہوئی اتر پڑی۔ نہیں نئی دہلی میں ایک تیسری پناہ گاہ برلا ہاؤس بھی تو ہے۔ وہ شانتی کا گھر۔ زندہ حقیقت، روشن سچائی، ہندوستان کا باپ جو آنکھوں میں آنسو بھرے اپنے بچوں کے لیے سینہ سپر ہے۔ وہیں تو ہر دکھ کی دوا ملتی ہے اور زخمی دلوں کے لیے مرہم بھی۔

ایک دن جو کیمپ پہنچی تو دیکھا کارکنوں کے خیمے کے پاس خالی زمین پر دری بچھائے چادر ڈالے بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ میں نے سوچا شاید کوئی اور قافلہ آ گیا۔ محفل سی جمی ہوئی تھی۔ ایک صاحب نے مجمع سے اُٹھ کر ایک کاغذ میرے ہاتھ میں دیدیا۔ پڑھا تو وہ ایک درخواست تھی۔ جو کسی یتیم خانہ کی طرف سے لکھی گئی تھی۔ نیچے یتامیٰ کے دستخط تھے۔ لکھا تھا کہ یتیم خانہ کی عمارت پر شرنارتھیوں نے قبضہ کر لیا ہے اس لیے ہم سب اپنے مہتمم کے ساتھ اُٹھ آئے ہیں۔ ہمیں خیمے۔ گدّے اور راشن دلوایا جائے۔ میں ایک نوجوان کو ساتھ لے کر ان کے پاس گئی اور پوچھا کہاں ہیں وہ یتیم لڑکے مجھے دکھایئے۔ مہتمم نے جواب دیا۔ فہرست میں سب کے نام لکھے ہوئے ہیں اور یہ سب جو بیٹھے ہیں وہی لوگ ہیں۔ اس وقت مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین کا کہنا یاد آ گیا۔ یہی سوچا کہ جتنے بچے مل جائیں گے چلو اچھا ہے سب کو جامعہ بھیجدوں گی۔ مردوں کے لیے راشن اور خیمے کا انتظام کر دیا جائے گا۔

لیکن مجمع پر جو نظر پڑی تو بچے کم اور بڑے زیادہ نظر آئے اس لیے میں نے لوگوں سے

کہا کہ ایک ایک نام پکار کر دیکھو۔ بچے کتنے ہیں۔ مجھے تو بہت ہی کم نظر آرہے ہیں۔ ان کی تعداد تو واجبی ہی واجبی نظر آرہی ہے۔

اس نے پہلا نام لیا تو ۱۷۔۱۸ سال کا ایک تندرست لڑکا جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں آواز سنتے ہی کھڑا ہوگیا۔ میں نے سمجھا کر کہا۔ بیٹا تم تو بہت بڑے ہو۔ کما سکتے ہو مگر شاید یتیم خانہ ہی میں پالے گئے ہو گے۔ اس لیے ان سب کے ساتھ ہو۔ خیر۔

دوسرے اور تیسرے نام پر دو بچے اٹھے جن کی عمر ۱۲۔۱۳ سال کی تھی مگر چوتھا نام لیتے ہی ایک ۳۰۔۳۵ برس کا خاصہ گبرو جوان کھڑا ہوگیا۔ میرے ساتھی نے بہت جھلا کر کہا۔ آپ۔ آپ یتیم ہیں یا یتیم کے باپ !؟

اور اس فقرے پر پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ ادھر میں نے غور کیا تو ادھیڑ مہتمم صاحب خود یتامیٰ کی فہرست میں شامل تھے۔ لوگوں کو ہنستے دیکھ کر وہ غصہ سے بھنّا اٹھے۔ انھوں نے کہا۔ جناب ہم سب یتیم خانہ کو چلانے والے لوگ ہیں۔ یتیم بچے یہ ہیں لیکن اٹھارہ بیس آدمیوں کی فہرست میں بمشکل آٹھ نو بچے تھے۔ باقی سب ہی یتیم خانہ چلانے والے بڑی عمروں کے بزرگوار تھے۔

میں نے کوشش کی کہ کسی طرح ان بچوں کو روک لوں مگر وہ "امامیہ یتیم خانہ" کی ملکیت تھے اور ان کو حاصل کرنے کے لیے مجھے خود کسی مجتہد سے "شیعیت" کی سند لینا پڑتی۔ حتیٰ کہ اس تجویز کو بھی انھوں نے منظور نہ کیا! کہ یہ بچے لکھنؤ کے شیعہ یتیم خانہ میں بھیجے جائیں۔ بدقسمتی دیکھیے مجھے کوئی شیعہ[1] بھائی بھی کیمپ میں اس وقت نہ ملا۔ جو میرا ہم خیال ہوتا یا مدد کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہتمم صاحب اپنی دکان لے کر لاہور روانہ ہو گئے۔ جہاں امید ہے یہ اب بھی اچھی طرح چل رہی ہوگی۔

اسی طرح ایک دن ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ میں نے اوپر کہا ہے کہ کفن کا انتظام یہاں جمعیۃ العلماء کی طرف سے تھا۔ پرانے قلعہ کی طرح ریلیف کمیٹی نہیں کرتی تھی۔ ممکن ہے پہلے اسی کی طرف سے ہو مگر میرے سامنے اس کی فراہمی جمعیۃ کے سر تھی اور تقسیم جامعہ کے والنٹیر کرتے تھے۔ بہر حال کفن کی تقسیم کے سلسلہ میں میّت کے ورثا اور لڑکوں سے بحثا بحثی ہوتے ہوئے دیکھ کر میں پہنچی تو معلوم ہوا کہ میّت کے کوئی پیر بھی ہیں۔ جو بہ نفس نفیس کیمپ میں مقیم ہیں اور

---

[1] ۔ اگرچہ کئی شیعہ نوجوان لڑکے اس وقت کیمپ میں کام کر رہے تھے مگر وہ اس وقت نہ شیعہ ہونے کے لیے تیار تھے۔ نہ سنی۔ صرف انسان رہنا چاہتے تھے۔

انھوں نے فتویٰ دیا ہے کہ اتنے گز کپڑے کے بغیر ستر پوشی مکمل نہ ہو سکے گی۔ ادھر لڑکے کم دینا چاہتے ہیں اور اس پر حجت ہو رہی ہے۔ میں نے لوگوں کو سمجھایا کہ جتنا کپڑا مل گیا ہے۔ لیلو۔ چلو میں پیر صاحب سے بات کر لوں گی۔

پیر صاحب خیمہ کے سامنے پیال کے دو موٹے گدّے تلے اوپر بچھائے سبز جبّہ اور عمامہ پہنے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اردگرد چند معتقدین دوزانوں بیٹھے تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ دیکھیے صاحب مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور کپڑے کی فراہمی بیحد دشوار ہو رہی ہے۔ ان دنوں خاص طور پر سخت دقت ہو رہی ہے۔ ایک روز تو ایسی حالت ہو چکی ہے کہ مرنے والے ابدن کے کپڑوں میں یا میلی چادروں میں اور عورتوں کے دوپٹوں تک میں دفن کیے گئے ہیں۔ ہمیں بھی معلوم ہے کہ عام اطمینانی حالت میں کفن کے لیے کپڑے کی کتنی مقدار ضروری ہوتی ہے مگر یہ تو مصیبت اور مجبوری کا زمانہ ہے اس میں سب کچھ جائز ہے۔

پیر صاحب بہت بگڑے۔ معتقدین بھی برہم ہوئے اور لڑکوں سے پھر جھگڑا ہونے لگا۔

میں نے پھر کہا۔ جناب آپ کیمپ میں پیر بن کر کیوں رہ رہے ہیں۔ اب تک یہ تمام لوگ سالہا سال سے آپ کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ اب ان پر وقت پڑا ہے تو آپ کو ان کی خدمت کرنا چاہیئے۔ یہاں کونے میں مت بیٹھیے۔ آیئے ہمارے ساتھ کام کیجیے تو آپ کو مشکلوں کا خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔

مگر پیر صاحب بھلا کیوں سننے لگے۔ کافی دیر تک گرما گرم گفتگو رہی۔ آخر ہم انھیں غصّے میں بکتا جھکتا چھوڑ کر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ کئی دن بعد کپڑے تقسیم کرتے وقت وہ پھر مجھے مل گئے اور کہنے لگے۔ بابا فقیر کی بھی کچھ فکر ہے۔ میں نے طنزاً کہا۔ جب آپ کے پاس دو گدّے۔ لانبا کرتا۔ صاف تہبند ہے تو آپ کو اور کیا چاہیئے۔ کہنے لگے کمبل۔ میں نے پھر اسی انداز میں جواب دیا۔ آپ تو خادم ہیں۔ فقیر ہیں۔ آپ کو اسباب دنیا کی کیا حاجت، اور نہیں تو پھر خدمت کیجیے، مزدوری کیجیے۔ بہت بگڑے اور بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ پھر تو ان سے کئی بار ملاقات ہوئی اور ایسا اتفاق ہوا کہ جب وہ بگڑ کر چلے جاتے تب مجھے افسوس ہوتا۔ مگر جانے کیا تھا کبھی میرا دل ہی نہ چاہا کہ انھیں کوئی چیز دوں۔ غالباً جہاں ہوں گے مجھے کوستے ہوں گے۔

یہاں کیمپ کمانڈر گورنمنٹ کا مقرر کردہ ایک اینگلو انڈین تھا۔ اور باقی سب آنریری کام کرنے والے، جن میں سے کسی کی ڈیوٹی رات کو ہوتی کسی کی دن میں۔ لڑکوں نے کیمپ کے نوجوانوں کی ایک ٹولی کو کیمپ پولیس کا نام دے رکھا تھا۔ جو چھوٹے چھوٹے ڈنڈے لیے کیمپ میں رات دن

گشت کرتے تھے تاکہ کسی طرف سے حملہ نہ ہو جائے۔

کچھ ہی دن گذرے تھے کہ یہاں مقبرہ ہمایوں میں بھی مجلے اجڑ کر، گاؤں ویران ہو کر ہزاروں کے قافلے آنے شروع ہو گئے۔ تندرست اور توانا دیہاتی مرد، ہٹی کٹی عورتیں لانبے تنگڑے نوجوان۔ چارپائیاں، چھاج، چھلنیاں، پٹارے، اناج کی بوریاں۔ بیل گاڑیوں، لاریوں اور فوجی ٹرکوں پر رکھے، آن کی آن میں کئی کئی ہزار کی تعداد میں آ کر اتر پڑتے۔ شہر کے لوگ سروں پر بکس اٹھائے، بچوں کی انگلی پکڑے، عورتیں پٹاری پاندان سنبھالے سڑپڑ کرتے قطار در قطار کیمپ میں چلے آرہے تھے۔ جلد ہی کیمپ کی صفائی غائب ہو گئی۔ نہ کوئی نظام باقی رہ گیا نہ باقاعدگی۔ جس کو جہاں جگہ ملی چادر تان کر بیٹھ گیا اور خیمہ کے لیے ہم لوگوں کی جان کھانی شروع کر دی۔

پُرانے قلعہ کے سارے خیمے اکھڑ کر شرنارتھیوں کے لیے جا چکے تھے۔ یہاں کہیں فاضل تو رکھے نہ تھے۔ نومبر دسمبر کی سردی اور کھلے آسمان کے نیچے چادر تان کر بیٹھنے والے ہی جان سکتے ہیں کہ کیا بیتی ہوگی۔ نمونیا اور بخار نے دھر لیا جسے دیکھو کھانسی۔ سینہ جکڑا ہوا۔ پہننے کو کپڑے تک پاس نہیں اور ہوائیں ایسی سرد کہ ہڈی کے اندر گھسی جا رہی ہوں۔ یہ ناقابل برداشت مصیبت دیکھ کر میں رو پڑی ڈاکٹر ذاکر حسین سے جا کر کہا۔ سارا حال سن کر متاثر ہوئے اور کہنے لگے۔ آخر وہ کیوں آرہے ہیں۔ انھیں سمجھائیے۔ میں نے بتایا کہ بہت سمجھا چکی ہوں مگر آنے والوں کا تانتا ٹوٹتا ہی نہیں۔ اس روز میری بہن نے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمت باندھو اور اپنے مکان واپس چلے جاؤ۔ اتنی زیادہ تعداد میں اگر پاکستان پہنچو گے تو وہاں بھی بھوکوں مرو گے۔ ریل میں کٹو گے۔ اس پر لوگ اتنے مشتعل ہو گئے کہ ان کو گھیر لیا اور لڑکوں نے بمشکل سب کو ہٹایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہیں معلوم کہاں سے دو سو خیموں کا انتظام کیا اور کیمپ میں بھجوائے۔ ہفتوں ان کی تعمیر اور تقسیم ہوتی رہی۔ مشکل یہ تھی کہ خیمہ لگانا بھی کسی کو نہ آتا تھا۔ وہی لڑکے دودھ اور راشن بانٹتے۔ کپڑے اور کمبل تقسیم کرتے۔ پھر خوب گالیاں اور کوسنے بھی سنتے۔ غرض جھگڑتے بھی وہی اور نپٹتے بھی وہی

عا۔ یہ عجیب سا لفظ اسی زمانہ کی پیداوار تھا۔ کچھ دن تک تو ہم لوگ صحیح تلفظ بھی نہ ادا کر سکے۔ اتنا موٹا سا لفظ جیسے منھ بھر جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ عادی ہو گئے تو پنجابی اخبارات نے شور مچایا ہم کو شرنارتھی نہ کہو ہم پرشارتھی ہیں اور پھر اپنے آپ کو مہاجر کہنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں۔ پناہ گزین اور مہاجر فارسی، عربی کے لفظ ہیں۔ پرشارتھی سے مزدور کی بو آتی ہے۔ شرنارتھی ہی لکھ رہی ہوں۔

مگر صرف خیمے ہی تو انسانی ضروریات کے لیے کافی نہ تھے۔ سردی قیامت کی پڑ رہی تھی۔ بیماروں سے اسپتال پٹ گیا تھا۔ ایک بار پھر راجکماری تک خبر پہنچانی پڑی۔ سوشیلا نے رپورٹ کی۔ ڈاکٹروں نے لکھا تب کہیں اسپتال کے لیے نئے بیڈ اور دوائیں آئیں۔ ایک نئے ڈاکٹر کا بھی تقرر ہوا اور دو نرسیں چار دائیاں بھی آگئیں۔ خاص طور پر لیڈی ڈاکٹر تو بہت ہی بھلی تھی، لیکن خاص دقت یہ تھی کہ مریض بھی جاڑے میں ٹھٹھر رہے تھے۔ آخر کار بڑی مشکل سے اسپتال کے لیے ساٹھ کمبل آئے جس میں صرف اٹھارہ اسپتال میں استعمال ہوتے۔ باقی معلوم نہیں ڈاکٹر یا کیمپ کمانڈر کس کے گودام میں محفوظ ہوں گے۔ ممکن ہے۔ دو ایک اور نکالے گئے ہوں مگر میری انتہائی کوشش کے باوجود ٹھٹھرتے ہوئے لاوارثوں کو ایک کمبل بھی نہ مل سکا۔

آخر کار تھک کر میں نے باپو کو ساری کتھا سنائی اور کہا۔ ہزاروں رضائیاں گورنمنٹ دوسرے پناہ گزین کیمپ میں تقسیم کر رہی ہے۔ آخر نمونیا اور بخار سے مرتے ہوئے لوگوں پر اسے کیوں رحم نہیں آتا۔ یہ فرق کیوں ہے۔ جب گورنمنٹ بھی ایسا کرے گی تو عوام میں اور اس میں فرق کیا رہا۔

باپو متاثر ہوئے۔ فوراً سکریٹری کو بلایا اور کہا کہ دو سو کمبل اس خیراتی اسٹاک میں سے جو پڑا ہوا ہے۔ مقبرہ بھجوا دیئے جائیں۔ میں نے خوش خوش آکر کیمپ والوں کو مژدہ سنا دیا کہ بہت جلد دو سو کمبل آجائیں گے۔ مگر نہیں۔ باپو سے شکایت کرنے اور یاد دہانی کرانے کا پھر موقع نہ ملا اور جو لوگ کرتا دھرتا تھے وہ اتنا بڑا دل کہاں سے لاتے۔ کہ دان دیتے وقت ہندو مسلمان کے فرق کو بھول جائیں۔ بد قسمتی سے ڈاکٹر سوشیلا نائر پنجاب یا کسی اور جگہ جا چکی تھیں ورنہ ان کو یاد دلاتی اور فوراً مل جاتے۔ اور کسی سے تب میری ملاقات نہ تھی۔

بہر حال کمبلوں کے لیے ڈاکٹر صاحب کو کہیں سے روپیہ مل گیا اور انھوں نے بہت سے کمبل بھجوا دیے۔ پھر میری لڑکی اور بہن نے لکھنؤ، بارہ بنکی اور الہ آباد کی مخیر بیگمات سے کپڑے اور روپیہ حاصل کر کے بھجوائے۔ جمعیۃ العلماء نے بہار اور یوپی کے مشرقی اضلاع سے کپڑا حاصل کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے لاوارث بچوں کے لیے اونی سوئٹر اور نئے کپڑے سلوا کر بھجوائے اور اس طرح خدا ان سب دینے والوں کا بھلا کرے یہ مشکل بھی آسان ہوتی رہی۔ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ آمد و خرچ کا حساب اخبار میں شائع کر دو۔ تاکہ دینے والے مطمئن ہو جائیں۔ مگر نہیں معلوم کیوں؟ میرا جی نہ چاہا۔ کہ خیرات کرنے والوں کی خیرات اس طرح ضائع کر دوں۔ اگر ان کو بھروسہ نہ تھا تو نہ دیتے۔

میرا اس کے سوا اس وقت اور کام ہی کیا تھا کہ جہاں سے مل جائے، لاکر کیمپ کی ضرورتیں پوری کروں۔ روزانہ کھچڑی کھاتے کھاتے مریضوں کو اُبکائیاں آنے لگتی تھیں۔ آخر اُن کو ترکاری، شوربا، دہی وغیرہ دینے کے لیے بھی تو پیسہ کی ضرورت تھی۔ اور یہ سب انھیں رقموں میں سے ہوتا تھا جو لوگ مجھے دیتے تھے۔ یا جامعہ سے آتی تھیں۔

ہاں اگر یہ کوئی مستقل اِدارہ ہوتا۔ مقررہ خرچ ہوتا تو سال بھر کا حساب مکمل کرنا اور لوگوں کو بتانا میرا فرض تھا۔ ہنگامی حالات۔ وقتی ضرورتیں۔ اتفاقی حادثہ۔ صبح سے شام تک عجیب وغریب ضرورتیں پیش آتی تھیں۔ کہاں تک وہ یاد رہتیں۔ اور کون ان کا حساب کرتا۔

نقد رقم لکھنؤ سے آئی پھر بریگیڈیر عثمان مرحوم نے پانچ سو روپے اور اُونی کپڑے بھیجے۔ یہ ساری چیزیں میں نے بچّوں کے لیے جامعہ کو دیدیں۔

کتنی بڑی ناشکری ہوگی اگر اس موقع پر اس عظیم ہستی کا ذکر نہ کیا جائے۔ جن کی سرپرستی۔ مدد اور قوت نے ہم کو یہ مواقع فراہم کئے کہ ہم دوسروں کا دکھ درد بٹا سکیں۔ رفیع احمد قدوائی مرحوم نے سبھدرا اور دوسرے کارکنوں کو کارچیپ اور مالی امداد کے ذریعہ اور مجھے خود اپنی ذاتی کار۔ فون۔ ملازمین اور جائے رہائش دے کر اس قابل رکھا کہ بے دھڑک ہر جگہ پہنچ جاتی تھی۔ ہر کسی کی مصیبت میں ان کے اقتدار کا نفع اٹھا لیتی تھی۔ ایک سکھ ڈرائیور ۔ ۔ ۔ ۔ کے بال بچہ پونچھ میں تھے اور جب قبائلیوں نے حملہ کیا تو اسکا درد ناقابل برداشت ہوگیا۔ میں نے بات رفیع صاحب تک پہنچائی اور انھوں نے چند ہی دن میں اس کے پانچ بچّے اور بیوی کو انتہائی خطرہ کی جگہ سے بذریعہ ہوائی جہاز منگوا کر اس کے سپرد کر دیا۔ بھلا یہ میرے بس میں کہاں تھا۔

4

لاوارث بچّے

میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ اکتوبر میں مختلف ہسپتالوں کا گشت کر کے بچّوں کی فہرست میں نے بنائی تھی اور جمیلہ بیگم نے اپنا مکان اُن کی رہائش کے لیے دینے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر تنہا بلا کسی حفاظت کے بچّے وہاں کیسے رہتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ضلع کے بڑے افسروں سے ہم جس وقت بھی کہتے وہ فوراً حفاظتی گارڈ مہیا کر دیتے مگر دو چار دن کے بعد جب بچّے مار دیے جاتے تو صرف اپنی بے بسی اور رنج وافسوس کا اظہار کر کے خاموش ہو رہتے۔ کسی کو مجرم قرار دینا بھی ان کی شرافت نہ گوارا کرتی، سزا دینا تو بڑی چیز ہے۔ بہر حال ذاکر صاحب نے یہ مشکل آسان کر دی اور میں نومبر میں اردن اسپتال اس ادارے سے گئی کہ جو بچے اچھے ہو چکے ہیں انھیں جامعہ لے آؤں۔

اوپر کی منزل کا وسیع کمرہ اس وقت خالی تھا اور تمام بچّے برآمدہ میں دھوپ تاپ رہے تھے۔ بعض بچّوں کے سر میں زخم تھے۔ بعض کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ ایک لڑکی کا ہاتھ بازو سے کٹ کر لٹک گیا تھا۔ ایک سات سالہ لڑکے کا سارا پیٹ پھٹا ہوا تھا۔ کھال جڑ چکی تھی اور ٹانکے کاٹے جا چکے تھے۔ ایک نو ماہ کا ننھا سا بچّہ زخمی سر اور ہاتھ لیے اپنی چھوٹی سی مسہری پر کراہ رہا تھا مگر ایک تیز ذہین لڑکی ان سب کو لیے ہوئے دھوپ میں بیٹھی خوش خوش کھیل رہی تھی۔

میں نے پوچھا تم تو اچھی ہو کیا تمھارے بھی چوٹ آئی تھی۔

ہنس کر بولی نہیں میں تو اپنی بوا کے ساتھ آئی تھی۔ کھلائی ہوتی ہے نا۔ اس کو میں بوا کہتی تھی وہ یہاں مر گئی۔ میرے ماں باپ اٹاوہ میں ہیں۔

میں نے پوچھا۔ اور ان سب بچوں کے۔

بدستور خوش ہو کر بولی ان سب کے! یہ دیکھو یہ رشید ہے نا۔ اس کے تو سب مر گئے اور وہ جو زینب ہے اس کے بھی سب لوگ مر گئے اور بابو کی اماں کا گلا کاٹ دیا گیا۔

لڑکی ہنس رہی تھی اور بے تکلف کہتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی عمر بمشکل پانچ سال کی ہوگی۔ موت اس کے نزدیک ایک کھیل تھی، کوئی دلچسپ چیز سب مر گئے، مار ڈالے گئے۔ اماں کا گلا کٹ گیا۔ کتنی معمولی سی بات، عجیب سی، ایسا تماشہ، ایسی کہانی جو اس نے کہیں پہلے نہ سنی تھی۔

میں اس سے باتیں کر رہی تھی اور ایک لڑکا مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میرا باپ ہے دو بھائی مر گئے۔ میرا ابا لکھنؤ میں ہے۔ میں تو اپنے بھائی کے ساتھ آیا تھا۔ ان دونوں کو اسٹیشن پر مار ڈالا مجھے لکھنؤ بھیجدو۔ لڑکا ہوشیار تھا اس نے اپنا پورا پتہ بتا دیا۔ کسی بچہ کی عمر آٹھ سال سے زائد نہ تھی۔ مگر یہ سب اس وقت ایک گھر ایک خاندان کے بچوں کی طرح آپس میں گھل مل کر رہ رہے تھے۔ سب نے ایک دوسرے کی رام کہانی سنائی۔

ان تمام بچوں میں صرف دو اس قابل تھے کہ میں انھیں لے جاؤں۔ نرس نے کہا کہ آج دیر ہو چکی ہے۔ آپ مہربانی کر کے کل دس بجے آجائیے اور ڈاکٹر سے اجازت لے کر انھیں لے جائیے۔

سامنے ہی دوسرا کمرہ تھا جہاں زخمی عورتیں اور لڑکیاں تھیں۔ نرس مجھے وہاں بھی لے گئی۔ سب سے پہلے میں نے ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کو دیکھا جس کی ایک ٹانگ غائب تھی۔ دوسری چار پائی پر ۱۳۔۱۴ سال کی ایک سانولے رنگ کی لڑکی کراہ رہی تھی۔ اس کے جسم پر بیشمار زخم تھے۔ دو ماہ ہو چکے تھے مگر اب تک اس کی تکلیف میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ وہ میرٹھ سے اپنے سرطانی پھوڑے کا علاج کرانے دہلی آئی تھی مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ تین ماہ بعد اب اس کے عزیز زندہ بھی ہوں گے؟ وہ ان سب کو رو رہی تھی، اور سب سے زیادہ خوفناک مریضہ ایک جوان عورت تھی جس کا ایک ہاتھ کلائی سے اور دوسرا بانہہ سے کٹا ہوا تھا۔ اس کی بارہ سالہ لڑکی پاس ہی دوسرے پلنگ پر تختیوں اور ٹپیوں سے جکڑی ہوئی ہائے ہائے کر رہی تھی اور وہ خود ان ہاتھوں سے محروم ہو چکی تھی جن سے اس کا سر سہلاتی تھپکیاں دیتی پانی پلاتی وہ بے بسی کے آنسو شاید میں زندگی بھر نہ بھول سکوں گی۔

میں اپنی نوٹ بک دیکھتی ہوں تو اس پر آج بھی کیلا، گزک اور ریوڑیاں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ تین چیزیں مجھے مہرولی والی رشیدہ یاد دلا دیتی ہیں۔ رشیدہ زیادہ سے زیادہ سولہ سال کی ہوگی۔ اس نے بتایا کہ جب ڈھار[1] چڑھی تو مرد لڑنے مرنے میں لگ گئے اور عورتوں نے قرآن سینے سے لگا کر کنویں

۱۔ دلی صوبہ میں دھاوا یا حملہ ہونے کو دھار چڑھانا بولتے ہیں۔

میں چھلانگ لگادی۔ کچھ بھاگ نکلیں، انہیں میں رشیدہ بھی تھی۔ لیکن وہ بھاگنے سے بھی نہ بچ سکی۔ تلواروں نے اس کے جسم کا ہر عضو زخمی کر دیا۔ اس نے کہا۔ ماں تم مجھے اپنی بیٹی بنا لو۔ میرا اب کوئی نہیں رہ گیا ہے۔ اور پھر بہت دنوں تک وہ مجھے ماں کہہ کر پکارتی اور کئی کئی دن میرا انتظار کرتی رہی۔ ایک دن میں نے کہا رشیدہ! کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے۔ کہنے لگی ہاں کل جب تم آنا تو میرے لیے کیلا، گزک اور ریوڑی لیتی آنا۔ لیکن میں صبح سویرے جو کیمپ جاتی تو شام تک گھر تک پلٹنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ نئی دلّی میں نہ گزک ملی نہ ریوڑی۔ نوکروں کی شہر جاتے ہوئے جان نکلتی تھی۔ افسوس میں اس کی خواہش پوری نہ کر سکی۔ یہ تین لفظ مجھے اس کی یاد دلا کر شرمندہ کرتے ہیں مگر یہ کثیف سی نوٹ بک میں نے اسی لیے سنبھال کر رکھ لی ہے کہ اپنی اس غلطی اور تساہل کو یاد کرتی رہوں۔ اس دن میں رشیدہ کو دیکھ ہی رہی تھی کہ ایک عورت نے مجھے پکارا۔ اس نے بتایا میرا نام بھوری ہے میرے بھیّا کو بلا دو۔ وہ اس انداز سے کہہ رہی تھی جیسے دلّی میں اس کے بھیّا کو ہر کوئی جانتا ہے۔ ان سب کو دلاسا دے کر اور پھر آنے کا وعدہ کر کے میں لیڈی ہارڈنگ اسپتال گئی۔

فرید آباد ختم ہو چکا تھا اور ان دنوں وہاں کے مشہور دیہاتی شاعر اور پرانے کانگریسی سید مطلبی دہلی میں مقیم تھے۔ بے شمار مریض انھوں نے شہر کے مختلف اسپتالوں میں اور زیادہ تر لیڈی ہارڈنگ اسپتال میں داخل کرائے تھے اور ان سے زیادہ تعداد لاپتہ تھی۔ مجھ سے انھوں نے کہا کہ ذرا ہمارے فرید آباد کی عورتوں کا پتہ لگائیے۔ اروِن اسپتال کے سوا اور سب جگہ خبر نہیں مریضوں کا کیا حشر کیا جاتا ہے۔ لیڈی ہارڈنگ اسپتال میں ہم نے جو مریض داخل کرائے ان کا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا۔

پرانے قلعہ میں مس خواجہ کے ساتھ جب میں نے جا کر دیکھا تھا تو فرید آباد کے بہت سے بچّے اور عورتیں وہاں تھیں۔ ان کے نام بھی میرے پاس لکھے ہوئے تھے۔ میں نے سید مطلبی کو سنائے۔

ع ۱ - سید مطلبی فرید آبادی بہت مستعد سرفروش سوشلسٹ تھے۔ ہریانوی زبان کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ اپنے خطابت اور کویتا سے عوام میں آگ لگا دیا کرتے تھے۔

ع ۲ - ابونعیم فرید آبادی بچوں کے مقبول کہانی نویس تھے۔

ع ۳ - فرید آباد مسلمانوں سے خالی ہو چکا تھا۔ سید مطلبی دہلی میں کہیں مقیم تھے میلوں دوڑ دھوپ کر اپنے وطن کے بکھرے دانے سمیٹ رہے تھے۔ کئی ماہ بعد جب مایوس ہو گئے تو شاید پاکستان با دلِ ناخواستہ سدھار گئے کیوں کہ اب یہاں ان کا کیا رہا تھا۔

تو کہنے لگے کہ ان میں ایک عورت تو وہی ہے جس کی میں بہت دنوں سے تلاش کر رہا ہوں۔ مہربانی سے آپ خود جا کر لے آیئے۔ مگر آج جو میں لینے گئی تو عورت مع اپنے تین بچوں کے جا چکی تھی۔ اسپتال والوں نے بتایا اس کے عزیز لے گئے ہیں۔ کون لے گیا۔ کس دن لے گیا۔ یہ کچھ نہ معلوم ہو سکا نہ وہ کیمپ ہی میں پہنچی۔

اب بھی وہاں کئی مریض تھے اور بہت سے بچے۔ ایک پیاری چھوٹی سی چھ سالہ بچی تھی جس کی کھوپڑی پر تلوار کا زخم تھا جو کسی طرح اچھا ہونے میں نہ آتا تھا۔ وہ بے چاری اپنے باپ کا نام بھی نہ بتا سکی ہر چند پوچھا یہی کہتی رہی "پہاڑ گنج میں سب ان کو منشی جی کہتے تھے!" چار بچے اور ان کی ماں برآمدہ میں لیٹے ہوئے اس دن کا انتظار کر رہے تھے جب ان کے عزیز آ کر ان کو لے جائیں گے کہاں؟ یہ انھیں خود نہ معلوم تھا۔ مہرولی کے کسی دیہات میں ان کا گھر تھا۔ چھوٹے زمیندار کا خوشحال گھر اور بہت سارے کھیت۔ مگر اب ان کے زخم اچھے ہونے والے تھے۔ اور پھر امیدوں نے ان کے چہرہ پر تبسم پیدا کر دیا تھا۔

دوسری طرف برآمدہ میں مسہری کے اندر چھپی ہوئی ایک نوجوان عورت پڑی تھی۔ جس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر تختیوں اور پٹیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ سینے پر بھی کاری زخم تھے اور وہ آہستہ آہستہ صرف بول سکتی تھی۔ بے انتہا خون نکل جانے کے باعث اس کی بینائی بری طرح کمزور ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے کئی بھائیوں، بھاوجوں، نوجوان بھتیجوں اور کمسن بھتیجیوں کی فہرست مجھے لکھائی اور کہا کہ ان سب سے کہنا پہاڑ گنج کی بلقیس لیڈی ہارڈنگ اسپتال میں ہے۔ پاکستان جاتے ہوئے اس کو بھی لیتے جائیں۔ فیض آباد کی ادھیڑ عورت اپنا زخمی ہاتھ جوڑے کھڑی تھی کہ کسی طرح مجھے فیض آباد پہنچوا دو وہاں میرا بھائی ہے۔ شوہر اور بچے تو کھو چکی بھائی کے پاس چلی جاؤں وہیں زندگی کٹ جائے گی۔

مریضوں کو دیکھتی ہوئی جب میں پچھلے برآمدہ میں پہنچی تو ایک ہندو بہن نے چپکے سے مجھے بلایا اور ایک خوبصورت لڑکی کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔ انھوں نے بتایا یہ لڑکی فریدہ طلعت مسلمان ہے۔ کسی اچھے گھرانے کی ہے اس کے باپ وغیرہ پتا نہیں کہاں ہیں۔ زخمی نہیں ہے۔ بیمار تھی فساد سے پہلے داخل ہوئی تھی۔ اسپتال والوں کے پاس ان کا پتہ بھی ہے بیچاری بہت روتی ہے مگر شاید انھوں نے اب تک اس کے والدین کو خبر نہیں کی ہے۔ آپ اس کی خبر لیجیے۔ کمرے کے ایک سرے پر ننھے بچہ کو گود میں لیے ایک جوان عورت زار و قطار رو رہی تھی۔ پاس ہی پلنگ پر اس کی تین سالہ بچی چیخ رہی تھی۔ یہ ننھی سی جان شیر دل سورماؤں کے بربریت کا اس بری طرح شکار ہوئی

تھی کہ خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ نیزہ اس کے نازک مقام سے گذر کر پیٹ تک پہنچ گیا اور اتنے گہرے زخم میں جب گزوں لانبی دوا میں ڈوبی ہوئی بتی رکھی جاتی تھی تو بچی کی تڑپ اور ماں کے آنسو دیکھنا کسی ذی حس زندہ انسان کے بس کی بات نہ تھی۔ عورت کہہ رہی تھی انھوں نے سب کو مار ڈالا۔ میری بچی کو نیزے پر اٹھا لیا مگر مجھے چھوڑ گئے۔ یہ سب دیکھنے کے لیے۔ ہائے اب کیا کروں گی؟ کہاں جاؤں گی؟ وہ مجسم دردناک سوال بن کر مجھ سے پوچھتی اور میں لرز اٹھتی۔

یہ سارے دلخراش منظر دیکھ کر جب میں واپسی کے لیے مڑی تو ایک بنگالی بہن مجھے اپنے کمرہ میں لے گئی وہ ماں تھی اور ماؤں کی بیقراریاں دیکھ کر اس کا دل تڑپ رہا تھا۔ بڑے اندوہ گین انداز میں اس نے اسپتال کے حالات مجھے بتائے اور کہا کہ ایک تین برس کی لڑکی اور بھی ہے وہ اب تندرست ہے۔ ہلکا سا زخم تھا جو چند دن میں اچھا ہو گیا۔ اس کا کوئی نہیں ہے۔ یونہی سارے اسپتال میں پھرتی رہتی ہے۔ کسی مسلمان کی بچی ہے۔ اپنے ساتھ لے جایئے۔

بچی لائی گئی۔ میں نے پوچھا تیرا نام کیا ہے۔ سیتا اور حسینہ۔ باپ کا نام پوچھا۔ ایک ہندو ایک مسلمان۔ اسی طرح ماں کا نام بھی۔ بنگالی بہن نے کہا وہ جو بھی کہے، ہے مسلمان کیونکہ یہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بتاتی ہے۔ میرا باپ کہتا تھا۔ اللہ بھلا کرے۔ یقیناً کسی مسلمان فقیر کی لڑکی ہے۔ نرسیں کہہ رہی تھیں یہ ہندو ہے۔ میں ذرا مشکل میں پڑ گئی۔ بس ایک ہی حل سمجھ میں آیا کہ اس کو گاندھی جی کے پاس لے جاؤں۔ لکھا پڑھی کر کے میں بچی کو لے کر چلی آئی اور سیدھی باپو کے ہاں گئی۔ فوراً ملاقات کی درخواست کی اور خوش قسمتی سے انھوں نے فوراً بلا لیا۔ باپو بیٹھے چرخہ کات رہے تھے۔ بدستور مسکراتے ہوئے پوچھا یہ لڑکی کہاں سے لائی۔ میں نے کہا۔ باپو یہ لڑکی تو ہندو مسلمانوں میں جھگڑا کرا دے گی۔ اپنے اور اپنے والدین کے دو دو نام بتاتی ہے۔ کتنا ہی پوچھو بھید نہیں کھلتا۔ اب آپ ہی بتایئے میں اس کو کیا کروں ہنسے اور بچی سے مخاطب ہو کر نام پوچھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے بتایا حسینہ اور سیتا۔ کہنے لگے۔ اچھا ابھی اس کو اپنے پاس رکھو۔ پھر کستور با ٹرسٹ کا جو اسکول مہرولی میں ہے وہاں چھوڑ دینا۔ لڑکی پھر کئی دن میرے ساتھ رہی اور ڈیڑھ ہفتہ بعد مہرولی بھیجدی گئی۔ شہر کے سارے اسپتال میں نے دیکھ ڈالے۔ بچوں کی فہرست تھی مگر بچے نہ تھے۔ وہ کیا ہوئے کہاں گئے یہ بھید نہ کھلا۔ شاید اچھے ہو کر جدھر سینگ سمایا ادھر چل کھڑے ہوئے یا شن والیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ جو بھی ہوا ہو مگر مجھے رہ رہ کر اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ آتے کے ساتھ ہی میرا دھیان اس طرف کیوں نہ گیا۔ کیوں میں نے فکر نہ کی اب کیا ہو سکتا تھا۔ وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ دو ایک کالٹرہ اسپتال میں ملے۔ جو کیمپ ہی میں والدین کو پہنچ گئے۔ میں صحت پانے والے

بچوں کو لا لاکر جامعہ (اوکھلے) چھوڑتی گئی وہ ایک ایک کر کے اچھے ہو رہے تھے۔ ان کے کٹے ہوئے پیٹ۔ پھٹے ہوئے سر۔ لٹکی ہوئی ٹانگیں جڑ گئیں اور لنگڑاتے ہوئے کمزور بچے جامعہ پہنچاتی گئی۔ وہاں جامعہ کا ایک پرانا ملازم خدابخش ان کی ٹانگوں پر مالش کرتا ماسٹر انھیں نہلاتے اور جیسے جیسے اعزہ ملتے جاتے ان کے حوالے کر دیتے۔ بچے بھی سب دہلی کے نہیں تھے۔ کوئی کلکتہ کا کوئی لکھنؤ کا ایک لڑکی میرٹھ کی دوسری آگرہ کی۔ مگر خدا وہ تو قادر مطلق ہے۔ اس نے سب کو منتشر کیا۔ پھر اکٹھا کیا اور پھر منتشر کر دیا۔

لیکن ارون ہسپتال کے بچے جب وہاں سے چلنے تو ماں سے زیادہ مہربان نرسوں سے لپٹ کر روتے۔ چار ماہ بعد اسپتال کے اسٹاف سے جدا ہوتے وقت انھیں ایسا لگتا جیسے گھر والوں سے بچھڑ رہے ہوں یہ وسیع کمرہ ان کا گھر تھا چھوٹی چھوٹی مسہریاں زمین پر بچھے ہوئے گدے اور برآمدہ میں پڑے ہوئے چھوٹے بینچ اور چوکیاں ان سب سے ان کو گہری محبت پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ جانور تھے جنھوں نے ان کو زخمی کیا کچھ انسان تھے جنھوں نے ان کی جان بچائی اور آرام پہنچایا۔ دنیا ابھی انسانوں سے خالی نہیں ہوئی تھی۔

میرٹھ والی لڑکی کو اس کے بتائے ہوئے پتہ پر میں سر محمد یامین خاں کی مدد سے گھر پہنچانے میں کامیاب ہو گئی۔ خاں صاحب اپنے ساتھ لیجا کر اسے اس کے ماموں یا چچا کو سونپ آئے۔

اور وہ کٹے ہوئے پیٹ والا بچہ مسٹر فیروز گاندھی کی عنایت سے اپنی سادہ کار برادری میں لکھنؤ پہنچ گیا۔ اس نے فیروز صاحب کو خوب ستایا۔ راستہ بھر حیران کیا۔ پہلے تو یہی سوال کیا کہ تم ہندو ہو یا مسلمان؟ پھر کہنے لگا مجھ کو ہندو بہت خراب لگتے ہیں۔ تم مجھے کہاں لے جاکر چھوڑو گے پیاس لگی تو کسی اسٹیشن پر اترا اور فوراً پلٹ آیا۔ فیروز صاحب کو حکم دیا کہ جاؤ تم میرے لیے پانی لاؤ۔ یہاں سکھ بہت ہیں مجھے مار دیں گے۔ میں تو نہیں اترنے کا۔ تمام راستہ وہ ہندو سکھ کی بات کرتا رہا۔ مگر فیروز صاحب اسے بحفاظت پہنچا آئے اور اس کا باپ جو اپنے تین بیٹوں کو ڈھونڈھنے کے لیے جان پر کھیل کر دلی روانہ ہو چکا تھا۔ پتہ نہیں اسے دیکھ کر کتنا خوش ہوا ہوگا۔ ناامیدی میں امید۔ تین میں سے بچ کر ایک تو آ ہی گیا۔

وہ تیز طرار لڑکی زرینہ سب سے پہلے میرے ساتھ آئی۔ باتیں کرتی ہوئی خوش خوش نیچے اتر رہی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر کے سکھ راستہ میں مل گئے۔ لڑکی میرا ہاتھ چھوڑ جھٹ ان سے لپٹ گئی۔ سردار جی نے اسے پیار کیا اور پوچھا کہاں جا رہی ہو۔ میں نے انھیں بتایا کہ اب یہ اچھی ہو گئی ہے۔

جامعہ لے جا رہی ہوں۔ وہاں پڑھے گی اور جب اعزّہ مل گئے، چلی جائے گی بہت خوش ہوتے۔ بچی کو پھر لپٹایا اور مٹھائی دی اور اوپر چلے گئے۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں مگر لڑکی کو خود نہیں معلوم تھا۔ وہ تو صرف "بابا" تھا۔ سب بچوں کا بابا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ رحمدل انسان یہاں آیا کرتا ہے اور سارے بچے اس سے لپٹ جاتے ہیں۔ سب سے پیار کر کے اور مٹھائی دے کر ہنس بول کر ڈیس چلا جاتا ہے۔ انسانیت کا مخلص نمائندہ اس درد اور دکھ کی دنیا میں بلا تفریق مذہب و ملت محبت اور پیار بانٹنے آتا تھا۔ اے کاش ہم سب اتنے ہی فراخدل ہوتے۔ افسوس ہے اس کا نام بھی معلوم نہ ہو سکا۔

ایک روز کیمپ کا گشت کرتے ہوئے مجھے صد لقین وہ لڑکی ملی جس کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی تھی۔ اس کی نند اور اس کا شوہر اسے گود میں اٹھا کر ادھر سے ادھر لے جاتے تھے۔ نئی بیاہی ہوئی دلہن "برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن" مگر جوانی کی راتیں خواب بن گئی تھیں اور مرادوں کے دن ماضی کی کہانی۔ اگرچہ اس وقت وہ اپنے عزیزوں میں خوش تھی، غریب لڑکی معلوم نہیں کب تک خوش رہ سکے گی؟ کیا یہ محبت اور ہمدردی زیادہ دن باقی رہے گی؟ اس کا نوجوان شوہر کب تک اس معذور و اپاہج عورت کو برداشت کرے گا؟ کیا اس کی قسمت میں سڑکوں پر گھسٹ گھسٹ کر بھیک مانگنا ہے؟ ایسے بہت سے سوال دماغ میں آئے مگر مستقبل پر کون حکم لگا سکتا ہے۔ مجھے تو حال دیکھنا تھا۔ کچھ ہی دن بیتیں گے کہ اس ماضی پر بھی پردہ پڑ جائے گا۔ اور پھر وہ پیارا بچہ جسے بابو کہتے تھے اچھا ہو کر میرے ساتھ جامعہ آیا۔ راستے بھر وہ اپنے نو ماہ کے بھائی کلو کو یاد کرتا رہا جسے احتیاطاً ہم نے کچھ دن کے لیے ابھی اسپتال میں چھوڑ دیا تھا۔ دونوں کی شکل بہت مختلف تھی۔ بابو گندمی رنگ کا بہت تندرست ذہین اور باتونی بچہ تھا اور کلو کالا کلوٹا، سوکھا بدصورت۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک ماں باپ کے بچے ہیں۔ ایک گھر کے ہیں یا غیر۔ ملٹری والوں نے دو بچے زخمی اٹھا کر ٹرک میں ڈالے اور اسپتال میں اتار دیے بابو نے اس کو بھیا کہنا شروع کیا اور لوگ بھائی کہنے لگے۔ میں جب جامعہ جاتی تو لپٹ جاتا۔ مٹھائی کے لیے لڑتا۔ سیب لے کر جاؤں تو روٹھ جاتا کہ میں نہیں بولوں گا مٹھائی کیوں نہیں لائی ہے۔ ایک روز جیپ پر گئی تو اسے بہت غصہ آگیا کہ لال موٹر پر کیوں نہیں آئی یہ بری ہے۔ میں اس پر نہیں جاؤں گا۔ میں نے کہا، اور تمھیں کون لے جا رہا ہے۔ میں تم کو لینے تھوڑی آئی ہوں۔ بس غصہ میں نوچنے لگا کہ بازار چل مٹھائی لوں گا۔

اکرام صاحب نے کہا۔ صاحب بابو بہت غصہ ور ہے۔ یہ کہتا ہے میں تمھیں مار دوں گا۔

تمھارا خون کروں گا۔ اکرام[1] تم مرجاتے تو میری زندگی ہو جاتی۔ تم مرتے کیوں نہیں ہو۔ میں بھی مرجاؤں گا وغیرہ وغیرہ خون اور مرنے کی باتیں بہت کرتا ہے۔

ایک روز اکرام صاحب نے مجھے فون کیا کہ بچوں کے لیے کچھ چیزیں خریدنا ہیں اگر آپ آسکئے تو چلی آیئے۔ ورنہ جامع مسجد تک جانے کے لیے گاڑی بھیج دیجیے۔ میں نے سوچا اچھا ہے آج بابو کو بھی تفریح کرادوں گی۔ خود ہی چلی گئی۔ بابو خوش خوش سوار ہوا مگر تھوڑی دیر بعد جیسے اسکو کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی جیسے کوئی نیند میں بول رہا ہو، خواب میں باتیں کر رہا ہو۔ گردن پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہنا شروع کیا۔ میرے ابا کے یہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس جگہ گردن سے اور وہ کہتے تھے۔ ہائے میری عورت کو مار ڈالا۔ اور بھیا کو بھی مار ڈالا۔ اور پھر مجھے انھوں نے اٹھایا۔ یوں زور سے اوپر پھینک دیا۔ ایسے۔ میں ٹین پر بیٹھا روتا رہا۔ پھر فوجی آیا اور موٹر میں بیٹھ گیا۔ پھر گھر میں رہنے لگا۔

میں نے پوچھا کس گھر میں۔ بدستور دوسری طرف نیم غنودگی کے عالم میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اسی گھر میں جہاں مس صاحب ہیں جہاں کلو ہے۔ ایک دم وہ چونک پڑا اس نے موٹر پر ہاتھ پھیرا اور پھر بولنا شروع کر دیا۔

اپنے ابا کے ساتھ میں بھی موٹر پر جاتا تھا جامع مسجد۔ مٹھائی اور غبارہ اور چیزیں لیتا تھا۔ ایکدم اسے غصہ آگیا۔ اس نے کہا میں مار ڈالوں گا۔ اکرام کو۔ چار برس کا توتلا بچہ "اترام" (اکرام) سے اتنا خفا کیوں تھا۔ مرنے کی آرزو اسے کس لیے تھی؟ وہ کیوں خون خون چلا رہا تھا۔ میں لرز گئی۔ رشید اور بابو نے مجھے وہ انجام دکھا دیا جس کی طرف ابھی میرا دماغ متوجہ بھی نہ ہوا تھا۔[2]

ہمارے آبا و اجداد نہ خونی تھے، نہ ڈاکو، نہ چور۔ انھوں نے کب ہمارے اندر ان گناہوں کی تخم ریزی کی تھی۔ اور پھر بھی ہم سب اتنے پاپی نکلے۔ لیکن یہ بچے۔ جو چار سال کی عمر میں خون خون پکارتے ہیں جو موت کا مذاق اڑاتے اور اس کے آنے کی دعائیں مانگتے ہیں یہ بچے جو اس ننھی سی عمر میں پوچھتے ہیں۔ تم ہندو ہو یا مسلمان، جو کہتے ہیں سکھ ملے تو اس کی

---

[1] ۔ اکرام صاحب ان بچوں کی اماں، ماسٹر اور نگراں تھے۔

[2] ۔ یہ بچہ پہلے جامعہ میں پھر "بچوں کا گھر" دریا گنج میں رکھا گیا۔ مگر اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ آخر میں بالکل پاگل ہو گیا۔

بوٹی بوٹی کاٹیں اور ڈرتے ہیں کہ ہندو ہمیں ماریں گے۔ ہماری گردن کاٹ دیں گے۔
آخر یہ کیسے ہوں گے؟ یہ خونی دماغ یہ پتھر دل یہ محبت سے ناآشنا بچے یہ کہاں جائیں گے۔ یہ ہندوستان کو آخر ذلت کے کس گڑھے میں گرائیں گے۔ سوچتے سوچتے کانپ اٹھی۔ اور مجھے اپنے سے کہیں زیادہ عقلمند جامعہ کے دونوں لڑکے شمس و قیصر نظر آئے۔ انھوں نے خطرہ کی بو سونگھ لی تھی۔ ان کی آنکھوں نے بھیانک مستقبل کی جھلک دیکھ لی تھی اور وہ تعمیری کام کے ارادہ سے کیمپ چھوڑکر شہر کا رخ کر چکے تھے۔ لیکن میں ماں ہو کر نہ سمجھ سکی یہ نسل تو خیر ڈوبی ہی ہے۔ حال تو بدتر ہے ہی مستقبل بھی تباہ ہو رہا ہے۔ آئندہ نسل اس سے بھی کئی گنا بڑھ چڑھ کر اندھی ہوگی اور اس سے بھی گہرے کنویں میں ڈوبے گی۔ اگر ابھی سے سنبھلنے کی کوشش نہ کی گئی۔

جب انسان نہیں تو ہندومت اور اسلام کیسا۔ آدمی ہی کے لیے تو دھرم، مذہب، اصول اور قانون سب کچھ ہے۔ وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ ہندوستان بھی گیا اور ہندو مسلمان بھی دونوں ختم ہو گئے۔

ان تمام عورتوں کے سامنے جو ضرورت مند تھیں لاوارث تھیں میں نے یتیم بچوں کی خبر گیری کے لیے ملازمت پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب معقول مشاہرہ پر کسی ہوشیار عورت کو رکھنا چاہتے تھے مگر جانے مسلمان عورتوں کو کیا ہو گیا تھا کہ خیرات لینے میں سب سے آگے اور کام کے نام سے کوسوں دور بھاگتیں۔ کوئی کہتی ارے ہم میں اتنی جان کہاں باقی ہے کہ کام کر سکیں۔ کوئی کہتی۔ ہم اپنے تین بچوں کو رو رہے ہیں کلیجہ تو چھلنی پڑا ہے۔ اللہ میاں نہ جانے کہاں سو رہے ہیں موت بھی نہیں بھیجتے۔ یہاں جینے کی حسرت کس کو ہے جو نوکری کریں۔ ایک کہتی ہمیں تو بس پاکستان پہنچا دو اور دوسری منہ بنا کر جواب دیتی یہ گوہ موت ہم سے نہ ہوگا۔

غرض ہر طرف سے مایوس ہو کر میں نے اکرام صاحب سے کہا کہ اب ماں کے فرائض بھی آپ ہی کو انجام دینا پڑیں گے۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ گھر والی بن کر کافی خوش تھے۔ صاف ستھرا مکان۔ سلیقہ سے برابر برابر بستر لگے۔ ہر چیز احتیاط سے رکھی ہوئی۔ بچے برآمدہ میں کھیلتے رہتے۔ کبھی کبھی فون سے مجھے اطلاع دیتے کہ بچے جوتے پہننے بازار جا رہے ہیں یا آپ کو بلا رہے ہیں۔ وہ اطمینان سے انتظام خانہ داری میں مصروف تھے۔

ایک روز جو میں لیڈی ہارڈنگ اسپتال گئی تو سکینہ اچھی ہو چکی تھی۔ میرے ساتھ کیمپ آئی تو یہاں اس کا کوئی رشتہ دار نہ ملا۔ پتہ چلا سب پاکستان چلے گئے۔ رشتہ داروں میں

باپ بھائی بہن کے علاوہ چار لڑکیاں اور اس کا شوہر بھی تھا۔ تین دن وہ تلاش کرتی اور روتی رہی۔ تب میں نے کہا کہ سکینہ چلو تم کو اوکھلے چھوڑ آؤں۔ بچوں میں تمہارا جی بھی بہل جائے گا۔ اور ان بے ماں باپ کے بچوں کی خدمت کرو گی تو اللہ تعالیٰ بھی تم پر فضل کرے گا۔ شاید تمھارے بچھڑے بھی جیتے جاگتے مل جائیں۔ وہ نیک عورت فوراً تیار ہو گئی۔

چار ماہ تک وہ ان بچوں کی ماں کی طرح خبر گیری کرتی رہی اس عرصہ میں ریڈیو اور خطوط کے ذریعہ سکینہ کے عزیزوں کا پتہ بھی لگ گیا۔ اس کی چاروں لڑکیاں نانا کے ساتھ کراچی میں تھیں اور شوہر آگرہ میں۔ شوہر جلد ہی آگیا۔ مگر اب سکینہ سے یہ بچے نہ چھوڑے جاتے تھے۔ ابھی آمد و رفت بھی آسان نہ تھی اس لیے سکینہ نے جانے سے انکار کر دیا۔ دوبارہ اور سہ بارہ جب شوہر آیا تو اسے لے گیا دونوں میاں بیوی اپنی بچیوں کو لینے کراچی گئے۔ بچے اور وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے وقت متاثر تھے۔ مگر مجبوری تھی وہ کیسے رکتی خدا کرے جہاں ہو خوش و خرم ہو۔ بڑے موقع پر اس نے ہماری مدد کی۔ اور اب تنہا اکرام صاحب ان کے والدین ہیں۔

ادھر دھڑا دھڑ بچوں کے اعزّہ ملے چلے جا رہے تھے۔ یہ زینہ خوش خوش اپنے ماموں کے ساتھ سدھاری۔

سب سے آخر میں جو بچہ اسپتال سے آیا اس کی پوری ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا اور اس لکڑی جیسی ٹانگ کا سیدھا کرنا صرف خدا بخش کا کام تھا۔ جب وہ چلنے پھرنے لگا تو جوتے پہننے جامع مسجد گیا۔ جوتوں کی دکان پر سارے بچے دیکھ بھال رہے تھے اور عین اسی وقت اس کا باپ آگیا۔ سارا خاندان گھر بار سب چیز ختم ہو چکی ہے۔ مگر زندگی کا ننھا سا سہارا یہ بچہ باقی تھا۔ بیٹے کو دیکھ کر باپ کی جو حالت ہوئی وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔

ایک روز قصاب پورہ سے گزرتے ہوئے مجھے کسی نے آواز دی دیکھتی ہوں تو وہی لڑکا پکار رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اپنے گھر میں تھا۔ سارے بچے جا چکے تھے مگر ایک لڑکی ابھی باقی تھی۔ اس کا کٹا ہوا بازو ابھی تک ٹھیک نہ ہوا تھا۔ وہ تنہائی سے پریشان تھی۔ اور مجھ سے اکثر پوچھتی کب لے چلو گی۔ ایک دن اس نے میلے کثیف سے تاش کی ایک گڈی میرے ہاتھ میں دی اور عجیب حسرت مایوسی اور شوق کے لہجہ میں بولی کہ یہ میری طرف سے رشید کو دیدینا۔

دو معصوم دل ایک دوسرے کے لیے تڑپ رہے تھے اور ننھی لڑکی اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لیے بیتاب تھی۔ یہ تاش نہیں معلوم اس نے کہاں پائے تھے۔ رشید کے ساتھ وہ کھیلا کرتی تھی۔ جب وہ نہیں تو انھیں لے کر وہ کیا کرے۔ اپنا پرخلوص تحفہ دلچسپی کا واحد سامان اسی کا

جمع پونجی وہ رشید کو بھیج رہی تھی۔ فطرتِ معصوم کی اس ادا نے میرا دل موہ لیا۔ تحفہ پہنچ گیا۔

جو بچے بڑے تھے وہ دریا گنج کے بچوں[1] کے گھر میں چھوڑ دیے گئے۔ چھوٹے خوردسال بچے جامعہ میں رہے۔

---

[1] ۔ بچوں کا گھر شاید کوئی پرانا یتیم خانہ سُنّی وقف بورڈ کی طرف سے تھا۔ کچھ سالوں سے ڈاکٹر ذاکر حسین اس بورڈ کے ممبر ہو گئے تھے اور یتیم خانہ کو صحیح معنوں میں "بچوں کا گھر" بنانا ان کی جدت تھی۔

5

دو اہم مہینے

مصیبت جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو حس مٹ جاتی ہے۔ اس وقت کیمپ کے لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ اب بیتابی کے ساتھ خوشی ڈھونڈھ رہے تھے۔ ایک بار پھر شہر سے بلوہ کی خبر آئی اور دوسرے دن صبح جمعیۃ العلماء کے ایک کارکن جو کانگرس کا بلّہ بھی لگائے رہتے تھے دو عورتوں کو ساتھ لے کر کیمپ آئے۔ عورتوں کو باہر چھوڑ کر انھوں نے میری طرف رخ کیا اور حسب معمول بڑے جوش و خروش سے کہنے لگے، آپا کل تمام دن کس کمبخت کو پانی تک پینے کی فرصت ملی ہو۔ سارے دن چاندنی چوک[1] میں دوڑتے گزری۔ میں نے کہا خیر شکر ہے چند ہی گھنٹوں کا تھا۔ کہنے لگے۔ اور غضب دیکھئے، عین اسی ہنگامہ میں دو برقع پوش عورتیں مل گئیں۔ میں نے ان کو پکڑا اور کہا۔ بہن تم یہاں کہاں۔ فوراً میرے ساتھ چلو ورنہ زندہ رہنا مشکل ہے۔ انھوں نے بتایا ہم دونوں کلکتہ سے آئی ہیں ہمیں واپس اسٹیشن پہنچا دو۔ پھر کلکتہ چلے جائیں۔ بھلا خیال تو کیجیے ان کی حماقت کا۔ میں نے کہا۔ پاگل ہوئی ہو۔ چلو اس وقت میرے گھر چلو۔ کل کیمپ پہنچا دوں گا۔ سو دیکھیے وہ دونوں باہر بیٹھی ہیں۔ ابھی ان کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔

میں اس وقت شاید کسی کام میں مصروف تھی۔ ان کے آنے کا انتظار کرتی رہی، خود خیمہ سے باہر نہ نکلی، تھوڑی دیر بعد ایک پناہ گزین نوجوان آیا۔ نوجوان کیمپ کا والنٹیر رہتا اور اندرونی انتظام کے لیے جو رضاکارانہ پولیس بنائی گئی تھی اس کا ممبر تھا۔ اس کا چچا کیمپ کمانڈر کا چپراسی تھا۔ اور دونوں چچا بھتیجے ذمہ دار اور کام کے آدمی سمجھے جاتے تھے نظم و ترتیب رکھنے میں ان لوگوں سے بڑی مدد ملتی تھی۔ اس نے کہا۔ کہ آپ سے ایک عرض کرنے آیا ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہے میں ابھی کنوارا ہوں۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ تو پھر۔

---

[1] - چاندنی چوک میں فساد ہوا تھا۔

وہ بدستور کہتا رہا۔ اور میرا چچا رنڈوا ہے۔ اس کی بیوی مر چکی ہے۔

میں نے پوچھا آخر اس تمہید سے تمھارا مقصد کیا ہے۔ شرما کر بولا۔ کہ وہ جو دو عورتیں آئی ہیں ان کو آپ کہاں رکھیں گی۔

میں نے کہا۔ ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔ کیا یہاں کوئی خیمہ خالی ہے۔

اس نے خوش ہو کر جواب دیا۔ میرا خود کا خیمہ خالی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو وہیں رکھ دیجیے۔ ان میں جو بڑی ہے۔ اس کے ہاں تو شادی ہونے والی ہے۔ اسپتال میں اس کو رکھ کر ہم لوگ دیکھ بھال کر لیں گے۔ جب بال بچہ ہو جائے گا۔ تو میرے چچا اس کے ساتھ نکاح کر لیں گے۔

میں نے جملہ پورا کر دیا۔ اور جو دوسری چھوٹی ہے۔ اس سے تم کر لو گے۔

سکرایا۔ جی ہاں۔ جی۔ یہی تو بات ہے۔ میرے چچا نے کہا کہ میں آپ کے کان میں ابھی سے یہ بات ڈال دوں تو اچھا ہے۔

میں نے کہا صاحبزادے۔ ابھی تو میں نے ان دونوں کو دیکھا بھی نہیں ہے۔ میرے پاس تک آنے تو دو۔ دیکھوں کون ہیں۔ کہاں سے آئی ہیں۔ یہ باتیں تو بعد کو ہوں گی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں آگئیں۔ حالات پوچھے تو پتہ چلا کہ دونوں شادی شدہ ہیں۔ ایک کا شوہر مر گیا۔ دوسری کا کھو گیا۔ اور اس جلتی آگ میں وہ کلکتہ سے شوہروں کو ڈھونڈنے آئی تھیں۔ نہ وہ بنگالی تھیں۔ نہ بیوہ۔ نہ کنواری۔ عجیب معمہ سی مجھے لگیں۔ صاف ستھرا ریشمی لباس بات چیت شائستہ۔ میرے اس کہنے پر کہ یہاں رہو۔ اگر تم شادی کرنا چاہو گی تو ان دونوں سے کر لینا۔ انھوں نے رونا شروع کر دیا۔ یہی اصرار کہ ہمیں اسٹیشن جانے دو۔ ہم کو کوئی نہ مارے گا۔ ہم اسی طرح آئے تھے۔ اسی طرح واپس جائیں گے۔

ورکرز کا خیمہ خالی کروا کر ان دونوں کے رہنے کے لیے دیا گیا۔ اور ان کا بکس پوٹلی سب وہاں پہنچوا کر میں دوسرے کاموں میں لگ گئی۔ کئی گھنٹہ بعد مجھے یاد آیا کہ ارے ان کے کھانے پینے کا بند و بست کرنا تو بھول ہی گئی۔ جلدی جلدی وہاں پہنچی تو دوسرا ہی تماشا نظر آیا۔ چچا پاس کھڑے تھے۔ بھتیجہ دوزانوں بیٹھا تھا۔ عورتیں رو رہی تھیں۔ اور ان کے پاس ہی چٹائی پر ایک نئی کتاب ایک سیب اور شاید پھول یا اور کوئی چیز پڑی تھی۔ اب سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ مگر اس وقت ناگوار سا ہوا۔ میں نے ان دونوں سے کہا تم باہر جاؤ۔ یہاں کیا کر رہے ہو۔ مجھے دیکھتے ہی چچا پہلے ہی رفو چکر ہو گئے تھے۔ اتنا سن کر بھتیجہ صاحب بھی چلے گئے۔ ہر چند پوچھا مگر اصلیت نہ کھلی۔ میں تو حسب معمول سہ پہر کو گھر واپس آگئی۔

دوسرے دن گئی تو معلوم ہوا۔ چچا بھتیجوں نے خاطر داری اور خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ مگر ان کا منہ کسی طرح سیدھا نہ ہوا۔ ایک بار بکس لے کر پھاٹک تک گئی تھیں کہ واپس لائی گئیں۔ دوبارہ پھر رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔ کچھ نہیں پتہ کہاں گئیں اور کیا ہوا۔

تھوڑے دن بعد اتحاد کانفرنس لکھنؤ سے پلٹتے ہوئے چچا بھتیجے کو وہ دونوں قتالۂ عالم پھر ملیں۔ کافی دیر ساتھ رہا۔ اچھی اچھی باتیں بھی ہوئیں۔ مگر رنڈوے بدستور رنڈوے رہے اور کنوار بدستور کنوارے رہے۔ بیچاری طوائفیں! برقع اوڑھ کر شریف زادی بننے کی کوشش کی تو وہ بھی نہ بن پڑی۔ بھلا چوکڑیاں بھرنے والی ہرنیاں پنجرے میں کیسے بند ہو سکتی ہیں۔ لڑکوں سے پتہ چلا کہ میرے آنے سے پہلے اس کیمپ میں اربابِ نشاط کا بڑا جھمگھٹا رہ چکا ہے۔ ان دونوں جامعہ کے شریف زادے ان کانٹوں سے اپنا دامن بچائے ہوئے راشن بانٹا کرتے تھے۔ حیران پریشان ان دیدہ دلیر برقعہ پوشوں سے کتراتے ہوئے بمشکل کیمپ کا گشت کرتے اور ان کے جھگڑے کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتے۔

سب سے زیادہ رحم مجھے ایک قوال پر آیا۔ رونی صورتیں۔ رونی باتیں اور رونے کی آوازیں سنتے سنتے اور دیکھتے دیکھتے حیران ہو گیا تو میرے پاس آکر کہنے لگا۔ اس وقت آپ اطمینان سے بیٹھی ہوں تو میں کچھ عرض کروں۔ میں نے کہا۔ فرمایئے کہنے لگا۔ یہ نہیں۔ میں آپ کو کوئی چیز سنانا چاہتا ہوں۔ میں پھر بھی نہ سمجھی۔ یہی جواب دیا۔ کہ جو کچھ کہنا ہو جلدی کہیئے۔

خوش ہو کر بولا۔ تو پھر اجازت ہے۔ ڈھولک لاؤں۔

تب تو میں چونک پڑی۔ ڈھولک۔ جواب دیا۔ جی ہاں۔ میں نے جھلا کر کہا۔ آخر آپ ہیں کون۔ چاہتے کیا ہیں۔

اس نے ادب سے جھک کر جواب دیا۔ حضور کا میراثی ہوں؛ قوال۔ بس حضور ایک چیز سنا دوں گا۔ پھڑک نہ جایئے تو کہیئے گا۔ اجازت کی دیر ہے۔

میں نے کہا۔ میاں، ہوش کی دوا کرو۔ اس قبرستان میں گانا۔ ذرا موت کی نغمہ سرائی سے فرصت ہونے دو تو یہ بھی ہو گا۔ سب کچھ ہو گا۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔

بے چارا قوال مایوس واپس گیا۔ وہ خوشی کے گیت گانے والے مجبور ہو رہے تھے کہ آہیں اور چیخیں سنتے رہیں۔

انھیں دنوں میری لڑکی اور داماد آ گئے۔ دونوں کو لے کر گئی اور تعارف کرایا۔ لڑکی بچپن میں ان سے مل چکی تھی مگر اب بڑی ہو گئی تھی اسلئے ظاہر ہے پہچاننا مشکل تھا

لیکن باپو نے کہا، "وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا۔"

میرے منہ سے نکلا۔ دو، تین مہینے اس کی شادی کو ہوئے ہیں، اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی دن اور مہینے میں اکثر بھول جایا کرتی تھی، مگر لڑکی نے فوراً ٹوکا۔ ارے نہیں پانچ مہینے ہو چکے ہیں گاندھی جی ہنس پڑے۔ اس کو اچھی طرح یاد ہے۔ وہ نہیں بھولی اور تو بھول گئی۔

میں نے کہا۔ باپو، یہ فوجی ہے۔ اب تک انگریزوں کے حکم سے لڑتا رہا ہے لیکن اب اپنی حکومت ہے۔ آپ اسے کچھ نصیحت کیجیے۔

اندر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ سوشیلا اور منوان کو اٹھا رہی تھیں۔ اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا۔ یہ بات ہے۔ تو پھر اب اپنے دیس کی سیوا کرو۔ دیس کی رکھشا کرنا ہی تمھارا کام ہے۔ جاؤ خوب خوش رہو۔"

آخر دسمبر میں ۱۹۴۷ء پہلی بار مجھے دہلی کے دو دیہات دیکھنے کا بھی موقع ملا[1]۔ ایک بہت بڑا قافلہ جس میں پانچ ہزار مرد عورت بچے تھے۔ اناج کی بوریاں۔ چارپائیاں اور سوپ چھلنیاں تک ٹرک بیل گاڑیوں پر لادے ہوئے آ کر کیمپ میں اتر پڑا۔ عورتیں اپنے گوٹے کناری والے جوڑے پہن کر آئی تھیں۔ مرد لمبے تڑنگے، طرہ دار پگڑیاں باندھے فاتحانہ انداز سے کیمپ میں داخل ہوئے۔ اور ہم سب گھبرا گئے کہ یہ بالکل نئے انداز کے پناہ گزین آ گئے ہیں الٰہی خیر کرے۔ پوچھنے سے پتہ چلا کہ نہ ان کے گاؤں پر حملہ ہوا نہ ان کا کوئی آدمی مارا گیا ہے۔ بس یوں ہی گاؤں چھوڑ کر پاکستان جا رہے ہیں۔

شاید آخر دسمبر یا شروع جنوری کا واقعہ ہے کہ ایک دن سبھدرا نے مجھ سے کہا کہ سنا ہے اسی گاؤں[2] کے دو ہزار ہندو بھی باہر میدان میں پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں اور سب نکال دیے گئے ہیں۔

---

[1] ہمیں یہ خبر ملی تھی۔ کہ دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تہاڑ گاؤں کے بدر عالم صاحب کی ہزاروں بیگھہ زمین سے اپنی پاکستان میں چھوڑی ہوئی پراپرٹی کا تبادلہ کر لیا ہے اس آراضی پر بسے ہوئے اور کاشتکار مسلمان اور ہریجن تھے۔ زمین ان سے خالی کرا کر ریفیوجیز کو دی جا رہی تھی۔ گاؤں کی آبادی تقریباً ۷ ہزار تھی۔ ۵ ہزار مسلمان دو ہزار ہریجن۔ مسلمانوں کے سامان کیمپ میں آ چکے تھے اور ہریجن گاؤں کے باہر نکال دئے گئے تھے۔ [2] تہاڑ گاؤں

[3] ہندوستان پاکستان

یہ سن کر ہم نے سوچا کہ چلو گاؤں دیکھ آئیں اور ممکن ہو تو ان سب کو واپس کر دیں پھر بسا دیں۔ صبح سویرے ہم دونوں نے تہاڑ کا راستہ لیا۔ دہلی سے نو دس میل پر یہ خوش حال گاؤں آباد تھا۔ راستے میں ایک جگہ بکثرت خیمے اور نوجوانوں کو ورزش کرتے دیکھ کر میں نے حیرت سے سوال کیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ سبھدرا نے بتایا یہاں راشٹریہ سنگھ کی ریلی ہو رہی ہے اور مجھے یاد آ گیا کہ اس کا بہت شہرہ بن چکی ہوں۔ بڑے بڑے مہاراجگان ان دنوں اس میں شرکت کے لیے دہلی آئے ہوئے ہیں اور جس ریاست میں سب سے زیادہ کشت وخوں اور بربریت کا مظاہرہ ہوا تھا اس کے مہاراج ادھیراج[1] اس اجلاس کے صدر ہیں۔ حکومت کے ایک ذمہ دار رکن بھی یہاں ویروں کو آشیرواد دینے آئے تھے اور دہلی کے ایک خود ساختہ بدنام لیڈر نے مسلمانوں کی طرف سے مہاراجگان میں سے بعض کو پارٹی یا ایٹ ہوم بھی دیا بلکہ میں یہ بھی سن چکی تھی کہ ایک مولانا صاحب[2] کے پاس جب ایٹ ہوم کی شرکت کا دعوت نامہ پہنچا تو انہوں نے بہت ہی رنج وغصہ کے ساتھ اسے واپس کر دیا اور کہا ان کو ہمت کیسے پڑی کہ مجھے اس میں شرکت کو بلوا دیں۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔

دہلی کا امن پسند طبقہ آج کئی دن سے انگشت بدنداں تھا کہ باپو کی موجودگی میں کانگرس گورنمنٹ کے ہوتے ہوئے شرپسندوں کی جماعت اس دہلی میں اکٹھی ہو رہی ہے جس میں ابھی چند ماہ پہلے خون کی ندیاں بہہ چکی ہیں۔ یہ نئی تیاریاں آخر کس لیے ہیں۔ کیا حکومت ابھی تک چونکی نہیں ہے سمجھی نہیں ہے۔ کیا اس کی دوست اور دشمن کو پہچاننے کی طاقت اس حد تک سلب ہو چکی ہے کہ اب ایسے فتنہ پردازوں کو اپنے ساتھ لے کر چلے گی۔ ہم لوگ آپس میں یہی باتیں کرتے ہوئے تہاڑ پہنچے۔ گاؤں سے باہر ہی تین بڈھے ہمیں ملے جو دو اپنی جنم بھومی کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ ہم میں سے ایک کو پہچان کر بول اٹھے، بہن جی دیکھئے ہم پر کتنا اتیاچار ہو رہا ہے۔ ہمارے گھر اور دھرتی سب شرناتھیوں کو دے دی جائے گی اور ہم کو اب گاؤں میں گھسنے بھی نہیں دیا جاتا۔ ایک ماہ سے ہمارے بیل وہ دیکھئے سامنے والے گاؤں میں بندھے ہیں۔ بچے اور جانور سب سردی سے مرے جا رہے ہیں۔ اور آج تو گاؤں کی صفائی بھی کرائی جا رہی ہے۔ یہ کہتے

---

[1] مہاراجہ پٹیالہ نے صدارت کی تھی اور اس میں سردار پٹیل نے تقریریں بھی کی تھی

[2] مولانا حفظ الرحمٰن

کہتے وہ رو دیے۔ بچارے بڈھے۔ اپنی عمر کے آخری دور میں ان کو یہ سب کچھ دیکھنا پڑا تھا۔

ہم نے پوچھا۔ یہ سب کون کرا رہا ہے۔

جواب دیا سرکار

مجھے ہنسی آگئی۔ کیمپ کے مسلمانوں سے پوچھتی ہوں۔ تم سب کیسے آگئے۔ آخر کس نے تم سے گاؤں خالی کرایا تو یہی جواب ملتا ہے کہ حکومت شدھی ہولے والوں اور کرانے والوں سے پوچھتی ہوں۔ تم نے کیوں ان کو تبدیل مذہب پر مجبور کیا؟ تم نے کیوں اپنا مذہب چھوڑا۔ تو منہ سکھا کر کہتے ہیں۔ سرکار کی اچھا حکومت کی مرضی ظالم اور مظلوم۔ قاتل اور مقتول سب حکومت کی مرضی سے مر رہے تھے اور مارے جا رہے تھے......

بڈھے نے اپنی رام کہانی ہمیں سنائی اور بتایا کہ ہمارا گاؤں چونکہ پاس پڑوس میں سب سے بڑا تھا اس لیے حکومت نے اس کو کیمپ بنا کر سارے مسلمان یہاں اکٹھے کر دیے تھے اور پہلی اصلی آبادی سے اب گنے چنے آدمی یہاں تھے۔

نئے آنے والوں سے ہماری ٹیڑھی سیدھی بات ہو بھی جاتی تھی مگر پرانے ساتھیوں سے نہ کوئی لڑائی تھی اور نہ جھگڑا لیکن حکومت کا حکم ہوا کہ ان سب کو کیمپ میں پہنچا دیا جائے۔ پھر تحصیل دار صاحب آئے۔ پولیس آئی اور ان سب کو ٹرک میں بٹھا کر لے گئے۔ اپنے ہل بیل وہ بیچ کر یہاں سے سدھار گئے۔ سنتے ہیں ان کو پاکستان میں زمین ملی گئی ہے۔ ان کے گئے پیچھے ہم سے بھی گاؤں خالی کرا لیا گیا اور اب صفائی ہو رہی ہے ہم اندر جانا چاہتے ہیں تو منع کرتے ہیں۔ یہاں مت آؤ۔ یہ سارے مکان زمین سب پناہ گزینوں کو دیدی جائے گی۔

باتیں کرتے ہوئے ہم سب آگے بڑھے تو خالی مکانوں سے پاؤں کی چاپ سن کر کتوں نے منہ نکال کر جھانکا گردنیں باہر نکالے وہ حسرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ شاید اب تک اپنے مالکوں کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے بھوکے پیٹ اور لڑکھڑاتی ٹانگیں بتا رہی تھیں کہ بھوک نے انھیں ادھ مرا کر دیا ہے۔ گاؤں بہت بڑا تھا۔ پختہ دو منزلہ مکان بھی تھے اور کچے صاف ستھرے جھونپڑے بھی مجموعی حیثیت سے خوش حال تندرست اور بہترین گاؤں تھا۔

ہم نے کسٹوڈین انسپکٹر کے متعلق پوچھا۔ ایک سپاہی جو راستے میں ہی مل گیا تھا ہمیں اس طرف لے چلا جہاں انسپکٹر بیٹھا ہوا صفائی کرا رہا تھا۔ زمیندار کے پختہ چبوترہ پر سامان نکلوا نکلوا کر ڈھیر کرایا جا رہا تھا اور نیچے سایہ دار درخت کے پاس مونڈھا ڈالے انسپکٹر اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا لیکن ان تین بڈھوں کو ہمارے ساتھ دیکھ کر تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ بگڑ کر بولا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو۔ چلو چلو۔ اپنا راستہ لو۔ فوراً روانہ ہو جاؤ۔"

میں نے کہا" ارے بھئی ان کا گاؤں ہے۔ ان کے گھروں سے سامان نکل رہا ہے۔ انھیں کو آپ آنے سے منع کرتے ہیں۔ یہ کیسا غضب ہے۔ کہنے لگا" نہیں صاحب آپ جانتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ بڑے چور ہیں۔ ذرا نظر چوکی اور کچھ نہ کچھ اڑا دیں گے"

میرے اس کہنے پر ذرا بڈھوں کے قدم ٹھٹکے تھے مگر انسپکٹر کب ماننے والا تھا اس نے پھر ڈانٹا۔

"بس لانبے پڑو جی۔ گاؤں کے اردگرد تمہاری شکل نہ دکھائی دے۔ سنتے ہو؟"

اور بچارے آنسو پونچھتے الٹے قدموں پلٹ گئے۔

قصداً اپنا تعارف نہ کرایا۔ یونہی چارپائی گھسیٹ کر بیٹھ گئے اور بات کرنے لگے۔

اچھا تو آپ گاؤں کی صفائی کروا رہے ہیں۔ بڑا گندہ ہو گا؟ شاید رفیوجیز کو یہاں بسایا جانے والا ہے؟ انسپکٹر نے جواب دیا۔ جی ہاں۔ یہ گاؤں اور اس سے ملحق ساری زمین ان کو الاٹ کی جائے گی۔

ہم نے پھر سوال کیا؛ اور یہ سب کسٹوڈین پراپرٹی ہو چکی ہے۔

کہنے لگا۔ جی ہو تو چکی ہے۔ اور یہ بھی ارادہ ہے کہ یہاں ایک ایگریکلچر کالج بنے گا۔ فارم ہو گا۔ بڑی اسکیم ہے۔ ہم نے دوستانہ طریقے سے پوچھا۔ مگر یہ تو بتایئے مسلمانوں کو چھوڑیے۔ مگر ہندو بھائیوں کی جائداد کسٹوڈین کی ملکیت کیسے بن گئی۔

تو بے پروائی کے انداز میں جواب دیا۔ نہیں صاحب سب ہو گئی۔ وہ بھی تو گاؤں سے بھاگ چکے ہیں۔

ہم نے اسے یاد دلایا کہ آپ کہتے ہیں مسلمان وہاں پاکستان میں ہندوؤں کی چھوڑی

ہوئی زمین حاصل کرلیں گے۔ اس لیے وہ تو اچھے رہے۔ مگر یہ ہندو کسان آخر کیا کریں گے؟ یہ زمیندار ہیں۔ ان کی گذر بسر کیسے ہوگی؟ بھوکوں مریں گے۔ بے پروائی سے بولا۔ "ان کو اسی فارم میں کچھ کام دے دیا جائے گا۔ یا شرنارتھیوں کے یہاں محنت مزدوری کرلیں گے۔ بھوکے کیوں مرنے لگے؟"

ہم نے حیران ہو کر سوال کیا "کہ زمین کے مالک کو آپ دوسروں کا محکوم اور مزدور بنا دیں گے؟"

کہنے لگا، "مجبوری ہے تو کرنا ہی پڑے گا۔"

اب ضروری معلوم ہوا کہ اس سے کھل کر سوال کریے جائیں۔ اس لیے پوچھا۔ کس کا حکم ہے؟ کس نے طے کیا ہے؟ اور خود اس کا نام معلوم کر کے ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب تو انسپکٹر گھبرایا۔ اس نے کہا۔ آپ نے تو یہ ہمیں اب تک بتایا ہی نہیں کہ آپ کون ہیں، کس لیے آئی ہیں۔ یہ تو میں سمجھ گیا کہ شہر سے آئی ہوں گی۔

چلتے چلاتے ہم نے اپنا تعارف بھی کرا دیا اور انسپکٹر کی پریشانی دیکھ کر بڑا لطف آیا وہ ہمارے ساتھ ساتھ گاؤں کے باہر تک آیا۔ راہ میں اپنی رحمدلی ثابت کرنے کے لیے اس نے کہا۔

"صاحب مجھے تو ان کتوں پر بڑا ترس آتا ہے۔ دیکھیے آہٹ پاتے ہی گردن نکال دی ہے۔ ان کی گذر بسر کے لیے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ بے چارے بھوک سے بے حال ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں۔ ان کے لیے کیا صورت کروں۔"

مجھے ہنسی آئی۔ آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ آدمیوں کو تو آپ نے بھوکا مرنے کے لیے نکال دیا اور کتوں کی آپ کو اتنی فکر ہے۔ یہ خوب رہی۔

وہ کھسیانی سی ہنسی ہنستا ہوا ہمارے ساتھ موٹر تک آیا۔ تھوڑی دور پر تینوں دیہاتی کھڑے آنسو پونچھ رہے تھے۔ انھوں نے اشارے سے ہاتھ جوڑ کر سبھدرا سے التجا کی کہ ہماری فکر جلد کرنا۔ وہ انھیں پہچان گئے تھے۔ وہ اس گاؤں میں باپو کے حکم سے پندرہ دن رہ چکی تھیں۔ دوبارہ پرائم منسٹر کی بیٹی اندرا بھی یہاں آئیں۔ خود باپو بھی ان سب کی ہمت قائم رکھنے اور ڈھارس بندھانے ایک بار آئے تھے۔ وہ ان کا راشن تک خود شہر سے جا کر لاتی تھیں کیونکہ مسلمان ڈرتے تھے دلی آتے ہوئے اور اب اسے ان سب مسلمانوں پر بہت غصہ تھا

کہ میں نے پندرہ دن یہاں پڑ کران کو روکا۔ باپو نے روکا۔ اندرا گاندھی نے ان کی ہمت بندھائی کہ تم اطمینان سے بسے رہو۔ گورنمنٹ تمہاری پوری مدد کرے گی۔ جتنی کوشش ان کے لیے ہوئی کسی کے لیے نہ ہوئی تھی اور پھر بھی یہ نہ ٹک سکے یہ ان کی بزدلی ہے۔

میں نے بتایا کہ وہ تاریخ وار بتلاتے ہیں کہ ۱۱ر اکتوبر کو ایک افسر نے آکر کہا کہ اب خطرہ ہے گاؤں چھوڑ دو ۱۶ر کو پھر ایک بڑے افسر[1] نے آکر یہی صلاح دی ۲۱ر اکتوبر کو پولیس افسر نے پھر یہی حکم دیا اور پھر آخر میں صوبہ کے ایک بڑے آفیسر نے ٹرک بھیج کران کو کیمپ روانہ کر دیا۔

مگر سبھدرا کو غصہ تھا۔ کچھ بھی ہو۔ اگر انہیں مجھ پر بھروسہ نہیں تھا۔ اندرا نہرو پر بھروسہ نہیں تھا، نہ سہی، باپو کی بات کا تو اعتبار کرتے۔ ذرا سی ہمت بھی قائم نہ رکھ سکے۔

میں نے بائیکاٹ کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگی۔ اتنے لڑنے والے لوگ آس پاس کے سارے دیہاتوں میں ان کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔ فوج کے اچھے سپاہی اور بڑے بڑے ڈاکو توان میں پیدا ہوتے تھے اب کہیں ایک آدمی راستے میں پیٹ دیا گیا یا ایک بیل چرالیا گیا یا سودے کے پیسے چھین لیے گئے تو اتنی چھوٹی سی بات پر پانچ ہزار لڑاکے جوان گاؤں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے دلوں میں ڈر ہی بیٹھ گیا تھا میں عورت ہو کران کا راشن لینے شہر جاتی تھی اور یہ ڈر کے مارے پاؤں باہر نہیں رکھتے تھے۔

تب میں سوچنے لگی کہ کہیں یہ خدا کا قہر ہی تو نہ تھا۔ یہ وہی ڈر اور دہشت تو نہ تھی جس کا ذکر کلام پاک میں ہے۔ کہ مقہور و مغضوب قوم پر اس سے زبردست قوم مسلط کر دی جاتی ہے۔ اور پھر ان کے دلوں میں اتنا خوف بیٹھ جاتا ہے کہ وہ مقابلے پر جمنے ہی نہیں پاتے ہیں۔ خدا جسے چاہتا ہے۔ زمین کا مالک بناتا ہے۔

ہم نے یہ طے کیا۔ کہ ہم سے ایک تو باپو کے پاس جائے اور دوسری پرائم منسٹر سے ملنے کی کوشش کرے۔ باپو نے داستان سنی تو بہت ہی رنجیدہ ہوئے۔ اور کہا۔

---

[1] ڈپٹی کمشنر

"معلوم ہوتا ہے اب مجھے مرنا ہی پڑے گا" اور پرائم منسٹر نے سنا تو کہنے لگے، "وہ لوگ کیمپ میں کیسے آئے۔ ان کو روکنے کے لیے تو ہیں اور میری لڑکی گئے تھے۔ ان بچارے کو کیا پتہ کہ وہ اور ہیں اور آفیسر اور۔ دو متوازی حکومتیں اس وقت چل رہی ہیں۔ایک کا تار تخریب پسندوں کے ہاتھ میں ہے۔۔ دوسری کا باپو کے دست مبارک میں۔ سچائی کمزور ہے اور جھوٹ طاقت ور۔ وہ جو کچھ چاہتے ہیں اس کے ہونے میں دیر لگے گی اور وہ تمام کام جلد ہو جائیں گے۔ جو گنڈوں دہشت پسندوں اور ملک کے دشمنوں کی تمنائیں ہیں۔

بہر حال دونوں نے کہا وہ لوکل گورنمنٹ اور ہوم ڈپارٹمنٹ سے پوچھیں گے انھیں خود حالات کا علم نہیں ہے۔ مگر باپو کی ہدایت ہوئی کہ اسی وقت جاکر باہر پڑے ہوئے لوگوں کو آباد کر دیا جائے اور دس بجے رات کو سبھدرا نے جاکر گاؤں والوں کے جانور وہاں بندھوا دئے۔ ان سے کہہ دیا کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنے مکانوں پر قبضہ کر لو۔ انسپکٹر اور اس کے آدمی جا چکے تھے اور دو ہزار ہندو صبح ہوتے ہوتے پھر گاؤں میں بس گئے۔ ان سے کہہ دیا گیا۔ اگر کسی نے ٹوکا تو پریشان نہ ہونا ہم سب نمٹ لیں گے فکر نہ کرو۔ باپو کا یہی حکم ہے کہ تم فوراً اپنی جگہ پہنچ جاؤ۔ چلتے وقت انھوں نے ہاتھ جوڑے اور کہا۔

"اتنا دیا اور کرو کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو بھی واپس لے آؤ۔ وہ آجائیں۔ تو گاؤں پھر بھر جائیگا۔ ان میں کے کئی آدمی کیمپ آئے اور انھوں نے رو رو کر اپنے ساتھیوں سے اصرار کیا کہ تم سب پلٹ چلو۔

باپو کے حکم سے جو کام پورا ہوا اس میں کون مین میخ نکالنے والا تھا خود پرائم منسٹر نے کہہ دیا تھا۔ اب بھی اگر لوگ کیمپ سے پلٹ جائیں تو ان کی سب چیزیں اسی طرح ان کو ملے گی جیسے ہندوؤں کو مل رہی ہے۔ اب یہ ہمارا کام تھا کہ ان کو واپس کرائیں۔ مگر افسوس ہے ہم اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آگے چل کر ان وجوہات کا ذکر کروں گی۔

لہ اس جملے نے ہمارے دل ہلا دیے۔ پر ارتھنا کے بعد کی تقریروں میں وہ اکثر ان دنوں کہتے تھے۔ "میں تو یہاں مرنے کے لیے آیا ہوں۔ میں نے تو جان کی بازی لگائی ہے۔ میں تو اب سو برس نہیں جی سکتا" وغیرہ وغیرہ

حالات ایسے نازک مرحلہ پر پہنچ گئے تھے کہ گاندھی جی جیسے زمانہ شناس کے لیے یہ اندازہ لگالینا کچھ دشوار نہ تھا کہ کوئی بہت بڑا قدم اٹھائے بغیر کوئی مضبوط بند باندھے بغیر اس تیز دھارے کو روکنا ممکن ہے۔

اور اسی لئے کچھ روز بعد ۔۔۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

6

کیمپ میں

اب جامعہ کے طلبا کے علاوہ بھی اور بہت سے لڑکے کیمپ میں کام کرتے تھے ان میں ایک صاحب ظفر خاں بھی تھے۔ میں انھیں ناپسند کرتے ہوئے بھی اس غلط فہمی میں کہ جامعہ کے ہیں، شریف آدمی سمجھا کرتی تھی۔ یہ تو بعد کو معلوم ہوا کہ وہ کیمپ میں پناہ گزین کے حیثیت سے تھے اور آہستہ آہستہ کیمپ کے انتظام میں دخیل ہو گئے تھے۔ گورنمنٹ کو شبہ ہوا کہ آبادی کم ہے اور لوگ فرضی ناموں سے زیادہ راشن وصول کر رہے ہیں منتظمین ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ بہر حال مقامی حکومت نے ضروری سمجھا کہ انکوائری کر لی جائے اور مجسٹریٹ مع کئی لڑکیوں کے تحقیقات کرنے آئے۔ لڑکیاں خیمے کے اندر اور مجسٹریٹ صاحب[ع۱] خود باہر اعداد و شمار فراہم کر رہے تھے۔ اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ کیمپ کے لوگ بھی انتہائی چالاکی سے دو کے بجائے چار کا راشن وصول کر رہے تھے۔ وہ تین چھٹانک آٹا یا چاول ان گرانڈیل دیہاتیوں کے لیے قطعی ناکافی تھا اور اسی لیے وہ فرضی تعداد دکھا کر اسی ترکیب سے اپنی خوراک پوری کرتے تھے۔ ادھر والنٹیر، چپراسی اسپتال کا سب عملہ اپنا حق زیادہ رکھنے کے لیے ہر روز کچھ نہ کچھ بچا لیتے تھے۔ حکومت کے آفیسر اس بیدردی کے ساتھ چیکنگ کر رہے تھے جیسے کوئی سازش پکڑی جا رہی تھی، اسلحہ یا بم نکلنے کی امید تھی، جیسے مجرموں کی خانہ تلاشی ہو رہی تھی۔ ہر طرف تعاون اور ہمدردی کا جذبہ ان دنوں مفقود تھا۔

اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظفر خاں جو راشن کے مہتمم بن بیٹھے تھے غصہ میں بھرے ہوئے میرے پاس آئے اور کہا کہ بے ایمانی کی حد ہے۔ میں نے لوگوں سے کہدیا ہے۔ تم پر بہت زیادتی ہو رہی ہے۔ تم راشن نہ لو۔ میں سوچ بھی نہ سکی کہ یہ کسی ہڑتال کا پیش خیمہ ہے۔ یہی خیال

ع۱ - ڈپٹی کمشنر ۔

کیا کہ فوری علاج سوچا ہوگا۔ یہ خیال بھی نہ تھا کہ کوئی شرارت ہے۔ لیکن ان چند الفاظ نے خطرناک صورت حال پیدا دی اور تین دن کیمپ کے کسی آدمی نے راشن نہ لیا۔ بھوک کے مارے برا حال، چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بچے اٹھنے سے معذور مگر راشن سے بدستور انکار۔ لڑکے بیچارے[1] لاعلم تھے کہ یہ سب ان کے ایک ساتھی کے کرتوت ہیں اور میں حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ ظفر خاں دو دن کے اندر کیمپ کے لیڈر کیسے بن گئے۔ واقعہ یہ تھا کہ دو کے بجائے چار کا راشن لینے والوں میں خود ظفر خاں بھی تھے اور ان دنوں انھوں نے خوب ہاتھ پیر نکالے تھے۔ ان نواب بے ملک کے بھائی کیمپ کے ایک حصے میں خیمہ ڈالے مع اسٹاف کے حفاظت کے بہانے سے مقیم تھے۔

اسمٰعیل پٹیل[2] جو اسسٹنٹ کمانڈر تھے، انھوں نے لکھا پڑھی کی۔ ڈپٹی کمشنر کو خبر کی، فوڈ منسٹری کو لکھا۔ اور جیسے جیسے حالات سے مطلع کیا ہو مگر کچھ حل نہ نکلا۔ کسی نے خبر ہی نہ لی۔ میں نے بھی چیف کمشنر[3] صاحب کو فون کیا۔ معلوم ہوا نہیں ہیں۔ ڈپٹی کمشنر[4] کو فون کیا، چپراسی نے کہا آرام کر رہے ہیں، پھر معلوم کیا۔ جواب ملا۔ دھوپ کھا رہے ہیں۔ پھر چیف کمشنر کو فون کیا۔ خدا خدا کر کے بولے۔ سارا حال بتایا تو کہنے لگے۔ اچھا دو دن ہو چکے مجھے تو خبر ہی نہیں۔ میں نے کہا۔ خیر اب تو خبر ہو گئی۔ جلد فکر کیجیے۔ ورنہ موتیں شروع ہو جائیں گی۔ کہنے لگے۔ ضرور کل ہی کوشش کروں گا۔

مگر صبح ہو گئی۔ کیمپ کی حالت بدستور تھی۔ فوڈ منسٹر کے سکریٹری آنے والے تھے مگر فرصت نہ ملی۔ مجسٹریٹ صاحب آئے مگر سارا حال سن کر واپس چلے گئے۔ شام تک یہی ہوتا رہا۔ تب تو پریشان ہو کر میں باپو کے پاس دوڑی گئی۔ وہاں جا کر سارا حال بتلایا۔ باپو نے اسی وقت فوڈ منسٹری کو فون کرایا۔ سوشیلا نائر کو میرے ساتھ کیا۔ سب کچھ ہوتے ہواتے کافی دیر لگ گئی۔ مگر جب کیمپ پہنچی تو دیکھا۔ فوڈ سکریٹری آ گر سب کے برت تڑوا چکے تھے اور راشن تول تول کر دیا جا رہا تھا۔

---

[1] - جامعہ کے طالب علم۔

[2] - جامعہ ملیہ کا مخلص ورکر اسٹوڈنٹ۔

[3] - خورشید احمد خاں۔

[4] - مسٹر رندھاوا۔

اس واقعہ سے میری طبیعت کھٹک گئی اور ظفر خاں مجھے عیار اور ناقابل اعتبار نظر آنے لگا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ جامعہ کے لڑکے کچھ کالج کھل جانے کی وجہ سے کچھ اس کام کی یکسانیت سے گھبرا کر دوسرے کاموں میں لگ گئے تھے۔ کچھ لڑکے اب بھی آتے تھے مگر تعداد کم ہو گئی تھی۔

مجھے کبھی پولیس یا فوج سے کاہے کو سابقہ پڑتا۔ جو زندگی میں نے اب تک گزاری تھی، اس میں نہ عدالت تھی نہ قانون۔ یہاں پہلی مرتبہ ایک تھانیدار صاحب سے بھی سابقہ پڑ گیا۔ ایک شخص کی بیوی اپنے میکہ میں تھی اور وہ مع اپنے ساتھیوں کے کیمپ میں مقیم تھا۔ بیوی کی یاد نے بہت ستایا اور کچھ والدین اور گاؤں والوں نے اکسایا تو ایک رات کیمپ کے محافظ ڈوگرہ سپاہیوں کو روپیہ دے کر اس نے اس پر راضی کر لیا کہ دو سپاہی ٹرک لے کر اس کے ساتھ جائیں اور اس کے گاؤں سے اس کی بیوی کو نکال لائیں جہاں کے سارے آدمی شدھی ہو چکے ہیں۔ عورت اپنے میکہ میں تھی اور ماں باپ کے ساتھ مجبوراً شدھی ہو گئی تھی۔ اپنی بیوی کے علاوہ اسے بھائی کی بیوی کو بھی لانا تھا۔ دو سو روپے پر معاملہ طے ہو گیا۔ لڑکیاں ٹرک پر بٹھائی جا چکی تھیں کہ گاؤں والوں کو خبر ہو گئی اور سب لاٹھیاں بلم لے کر دوڑ پڑے دو ایک لاٹھیاں پڑیں بھی اور ایک لڑکی چھن گئی مگر وہ اپنی بیوی کو لے آیا۔ اور یہ سب اتنا چھپ کر کیا گیا کہ ہمیں کوئی علم نہ تھا۔ اس لیے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ مجسٹریٹ صاحب کس لڑکی کی تلاش میں ہیں۔ ایک بار تھانیدار صاحب آئے، کیمپ کا چکر کر کے واپس گئے۔ دوسری بار آئے تو مجھ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے سارا حال بتایا اور کہا۔ لڑکی اسی کیمپ میں ہے۔ ہم سب نے لاعلمی ظاہر کی لیکن یہ ضرور پوچھا کہ کیا اپنی بیوی کو لانا بھی کسی قانون کی رو سے جرم ہے۔ انھوں نے واقعہ کی تشریح کی اور یہ بھی بتایا لڑکی کے والدین ہندو ہو چکے ہیں اور باپ کی طرف سے رپورٹ کی گئی ہے۔ گولی بھی دہا(ڑ) چلی تھی۔ بڈھا ساتھ تھا۔ اور اس گاؤں کے دو ایک زمیندار اور پٹواری وغیرہ بھی آئے تھے۔

تھانیدار نے کہا۔ لڑکی ہندو تھی۔ اس کو زبردستی اٹھا لائے ہیں۔ میں نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر باپ شدھی ہو گیا تو بیاہی ہوئی لڑکی نہیں ہو سکتی۔ نہ باپ اس کو روکنے کا قانوناً مجاز ہے۔ شوہر مسلمان ہے وہ اپنی بیوی کو بلا تا رہا۔ باپ نے روکے رکھا تو زبردستی لے آیا۔

ذرا سنبھل کر بولے مگر جناب وہ ملٹری ٹرک لے کر گیا۔ یہ جرم ہے۔ پھر اس نے بلوہ کرایا اور گولی بھی چلی۔ مجھے نہ تو سارا واقعہ معلوم تھا نہ اس وقت تک پولیس کے ہتھکنڈوں کو سمجھتی تھی۔

حماقت دیکھیے کہ ان کے کہنے میں آ گئی اور لوگوں سے کہا کہ بھی اس آدمی کو حاضر کر دو۔ سچا سچا بیان دیدے اور تھانیدار صاحب سے کہا کہ جب اس معاملہ میں آپ نے مجھے ڈالا ہے تو میں سچا بیان دلوا دونگی مگر آپ بھی وعدہ کیجیے کہ ان پر رحم کریں گے۔ بہت مصیبت زدہ ہیں۔

بڑے وثوق کے ساتھ کہا، ہاں، ہاں، جیسا آپ کہیں گی۔ ویسا ہی ہوگا۔ اس کو بلوا دیجیے۔

یہ واقعہ تھا کہ تھانیدار صاحب کے ہتھے وہ شخص ہرگز نہ چڑھتا۔ تین چار دن چھپانے کے بعد وہ اسے پاکستان روانہ کر دیتے۔ مگر میری بات کا وہ لوگ لحاظ کرتے تھے اس لیے سامنے کر دیا۔ لڑکا سہما ہوا سا آیا۔ میرے ڈھارس بندھانے پر اس نے سب قبول دیا۔ روپیہ دینے کا بھی ذکر کیا۔ لاٹھی چلنے کا بھی۔ صرف گولی چلنے کا اس نے سختی کے ساتھ انکار کیا اور یہ سچ تھا۔ تھانیدار صاحب کو مقدمہ جاندار بنانے کے لیے من گھڑت کہانی تیار کرنی ضروری تھی۔

میں نے بڈھے سے کہا کہ بڑے میاں بڑے شرم کی بات ہے کہ تم نے بڑھاپے میں اپنا ایمان خراب کیا اور اب چلتے چلاتے داماد کو جیل بھی بھجوا دینا چاہتے ہو۔ اللہ کو کیا منھ دکھاؤ گے۔ بڈھا زار و قطار رونے لگا۔ گاؤں والے اس کے جان پہچان بھائی برادری سب اس کو لعنت ملامت کر رہے تھے اور وہ بے بسی سے رو رہا تھا۔ لڑکی اور داماد بھی رو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بے کسی تھی، حسرت تھی۔ فوراً ہی سب کو معلوم ہو گیا کہ جو کچھ ہوا ہے، یہ سب ذیلدار اور تھانیدار صاحب کی شرارت ہے۔

تھانے دار صاحب نے رنگ بدلتے دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے۔ اچھا تو بیٹا تم میرے ساتھ آؤ۔

میں نے کہا، یہ کیا۔ کیا آپ اس کو گرفتار کریں گے۔ بولے قانون یہی کہتا ہے۔ جل کر میں نے کہا۔ آپ کا قانون بھی خوب ہے۔ وہ فوجی جو کیمپ کے پہرہ دار محافظ ہیں، کیمپ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ بلا اجازت پبلک کام کے لیے ٹرک لے جاتے ہیں، دو سو روپیہ رشوت وصول کرتے ہیں۔ قانون ان کو مجرم نہیں ٹھہراتا۔ مجرم ہے وہ جو اپنی بیوی کو باپ کے گھر سے لایا۔ آپ پولیس کے آفیسر لڑکی کے باپ کو مجبور کر کے غلط رپورٹ کراتے ہیں کہ انھوں نے گولی چلائی اور لڑے۔ وہ جو حملہ کرنے آئے تھے، وہ اور آپ مجرم نہیں؟ اپنی حفاظت کے خیال سے اس نے ملٹری کے آدمی ساتھ لیے اور اپنے آفیسر سے چھپا کر جنھوں نے اتنی بڑی جسارت کی۔ قانون ان پر کوئی الزام نہیں لگاتا؟ کرایہ پر لینے والا مجرم ہے۔ اچھی بات ہے لے جایئے میں بھی دیکھوں گی آپ کیسے مقدمہ چلاتے ہیں۔

باپ کے آنسو بتا چکے تھے کہ کس مصیبت میں وہ زندگی گزار رہا ہے۔ تقریباً پچاس آدمی اس گاؤں میں جان کے ڈر سے بظاہر ہندو بنے ہوئے رہ رہے تھے۔ ان کی فہرست حاصل کر کے دو دن کے اندر مسٹر بٹن ایس پی کی مدد سے سب کو میں نے نکلوا کر کیمپ پہنچا دیا۔ یعنی مدعی مع خاندان کے اب کیمپ میں تھا۔ اس کی طرف سے ایک درخواست بھی پہنچا دی گئی کہ وہ رپورٹ مجھ سے مجبور کر کے لکھوائی گئی تھی اور میں نے جو کچھ اپنے داماد پر الزام لگایا، غلط ہے۔

مگر لڑکے کو تھانے دار صاحب نے جیل پہنچا دیا۔ میں نے ایک بڑے آفیسر سے کہا کہ کسی طرح اب معاملہ ختم کرا دیجیے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ معاملہ میرے سامنے آیا تو ختم کرا دوں گا۔ مگر تھانیدار صاحب کو ضد ہو گئی۔ انھوں نے ایک مہینے تک کاغذات اپنے پاس ہی رکھے۔ اوپر بھیجے ہی نہیں۔ ملزم کے رشتے دار اس کی بیوی دن رات میری جان کو روتے تھے کہ تمھارے کہنے سے یہ ہوا۔ تم اب خبر نہیں لیتی ہو۔ انھیں کیا پتہ کہ میں کتنی کوشش کر رہی تھی۔ مگر چالاک سب انسپکٹر جیت گیا اور میں ہار گئی۔ تھک کر وہ سارے لوگ پاکستان چلے گئے اور چلتے چلتے خوشامد کر گئے کہ اسے بھولنا نہیں۔ اور پھر ایک دن خبر آئی کہ تھانے دار صاحب کو کسی نے گولی مار دی۔ کچھ عرصہ بعد دو ڈھائی ماہ رہ کر لڑکا بھی پاکستان گیا۔ لیکن ملٹری سے کوئی باز پرس نہ ہوئی بدستور لوگ ٹرک کرایہ پر لیتے رہے۔

پہاڑ گنج کے جوہریوں میں سے ایک تسلسٹ صاحبزادہ جو جامعہ کے طالب علم رہ چکے تھے پاکستان سے واپس آئے۔ کیمپ میں وہ لڑکوں کے ساتھ آئے اور بتایا کہ اس ارادہ سے آیا ہوں، اگر کوئی بچی کھچی چیز مل جائے تو اسے حاصل کر لوں۔ ان کے مکان پر رفیوجیز کا قبضہ تھا۔ جواہرات اور زیورات سب لٹ چکے تھے۔ صرف ایک دیوار کے چور خانہ میں مال باقی تھا۔ جسے وہ کسی ترکیب سے حاصل کر لینا چاہتے تھے۔ یہ دلیر نوجوان کھدر کا کرتا پاجامہ پہنے زین کا تھیلہ لٹکائے پہاڑ گنج قرول باغ تک کا چکر لگا آتا۔ اس نے چند چیزیں اپنی چھوٹی بہن کے لیے خود تیار کی تھیں اور وہ بھی کہیں محفوظ تھیں۔ ان کی اسے سب سے زیادہ فکر تھی۔ کہتا تھا کہ بھاگتے وقت قیمتی چیزوں کی پوٹلی بھی چھوڑ دینی پڑی اور دو بہنیں بھی زبردستی چھن گئیں۔ جن میں سے ایک دوسرے ہی دن سبھدرا کی کوشش سے برآمد ہو گئی اور دوسری غیرت دار لڑکی کو جب سکھ بنایا جانے لگا تو اس نے چولھے یا کڑھاؤ میں سر رکھ کر جان دیدی۔

شہر کی گلیوں میں پنساریوں اور پان والوں کے پاس سے اس نے اپنے قیمتی نقشے خریدے۔ بہن کے زیورات تو تاریکی میں نکال لایا مگر ان سب چیزوں کو لے کر ہوائی اڈہ تک پہنچنے کی ہمت

س میں نہ تھی اور اس کے لیے اسے مدد کی ضرورت تھی۔

میں نے پوچھا کہ جب تمھیں دلّی سے اتنی محبت ہے تو حالات درست ہوتے ہی پھر آجاؤ گے۔ اس نے مایوسی کے ساتھ سر ہلایا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں بھی میرے آباؤ اجداد اسی خونی دروازہ پر پھانسی پا کر لٹک چکے ہیں۔ اب کی پھر میرے خاندان کے دس بارہ افراد تہہ تیغ ہوئے اس لیے ابھی تو دلی آنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ ساری مصیبتیں یاد ہیں۔ وہ تو کہیے چند ہیرے کی چھوٹی چھوٹی پڑیاں میں نے جیب میں ڈال لی تھیں ورنہ بھوکوں مرنے کی نوبت ہوتی۔ وہ بچ گئیں اور اب سارے خاندان کے مستقبل کا انحصار ان پر ہے۔ آپ دیکھ لیجیے گا کہ ان میں سے ایک سٹ بنا کر اتنا کما لوں گا کہ دکان کھول لوں۔ اور وہی ہوا۔ میں نے سنا ہے کہ اس محنتی ہنرمند اور آرٹسٹ خاندان نے اپنی دنیا کراچی میں آپ بنالی ہے۔

انھیں دنوں ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا دلی کے جوہری۔ راعی اور عام لوگ پہلے کٹ پٹ کر بچے کھچے پاکستان پہنچ چکے تھے۔ اب چاندی والے نیاریے اور سادہ کار بھی اٹھ اٹھ کر پاکستان جانے کے لیے کیمپ آنے لگے۔ ہر ٹرین میں بڑی تعداد ان کی نکل جاتی۔ دلی کے بیوپاری پریشان تھے۔ زردوزی والے، کامدانی ساز بھی رخصت ہو رہے تھے۔ بیوپاریوں نے گورنمنٹ تک معاملہ پہنچایا کہ اگر یہ سب چلے گئے تو دلّی کی مشہور صنعت اور کاروبار ختم ہو جائیگا۔ ان کو کسی طرح روکا جائے۔

دلّی کے ایک بیوپاری میرے یہاں آئے اور بتایا کہ ایک مسلمان دوست نے دو سو روپیہ مجھے بھیجا ہے کہ مسلم کیمپ میں خرچ کر دوں۔ آپ بتا دیجیے کہ کس کو دیئے جائیں۔ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کا پتہ بتا دیا کہ ان کو بھیج دو۔

بیوپاری بہت فکرمند تھے کہ اب ان کے زیورات کون بنائے گا۔ کیسے تیار ہوں گے۔ نگینہ جڑنے والے سونا دھونے والے۔ نفیس نازک زیور تیار کرنے والے سب مسلمان تھے۔ وہ بناتے تھے، ہم بیچتے تھے۔ صدیوں سے اسی طرح مل جل کر چل رہا تھا۔ چاندی کے کاریگر بھی مسلمان تھے۔ اچھے درزی بھی وہی تھے۔ زردوزی اور کامدانی گوٹا کناری بھی انھیں کا فن تھا۔ اب کیسے ہم سارے ہندوستان کو مال سپلائی کریں گے۔ کہتے تھے کہ میں نے بمشکل اپنے چند کاریگروں کو روکا ہے مگر وہ بھی ہر روز بھاگنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔

دلی کا کاروباری طبقہ حکومت کو بھی پریشان کر رہا تھا کہ کسی طرح یہ آفت کم ہو۔ یوں دیکھنے میں تو عام طور سے مسلمان بڑے بدھو سے نظر آتے ہیں مگر اسی زمانے میں ان کے

جو ہر کھلے۔ ہوٹل اور کھانے کی دکانیں اپنے بہترین باورچیوں کو رو رہی تھیں اور لوگ کہتے تھے کہ ڈرائیور اور مکنیک بھی انھیں میں زیادہ تھے۔

میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ گاندھی جی کے متوسلین کے سوا لوکل کانگریس میں کوئی بھی اس کیمپ میں نہ آتا تھا۔ اس لیے اب تک میں کسی سے نہ مل سکی مگر اب اکّا دکّا لوگ نظر آنے لگے تھے۔ ایک دو بار پراونشل کانگریس کمیٹی کے ممبر بھی آئے۔

دسمبر ۱۹۴۷ء تک مسلسل کیمپ میں کام کرنے کے بعد جب یہ دیکھا کہ آنے والوں کا تانتا کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں تو ہم سب پریشان ہو گئے۔ خیموں کی قلت۔ سردی کی شدّت نمونیا اور چیچک کی کثرت نے پناہ گزینوں کی حالت اتنی ابتر کر دی کہ اسپتال میں کوئی گنجائش نہ رہی۔ پریشان ہو کر ایک دن میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے پاس اوکھلے گئی اور انھیں موجودہ مصائب کی داستان سنائی۔ وہ بھی متاثر ہوئے مگر کوئی حل اس کا ان کی سمجھ میں بھی نہ آیا۔ آنے والے اب مصیبت زدہ۔ لٹے پٹے۔ کمزور مریض یا زخمی نہ تھے۔ اچھے بھلے اپنا گھر چھوڑ کر مال اسباب سمیٹ کر یا بیچ کر آرہے تھے۔ محلہ اور گاؤں برابر خالی ہوتے جارہے تھے اور واپسی کا نام لو تو لڑنے پر تیار ہو جائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ میرا خیال ہے۔ آپ اب کیمپ جانا کم کر دیجیے اور ان کو آرام پہنچانے کے لیے زیادہ پریشانی نہ اٹھائیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ تکلیف سے مجبور ہو کر اگر وہ گھر واپس چلے جائیں تو یہ ان کی سب سے بڑی امداد ہو گی۔

بھائی صاحب[1] سے ذکر ہوا۔ انھوں نے بھی کہا کہ نہیں دیکھا جاتا تو نہ جاؤ۔ آخر وہ آکیوں رہے ہیں۔ حکومت ان کو روک رہی ہے۔ تم سب واپس کر رہے ہو۔ پھر چلے آرہے ہیں۔ تو تکلیف اٹھانے کو خود ہی جی چاہتا ہے۔ جب ہی تو آرہے ہیں۔

لیکن میں جانتی تھی۔ اقتصادی بائیکاٹ نے ان کی زندگی اجیرن کر دی ہے اور اسی سے گھبرا کر وہ بھاگ رہے ہیں۔ اسی لیے مجھے ہمدردی تھی۔ مہاتما جی سے بھی سب حال کہا۔ وزیر صحت تک خبر پہنچائی۔ دوائیں اور پلنگ کیلیے ڈاکٹروں سے اور لکھوایا۔ اور کچھ نہ کچھ پورا ہو گیا۔ کم از کم علاج کا بندوبست ہو گیا۔

ایک دن شہر سے تین صاحبان تشریف لائے۔ میں ان میں سے کسی کو نہ جانتی تھی مگر ایک صاحب کے نام کے آگے (آف برلن) سُن کر مجھے یاد آگیا کہ ان کی آواز سے تو قریب قریب

---

[1] رفیع احمد قدوائی۔

ساری دنیا واقف ہے۔ دوسرے ایک درگاہ کے امیدوار سجّادہ تھے اور تیسرے ایک تاجر۔ ان لوگوں نے آتے ہی ہمیں شہروں اور دیہات کے نمائندوں کو بلانے کے لیے کہا۔ لوگ آئے اور تینوں صاحبان نے بہت ہی بھونڈے طریقے سے ان کو شہر واپس جانے پر راضی کرنا چاہا۔ ایک بگڑے دل حکیم صاحب ذرا تیز تیز بولنے لگے۔ اور اس پر "آف برلن" کو غصّہ آگیا۔ وہ غصّہ کوئی معمولی نہ تھا۔ موصوف نے ساری لسانی صرف کر دی۔ زور زور سے میز پر ہاتھ مارے اور جھلّائے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ معاملہ اب خراب ہوگیا۔

انھیں دنوں ایک روز پاکستانی ہائی کمشنر آ گئے۔ وہ اکثر آیا کرتے تھے اور مجھ سے کئی بار ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ مگر اس دن کیمپ کے شورش پسندوں کی بات چیت سے میں کچھ ایسا جلی ہوئی تھی اور ان کے پروپیگنڈہ نے کچھ ایسی خراب صورت حال پیدا کر دی تھی کہ اسپتال کے اسٹاف اور ان کے معتقدین کے سامنے میں نے سوال کیا کہ براہ مہربانی ایک مسئلہ صاف کر دیجیے۔ کیا یہ کیمپ پاکستان کی طرف سے ہے؟ راشن، خیمہ اور کمبل پاکستان کی طرف سے تقسیم ہو رہے ہیں؟ یہ سب اسٹاف تنخواہ وہیں سے پا رہا ہے؟ ہر بات کا جواب انھوں نے نفی میں دیا اور کہا ہمارا کوئی تعلق اس کیمپ کی مالیات سے نہیں ہے۔ اس کیمپ میں بھی یہی صورت تھی۔ سب انتظام ہندوستانی حکومت کرتی ہے۔ ہاں ہمارے کہنے سے اسپیشل ٹرین کا بندوبست ہوتا ہے۔ روانگی اور حفاظت کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں اور رخصت ہونے والوں کو اجازت نامہ ہمارا آفس دیتا ہے۔ میں نے لوگوں سے کہا سن لو اپنے پروپیگنڈے کی حقیقت بیکار کیوں غریبوں کو بہکا کر بھاگنے پر مجبور کرتے ہو۔

ادھر کیمپ کے باہر ڈوگروں نے آفت مچا رکھی تھی۔ ہر آنے جانے والے سے پیسہ وصول کرتے۔ دو چار روپیہ سے لوگوں نے تھوڑا تھوڑا سودا لا کر بیچنا شروع کر دیا تھا۔ دکان داروں سے زبردستی چیزیں لے لیتے اور قیمت نہ دیتے۔

اسی طرح کی ایک شکایت لے کر میرے پاس ایک دکان دار آیا۔ کشور پاس کھڑی تھی۔ میں نے کہا لڑائی میں تو تم بہت تیز ہو۔ کبھی اسٹاف سے لڑتی ہو کبھی کیمپ کمانڈر سے ذرا اس غریب کے پیسے ملٹری والوں سے دلا دو تو جانوں۔ بیچارہ ٹٹ پونجیا رو رہا تھا۔ بیس آنے کی ماچس سگریٹ لے کر اس نے پی ڈالی تھی۔ یوں تو روز ہی وہ لوگ تھوڑا بہت لے لیا کرتے تھے، آج زیادہ لے لیا تھا اور وہ برداشت نہ کر سکا۔

کشور گئی اور تھوڑی دیر بعد خوش خوش واپس آئی۔ وہ حولدار سے لڑ کر آئی تھی۔

اسے خوب لعنت ملامت کر کے اس نے پیسے دلوائے۔ حوالدار نے دیکھا، لڑکی آفت ہے۔ کہیں آفیسروں کو خبر نہ کر دے۔ اس نے چپکے سے نکال کر دیدیئے۔

جامعہ کے لڑکے اب یہاں کی صورت حال سے بہت بد دل ہو رہے تھے۔ یہ کام یہ خدمت اور یہ فضا اب برداشت سے باہر تھی۔ مگر ان میں سے کئی آخر تک جمے رہے۔ دو شہر چلے گئے۔ کچھ نے پڑھائی شروع کر دی۔

شہر والے دونوں لڑکے شمس اور قیصر کسی کسی دن کیمپ آجاتے تھے۔ انھوں نے بڑے لطف کے ساتھ اپنی ہٹ دھرمیوں کی کہانی مجھے سنائی اور کہا کہ کیمپ کے کام سے آپ بھی عاجز ہیں، اب شہر آکر ہمارے ساتھ کام کیجیے۔ ادھر سبھدرا او تہ (جواب مسز جوشی ہیں) کئی بار مجھے بلا چکی تھیں کہ اب اصلی کام تو شہر میں ہے۔ کیمپ سے واپس کرنا دشوار ہے۔ محلہ میں روک لینا آسان ہے۔ اور اس وقت سب سے بڑی ضرورت امن قائم کرنے کی ہے۔ اس کے بغیر نہ کیمپ بند ہوگا، نہ بھگدڑ ختم ہوگی۔ اور پھر میں نے بھی یہی رائے قائم کر لی کہ اب مجھے شہر چلنا چاہئے۔

شمس اور قیصر نے جس مکان میں ڈیرہ جمایا تھا، وہ رحمانیہ اسکول کی خالی عمارت تھی۔ اتنا بڑا مکان جس میں درجنوں کمرے تھے زبان حال سے استاد اور طالب علموں کا مرثیہ خواں تھا۔ پڑھنے والے اور پڑھانے والے، سب پاکستان چلے گئے۔ باقی رہے نام اللہ کا! اب ہو کا عالم تھا، اور رفیوجیز قبضہ کرنے کے لیے ارد گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ مگر ان دو لڑکوں نے انتہائی ہمت اور دلیری سے اپنی راتیں اور دن وہاں گزارے۔ بم بھی پھینکا گیا اور دن بھر شر نار تھی گروہ گھسنے کی بھی کوشش کرتے مگر یہ آہنی عزم و ارادہ والے لوگ اپنے شیخ کے تربیت یافتہ تھے، بھلا کیا بھاگتے، بدستور ڈٹے رہے۔ دروازہ بند رکھا۔ چائے پی پی کر کمبخت پیٹ کو تسکین دی، مگر مکان نہ چھوڑا۔

جامعہ کے یوم تاسیس کے دن جو جلسہ ہوا تھا، اور اس میں شمس نے جو تقریر کی تھی اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے دماغ میں کوئی نئی کھلبلی مچ رہی ہے۔ یہ کہنا "کہ جامعہ نے پھیلے ہوئے کام کو سمیٹ کر ایک نقطہ پر اکٹھا کیا تھا۔ اب پھر وقت آگیا ہے کہ اسے پھیلایا جائے۔ گلی کوچوں میں پھیلایا جائے" بلا وجہ نہ تھا، کوئی اسکیم دماغ میں چکر کاٹ رہی تھی۔ عمل کے

شوقین نوجوان کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے اور ان کے ساتھی منزل کا پتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ساتھ دینا چاہتے تھے ۔

کس ندانست کہ منزل گہہ مقصود کجا است[1]

ایں قدر ہست کہ بانگے جرسے می آید

بہرحال ان کی ہمت دیکھ کر دو ایک ساتھی اور بھی آ گئے۔ گلی اور سڑک پر کھیلتے ہوئے بچوں کو بلا بلا کر کھیل کے بہانے اپنا رنگ جمانے کی کوشش شروع کر دی، جامعہ کے اخلاص احمد صدیقی اسکاؤٹ ماسٹر بھی پہنچ گئے۔ وہ پرانے کھلاڑی چٹکی بجانے میں بچوں کو پھسلا لینا، ان کا پرانا مشغلہ تھا، بہت جلد اپنے رنگ پر لے آئے اور چار دن میں بچوں کی تعداد بارہ ہو گئی۔

میں جب پہلے روز گئی ہوں تو بچے کھیل رہے تھے۔ گیلری میں کرسی ڈالے اسکاؤٹ ماسٹر بیٹھے تھے۔ محلہ کے مسلمان ڈر خوف کی وجہ سے نہ آتے تھے اور شرنارتھی، جو (پاس کے تمام کوارٹروں میں آباد ہو چکے تھے) دشمن سمجھ کر رخ نہ کرتے۔ یہی بچے ان سب کے مددگار بھی تھے۔ وہ اپنے گھروں سے چھپ چھپا کر زبردستی آجاتے مکان کی صفائی جتنی ان دو تین آدمیوں نے ممکن ہوا کر لی تھی مجھے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی، اور پھر دوسرے تیسرے دن جانا شروع کر دیا۔

لڑکوں نے کہا کہ اب آپ کا کام یہ ہے کہ محلہ میں امن پروپیگنڈا کیجیے۔ مسلمانوں کا خوف و ہراس کم کیجیے۔ رفیوجیز میں ہمارا اعتماد قائم کرا دیجیے اور ان لوگوں کو مجبور کیجیے کہ اپنے بچے یہاں بھیجیں جب ہندو مسلم بچے اکٹھا ہوں گے، تو امن آپ سے آپ ہو جائے گا اور یہ افراتفری کم ہو جائے گی۔

ہوشیار لڑکوں کی ہدایت کے مطابق میں نے محلہ کا گشت شروع کر دیا۔ کسی دن سبھدرا کے ساتھ ہو جاتی، اور کسی دن تنہا۔ مختلف لوگوں سے ملی۔ چھوٹے چھوٹے اجتماع کئے اور ان سے اپنی مدد آپ کرنے، اور ہمت قائم رکھنے کی درخواست کی۔ یہ تو کہہ بھی نہ سکتی تھی کہ حکومت پر بھروسہ کرو کیونکہ پراونشل گورنمنٹ کی طرف سے عام بدگمانی اور ناامیدی پھیلی ہوئی تھی اور یہ کچھ بے جا بھی نہ تھی۔ صوبہ کی حکومت نہ بھروسہ کے قابل تھی، نہ اس سے کوئی امید قائم کی جا سکتی تھی۔ اس

---

[1] ۔ کوئی نہیں جانتا کہ منزل مقصود کہاں ہے۔ بس اتنا ہے کہ دور سے پکار کی آواز آ رہی ہے یا قافلہ کے چلنے کی آواز آ رہی ہے۔

لیے ذمہ داری کے ساتھ عوام سے یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ تمھاری حفاظت ہو گی۔ مدد ہو گی، انصاف ہو گا۔ ہمیں خود کب یقین تھا، کہ یہ کچھ ہو گا۔ جو اُن سے کہتے۔

میں ان سے کہتی تھی کہ تمھارا خیال ٹھیک سہی، حکومت تم کو نکالنا چاہتی ہے، یہی سمجھ لو۔ لیکن کیا کسی کے کہنے سے تم اپنا گھر، اپنی چیز، اپنا حق چھوڑ دو گے؟

وہ ایک آدمی ہو یا حکومت، اپنے حق کے لیے۔ اپنے ملک کے لیے آخر تم میں لڑنے کا جذبہ کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ لڑے بغیر تو کسی کو کچھ نہیں ملا کرتا۔ اور لڑائی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ تلوار ہی ہو آخر انگریزوں سے کانگرس نے کیسے لڑائی لڑی۔ وہی عدم تشدد تمھارا بھی ہتھیار ہو سکتا ہے۔ تمھارا گھر، تمھاری عزّت۔ تمھارا ملک سب خراب ہو رہا ہے۔ اس کو برباد کرنے والے کسی کے بھی دوست نہیں ہیں۔ کسی کے بھی ساتھی نہیں۔ ان کا دھرم پیسہ ہے۔ شیطان نے ان کو ورغلا رکھا ہے، تم کیوں بہکے جا رہے ہو۔ جو ان سب چیزوں کو برا سمجھتے ہو۔ تمھارا کام صرف اتنا ہے۔ کوئی کچھ کہے۔ مارے یا زندہ رہنے دے۔ اپنے گھروں میں ڈٹے رہو۔ فتنہ۔ فساد نہ پھیلاؤ۔ اور ان کے ہاتھ مضبوط کرو جو امن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس باپ کی مدد کرو جو تم سب کی اس درندگی پر خون کے آنسو رو رہا ہے۔

یہ سن کر بڑی بحثا بحثی ہوئی۔ عورتیں ایک دم چیخ چیخ کر چھت سر پر اٹھا لیتیں۔ کچھ بکتی جھکتی برقعہ سر پر ڈال کر بھاگ کھڑی ہوتیں۔ کچھ لڑنے کھڑی ہو جاتیں۔ تمھارے اوپر پڑتا تب جانتیں، تمھارے بچے مرتے۔ گھر بار لٹتا۔ مالک مرتا تب چوٹ لگتی۔

لیکن مجھے ان دنوں غصہ نہ آتا۔ معلوم نہیں کہاں چلا گیا تھا بعض وقت خود بھی تعجب ہوتا کہ اتنی ٹھنڈی اور سلجھی ہوئی، تو میں کبھی نہ تھی۔

محلہ میں بری طرح مکان، دکانیں بیچ بیچ کر، پگڑی پر دے دے کر لوگ بھاگ رہے تھے، اور غریبوں کے سر اس کی وجہ سے اور بھی مصیبت آ رہی تھی۔ گلی کا کوئی متمول تاجر یا مالک مکان، دکان مکان بیچ کر یا ہزاروں روپیہ پگڑی کا لے کر پاکستان چلا جاتا اور اس مکان میں شرنارتھی آباد ہو جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پڑوس کے دس غریبوں کو اس نئے آدمی کی دھونس، جبر اور دھینگا مشتی اپنا مکان چھوڑنے پر مجبور کر دیتی۔ ان کا باہر نکلنا چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا۔

اس محلہ میں کانگرس لیبر سیکشن کام کر رہا تھا۔ ان سب نے شانتی دل کے نام سے ایک امن پسند گروپ بنا لیا تھا جو محلہ میں امن قائم رکھنے کے لیے ڈنڈا، بندوق، خوشامد اور عدم تشدّد سب سے کام لیتا تھا۔ شانتی دل میں سوشلسٹ خیالات کے لوگ زائد تھے۔ ہندو مسلم

امن پسند نوجوان بھی شامل تھے۔ ایسے لوگ جو اس مصیبت اور خطرے کے وقت پارٹی بندی کو بالائے طاق رکھ کر مشترکہ عمل میں نکل آئے تھے۔

اسی طرح کا ایک اور گروہ شہر کے خطرناک ترین علاقوں میں بھی کام کر رہا تھا اس میں سوشلسٹ، کمیونسٹ، کاکوری کیس کے سوٹما، اور سیواؤں کے والنٹیر سب ہی شامل تھے۔ میں ان کے اکثر ممبروں سے ملی تھی، اور ستمبر و اکتوبر کے بہت سے واقعات اپنے چشمدید انھوں نے مجھے بتائے تھے۔

رحمانیہ اسکول کے پھاٹک پر بہت جلد کئی سائن بورڈ لگ گئے۔ "مرکز اتحاد و ترقی" "بچوں کا کلب"۔ "شانتی دل" آفس وغیرہ اور میں ان تینوں کمروں میں دن کا بیشتر حصہ صرف کرتی تھی تھوڑے ہی دن بعد سہمے ہوئے مسلمان اتنے نڈر ہو گئے۔ کہ یہاں خود بھی آئیں اور اپنے بچوں کو آنے دیں۔ اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان میں اتنی ہمت ان کے بچوں نے پیدا کی۔ وہ ہی ان کو لے کر آتے تھے اور یہاں سے جاکر تعریف کرتے تھے۔

وہ چھوٹے اجتماع جو یہاں ہوتے رہتے تھے، اکثر مشورہ کے لیے ہوتے مگر ہراساں دلوں کے لیے اتنا سہارا ابھی بہت تھا، اور آہستہ آہستہ لوگوں کی دلچسپی اور اعتماد بڑھ رہا تھا۔ شانتی دل کی طرف سے ایک بڑے جلسے کا اعلان کیا گیا۔ مگر اس بڑے جلسے میں بمشکل سو آدمی شریک ہوئے۔

لوگوں نے مشکلات بیان کیں۔ کاروبار بند ہونے کا ذکر کیا۔ ہر وقت کے اندیشے کا ذکر کیا۔ اور پھر شمس نے بہت ہی جوشیلے انداز میں محلہ کے متمول اشخاص سے اپیل کی:

> کہ دو تین ہفتہ ہمیں اور کوشش کرنے کی مہلت دیدیجیے۔ امن[2] قائم ہو رہا ہے۔ بہت کچھ ہو بھی چکا ہے۔ ہم سب اور بھی جان توڑ کوشش کریں گے۔ فضا سازگار ہو رہی ہے۔ اتنی مہلت تو آپ کو ضرور ہی دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ بچوں کو یہاں آنے سے مت روکئے۔ کئی مہینے سے ان کی پڑھائی بند ہے۔ ہم عارضی طور پر ان کی پڑھائی کا بندوبست کریں گے۔ ان کا وقت بے کار سڑکوں پر گھوم کر

ع۱ ۔ چودھری بشیر جنگ بھی ان میں شامل تھے۔ جب امن و امان ہو گیا تو وہ ایسے روپوش ہو گئے کہ کبھی کبھی سال دو سال میں ان سے ملاقات ہو جاتی تھی اب وہ بھی نہیں۔

ع۲ ۔ ہم یہ کہتے تھے، لیکن شہر میں قتل ہو جاتے تھے ان کا خیال آتے ہی الفاظ حلق میں پھنس جاتے تھے۔

یا آپس میں لڑکر گزرتا ہے، ہم ان کے کھیل اور تعلیم دونوں کا پروگرام بنا رہے ہیں:

اس پر ایک صاحب اٹھے۔ انھوں نے حکومت۔ ورکرز۔ کانگرس سب کو لتاڑا۔ اور کہا کہ ہم دو ہفتہ انتظار کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ہمیں یہ یقین دلا دیا جائے کہ اگر اس وقت تک امن نہ ہوسکا تو ہمارے ساتھ مسٹر قدوائی اور مولانا آزاد بھی ہندوستان سے ہجرت کر جائیں گے۔ میں کہے دیتا ہوں، مسلمان اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ حکومت اس کو رکھنا نہیں چاہتی۔ دلی سے نکالنا مقصود ہے۔ ہندو راج بنانے کا منصوبہ ہے اور ہم خود رہنا نہیں چاہتے۔

مقرر صاحب نے حکومت کے مظالم کی لابنی داستان چھیڑ دی۔ ان کی گرما گرم تقریر نے بہت سے دل جلوں کو خوش کیا۔ انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ پولیس اور فوج نے، افسروں نے اور پڑوسیوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ کیا ہے۔

جب وہ کہہ چکے تو میں نے عرض کیا:

کہ جناب نے حوالے تو قرآن حدیث سب کے دے ڈالے۔ مسلمانوں کی تاریخی روایات کا بھی ذکر کیا، اور پدرم سلطان بود، کا راگ بھی الاپا۔ لیکن کیا آپ مجھے قرآن شریف میں سے کوئی ایسی آیت بھی سنا سکتے ہیں جس میں یہ حکم ہو کہ جب تمھیں کوئی تمھارے گھروں سے نکالے۔ تمھارا مال اسباب لوٹے۔ تم سے لڑے تو تم بھاگو، بے زکان بھاگو۔

میں اپنے محدود علم کی بنا پر کہہ سکتی ہوں، کہ میں نے تو اب تک جو کچھ پڑھا ہے، اور سمجھا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اپنے حق کے لیے مقابلہ کرو۔ ثابت قدم رہو۔ اللہ سے مدد مانگو! میرے عزیز بھائی۔ اگر ایسی کوئی آیت یا حدیث لے آئیں تو میں بھی بھاگ چلوں۔

اس کے علاوہ مجھے افسوس ہے کہ بھائی صاحب کی یہ خواہش کہ ان کے مسلم وزیر ان کے ساتھ جائیں، شاید پوری نہ ہو سکے گی۔ ان کی فکر بھی بے کار ہے۔ ان کو یہیں جینا اور مرنا ہے اپنے ملک میں، اور اپنے ملک کے لیے۔ بھاگے وہ جس کے لیے یہاں ٹھکانا ہو اور دوسری جگہ نہ ہو۔ ان کو تو اندیشہ ہے کہ موت دنیا کے ہر حصہ میں وقت مقررہ پر ضرور آئیگی۔ خیر، وہ تو بڑے لوگ ہیں۔ آپ مجھ سے کہیے تو شاید میں بھی اس پر عمل نہ کر سکوں۔ کیمپ میں کالرا، یا ہیضہ سے، راہ میں، ٹرین پر، غنڈوں کی تلواروں یا پولیس و فوج کی گولیوں سے پھر لاہور کی سڑکوں پر بھکاری بن کر، فاقہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے

توہزار درجہ اچھا ہے کہ بہادری سے اپنے گھر میں جان دوں۔ میرے مرشد گاندھی جی نے بھی یہی سکھایا ہے۔

اور میں آپ سے یہ تو کہنے بھی نہیں آئی ہوں کہ حکومت آپ کو بچائے گی۔ جناب موت ہے، خطرہ ہے۔ سب کچھ ہے۔ اگر آپ مسلمان ہیں تو خدا پر بھروسہ کیجیے، ورنہ پھر اسلام کا نام نہ لیجیے۔ میں زندگی کی طرف، نہیں عزت کی موت کی طرف آپ کو بلاتی ہوں، تشدد اور نفرت کی طرف نہیں، عدم تشدد اور محبت کا بلاوا لے کر آئی ہوں۔ کیا اب بھی آپ لوگ باپو کی آواز، ان کی پکار نہ سنیں گے، یہ جو کچھ ہوا ہے، اور ہو رہا ہے، اگر یہ قہر الٰہی ہے، تو اس سے بچ کر آپ کہاں جائیں گے؟ وہ تو ہر جگہ آپ کو گھیرے گا۔ بہتر صورت یہی ہے کہ رضائے الٰہی کے سامنے جھک جائیے۔ اگر وقت پورا نہیں ہوا ہے۔ زندگی باقی ہے، تو اسے ختم کرنے کی طاقت کسی انسان میں نہیں۔ استقلال، پامردی و ہمت سے اس مصیبت کا مقابلہ کیجیے۔

غرض خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور بھاگ دوڑ میں تھوڑی سی کمی واقع ہو گئی۔ شانتی دل، کانگریس کمیٹی، اور مرکز اتحاد و ترقی، تینوں نے مل کر محلہ کی باگ ڈور تھام لی۔

"اتحاد و ترقی" ناظرین نے اس کا تذکرہ اخباروں میں پڑھا ہو گا۔ لکھنؤ میں ہندوستان کے مسلمانوں نے جمع ہو کر، مولانا آزاد کی رہنمائی میں اس تحریک کو جنم دیا تھا۔ وہ خوف و ہراس۔ بے اطمینانی و بے چینی جو اس وقت مسلمانوں میں عام ہو رہی تھی، اس کا یہ حل سوچا گیا تھا اور سارے دیس میں اس کی شاخیں پھیلا دینے کا منصوبہ باندھا گیا تھا۔ مولانا صاحب کے حکم سے جامع مسجد کے قریب ایک بڑے مکان میں "اتحاد و ترقی" کا ایک سائن بورڈ لگا کر ایک مشہور ادیب اور ایک سابق نازی مقرر کو اس کا انچارج بنا دیا گیا تھا۔ لڑکوں نے سوچا، ہم بھی اس کو اپنا لیں۔ مستقبل کے کام اور انجام دونوں پر اس وقت پردہ پڑا ہوا تھا۔ نوجوانوں کا ایک گروہ تھا جس کی کوئی منزل متعین نہ تھی مگر جو اس صورت حال سے بیزار تھا۔ ان کے کانوں میں آہیں اور چیخیں گونج رہی تھیں اور وہ اپنے کانوں میں انگلیاں بھی نہیں دینا چاہتے تھے، بلکہ سن کر سمجھنا اور مدد کو پہنچنا چاہتے تھے۔ مکان پر زبردستی قبضہ بادی النظر میں تو ہٹ دھرمی ہی ناظرین کو نظر آئی ہو گی مگر یہ وہ لوگ تھے، جو شام کے اندھیرے کو چیر کر، صبح کی روشنی کو کھینچ لانا چاہتے تھے۔ وہ اس مرتے اور

سسکتے ہوئے سماج کو پیروں تلے روند کر نئے زمانہ کا استقبال کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جو کچھ ہوا، اس کا الزام انگریز کے سر رکھ دینے سے نہ واقعات کی حقیقت کو جھٹلایا جاسکتا ہے، نہ زخموں پر مرہم رکھا جاسکتا ہے۔ یہ سیاسی بازیگری۔ یہ شطرنج کی بساط پر مہرے لڑانے والے۔ قوم کی ٹوٹی پھوٹی دیوار پر پلاسٹر کر کے اس کو کچھ دن کے لیے چکنا تو کر سکتے ہیں، مگر اس کی سالخوردہ بنیادوں کو جو ڈھ جانے کے قریب ہیں، مضبوط اور پائدار نہیں بنا سکتے۔

اس لیے انھوں نے بڑے تناور درختوں کے گرنے پر افسوس نہ کیا جھولتی ہوئی سیاست کی پینگوں نے اپنا دامن بچایا اور عافیت کی جگہ ڈھونڈھ کر محنتی مزدور، اور سبز منڈی مالی کی طرح نئے پودے لگانے اور تعمیر کے لیے نئی اینٹیں تھاپنے کی ٹھان لی۔

"**اتحاد و ترقی**" کی اسکیم شہر میں کہاں تھی؟ اس کا کرتا دھرتا کون تھا، اور اس نے کتنی کامیابی حاصل کی؟ یہ تو سب مجھے معلوم نہیں۔ میری نظر محدود تھی، اور دائرۂ عمل اس سے زیادہ محدود۔ مگر اتنا جانتی ہوں کہ پہلی ہی منزل پر، ان دو مشہور ہستیوں میں اس پر جھگڑا ہو گیا کہ کرسی اور الماریاں کیسی خریدی جائیں؟ کون سا کمرہ کس کام کے لیے مخصوص ہو؟ اور سب سے زیادہ اختلاف اس بات پر ہوا کہ چپراسی رات کو یہاں سوئیں یا اپنے گھروں میں؟ ایک ادیب، ایک مقرر، ایک نازی، ایک کانگریسی۔ نظریوں کا ٹکراؤ ہو گیا۔ زندگی کی قدریں، ایک دوسرے سے لڑ پڑیں، اور ان میں سے ایک صاحب نے اپنا بوریا بستر باندھ لیا۔

لیکن "اتحاد و ترقی" کے نام سے دو ماہ ہمارے ساتھی کام کرتے رہے، اور جلد ہی ہمیں موقع مل گیا کہ اتحاد و ترقی کا سائن بورڈ ہٹا کر "تعلیم و ترقی" لکھ دیا جائے اور جامعہ کی یہ پرانی اسکیم جس کا فسادات سے پہلے صرف ایک جگہ قرول باغ میں تجربہ کیا گیا تھا یہاں شروع کر دی جائے[1]۔

صبح سے لے کر شام تک بیسیوں مسائل در پیش ہوئے۔ سینکڑوں آدمی اپنی اپنی درخواستیں

---

[1] ۔ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم نے یہ تحریک قرول باغ میں جامعہ ملیہ کے اسکول اور مکتبہ کے ماتحت شروع کی تھی۔ اس تحریک نے اڈلٹ ایجوکیشن یعنی بالغوں کی تعلیم کے سلسلہ میں بھی بہت کام کیا اور بالغ نو آموختہ لوگوں کے لیے کافی لٹریچر ہر موضوع پر فراہم کیا تھا۔

لے کر آئے اور ہمارے نوجوان ان کی مدد کے لیے دوڑتے رہتے۔ کام کرنے والے بہت کم تھے اور ابھی تک ہماری رسائی رفیوجیز تک بھی نہ ہو سکی تھی، اگرچہ ان کے بچے کھیلنے کے لیے آنا شروع ہو گئے تھے حتیٰ کہ قرول باغ تک سے جامعہ اسکول کے پرانے طالب علم آجایا کرتے تھے۔

اس مشکل کا ذکر ایک دن ڈاکٹر کچلو[1] صاحب کے سامنے کیا، وہ بچارے اپنوں کے ستائے ہوئے اور غیروں سے نالاں خانما برباد ان دنوں ہمارے یہاں مہمان تھے، ان کے پاس بہت سے لڑکے لڑکیاں ہندو سکھ آتے رہتے تھے۔ آج بھی پنجاب کے عوام ان پر اعتماد کرتے تھے۔ بچے ان سے محبت کرتے تھے، اور دوست ان کو دوست سمجھتے تھے، ایک کمرہ میں بالکل خاموشی کے ساتھ سکون سے زندگی گزارنے کا عہد کر لیا تھا جو دن بھر میں بیسیوں بار ٹوٹتا لڑکے غول کے غول آتے۔ مجھ سے اکثر وہ شہر کی حالت دریافت کرتے تھے۔ ہماری اس مشکل میں انھوں نے مدد کرنے کا وعدہ کر لیا، اور انٹرنیشنل اسٹوڈنٹ کانگرس کے آٹھ لڑکے ان کے حکم سے ہمارے ساتھ آگئے۔

گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا کہ تین ماہ سوشل سروس کرنے کے بعد ہر لڑکا ڈگری لینے کا مجاز ہو جائے گا، اور ان کی سال بھر کی محنت برباد نہ ہو گی۔

بڑے انہماک کے ساتھ انھوں نے کام شروع کر دیا، اور ان کے ذریعہ سے ہماری رسائی شرنارتھیوں تک ہو گئی۔ انھیں دنوں مسز ساوتری بھارگوا اور سچیتا کرپلانی نے آکر تعلیمی مرکز کو دیکھا۔ بچوں کی عارضی پڑھائی، ان کا کھیل۔ ان کی یک جہتی دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ سچیتا جی کو خاص کر بہت تعجب تھا کہ پناہ گزینوں کے بچے یہاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ آپس میں محبت بڑھانے کے لیے ہم مسلم بچوں کی طرف سے ہندو بچوں کو، اور ہندو بچوں کی طرف سے مسلم بچوں کو مٹھائی۔ کھلونے وغیرہ پہنچائیں، تو یہ چیز بھی امن قائم کرنے میں مدد کرے گی۔

تجویز معقول تھی اور ہم اس پر عمل کرنے میں بالکل دیر نہیں کی۔ دوسرے ہی دن کھیل لے کر ہم[2] نے ویول کینٹین جانے کا قصد کیا۔ خیال تھا کہ بچوں کو بھی لے چلیں مگر حالات

---

[1] - ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ امرتسر سے اجڑ کر اور لاہور میں مسلمانوں کے ہاتھوں پٹ کر جان بچا کر گاندھی جی سے ملنے آئے تھے۔ پھر یہیں رہ پڑے، یہیں مرے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اطمینان بخش نہ تھے، اس لیے ذرا دل دھڑکا، اور انھیں ساتھ نہ لیا۔

اسٹیشن پر اترنے والے ہزاروں ہندو سکھ پناہ گزیں عورتیں مرد بچے زمین پر ٹاٹ وغیرہ بچھائے ہوئے کینٹین میں پڑے تھے۔ سیکڑوں بچے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ بچارے معصوم بچے، انسان کی حیوانیت کا شکار گھروں سے محروم، خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ عورتیں ٹھیک کہتی تھیں:

"اس سے تو غلامی اچھی تھی۔ ہمارا ایک گھر تو تھا جہاں بچوں سمیت ہم سر چھپائے عزت کے ساتھ بیٹھے تھے۔ یہ کیسی آزادی ہے کہ ہم سڑکوں پر رلتے پھر رہے ہیں۔"

دیول کینٹین کے مہتم نے ہماری مدد کی، اور بہت ہی خلوص کے ساتھ اس رسم کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے فوراً تمام بچوں کو تین چار صف میں بٹھال دیا اور میز پر پھلوں کا ڈھیر لگا کر ہم سے کہا کہ اب تقسیم کیجیے۔ مگر تقسیم سے پہلے مجھے پیار اور سلام بھی پہنچانا تھا۔

میں نے بچوں سے کہا کہ

"میں ان مسلم بچوں کی طرف سے جو تمھاری طرح پیارے اور معصوم ہیں، جو کھیلنا چاہتے ہیں لڑنا، جھگڑنا نہیں چاہتے، تمھارے لیے ان کی طرف سے محبت اور پیار لائی ہوں۔ وہ سب تم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ ہمارے ماں باپ اور تمھارے ماں باپ سب جھگڑالو ہیں، لڑاکا ہیں۔ مارتے ہیں۔ نکالتے ہیں، مگر ہم تم سب بچے ہیں، اور بچے نہ ہندو ہوتے ہیں نہ مسلمان۔ وہ تو صرف بچے ہیں اور مل جل کر کھیلتے ہیں، اس لیے آؤ ہم تم سب ایک دوسرے سے ملیں، اور ایکا کر لیں۔"

بچے بہت خوش ہوئے مجھے امید نہ تھی کہ اتنی مسرت مجھے وہاں دیکھنے کو ملے گی۔ وہ سارے بول اُٹھے۔ "ہم ضرور چلیں گے اور اُن کو اپنا بھائی بنا لیں گے۔"

ایک جگہ کی کامیابی نے حوصلہ بڑھا دیا۔ عارضی اسکولوں نے جو اسٹوڈنٹ کانگرس کے

ع۲۔ ہیں اور ساوتری۔

ع۳۔ دیول کینٹین ایک عارضی کیمپ تھا جہاں پاکستان سے آنے والے شرنارتھی چند دن گزار کر کسی گاؤں یا محلہ میں بھیج دیے جاتے تھے۔ مصیبت زدوں کا ایک جنگل۔ ایسا دہناک منظر کہ قدم قدم پر آنسو روکنا مشکل تھا۔

لڑکے لڑکیاں چلا رہے تھے، ایک دوسرے کے یہاں پھل، غبارے، مٹھائی وغیرہ بھیجی، اور خلوص و محبت کے پیغام!

میں نے جا کر باپو کو بھی یہ خبر سنائی مگر وہ، ان دنوں نہ جانے کیسے ہو رہے تھے' ان کے تبسّم میں اب وہ سچی خوشی باقی نہیں تھی، جو ہمیشہ جھلکا کرتی تھی، ان کی ہر بات، ہر جملہ جیسے غم میں لپٹا ہوا ہوتا۔ وہ کچھ کہتے' اور مجھے ایسا لگتا، جیسے:

"میں ہوں اپنی شکست کی آواز"

لیکن پھر بھی انھوں نے اس چیز کو پسند کیا، اور خوش ہوئے۔

اب تو کئی کئی دن گزر جاتے اور میں پرارتھنا میں بھی شریک نہ ہوتی تھی۔ اتنی لاپروائی کیوں پیدا ہو گئی تھی، اب افسوس ہوتا ہے۔ کاش ہر روز جاتی۔

بہرحال میرے ساتھیوں نے یہ طے کیا کہ تمام عارضی اسکولوں کے بچّوں کو ایک ساتھ دعوت دیں اور یہاں صرف بچوں کا اجتماع ہو۔ تیاریاں شروع کر دی گئیں۔

حیرت انگیز تیزی سے حالات بدل رہے تھے۔ اب مرکز کے سامنے والے کمرہ میں جہاں ایک میز پر تازہ اخبارات اور رسالے رکھے رہتے تھے، لوگ مستقل آتے جاتے رہتے گھنٹوں بیٹھ کر اخبار پڑھتے۔ بات چیت کرتے۔ عورتیں اور مرد دونوں اپنی اپنی دشواریوں میں ہم سے امداد اور صلاح لینے لگے۔ آہستہ آہستہ قومی و مذہبی سوال ختم ہو رہا تھا۔ مسلمان اعتماد، خوشی اور شوق کے جذبات لیے وہاں آتے، پناہ گزین خوشی خوشی اپنے بچّوں کو اسکول میں داخل کراتے۔ ہندو عورتیں بے دھڑک اندر آجاتیں۔ بے تکلف ہو کر باتیں کرتیں، اور ہم لوگ انھیں ہمدرد اور اپنے آدمی دکھائی دیتے۔ وہ مجھے پاکستان میں اپنے اوپر بیتی ہوئی داستان سناتیں، شرمناک مظالم کی کہانیاں بیان کرتیں، اور اس وقت ان کے چہرے رنج اور غصّہ سے سرخ ہو جاتے۔

مگر جب میں نے یہ کہا کہ وہ لوگ انسانیت کے دشمن ہیں۔ ہمارے آپ کے دونوں کے دشمن ہیں۔ چاہے وہ جس مذہب کے نام لیوا ہوں، اس سے کوئی غرض نہیں، ہمارا محاذ تو ایسے ہی دشمنوں کے خلاف ہے جنھوں نے نیکی کو چھوڑ کر بدی کی پوجا کی ہے۔ خدا کو بھول کر شیطان کا تتبع کیا ہے، اور بھرے پرے دیس کو لوٹ کر ویران کر دیا ہے، اور آدمیت کو مار کر حیوانیت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں، یہ سن کر وہ سب ٹھنڈے پڑ جاتے، اور دوستانہ بات چیت شروع ہو جاتی!

میں تجربہ کر رہی تھی، اور ان غصہ سے بھرے ہوئے لوگوں پر محبت کا تیر چھوڑ کر جب چہروں پر مسکراہٹ دیکھ لیتی، تو ایسا لگتا جیسے کوئی دولت مل گئی ہو۔

ایک مستعد، سکھ لڑکا ترلوک سنگھ، جوان ہنگاموں میں اپنے باپ کو کھو چکا تھا، ہمیں بہت عزیز تھا۔ اتنا بھولا۔ ذہین مگر چست آدمی تھا کہ جو کام کرتے دوسرے لڑکے ہچکچاتے ہم اس کے سپرد کر دیتے۔ شمس ذرا فلسفی واقع ہوئے تھے۔ سارا انتظام لکھنا، پڑھنا، حساب، کتاب، اسکیم اور بجٹ، سب ان کے سپرد تھا۔ قیصر عجیب معجون مرکب تھے کام کے لحاظ سے بڈھے خرانٹ، مگر صورت اور حرکتوں میں بالکل بچّہ۔ اور بچّوں کے محبوب ترین استاد بھی وہی تھے۔ سارے کھیل ان ہی کی نگرانی میں ہوتے، جلسہ، میلہ اور ساری ہڑبونگ اکثر انھیں کے دماغ کی اپج ہوتی۔ اسکاوٹ ماسٹر پاکستان چلے گئے تھے۔ اوکھلے سے استاد اور طالب علم وقتاً فوقتاً آیا کرتے تھے، اور نئے رنگروٹ ان سے ٹریننگ حاصل کرتے۔ میٹرک۔ بی۔ اے اور ایف۔ اے میں پڑھنے والی کئی پناہ گزیں لڑکیاں بھی اب استادوں میں شامل تھیں۔ ترلوک سنگھ بھی پڑھاتے تھے۔ مسٹر بناری۔ دبلے، کالے، میز کے پاس بیٹھے ہوئے یا علمی اور سیاسی مباحثہ کرتے رہتے، یا پھر اپنے ساتھیوں کی فرضی ڈائری پر دستخط کرتے۔ وہ پارٹی کے سکریٹری تھے اور ان کے اکثر ساتھی صبح نہا دھو کر، سوٹ پہن کر دیر تک ٹہلنے کے لیے آجایا کرتے تھے جن کی ڈائریوں پر دستخط کرنا ضروری تھا۔ کبھی کبھی میں ان کو سائیکل پر کسی گاؤں کی خبر لینے دوڑا دیتی جہاں سے وہ ہمیشہ لڑ کر واپس آتے۔

قیصر مرکز کے لیے دیواری اخبار۔ بچوں کا اخبار اور پوسٹر وغیرہ تیار کرتے اور بچّوں کو سمیٹتے۔ ہریش اور جبار وغیرہ بہت سے لڑکے ان کی ہدایات پر عمل اور ان کی مدد کرتے اور شمس ان سب ٹکڑوں کو جوڑ کر نظم و ترتیب کے ساتھ نمایاں شکل عطا کرتے۔ ناظم وہی تھے۔ یہ تمام لڑکے، لڑکیاں۔ والنٹیر۔ چپراسی۔ طالب علم۔ مہتر اور سب کچھ تھے، اور میں ان بہت سے بچوں کی ماں۔

ان لڑکوں نے امن قائم کرنے میں جو محنت کی ہے، اس کا اقرار کانگرس والے ہرگز نہ کریں گے۔ مگر وہ یہاں تھے ہی کہاں جو دیکھتے۔ وہ برلا ہاؤس میں یا گورنمنٹ ہاؤس میں یا پراونشل کانگرس کے آفس میں ہوں گے۔ یہاں گلیوں اور محلوں میں تو میں انھیں ڈھونڈھتی ہی رہی۔

اور پھر شُبھدرا اٹھی، جو دیوانہ وار امن قائم کر دینے پر تلی ہوئی تھی۔ دبلی۔ پتلی۔ زرد۔

کمزور سی لڑکی، مگر بلا کی سخت جان۔ گاندھی جی کی عاشق زار۔ مگر اہنسا سے بد دل۔ دن رات شہر کی گلیوں میں ستمبر سے پھر رہی تھی۔

وہ محلوں سے پرانے کھاگ کھینچ کر لائی، اور ان سے شانتی دل میں کام لیا۔ نہ جانے اس کی شخصیت میں کیسی لچک تھی کہ لیگی اور سنگھی دونوں اس کے ساتھ ہو گئے۔ مسلم محلوں میں وہ ان کی ڈیوٹی لگا دیتی۔ وہ ساری رات کھڑے پہرہ دیتے، مگر در پردہ گڑبڑ بھی کرتے۔

وہ خوب سمجھتی اور ان کی ظاہر داری پر ہنستی تھی۔ مذاق اڑاتی تھی مگر کام لے لیتی تھی۔ انسان کتنا اقتدار پرست اور ابن الوقت ہوتا ہے۔ صرف یہ خیال کہ سبھدرا کی رسائی باپو اور پرائم منسٹر تک ہے بڑے بڑوں کو میدان میں لے آتا تھا اور یہ اندازہ کہ حکومت کا رجحان اب مسلمانوں کو بچانے کی طرف ہے، بہتوں کو راستہ بدل لینے پر مجبور کر دیتا۔ وہ کہتے۔ بھئی موقع مصلحت دیکھو۔ اس وقت حکومت کی مدد کرنا چاہیے۔ وہ بھی آ گئے جو آج بھی دل سے پکے فرقہ پرست تھے، اور وہ بھی جو اپنی کمزوری یا کنجوسی کی وجہ سے ستمبر میں غیر جانبدار بنے رہے تھے۔

اور پھر گاندھی جی کا برت شروع ہو گیا۔ کس قیامت کا مہینہ تھا، جنوری۔ اس ایک مہینے میں کیا کچھ ہو گیا۔ تمام وہ طاقتیں، جو بدی کے بے اندازہ دباؤ سے بس کر رہ گئی تھیں، وہ بھی جو شیطانی قوت سے ہار مان کر سرنگوں ہو چکی تھیں، اور وہ بھی جو اس شکنجہ میں جکڑی ہوئی رہائی کے لیے تڑپ رہی تھیں، بندھن توڑ کر نکل پڑیں۔ شاید گری ہوئی عمارت کا ملبہ ہٹا کر انسانیت ابھر آئی۔ ابھی تک تو ؎

"تخریب نے پرچم کھولے تھے، دم توڑ رہی تھیں تعمیریں"

مگر اب تعمیری قوتیں اکٹھی ہونی شروع ہو گئیں۔ سچائی نے سینوں میں کروٹ لی۔ محبت تڑپ کر باہر نکلی اور شانتی کی دیوی نے فساد کے بھوت سے اپنی گردن چھڑا لی۔

برت کے پہلے ہی دن برلا ہاؤس سے بجلی کی سی ایک لہر آئی اور سارے شہر میں پھیل گئی۔ ابھی تھوڑے ہی دن ان واقعات کو گزرے ہیں، مگر لوگ پوچھتے ہیں 'برت سے کیا فائدہ ہوا؟ اس سے کیا اثر پڑا؟ جان بھی گئی!

۱ع - (حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) سبھدرا پراونشل کانگرس کمیٹی کی ممبر تھیں۔ ان دنوں شہر میں ایک چھوٹی سی جماعت "شانتی دل" کے نام سے بنائے ہوئے امن قائم کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہی تھیں۔

میں ان آنکھوں کو کیسے کچھ دکھا سکتی ہوں۔ جو دیکھنا ہی نہ چاہیں، لیکن یہ میری آنکھوں دیکھا حال ہے کہ برلا ہاؤس سے نکل کر ہم جو شہر پہنچے ہیں، تو انداز بدلا ہوا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں میں ندامت تھی، گردنیں جھکی ہوئی تھیں، آنکھیں نم تھیں۔ اور ہر جگہ یہی ذکر تھا کہ باپو نے برت رکھ لیا۔

سب سے زیادہ بدتر حالت کانگریسی بھائیوں کی تھی۔ جھوٹی ہمدردی نے ان کے ایمان واخلاق کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ باپو کا پڑھایا ہوا سبق کچھ دنوں سے انھوں نے بھلا رکھا تھا۔ انتقام کی آگ بھڑکانے والے خود وہ بھی تھے، اور انھیں کے انحطاط وزوال نے باپو کو زیادہ چوٹ پہنچائی تھی۔ وہ تو امید کرتے تھے کہ ایک گروہ جوان کا ساختہ پرداختہ ہے، اس کے قدم نہ ڈگمگائیں گے، وہ پہاڑ کی طرح اٹل رہیں گے، وہ بہتے دھارے میں کود کر انسانیت کو نکال لے جائیں گے، ان ہی نے انصاف، سچائی اور محبت کا گلا گھونٹا۔ اس کشتی کا ناخدا دیکھ رہا تھا کہ کشتی میں سوراخ کرنے والے سب لیٹرے۔ غنڈے، اور پاگل ہی نہیں، اس کے اپنے بچے" بھی ہیں۔ اور اب اس وقت یہ احساس، یہ فکر اور ضمیر کی نیش زنی ان کو مارے ڈالتی تھی کہ کہیں باپو کے ہتیاروں میں ان کا نام بھی نہ لکھ جائے۔

مردے قبروں سے نکل پڑے۔ سوئی ہوئی روحیں، اور کھوئی ہوئی نیکیاں جاگ پڑیں ہر ایک نے اپنا مسکن چھوڑ دیا۔ پروگرام تیار ہوئے۔ اسکیمیں بنیں اور ہر آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے سبھدرا کے ساتھ گشت کا پروگرام بنایا۔ برت کا پہلا ہی دن تھا۔ ابھی ابھی دعا میں شرکت کر کے آ رہی تھی۔ دل ویسے ہی ٹوٹا ہوا تھا۔ راستہ میں باتیں ہو رہی تھیں کہ اب کام کی نوعیت کیا ہو، کون سا راستہ اختیار کریں؟ سبھدرا جیپ چلا رہی تھیں۔ جوں ہی ہم عیدگاہ سے گزر کر قصاب پورہ کے سامنے والی سڑک پر پہنچے ہیں۔ کہ دور ہی سے ہم نے دیکھ لیا۔ ایک ٹرک روانہ ہو گیا، اور دوسرے پر سامان لدر ہا ہے عورتیں اور بچے سوار ہو رہے ہیں۔

میں نے کہا۔ سبھدرا۔ معلوم ہوتا ہے۔ آج یہ محلہ بھی اُجڑا!

انھوں نے کہا۔ ہاں، لگتا تو ایسا ہی ہے، ان کو روکنے کی کوشش کریں نا؟

"ضرور" میں نے جواب دیا۔ ویسے کیمپ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہزاروں کے قافلے دیہاتوں سے آچکے ہیں۔ اب اس محلہ کے تین، چار ہزار پہنچ گئے، تو اور بھی آفت آجائے گی، آخر کہاں تک آدمی اس میں سمائیں گے؟

جیپ رکی۔ سبھدرا کو اس علاقہ میں کون نہیں جانتا۔ اسے دیکھ کر سب ہی قریب آگئے حال

پوچھا تو لوگوں نے بتایا۔ "پچ پچ محلہ خالی کر دینے کا ارادہ ہے۔ ایک ٹرک جا چکا ہے، دوسرا بھرا جا رہا ہے۔

انھوں نے کہا۔ چار ماہ سے ہم اپنے گھروں میں ہر مشکل اور مصیبت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ مگر اب عاجز آ کر نکلے ہیں۔ ان چار مہینوں میں ساری جمع جتھا ہم نے ختم کر ڈالی۔ سب پونجی کھا ڈالی۔ اب کچھ بھی نہیں رہ گیا۔ تو مجبوراً پاکستان جانے کی سوچی ہے۔ کاروبار بالکل بند ہے۔ جب کوئی کام نہیں، دھندا نہیں، آمدنی نہیں، تو زندگی کیسے کٹے گی۔

آپ تو جانتی ہیں، ہمارا روزگار ہی گائے، بکریوں کا گوشت اور کھال فروخت کرنا ہے۔ اب گائے کے شبہ میں بکری کا گوشت بھی بیچنے نہیں دیتے۔ دو تین آدمی مارے جا چکے ہیں، اور اس سامنے والی گلی سے گزرنا رفیوجیز نے مشکل کر دیا ہے۔ بالکل محلہ کے اندر قید ہو کر رہ گئے ہیں۔

وہ کہہ رہے تھے، اور میں سوچ رہی تھی تو یہ سب بھی کیمپ پہنچیں گے۔ وہاں چادروں کی چھت کے نیچے راتیں گزار کر نمونیہ اور بخار میں مبتلا ہوں گے اور ان میں کے آدھے تو یہیں مر جائیں گے پھر ٹرین پر سوار ہونے میں کچھ کچلے جائیں گے۔ کسی کے بچے چھٹ جائیں گے کسی کی بیوی۔ اسٹیشن پر کچھ سامان پولیس چھین لے گی۔ کچھ یہ کیمپ میں بیچ کر کھائیں گے کچھ مشرقی پنجاب سے گزرتے ہوئے ڈاکو لوٹ لیں گے، اور پھر لاہور پہنچ کر یہی جاڑا، یہی دکھ، یہی پولیس اور غنڈے، جیسے نظر میں سارے سین پھر گئے ــــــ یہ تندرست نوجوان یہ مستعد عورتیں۔ یہ راسخ العقیدہ بڈھے۔ یہ سب تڑپ تڑپ کر موت کو بلائیں گے۔ دانے دانے کو ترس کر جان دیں گے۔ اپنے دو منزلہ مکانوں کو چھوڑ کر جانے والے ایک خیمہ اور ایک کمبل کے لیے بھکاریوں کی طرح گھنٹوں ہمارے پیچھے لگیں گے۔ راستہ نکلنا مشکل کر دیں گے اور پھر عاجز آ کر ہم انھیں دھتکار دیں گے ــــــ

ہم نے محبت اور خلوص کے ساتھ ان سے اپیل کی، اونچ، نیچ سمجھاتی، اور کہا کہ آپ سب گھروں کو واپس جائیے۔ مظلوموں کی مدد کرنے والے باپو ابھی موجود ہیں۔ ہم لوگ برلا ہاؤس سے آ رہے ہیں۔ باپو نے جان کی بازی لگا دی ہے۔ یا دلی میں امن ہو گا اور یا وہ جان دیدیں گے۔ امن رکھنے میں آپ بھی مدد کر سکتے ہیں۔ اس طرح کہ بھاگ کر خوف و دہشت نہ پھیلائیے۔ اتنے بڑے محلہ کا اجڑنا دیکھ کر دوسری جگہ افراتفری مچ جائے گی۔

کیا باپو کی جان آپ کو عزیز نہیں۔ ہمارا امن اس قابل رکھیے کہ ہم ان سے کہہ سکیں کہ دلی میں امن ہے۔ مسلمان اب نہیں بھاگ رہے ہیں۔ اپنے گھروں میں اطمینان سے بیٹھے ہیں۔

آپ تو بہادر قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمّت قائم رکھیے، اور ان سب مشکلوں کا مقابلہ مردانہ وار کیجیے، بہت جلد حالت بدل جانے والی ہے۔ حکومت ہرگز کسی کو نکالنا مارنا نہیں چاہتی، اس کا یقین کیجیے۔ بہادر ایک مرتبہ مرتا ہے، اور بزدل سو مرتبہ۔

ہم دونوں نے وعدہ کیا کہ ان کی ہر مشکل کا حل ڈھونڈھیں گے، اور ان کی حفاظت اور مدد کا بندوبست کریں گے!

انھوں نے پھر یہ عذر کیا کہ پہلا ٹرک جا چکا ہے۔ کہیں وہ پاکستان نہ چل دیں، ان کو آج واپس بلا دیجیے۔

یہ بھی وعدہ کر لینا پڑا۔ حالانکہ یہ ٹیڑھی کھیر تھی۔ مگر اللہ کے بھروسہ پر ہاں کر لی اور اطمینان دلا دیا کہ ابھی جاکر ان کو لیے آتے ہیں۔

اس تمام کاوش کا اثر یہ ہوا کہ، لوگوں نے اپنی پوٹلیاں، بکس وغیرہ سب اٹھا لیے، اور محلہ میں واپس چلے گئے، لیکن محلہ کے باہر کی رُخ کوارٹر تھے، ان میں سے نکل نکل کر پناہ گزیں یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے، یہ کوارٹر محلہ کو تین طرف سے حلقہ کیے ہوئے تھے، اور سب پناہ گزینوں کے قبضے میں تھے۔ مسلم آبادی سب محلہ کے اندر تھی۔

پہلے تو دور ہی سے اشارہ ہوتے رہے، غصّہ سے بھری ہوئی آوازیں آتی رہیں، اور یہ دیکھ کر کہ لوگ پوٹلیاں دبائے گھروں کو واپس جا رہے ہیں، وہ لوگ آپے سے باہر ہو گئے غیظ و غضب سے بیتاب ہو کر ہماری طرف دوڑے۔ میں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے سبھدرا سے کہا کہ کہیں ان دونوں میں فساد نہ ہو جائے۔ ہمیں حفاظت کا انتظام ابھی کرنا چاہیے۔ اور موٹر ابھی اسٹارٹ بھی نہ ہونے پائی تھی، سبھدرا نے اسٹیرنگ پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ہم لوگ گھر گیے، بپھرا ہوا مجمع ہمارے ارد گرد تھا، اور ہم حیران و پریشان کہ اس مجمع کو کیسے سمجھائیں؟ مگر خدا ہی نے حواس درست اور ہمّت قائم رکھی، سبھدرا تو نہ جانے کتنے خطروں میں پھنس چکی تھی۔ باپو کی تعلیم اور تربیت کا فخر بھی اسے حاصل تھا اس لیے خوب منجھی منجھائی تھی، لیکن میرے لیے پہلا اتفاق تھا، ہم دونوں ان کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سبھدرا پنجابی میں اور میں ہندوستانی میں ہم نے کہا:

یہ جو کچھ ہوا ہے اسے تم دشمنی نہ سمجھو، اپنے دکھ سے دوسرے کے دکھ کا اندازہ کرو۔

ہم نے ان کو یہ بھی بتایا کہ آج گاندھی جی نے مرن برت رکھ لیا ہے۔ ایسا نہ کرو کہ وہ اپنی جان ہی دے دیں۔ شانتی پھیلانے کے لیے ضروری ہے کہ تم کو گھر بھی ملے، اور گھر والے بھی بے گھر بھی نہ ہوں۔

مگر وہ بری طرح چیخ رہے تھے۔ عورتیں گالیاں دے رہی تھیں۔ مرد بھرے ہوئے ہماری طرف آتے اور پھر اپنے گروہ میں مل جاتے۔ وہ کہتے:

"مرنے دو اس بڈھے کو، ہمارے نہیں اتنے آدمی مارے گئے؟ ایک وہ مرجائیگا تو کیا ہو جائے گا۔ مرجانے دو اس کو۔ اس نے ہمارے لیے تو کچھ نہ کیا۔"

سبھدرا کو جواہر لال کی بیٹی سمجھ کر انھوں نے پنڈت جی کے لیے کوسنوں کی بوچھار کر دی۔ چند آدمی مجھ سے پوچھنے لگے، تم کون ہو ہمیں بتاؤ۔

میں نے کہا: "صرف ایک ورکر۔ یا والنٹیر!"

کہنے لگے، "نہیں نام بتاؤ۔"

اور جب میں نے کہا مسز شفیع، تو حیرت کے ساتھ موٹر میں سر ڈال دیا۔ "کیا تم مسلمان ہو؟"

مجھے ہنسی آگئی۔ اقرار کرتے ہی مجھ پر برس پڑے۔ تمھارے پاکستان والوں نے ہمارے گھر اجاڑے، بچے مارے، عورتیں بے عزت کیں۔ تم نے یہ کیا، وہ کیا۔ انھیں مسلمان کا مکروہ لفظ سنتے ہی اپنی ساری مصیبتیں یاد آگئیں۔

میں نے پھر سمجھانے کی کوشش کی، اور کہا صاحب، پاکستان والے تو آپ کے تھے، میرے کہاں سے ہو گئے؟ وہ آپ کے پڑوسی تھے، آپ کے دوست تھے۔ صدیوں کے ساتھی یہاں ہم نے کچھ آپ کے ساتھ کیا ہو، تو الزام دیجیے، یہاں کے ہندو مسلمان کسی نے آپ کو ستایا ہے تو ان کا بدلہ آپ ہم سے لیجیے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ہمیں ذرا سا موقع تو دیجیے **آپ تو مار** کاٹ مچاتے رہتے ہیں، کچھ کرنے تو دیتے نہیں۔

مگر وہاں کون سنتا ہے۔ بدستور چیخ پکار ہوتی رہی۔ تعجب ہے انھوں نے چھرے کرپانیں کیوں نہیں نکالیں۔ حالت نازک تھی، اور اس وقت سکون اور خوش اخلاقی سب سے زیادہ ضروری تھی۔ ایک بھرے ہوئے سردار جی کبھی عورتوں کو تیز کرتے کبھی مردوں کو۔ مگر دوسرے سردار جی کسی قدر فاصلہ پر کھڑے صرف تماشہ دیکھ رہے تھے، صورت اور وضع سے پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے۔ سبھدرا نے چالاکی سے کام لیا۔ ان سے کہا۔ سردار جی! آپ بہت سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تو کچھ نہیں رہے ذرا میری بات سنیے۔ وہ قریب آئے، اور میں نے ان کو بتایا کہ دیکھیے، ان لوگوں کو سمجھا دیتے۔ کتنی بے وقوفی کی بات کر رہے ہیں۔ اس محلہ کے لوگ اجڑتے تو ان کا بھی یہی حال ہوتا، جو آپ کا ہو رہا ہے۔ اور کیا یہ صورت زیادہ بہتر نہ ہوگی کہ آپ ایک

دوسرے کے دوست اور بھائی بن کر رہیں، دکھ سکھ کے ساتھی بن جائیں۔ ہندوستان تو بہت بڑا ملک ہے۔ اس میں ہم اور آپ دونوں بڑی آسانی کے ساتھ سما سکتے ہیں، فراغت سے رہ سکتے ہیں۔ آج ہی سے باپو نے برت شروع کیا ہے۔ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں، یہ غلط فہمی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ آدمی، آدمی بن کر رہیں۔ پھر پہلے کی طرح بھلے دن لوٹ آئیں، جو پاپ ہندو اور مسلمانوں نے کیے ہیں، وہ تو بڑے ہی شرمناک ہیں۔ کیا آپ کو وہ پسند ہیں؟ کیا آپ چاہتے ہیں۔ پھر وہی ہو؟ مگر یہ بچارے جاہل لوگ نہیں سمجھتے، ان کو آپ بتائیے۔

سردار جی خوش ہو گئے، اور الٹے اپنے ساتھیوں کو ڈانٹنے لگے۔ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں بھی مجھ سے بات کرنے لگے۔

اور جب ہم نے ان سے کہا کہ ہم تو تمھارے جیسے بچوں کی تلاش میں ہیں تاکہ تم سے محبت، شانتی اور نئے ہندوستان کی نئی دنیا بنانے میں مدد لیں۔ تم اگلی نسل کے نمائندہ ہو، آؤ ہماری مدد کرو تو وہ بھی بول اُٹھے کہ ہم تو خود ہی کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں موقع کب دیا جاتا ہے۔

میں نے خوش دلی سے کہا کہ کل تمھارے کوارٹر میں آؤں گی، اور تنہا آؤں گی، تمھارا جی چاہے گا تو مجھے مار ڈالنا۔ لیکن میں یہ ثابت کرنے کے لیے آؤں گی کہ تم کو دشمن سمجھتی ہوں نہ غیر۔ یہ سن کر ایک لڑکی میرے گلے سے لپٹ گئی۔ نہیں ماتا جی، آپ ضرور آیئے۔ بھلا ہم آپ کو ماریں گے۔ آپ میرے گھر آیئے گا۔ یہ دیکھیے سامنے ہمارا کوارٹر ہے۔

ادھر سبھدرا عورتوں سے نپٹ رہی تھی۔ وہ اس کی ساڑی پکڑ پکڑ کھینچتیں، اور کسی طرح موٹر اسٹارٹ نہ کرنے دیتی تھیں۔ بہت کچھ اس نے سمجھایا، دلاسا دیا اور سردار جی کے سمجھانے سے ذرا سامنے کی سڑک خالی ہوئی۔ میں نے ہلو کا دیا، اور سبھدرا نے موٹر ہوا کر دی۔

لیکن ابھی ایک کام تو باقی تھا۔ محلہ کی حفاظت اور دونوں پارٹیوں کے ٹکراؤ کو روکنے کے لیے وہ بندوقچی لانے تھے۔

یہ بندوقچی اسپیشل پولیس کے آدمی تھے، جن کو کانگرس اور جمعیۃ کی کوششوں سے محلوں کی حفاظت کے لیے بندوقیں مل گئی تھیں، چند ذمہ دار لوگ بحیثیت اسپیشل مجسٹریٹ کے ان کی نگرانی کرتے تھے۔ بہر حال دوسرے محلہ سے دو آدمی لا کر ہم نے کوارٹروں سے کچھ پرے ہی چھوڑ دیے، اور چند منٹ رک کے بغیر مقبرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

7

عمل ردعمل

مقبرہ کا کیمپ ان دنوں ہمیشہ سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔ میں نے جانا کم کر دیا تھا۔ دوسرے تیسرے دن خیریت معلوم کرنے چلی جایا کرتی تھی اور دو ایک کام کر آتی تھی۔ روزانہ کی حاضری شروع جنوری سے بند تھی۔ اس سارے مہینے ہم سب کی یہ کوشش رہی کہ کسی طرح اجڑے ہوئے محلے اور گاؤں پھر بس جائیں۔ پنجابی پناہ گزین گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے، یہ تو بعد کو معلوم ہوا، مگر حکام نے گاؤں اسی لیے خالی کرائے تھے کہ ان کو بسایا جائے، اور اب وہ اجڑے پڑے تھے، عوام کی خود بھی مرضی واپس جانے کی نہ تھی۔ ہم حکام سے معاملت کرتے اور عوام بگڑ جاتے۔ عوام کو بھاتے اور راضی کر لیتے تو افسر آڑے آجاتے۔ یہ ناکامیاں بعض وقت ایسی ہمت توڑ دیتی تھیں کہ ہم میں سے بہتوں کا جی چاہتا تھا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے گھر بیٹھ رہیں، اور میں شاید بیٹھ بھی رہتی، اگر باپو کے بول کانوں میں نہ گونجتے ہوتے، اور دبلی پتلی سبھدرا کی دیوانگی مددگار نہ ہوئی۔ میری ہی کیا، بہت سارے ساتھیوں کی ہمت اسے دیکھ کر بندھ جاتی تھی۔

ہم اب بھی ہفتہ میں دو تین بار ضرور جاتے تھے اور اک دن جو جا کر دیکھا تو نئے آنے والے[1] اپنی پوٹلیاں سنبھالے کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے تھے۔ ہم نے ان سے سارا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ وہ سب تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ واپس جاؤ۔ کچھ لوگوں کو پس و پیش تھا، کچھ متاثر تھے۔ کیمپ میں ایک خاموشی اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ میرے پاس آئے اور باپو کے متعلق سوال کیا اور یہ سن کر کہ جب تک امن نہ ہو جائے گا، وہ برت نہ توڑیں گے، اسی کوشش میں جان دیدیں گے۔ لوگوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

انھوں نے کہا، جب وہ اتنا کچھ کر رہے ہیں، تو ہم بھی گھر واپس جاتے ہیں۔ جو نتیجہ ہو۔ بہتوں

---

[1] ۔ قصاب پورہ سے آنے والے۔

نے اپنا مختصر سامان سنبھالا، اور چل پڑے۔ کچھ لاری اور ٹانگوں کا انتظار کرنے لگے۔ قصاب پورہ والے ایک دو کو چھوڑ کر تقریباً سب کے سب واپس چلے گئے

ایک مسلم لیگی حکیم صاحب مجھ سے الجھ پڑے کہ واپس جانے کے لیے تو کہتی ہو، اور حکومت جو پولیس اور فوج کے ذریعہ ہمارا قتل عام کراتی ہے، اس کو روکنے والا کوئی نہیں۔ اس ہندوستان کا بیڑا غرق ہوگا، دیکھ لینا۔ ہندو راج میں کسی مسلمان کی گذر کہاں، جس کا جی چاہے ہند دبن کر رہے، ہم یوں نہیں رہنے کے۔ ان سے بہت تلخ گفتگو بھی ہوئی۔ حکیم صاحب نے طویل تقریر کر کے بہتوں کو اپنا ہمخیال بنالیا۔

لیکن واپسی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اگرچہ اس دن بھی دلّی میں تین قتل ہوئے۔ ۴۔ ۴ آدمی اب تک روزانہ بہادروں کی تلوار کا نشانہ بنا کرتے تھے اور آج سے کئی دن پہلے ایک واقعہ اور بھی پیش آچکا تھا۔ کچھ لوگ تانگہ پر کیمپ سے گھر واپس جا رہے تھے۔ راستے میں سکھوں کی ایک جماعت نے دو فرلانگ پرے ان پر حملہ کر دیا۔ مال اسباب چھین لیا اور گھوڑا بھاگتا ہوا زخمیوں کو لے کر پھر کیمپ واپس آیا۔ تانگہ والا اور مسافر سب ہی خون میں لت پت تھے۔ اس واقعہ نے اور بھی سب کو ہراساں کر دیا تھا۔ ادھر اسی روز گجرات[1] کی ٹرین کا دل ہلا دینے والا واقعہ لوگوں کو معلوم ہوا تھا، اور سب کو یقین تھا کہ اب جو ٹرین پناہ گزینوں کو لے کر جائے گی، وہ سلامت پاکستان پہنچ نہیں سکتی۔

نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن، لوگوں پر مایوسی اور ہیبت کا شدید غلبہ تھا۔ اس پر باپو کا برت۔ ان کے دل ہل گئے، اور بہتوں نے، مرتا کیا نہ کرتا، گھر واپس جانا بہتر سمجھا۔

یہ واقعہ تھا کہ کسی محلہ یا گاؤں میں پولیس کی ڈیوٹی لگ جانے کے معنی یہ تھے کہ سارا علاقہ ویران ہو جائے۔ ان دنوں قاتل کی بجائے مقتول کے اعزہ گرفتار ہوتے تھے، اور مجرم کے بجائے رپورٹ کرنے والا پکڑا جاتا تھا۔ یہ نہ سمجھیے کہ کل ایڈمنسٹریشن معطل تھا، نہیں۔ بیدار مغز حکام ہر وقت چوکنا اور مستعد رہتے تھے۔ اور یہ لاقانونی صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہ تھی، بلکہ خود کانگریس حکومت اور کانگریس کے جنم داتا کے خلاف محاذ قائم کرنے میں ساری بیدار مغزی صرف ہوتی تھی، اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گی۔

---

[1] ۔ پاکستانی پنجاب سے آنے والی ٹرین گجرات میں روک کر تقریباً سارے مسافر جو ہندو تھے قتل کر دیے گئے تھے۔

بہر حال میں نے لوگوں سے اپیل کی کہ اگر تم نگر جاکر پناہ گزین بھائیوں سے بھائی چارہ قائم کر کے امن قائم کر لیا تو باپو کو بچا لو گے۔ وہ دیس کی سب سے بڑی دولت' اور ہم سب کا سہلا ہیں' اس اپیل نے انھیں اتنا متاثر کیا کہ کچھ پیدل ہی چل پڑے۔

پرادنشل کانگرس کمیٹی کے لوگ بھی آئے اور تمام دوسرے کارکن بھی — اور کیمپ کے اندر لاؤڈ سپیکر لگی ہوئی گاڑی گشت کرنے لگی۔ مقرر ہر طرح ان کو اطمینان دلا رہے تھے اور حکام پریشان تھے کہ اتنی مشکلوں سے تو انھوں نے دلّی صوبہ کو مسلنٹوں سے صاف کرایا تھا' اور شہر کا اب صرف ایک ٹکڑہ صاف کرنا باقی رہ گیا تھا کہ گاندھی جی نے یہ آفت مچادی۔ پرانے مسلم لیگی جو کیمپ میں تھے الگ ہکا بکا رہ گئے۔ وہ تو ثابت کر دینا چاہتے تھے' ہندوستان نسل کشی کر رہا ہے۔ ہندو راج کا خواب پورا کرنا چاہتا ہے۔ یہ جمہوری حکومت ڈھونگ ہے۔ دیکھ لو خاص راج دھانی میں ایک مسلمان کا بنس باقی نہیں ہے' مگر افسوس وہ یہ نہ کہہ سکے!

اور دوسرے دن سبھدرا نے تانگہ' ریڑیاں اور لاریاں اکٹھی کیں۔ محلوں کے سیکڑوں بچے اس میں سوار کر دیے گئے۔ قیصر بدستور ان کے افسر اعلیٰ تھے' بچوں کی زبان پر نعرہ تھا۔

"باپو کو بچاؤ" "ہندو مسلم بھائی بھائی" "ہندو مسلمانوں ایک ہو جاؤ!"

بچوں نے شہر کے ایک ایک کونے میں باپو کا پیغام پہنچایا' ہر جگہ اپنے گیتوں اور شعروں سے سونیوالوں کو جھنجھوڑا' اور لوگ جاگ اٹھے' چونک پڑے۔

بچوں کا یہ کارنامہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ دلّی کی سرزمین پر جب شانتی۔ محبت اور سچائی کا وجود باقی نہیں رہ گیا تو باپو نے بساطِ زندگی پر جان کی بازی لگائی' اور فطرتِ معصوم بچوں کی شکل میں ان کی مدد کے لیے دوڑ پڑی۔ اس دن تو ایسا لگتا تھا' زمین و آسمان سے بچے نکل پڑے ہیں' ہزاروں بچے چیختے' چلاتے' سڑکوں اور گلیوں میں باپو کو نہیں' انسان اور انسانیت کو قائم رکھنے کے لیے' شیطانی قوتوں کو چیلنج کر رہے تھے۔ معصومیت ازل نیکی کی تنظیم کر رہی تھی' سچائی کو ڈھونڈھ رہی تھی اور نور کی کرنیں ظلمت کی قبا چاک کرنے کو نکل پڑی تھیں۔

اور میں اس جلوس کے پیچھے کھڑی ہوئی سوچ رہی تھی اس معصومیت کو بھی تو نفرت نے ان دنوں تہ تیغ کرنے کی کوشش کی تھی' یہ بچی کیسے؟ یہ آئی کہاں سے؟

تین دن کے اندر دلّی کے زمین و آسمان بدل گئے۔ دوسرے دن سے پھر کوئی قتل بھی نہیں ہوا۔ کسی کو کوئی چھرا بھی نہ گھونپا گیا۔ کوئی زخم خوردہ اپنا سامان لے کر مقبرہ کو بھی نہ بھاگا

اور پھر چوتھے دن[1] عورتوں کا جلوس، ماں بہنوں اور بیٹیوں کا جلوس نمودار ہوا۔ ماں کی مامتا، بہنوں کی محبت، اور بیوی کی عزت، امن و شانتی کی بھیک آدمیت کے نام نہاد دعویداروں سے مانگنے نکلی۔ جامع مسجد سے ہوتا ہوا، چاندنی چوک اور لال کنویں سے بھی جلوس گزرا۔ اس میں برقعہ پوش بھی تھیں، ساریاں بھی اور پنجابی شلواریں بھی۔ یہ برقعے ان راستوں سے بھی گزرے، جہاں دن دہاڑے انسانیت کا خون بہا تھا عصمتیں لٹیں تھیں۔ معصومیت کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ مگر آج سکون تھا۔ دلوں میں ٹھنڈک تھی۔ لوگوں کی نظروں میں حقارت کی بجائے تحسین و عزت جھانک رہی تھی۔ لفظوں میں شرافت اور خلوص کی مہک تھی۔ کالجوں کی تمام لڑکیاں اسکول کی چھوٹی بچیوں کا گروہ، اور بڑی عمر کی عورتیں۔ سب ملاکر دس ہزار عورتوں کی بہت لانبی قطار گزرتی رہی۔

اگرچہ اب بھی ایک لاری تیز تیز چلتی ہوئی برلا ہاؤس تک جایا کرتی تھی اور اس کا نعرہ تھا۔

"ملا گاندھی مردہ باد" "محمد گاندھی مردہ باد"

اور آج برت کے تیسرے دن وہ دہلی کلاتھ مل کے مزدوروں کو ایک جگہ کھڑی ہوئی مل گئی، انھوں نے سب کو پکڑ کر خوب مرمت کی۔ اس کے بعد پھر لاری نکلتی ضرور تھی، مگر رکتی کہیں نہ تھی، تیز تیز چلتی ہوئی مشہور سڑکوں سے گزر کر، برلا ہاؤس تک جاکر غائب ہو جاتی۔

میں بھی ایک دن لال کنویں سے گزر رہی تھی کہ چوراہے پر اسے ٹھہرا ہوا دیکھا۔ اس وقت کوئی صاحب اس پر کھڑے ہوئے تقریر کر رہے تھے اور نعرے لگ رہے تھے۔

"مسلمانوں کو نکالو" "خون کا بدلہ خون" "گاندھی کو مرنے دو"

لیکن برت کے پانچویں دن کس میں طاقت تھی کہ ایسا جملہ کہہ سکے۔ ایک لاکھ سرکاری ملازموں کے دستخطوں سے عرضداشت باپو کے سامنے پیش ہوئی۔ سرکاری افسروں نے وعدے کئے۔ پولیس نے عہد کیا۔ یہ ساری خبریں ہم شہر میں سنتے تھے۔ برلا ہاؤس جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی میں تو ایک دن پرئیر میٹنگ میں گئی بھی۔ باپو کی کمزور آواز نے کچھ کہا بھی لیکن کچھ یاد نہیں، صرف ایک دھن سوار تھی، ایک لگن دل میں لگی ہوئی تھی، اور یہی حال سب کا تھا، بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔

---

[1] ۔ اس جلوس کی کامیابی کا سہرا حکیم خلیل الرحمٰن نار کے سر تھا۔ مسلمان برقعہ پوش عورتوں کو ان کی حکمت و دلیری نے سہارا دیا تھا۔

ایک روز باپو سے ملی تھی۔ چہرہ نیلا ہو رہا تھا۔ کیا پتہ برت کا اثر تھا یا اندرونی دکھ کا۔ اور پھر عین اس وقت کہ ہم سب مصروف تھے۔ پانچ دن کی ہماہمی نے کانگریسیوں کو تقریباً ادھ موا کر دیا۔ اور والنٹیروں کے چہرے سوکھ کر لٹک آئے تھے کہ یہ مژدۂ جاں بخش ملا" باپو برت توڑ رہے ہیں"۔ آدمیوں کا سیلاب برلا ہاؤس کی طرف چل پڑا۔

دوسرے دن سے کام اور بھی بڑھ گیا۔ اب تو جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کو پورا کرنا تھا۔ اگرچہ کام کا کوئی پروگرام مکمل نہ تھا جس کا جی چاہتا کرتا، مگر بنیادی مقصد امن قائم کرنا تھا۔ پائدار، مضبوط امن۔ کانگریسی بھی پچھلی غلطیوں کی تلافی کے لیے جان دیے دے رہے تھے۔ جی توڑ کر امن کی کوشش شروع کر دی۔ اور سوشلسٹ وہ تو ستمبر سے اب تک کرتے آئے تھے۔ پولیس افسر بھی ذرا ڈھیلے پڑے تھے۔ پہلے تو ہمارے لڑکے رپورٹ کرنے جاتے، کوئی بات نہیں کرتا تھا، علاقے کے مسلمان پولیس اسٹیشن سے دھتکار کر نکال دیے جاتے تھے، مگر اب ایسا نہ ہوتا تھا۔

کوئی میز کے کنارے بیٹھ کر، کوئی گلیوں میں پھر کر، کوئی شہر میں گھوم کر دن گزارتا، مگر امن پسندوں کا گروہ اب بھی چھوٹا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو برت ٹوٹتے ہی وہ اپنے فرض سے ادا ہو گئے۔ بظاہر سیدھے بنے رہے لیکن در پردہ وہ اپنی حرکتوں کو دہرانے کا منصوبہ باندھنے لگے۔

میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ سوشل سروس کرنے والے لڑکے لڑکیوں نے شرنارتھیوں کے لیے آٹھ اسکول شہر کے مختلف حصوں میں کھول رکھے تھے۔ یہ عارضی اسکول تھے، اور ان کی کلاسیں اکثر کھلے آسمان کے نیچے بھی ہوا کرتی تھیں۔ برت سے پہلے پروگرام تھا کہ ایک روز یہ سب بچے اکٹھے کیے جائیں۔ لیکن برت شروع ہونے کے بعد اور زیادہ اس کی ضرورت محسوس ہوئی اور تیسرے یا چوتھے دن بچوں کو مدعو کر لیا گیا۔

مکان کی مختصر صفائی ہوئی۔ زمین کے گڑھے پاٹے گئے اور کمروں کی ستھرائی ہوئی۔ وقت مقررہ پر چار سو سے زیادہ بچے "مرکز تعلیم و ترقی باڑہ ہندو راؤ کے ماتحت رحمانیہ اسکول میں جمع ہو گئے۔ صحن میں کئی فٹ اونچا ترنگا جھنڈا لگایا گیا۔ اور اس کی پرچم کشائی کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کو بھی مدعو کیا گیا۔ بچے خوش و خرم اچھلتے کودتے پھر رہے تھے۔ ان کی تصویریں لی گئیں۔ پھر پھل کھائے گئے۔ گیت ہوئے۔ اور سادتری بہن نے اپنی پیاری سی تقریر میں اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ آخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے بچوں کی عقل و سمجھ کے مطابق حالات حاضرہ اور

اس سے پیدا ہونے والے نتائج کا ذکر کیا۔ بچوں نے گلے مل کر دوستی کے عہد و پیمان باندھے۔

اس دن وہ تمام امن دوست نوجوان، پریم کا درس دینے والی لڑکیاں اور نئے ہندوستان کے نئے معمار بھی اکٹھے ہوئے جو ان اسکولوں کو چلا رہے تھے۔ اجتماع بڑا شاندار تھا۔ ہر شخص اس نئے تجربے سے مسرور تھا۔ اور مرکز کی زندگی کا اسی دن سے بنا دور شروع ہوگیا۔

میں نے باپو کو بھی یہ دل خوش کن خبر سنائی اور اس امید پر ان کا چہرہ دیکھا کہ میری طرح وہ بھی اسے نیک فال سمجھیں گے۔ مگر قوم کا نباض اس بحرانی کیفیت کو خوب سمجھتا تھا۔ انھوں نے اچھا کہا نہ برا۔ صرف "ہوں" "ہوں"! جیسے وہ مطمئن نہ تھے۔ وہ تو صبح کے پجاری تھے اور ابھی تو گھری کالی رات تھی۔

ان دنوں باڑہ کا کانگرس آفس بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ اگرچہ اس وقت اس میں اکثریت سوشلسٹوں کی تھی اور انتھک محنت کرنے والوں کا گروہ اس میں اکٹھا تھا، مگر جلد ہی سوشلسٹ اس سے الگ ہوگئے اور تب جو انچارج ہوئے، وہ بیچارے نیک مرنجاں مرنج پالیسی کے قائل، جھگڑے کے دنوں میں سنگھ کی ہٹنگ کی صدارت بھی انھوں نے کرلی اور اب پیس پروپیگنڈا بھی کیا کرتے تھے، کانگرس ایسے صلح پسندوں سے ان دنوں بھری پڑی تھی۔ سوشلسٹ علی الاعلان یہی الزام لگا رہے تھے۔ لیکن میرا اس جھگڑے سے کیا واسطہ۔ ان میں کے سلجھے ہوئے لوگ اب ہمارے مددگار تھے۔ شاید جنوری میں مجھے ایک صاحب نے چند نوجوانوں سے ملایا تھا جو شہر کے خطرناک ترین علاقوں میں گلیوں کے اندر مظلوموں کی امداد اور بحالی امن کا کام کرتے تھے۔ یہ چھوٹی سی پارٹی شہید بھگت سنگھ کے بچے کھچے ساتھیوں، کمیونسٹ، سوشلسٹ اور سیوا دل کے والنٹیروں پر مشتمل تھی۔ ان کا ہر فرد ستمبر سے اب تک جان ہتھیلی پر دھرے مصیبت زدوں کی امداد کر رہا تھا۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان میں بیشتر افراد وہ تھے جن کی تخریبی سرگرمیوں کو کانگریس قابل نفریں قرار دے چکی تھی۔ ان میں ایسے لوگ تھے جن کو کانگریس غنڈوں سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے، اور جب ملک پر مصیبت پڑی، تو کانگریسیوں سے زیادہ کام انھوں نے کیا۔ ان میں اچھے لکھنے والے اور نئے ادیب بھی تھے۔ انھوں نے فرقہ پرستوں کے خلاف قلمی جہاد شروع کر دیا، غرض دامے۔ درمے۔ قدمے۔ سخنے ہر طرح یہ گروہ ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھ رہا تھا۔ میں ان سے ملی تو حیرت یہ ہوئی کہ یہ لوگ آج بھی اپنے نقش قدم پر مضبوطی سے پاؤں جمائے کھڑے تھے۔ ان کے دل اور دماغ صاف تھے، اور اس وقت جب کہ ہماری آنکھوں کے نیچے اندھیرا تھا اور مستقبل کا کوئی خاکہ ہمارے ذہن

میں باقی نہ رہ گیا تھا، ان کے یہاں پوری اسکیم اور بے نظیر عزم و ارادہ موجود تھا۔

جنوری میں ایک دن سبھدرا سے ملنے گئی تھی تو معلوم ہوا، کسی لائبریری[1] کا افتتاح کر رہی ہیں، سن کر جی خوش ہو گیا کہ شکر ہے کہیں سے علم و عقل کی آواز تو آئی۔ بن بلائے میں بھی پہنچ گئی۔ اس وقت جلسہ کی صدارت سید مطلبی[2] (فرید آبادی) کر رہے تھے، انھوں نے اصرار کیا کہ آپ بھی چند لفظ کہہ دیجیے۔ ہر چند کہا مجھے تقریر کرنی نہیں آتی، مگر نہ مانے۔ زندگی میں پہلا اتفاق اتنے مردوں میں بولنے کا تھا۔ دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا کہ اپنی آواز میں نہ سن سکی تھی۔ لشتم پشتم چند بے ربط ٹوٹے پھوٹے جملے کہہ کر بیٹھ گئی۔ یہ واقعہ تھا کہ سارے شہر میں صرف یہ علاقہ "شانتی دل" کی کوششوں سے ایسا تھا کہ جہاں شر نار تھی اور مقامی ہندو مسلمان پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے۔

جلسہ ختم ہو گیا مگر مجھے بڑی شرم آئی۔ سبھدرا دیکھو کیسا اچھا بولتی ہے۔ جیسے رک رک کے بات کرتی ہے۔ ویسے ہی تقریر۔ لیکن کیسے پتہ کی بات کہہ جاتی ہے، ایک میں ہوں۔ بوڑھی گھوڑی کسی مصرف کی بھی تو نہیں۔ دو جملے بھی گت سے کہہ نہ پائی۔ اور پھر میں نے اپنا اضطراب مٹانے کی کوشش شروع کر دی۔

جن دنوں میں لوگوں سے شہر اور گاؤں واپس جانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ جیت پور کا نمبردار ایک دن مجھ سے ملنے آیا۔ آدمی سلجھا ہوا سنجیدہ اور سمجھدار تھا۔ اپنے سیکڑوں ساتھیوں سمیت اس وقت وہ بھی کیمپ میں مقیم تھا۔ ہم سے بات چیت کرتے ہوئے اس نے کہا:

"اگر ہماری طرف سے کوئی بات ہوئی ہو، تو آپ ہمیں الزام دیں۔ اس وقت بھی آپ مدن پور کے ذیلدار نرکھارام سے میری بابت جا کر پوچھ لیجیے۔ ہم اور وہ ایک دوسرے کے دکھ

---

[1] ۔ پل بنگش پر ایک چھوٹی سی لائبریری کھولی گئی تھی۔

[2] ۔ سید مطلبی فرید آباد کے رہنے والے۔ کھڑی بولی جو دیہاتوں میں دہلی کے اب بھی بولی جاتی ہے، اس کے مشہور شاعر تھے۔ تقسیم سے پہلے ان کے گیت اور ان کے بیٹے ابو تمیم فرید آبادی کا بچوں کے لیے لٹریچر بہت مقبول تھا۔ فسادات میں فرید آباد ختم ہوا اور اس کے ساتھ اس خاندان کے بیشتر افراد جو بہت پکے نیشلسٹ مسلمان تھے سب کچھ کھو کر بھی گاندھی جی کے شہید ہونے تک ہندوستان میں ڈٹے رہے۔ آخر کار بادل ناخواستہ پاکستان چلے گئے۔

درد کے ساتھی اور صدیوں کے پڑوسی ہیں۔ لیکن ایسی دانت کاٹی دوستی ہوتے ہوئے بھی کسی نے موقع پر ہمارا ساتھ نہ دیا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہمارے خیالات خراب تھے، تو جھوٹ ہے۔ ہمارے علاقہ سے ووٹ کانگرس کے سوا کوئی پارٹی آج تک نہیں لے جا سکی ہے۔ پچھلے الکشن میں ہم سب نے ایک ہو کر کانگرس کا ساتھ دیا۔ وہی نیتا جو اب حکومت کی گدی پر ہیں، ہم ان کے لیے جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے اور اب یہاں اتنے دن سے کیمپ میں پڑے ہیں تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ جب ووٹ لینا تھے، تب ہماری پوچھ تھی۔

"ذرا پنڈت جی مہاراج[1] سے موقع ملے تو کہیے کہ اور کچھ نہ سہی، ایک دفعہ ہمیں اپنے درشن تو کرا ہی دیں۔ وہ ایک بار بلند شہر ہو آیا تھا، اور بہت خوش تھا کہ یوپی میں امن و امان ہے، وہاں کی حکومت نے بڑا اچھا انتظام کر رکھا ہے۔ بسسرال والے کہتے ہیں یہیں آ کر بس جاؤ، مگر جب جیت پور چھوٹ گیا تو یوپی کیوں جاؤں، اب تو پاکستان ہی جانا ہوگا۔

دوسرے دن میں اپنے دو ساتھیوں سمیت مدن پور گئی۔ ہماری دوسری ساتھی باپو کی چیلی تھی، اور تیسرے ایک ورکر تھے، جو صورتاً نہ شیعہ معلوم ہوں نہ سنّی۔ کوئی ان کو کمیونسٹ سمجھتا تھا اور کوئی بگڑا ہوا ملا۔ زبان خالص دہلی کی بولتے تھے، اور حلیہ مدراسی تھا۔ بہت کم بات کرتے تھے اور مسکراتے ہر وقت تھے، اسی مسکراہٹ نے دوستوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ بہت خوش مزاج ہیں۔ لیکن ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ شئے لطیف کی کمی ہے۔ اکثر خفا ہو جاتے تھے، اور ہفتوں خفا رہا کرتے تھے۔

ذیلدار بڑے اخلاق سے پیش آیا۔ دودھ پانی سے تواضع کی اور پھر ہمارا نام پتہ اور آنے کا مقصد پوچھنے لگا۔

میں بولنا چاہتی ہی تھی کہ ہمارے ساتھی نے تیکھے ہو کر بالکل اس انداز سے ایک سانس میں تینوں نام دہرا دیے جیسے کہہ رہے ہوں "یہ نام ہے۔ مسلمان ہیں، کر لو، جو تمہارا جی چاہے"، اور پھر فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ مجھے اس پھرتی پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ ذیلدار بھی کچھ سمجھا لاپروائی ظاہر کرنے لگا۔ خیر، جو ہو۔ ہمیں تو خوشی ہے کہ آپ لوگ تشریف لائے۔ اس نے کہا۔

"صاحب جیت پور والے ہماری ذات، ہماری گوت، اپنے بھائی ہیں۔ تم جانو گا ؤ ں

---

[1] جواہر لال جی۔

کے لوگ ان پڑھ مورکھ تو ہوتے ہی ہیں۔ ہم کیا جانیں حکومت کیا کرتی ہے، کیا چاہتی ہے۔ پچھلے دنوں جب حکومت نے اعلان کر دیا کہ اب کوئی مسلمان ہندوستان میں نہیں رہے گا، تو ہم نے جیت پور والوں سے کہا کہ بھائیو، سنو، تم سب ہندو بن جاؤ۔ ہمارا تمھارا ساتھ نہ چھوٹے۔ ہمارا جی نہیں چاہتا کہ تم دیس چھوڑو۔ اب تو یہ بات ہو ہی گئی ہے کہ پاکستان میں مسلمان رہیں گے، ہندوستان میں ہندو۔ اس لیے مجبوری ہے۔ مگر احسان[1] نے کہا، نہیں ہم ہندو تو نہ بنیں گے چاہے جان جاتی رہے۔ ہم کو جانے دو۔ جو تقدیر میں بدا ہو۔ ہم لوگ باغ تک ان سب کو بدا کرنے گئے اور جب چھوٹے ہیں، تو ہماری آنکھ میں بھی آنسو تھے، اور احسان کے بھی۔ اب جب آپ کہتی ہیں۔ کہ ایسا حکم گورنمنٹ کا نہیں ہے، تو مہاتماجی جیسا کہیں کرنے کو تیار ہیں۔ ہم اپنی بیل گاڑیاں لے کر چلیں گے، اور ان کو بال بچوں سمیت لے آئیں گے۔

لیکن یہی بات جب ہم نے احسان سے آکر کہی، تو اسے اعتبار نہ آیا۔ اس نے رنجیدہ ہو کر کہا:

"ارے ہم پر جو کچھ بیتی ہے، وہ آپ کیا جانیں، اب بھلا پلٹ کر جائیں گے۔"

میں دیکھ رہی تھی، وہ پس و پیش میں ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا، ساتھیوں سمیت واپس جائے۔ مگر کونسا خوف تھا جو اس کے قدم اٹھنے نہ دیتا تھا۔ اس وقت تو ہماری سمجھ میں نہ آیا شاید صرف بے اعتباری و بدگمانی ہو یا تبدیلیٔ مذہب کا ڈر۔ کچھ ہی دن بعد میں نے اس معزز زمیندار کو کیمپ کمانڈر کی خوشامد کرتے دیکھا کہ اس کی بیوی کو دو گھنٹہ کے لیے نظام الدین تک جانے کی اجازت مل جائے تاکہ وہ اپنا سر دھو کر غسل کر سکے، ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ اس کی غیرت تقاضہ نہیں کرتی کہ وہ کھلے نل پر نہائے دھوئے اور اجازت نہ ملی۔ اب وہ کیمپ کی زندگی سے تنگ آچکا تھا۔ اس کے بہت سے ساتھی یوپی وغیرہ کے حصوں میں منتشر ہو چکے تھے اور وہ خود سوچ رہا تھا۔ اسباب زراعت بیچ دینے کے بعد اگر وہ گاؤں واپس جاتا ہے تو ۶ مہینے اسے از سر نو جمنے میں لگیں گے، پاکستان کا تجربہ کیوں نہ کرے۔

ان لوگوں کی واپسی ایک بہت بڑا مسئلہ بن کر رہ گئی تھی۔ ہم نے ایک دن عام میٹنگ کی اور سب گاؤں والوں کو بلا کر سمجھانا شروع کیا۔ مجمع میں ایک ترکی ٹوپی والا خاص طور پر ادھر سے ادھر کنویسنگ کر رہا تھا، دو چار اور بھی تھے، جو بات ہی نہ کرنے دیں۔ بلا وجہ قابلیت

---

[1] احسان جیت پور کا زمیندار بلکہ نمبر دار تھا۔ مدن پور اور جیت پور میں صرف آدھ میل کا فاصلہ تھا۔ مسئلہ شاید شدھی ہونے کا تھا جسے اس نے گوارا نہ کیا۔

جھاڑ رہے تھے۔ چھانٹ چھانٹ کر عربی فارسی کے لفظ بولیں اور عوام کو مرعوب کریں۔ یہ سماں دیکھ کر مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ گاؤں کا پٹواری اور ذیلدار کتنا خطرناک اور ذی اثر ہو سکتا ہے۔

وہ لوگ کہہ رہے تھے۔ ہم کو تو حکومت نے نکالا۔ اس کے حکم سے ہم نے گاؤں چھوڑا ہے۔ ہم نے تردید کی۔ یہ سب غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔ اور ٹہاڑ والے تو اس قسم کی بات کہہ بھی نہیں سکتے۔ ان کو روکنے کے لیے گاندھی جی، اور خود وزیر اعظم تک نے کوشش کی۔

کہنے لگے۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ بے شک ہماری مدد بھی کی گئی اور ہم کو منع بھی کیا گیا اور ان بہن[1] ہی کے تو ہم بہت احسان مند ہیں، ان بے چاری نے تو بڑی سرپرستی کی۔ مگر اس کو کیا کریں۔ فلاں[2] دن ضلع کے افسر نے آکر، فلاں تاریخ تحصیل کے حاکم نے آکر ہمیں حکم دیا۔ اور اس تاریخ کو پولیس کے افسر صاحب آئے اور کہہ دیا کہ گاؤں خالی کر دو۔ ان کے روکے تو ہم دو تین ماہ تک ڈٹے رہے، پھر ہماری مشکلیں بڑھتی گئیں، چالیس فی صدی ہمارے گاؤں میں ملازم سرکار تھے، بغیر کوئی وجہ بتلائے ہوئے، ان کا نام ملازمت سے خارج کر دیا گیا۔ تین مہینے سے ہماری بندوقیں ضبط ہیں۔ صرف ایک لائسنس پورے گاؤں میں باقی تھا۔ ۱۲ر اکتوبر کو وہ بھی چھن گیا۔ جب کہ ۲۰ فیصد ہندو آبادی کے پاس اس وقت ۵۶ لائسنس ہیں۔ پھر؛ گاؤں کی پنچایت کر کے پاس پڑوس والوں نے ہمارا سوشل بائیکاٹ کیا۔ ہمارے جانور تک وہ اٹھالے جاتے ہیں۔

میں نے پوچھا کتنے مویشی غائب ہوئے؟

کہنے لگے؛ ایک بیل ہمارا اٹھالے گئے۔

سبھدرا نے جل کر کہا: سیکڑوں جانور تم دوسروں کے چرا لاتے تھے، ایک اپنا اٹھ گیا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔

اور یہ واقعہ تھا کہ صوبۂ دلی عجیب وغریب قسم کے لوگوں سے بھرا پڑا تھا؛ اپنے عروج کے دنوں میں اس گاؤں کے باشندے بڑے زبردست ڈکیت اور لٹرا کو ہوا کرتے تھے، دولت کی ریل پیل بہت کچھ ان کی ناجائز کوششوں کی بدولت تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بہترین کاشتکار بھی تھے، پولیس اور فوج کے لیے مضبوط نوجوان انھیں گاؤوں میں مہیا ہوتے تھے۔

ع1 - سبھدرا جوشی۔

ع2 - ان لوگوں نے مجھے وہ سب تاریخیں بھی نوٹ کرائیں جن میں افسران مال ڈپٹی کمشنر اور تحصیلدار وغیرہ نے، ان سے یہ باتیں کیں۔

انھوں نے ہم کو یہ بھی بتایا کہ سندھ اور شاید ملتان میں ہماری زمین کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ ایک ذمہ دار لوکل افسر[1] نے ہماری ۱۳ ہزار بیگہ زمین کو اپنے خاندان یا دوستوں کی ۱۴ ہزار بیگہ پاکستان میں چھوڑی ہوئی زمین سے بدل دا دی ہے۔ معاملہ طے ہو چکا ہے۔ پکّا ہو چکا ہے، اس لیے واپسی کا کوئی سوال ہی باقی نہیں ہے۔

اور پھر جب بھی ایسی صورت پیدا ہوتی کہ یہ ہزاروں آدمی اپنے گھر واپس جائیں کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی۔ دو بار گاندھی جی سے ان کی ملاقات کا وقت مقرر ہوا اور ان میں کے ذمہ دار آدمیوں نے وعدہ کیا کہ اگر مہاتما جی اپنی زبان سے کہہ دیں تو ہم واپس چلے جائیں گے۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہاں آنے سے پہلے انھوں نے اپنے گاؤں سے ایک ریٹائرڈ لفٹیننٹ کو اپنا نمائندہ بنا کر باپو، اور ایک بڑے افسر کے پاس بھیجا تھا۔ مگر وہ یہاں سے جواب لے گیا کہ حاکم نے تو یہی صلاح دی ہے کہ چلے آؤ اور باپو نے مایوسی کے ساتھ[2] کہا۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔

لیکن اب وہ تیار تھے، اور دوسرے دن ملنے والے تھے، مگر حکّام چوکنّا تھے، ایک بڑے افسر[3] نے کیمپ کا دورہ کیا اور وہ سب صلاح لینے دوڑ پڑے۔ افسر نے کہا:

"ایک حاکم کی حیثیت سے تو میں یہی کہوں گا کہ کچھ ڈر نہیں، تم کو واپس جانا چاہیے کیونکہ اس وقت سرکار کی مرضی یہی ہے، مگر ایک دوست کی طرح پوچھو تو میں ایسی صلاح نہیں دے سکتا۔ ابھی حالت ٹھیک نہیں ہے۔

لیجیے صاحب، قصہ ختم۔ دوسرے دن انھیں برلا ہاؤس جانا تھا، شام کو یہ بات چیت ہوگئی، اب نہ وہ گاندھی جی سے ملنا چاہتے تھے نہ گھر واپس جانے کی خواہش تھی۔ وہ کیا اکھڑے ان کے ساتھ پانچ سات گاؤں اور منکر ہو گئے، اور ہم لوگ اپنا سا منہ لے کر پلٹ آئے۔ وہ بدستور کیمپ میں رہتے رہے، ہمارا تو فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہم کو تو پاکستان جانا ہوگا۔

ہم سب کو ایک دن تعجب ہو گیا جب دہلی کلاتھ مل کے ملازمین سے بھرا ہوا ایک ٹرک آکر پھاٹک پر رکا۔ وہ بھی پاکستان جانے کے لیے آئے تھے، مگر اپنے افسروں کے بے حد مداح تھے، پتہ چلا کہ مل کے باہر ان کے دو آدمی مارے گئے تھے، اس لیے منتظمین نے فیصلہ کیا کہ ان سب

---

[1] - مسٹر رندھاوا ڈپٹی کمشنر دہلی۔

[2] - ان کو دھوکا دیا گیا۔

[3] - ڈپٹی کمشنر۔

کو مع بال بچوں کے کیمپ پہنچا دیا جائے اور وہاں سے اپنی لائل پور والی مل میں پہنچا دیے جائیں۔ لائل پور کے ہندو ملازمین کو ہندوستان بلا لیا جائے۔ تجویز معقول تھی۔ نتیجہ ساتھ تھا۔ کیونکہ کیمپ کے داخلہ کی اجازت نہ تھی۔ نہ اندر اب جگہ باقی تھی، اس لیے باہر ہی کے صحن میں ان کا انتظام ہوا۔ نیجر کا رویہ بہترین تھا، مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے اعتبار نہ آیا۔ آج تک افسوس ہے کہ بلا وجہ میں نے ان کی نیت پر شک کیا۔ لیکن حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ ہمیں کسی بھلے آدمی پر مشکل سے یقین آتا تھا۔

پندرہ دن گزر گئے اور مزدور، کاریگر سب جان سے بیزار ہو گئے۔ اتفاق دیکھیے کئی دن سے منیجر وغیرہ بھی نہ آسکے تھے، اور وہ سب لوگ پریشان تھے۔ ان کے پاس خیمہ بھی نہ تھا نہ ہم ان کے لیے مہیا کر سکے۔ چادروں کے نیچے سب کے بچے بیمار ہو گئے۔ عورتیں بلبلا اٹھیں، اور مزدوروں نے بھی میری طرح بدگمانی کا اظہار شروع کر دیا۔

ایک دن باپو کے سامنے ذکر ہوا۔ میں نے ان سب کا حال سنایا تو انھوں نے اپنے سکریٹری سے کہا کہ ذرا فون کر کے دہلی کلاتھ مل والوں سے پوچھو۔ وہ تو بھلے لوگ ہیں، ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

اور دوسرے ہی دن میں نے دیکھا کہ مزدور خوش خوش گھوم رہے تھے کہ بس دو ایک دن میں ہماری ٹرین لگ جائے گی۔ ہمارے منیجر صاحب آئے تھے سب بندوبست ہو گیا ہے۔

یہی صرف ایک قافلہ تھا۔ جو خوش اور مستقبل کی طرف سے مطمئن بلا غم و غصہ کے ہندوستان سے رخصت ہوا ہے، سب کی زبان پر مالک کے لیے دعائیں تھیں اور تعریف و تحسین جبکہ برلا مل کے ملازمین کا جو حشر ہوا، اور برلا مندر جس طرح قتل گاہ اور قاتلوں کی پناہ گاہ بنا رہا وہ سارے دلی والے جانتے ہیں، اس لیے دہلی کلاتھ مل کی یہ شرافت دیکھ کر سب بول اٹھے کہ سچ مچ دنیا ابھی امن و انصاف پسند کرنے والوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔

لیکن اس کے مقابلے میں دلی کے ہر محکمے کے مسلم ملازمین علیحدہ ہو چکے تھے، ان میں سے بہتیرے ایسے تھے، جو پھر ملازمت پر واپس جانے کے خواہش مند تھے۔ پاکستان جانے کا ان کا ارادہ نہ کبھی تھا نہ اب تک اپنے کو وطن چھوڑنے پر تیار کر پائے تھے۔

خاص طور پر دہلی کے تمام اسپتالوں کے ملازمین قریب قریب کیمپ میں تھے یا پاکستان جا چکے تھے اور ان میں کے باقی اب بھی واپس جانے کے لیے بیتاب رہا کرتے تھے۔ زنانہ میڈیکل کالج کی ڈسپنسری کا ایک مہتمم جس کی پندرہ یا سولہ سال کی ملازمت تھی جب کیمپ

میں آیا ہے تو اسے خیال تھا کہ اپنے پرانے ملازمین کی جان بچانے کے لیے ہماری میٹرن نے کچھ دنوں کے لیے کیمپ بھجوا دیا ہے۔ مگر جب چار ماہ پڑے رہنے کے بعد اور بیسیوں خط بھیج کر بھی سنوائی نہ ہوئی تو اس نے مجھ سے کہا کہ آپ جا کر کہیے۔ میں تنگ آگیا ہوں۔ کسی طرح یہاں سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ سنتا ہوں گورنمنٹ نے کوئی آرڈر بھی نہیں نکالا ہے کہ اسپتالوں میں مسلم ملازمین نوکر نہ رکھے جائیں۔ لیکن میرے ساتھ انصاف کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ یہ بہت سارے لوگ پھر کیوں اپنی جگہ واپس نہیں بلائے جاتے؟ میرا پاکستان میں کیا رکھا ہے۔ میں کیوں جاؤں؟

میں اسپتال گئی، وہاں اس کو سب جانتے تھے۔ سب نے کہا، وہ تو بہت اچھا آدمی ہے۔ یہاں کا سب سے پرانا آدمی ہے، مگر کسی نے حامی نہ بھری کہ اس کو بلانے کی کوشش کرے۔

میٹرن سے بھی ملی اور اس کا سلام پہنچایا۔ بہت خوش ہو کر اس نے پوچھا۔ اچھا، وہ علی محمد ابھی تک ہے۔ ٹھیک تو ہے؟ پاکستان نہیں گیا؟

میں نے کہا، وہ بہت پریشان ہے، یہاں واپس آنا چاہتا ہے، اس کا سامان بھی یہیں پڑا ہے کیا وہ آجائے؟ آپ اجازت دیتی ہیں۔

گھبرا کر بولی، نہیں، نہیں، بس اس کو سلام بول دینا۔ سامان سب ہم نکلوا دیں گے۔ بیچارہ گورنمنٹ ڈسپنسری کا ملازم اپنے پراویڈنٹ فنڈ کو رو رہا تھا۔ کیمپ کمانڈر اور ڈاکٹروں کی معرفت بہتیرے خط بھیجے، مگر جواب نہ آیا۔ اگرچہ معاملہ ہیلتھ منسٹر تک پہنچایا گیا، اور وہ مارچ کے آخر تک دہلی میں رہا مگر کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی شاید پھر بعد کو مل گیا ہو۔

لیکن سامان تقریباً سب منگوا دیا گیا۔ اتنا ہی ہم کر سکتے تھے۔ کسی کا یوسا کالج کی کوٹھری سے نکالا گیا، اور کسی کا ٹی۔ بی کوارٹروں میں مل گیا۔ مگر پاکستان ان کو زبردستی دھکیل کر بھیجا گیا۔

یہی حال ہر محکمہ کے ملازمین کا ہوا۔ جنھوں نے پاکستان لکھا تھا، وہ بھی گئے، جنھوں نے ہندوستان لکھا وہ بھی بھگا دیے گئے۔

ایک صاحب ادکھلے میں پناہ گزیں تھے، ڈاک و تار کے محکمہ میں کسی اچھی جگہ پر نوکر تھے۔ وہ بہت دنوں تک جمے رہے۔ ویسے بھی شاید نیشنلسٹ خیالات رکھتے تھے۔ ادکھلے میں اپنی داڑھی سمیت جب ٹہلنے نکلیں تو راہ چلتے ٹوکیں "اچھا تم ابھی تک پاکستان نہیں گئے، اب تم کو ہم بھیجیں گے!"

آخر کار دل مضبوط کر کے ایک دن وہ آفس پہنچ گئے، تو ان کے افسر نے صاف کہہ دیا،

فضا بہت خراب ہے، آپ ابھی دفتر نہ آیئے، اور چھٹی لے لیجیے۔ شاید دونوں بھائی اسی آفس میں تھے۔ دوسرے بھائی بھی پہنچے، اور گھیر لیے گئے۔ بڑی مشکل سے چند دوستوں نے پچھلے دروازے سے ان کو بچا کر باہر نکالا۔

کتنے اسکول ماسٹر تھے، دیہاتی اسکولوں کے مدرس تھے، پولیس مین تھے اور خاصے بڑے عہدیدار بھی، سب ہی متفکر تھے کہ کیا کریں۔

ان دنوں ہندوستان کے اندر غیر مذہبی ریاست ہونے کے بارہ میں خود کیبنٹ کے اندر بھی وہ اتفاق نہ تھا جو آج ہے اس لیے اعلان کھل کر ہوتے ہی نہ تھے۔ اعلانات مبہم، حکام کا رویہ مخالفانہ، اور سرکار کا طرزِ عمل ناقابل فہم تھا۔ صرف ایک باپو تھے، جو پکار کر کہہ رہے تھے، ہندوستان سب کا ہے۔ اس ریاست میں سب کی جگہ ہے۔ سب انسان بھائی بھائی ہیں یہ سمجھے بغیر دیس کا بھلا نہ ہوگا۔

انھیں دنوں باپو سے ملنے ایک صاحب اجمیر شریف سے آئے، اور اجمیر کی خونی داستان ان کو سنائی۔ اس سے پہلے ۵ دسمبر کو وہاں فساد ہو چکا تھا اور پھر ۱۴ سے لے کر ۱۶ یا ۱۸ دسمبر ۱۹۴۷ء تک جاری رہا تھا۔ بیچ میں کچھ دن معاملہ ٹھنڈا رہا مگر ۱۱ جنوری ۱۹۴۸ء کو پھر شروع ہو گیا۔ سرکاری رپورٹ تو کل ۵۷ آدمیوں کی چھپی، مگر واقعہ یہ ہے کہ کئی ہزار آدمی قتل ہوئے اور مسلمانوں کی ۸۰ ہزار آبادی سمٹ کر ۸ ہزار رہ گئی جو کچھ تھے وہ درگاہ میں جمع ہو گئے تھے۔ ہر لحظہ اندیشہ تھا کہ کب درگاہ پر حملہ ہو جائے۔ باپو کے برت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

اجمیر کے لوگوں سے بھری ہوئی ایک اسپیشل حیدرآباد پہنچی اور خستہ و تباہ حال لوگ جب پاکستان گئے تو کراچی میں بھی بلوہ ہو گیا، اور بیشمار سکھ مارے گئے۔

بدلہ کا یہ چکر سال ڈیڑھ سال سے چل رہا تھا۔ اجمیر کی تفصیلی حالات اگر موقع ہوا تو آگے چل کر لکھوں گی اور ناظرین دیکھیں گے کہ ہندوستان کے ہر حصہ میں ایک ہی اسکیم کے مطابق سارا کام ہوا تھا۔

ادھر تو یہ تمام خبریں سُن سُن کر لوگ کیمپ چھوڑنے کا نام نہ لیتے تھے، اور ادھر بظاہر معاملہ ٹھنڈا ہونے کے باوجود یہ حالت تھی کہ ایک روز جب ۹ - ۱۰ بجے رات کو مجھے فقیر[1] نے فون

ع[1] - جامعہ کا ایک کارکن۔

کیا کہ ہمارے دو ساتھیوں کو ایک سکھ ٹانگہ والا قرول باغ کی طرف بھگا لے گیا ہے، اور قرول باغ اب تک وہ خطرناک محلہ تھا جہاں سے کسی مسلمان کا زندہ بچ کر آنا ناممکن تھا تو میں گھبرا گئی، اور یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ شاید باپو کے برت کا اثر ختم ہو رہا ہے، اور پہل ہمارے ہی ساتھیوں سے ہو گی۔

میں نے پوچھا: "پھر تم نے رپورٹ کی؟"

اس نے جواب دیا: میں یہیں صدر بازار سے بول رہا ہوں۔ تھانیدار صاحب کسی طرح توجہ نہیں کرتے۔ دو پولیس مین اپنے ساتھ جانے کے لیے مانگ رہا ہوں، وہ بھی نہیں دیتے۔ نہ رپورٹ لکھتے ہیں۔

بہر حال مجھے جانا تھا، اور بلا یہ سوچے سمجھے چلی گئی کہ میں کیا کر سکوں گی۔ حالات پوچھے تو پتہ چلا کہ کسی تانگہ کی سائیکل سے ٹکر ہو گئی تھی۔ اور اس زمانہ میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی، اناڑی تانگہ والے روز ہی ایکسیڈنٹ کرتے رہتے تھے، کسی نہ کسی مالک کو مار کر وہ تانگہ چھین لیتے اور اینڈے بینڈے ہاتھ مار کر گھوڑے کو ہانکنا شروع کر دیتے، چلاتے کدھر جاتا کدھر۔ مگر اب وہ کئی ماہ سے تانگہ کے مالک تھے، ان کو کون ٹوک سکتا تھا۔ اتفاق سے یہ دونوں لڑکے وہاں موجود تھے، انھوں نے دوسروں کی مدد سے تانگہ والے کو پکڑا اور اسے مجبور کرنے لگے کہ زخمی کو لے کر اسپتال چلو۔ اس نے جانے سے انکار کیا تو کچھ لوگ چلا اٹھے، نہیں جاتا تو اس کو تھانے لے جاؤ۔ لڑکے دونوں زبردستی اس ارادہ سے تانگہ پر سوار ہوئے کہ مریض کو اسپتال پہنچا دیں، اور تانگہ والے نے گھوڑے کو چابک رسید کر دی۔

کچھ سکھ بھی سائیکلوں پر تانگہ کے ساتھ ہو لیے۔ گھوڑا سرپٹ قرول باغ کی طرف جا رہا تھا، اور اتنا تیز کہ اس پر سے کودنا بھی ناممکن تھا۔

میں نے تھانیدار صاحب سے کہا، کئی گھنٹے اس واقعہ کو ہو چکے ہیں، اور آپ نے نہ اب تک رپورٹ لکھی نہ پولیس بھیجی۔ اگر اس دوران میں لڑکے مار ڈالے گئے تو کون ذمہ دار ہو گا؟

تھانیدار صاحب غالباً خوب پیے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھا، اس سپاہی کو دیکھا جو گھر والوں نے احتیاطاً ساتھ کر دیا تھا اور بولے۔ نہیں مارنے والے کا کوئی ڈر نہیں۔

میں نے سختی سے کہا، یہ تو آپ کا خیال ہے، لیکن ہم کو اندیشہ ہے کہ یہی ہو گا۔ اس لیے آپ دو آدمی مجھے دیدیجیے، تیسرا ساتھ ہے، ہم خود تلاش کر لیں گے۔

انھوں نے غنودگی میں کہا، آؤ بھئی فلاں فلاں، تم بیٹھ جاؤ۔ آواز بھرائی ہوئی تھی۔ سپاہی

قریب آئے، تو ہاتھ میں بندوق کے بدلے لاٹھیاں، طبیعت جل گئی۔

میں نے کہا۔ رکھیے اپنے پولیس والوں کو، آؤ بھئی ہم چلیں۔ ہم تینوں کافی ہیں۔ ہمیں ایسی پولیس کی ضرورت نہیں۔

سپاہی کی نالائقی۔ اس نے نہ جانے کیا چپکے سے کہہ دیا کہ تھانیدار صاحب چونک پڑے، رنگ ہی بدل گیا۔ شاید اس نے بھائی صاحب[1] کی کوٹھی کا پتہ دے دیا۔ یا کیا ہوا۔ مستعد ہو کر کہنے لگے: چلئے میں پورا گارد لے کر خود چلتا ہوں۔ سپاہیوں کو تیاری کا حکم دے دیا۔ بندوق سنگینیں سب ہی نکل پڑیں اور مجھ سے فرمایا کہ آپ تشریف لے چلیے میں پیچھے آتا ہوں۔

قرول باغ شیدی پورہ وغیرہ میں تلاش کرنے کے بعد جو میں پھر تھانے کے پاس سے گزری تو دیکھا مجمع ہے۔ لڑکے آ گئے تھے ۔۔۔۔ چوراہے کے کسی کانسٹبل نے ایک دوسرے کانسٹبل کی مدد سے تانگہ والے کو گرفتار کر لیا تھا۔ اگرچہ اس کو پچاس روپیہ رشوت بھی پیش کی گئی مگر اس نے ملزم کو گرفتار کیے بغیر نہ چھوڑا اور آگے نہ بڑھنے دیا۔ لڑکے متاسف تھے کہ ہماری وجہ سے تانگہ والے کو جیل ہو جائے گی اور تھانیدار صاحب کڑک رہے تھے۔

"حوالات میں بند کر دو بدمعاش کو۔"

حالانکہ مجھے یقین ہے، ہمارے آنے کے بعد ہی، "بدمعاش" خوش خوش گھر کو سدھارا ہوگا۔ یہ حال تھا پولیس کا۔ بدمعاش اکڑے ہوئے گھوم رہے تھے، اور غریب ہندو مسلمان دونوں پٹ رہے تھے۔ برت کے بعد یہ سن کر جی خوش ہوا تھا کہ پولیس مینوں نے بھی وعدے کیے ہیں۔ نیک چلنی کا اقرار کیا ہے، اور اس عرضداشت پر دستخط کیے ہیں جو باپو کے سامنے پیش ہوئی تھی۔ مگر اس طرح کے دو ایک واقعات نے جتا دیا کہ یہ سب وقتی تھا، دل بدلنے اور اخلاق سدھرنے میں ابھی بہت دن لگیں گے۔

اور یہی سب دیکھ کر میں نے سوچا کہ اگرچہ ضمیر کے خلاف ہے، مگر دوسروں کی مشکل آسان کرنے کے لیے اگر ذرا سی دھونس جما لوں، تو یقین ہے، اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے گا۔ اس لیے بھائی صاحب کے اثر اور عہدہ سے میں نے ناجائز فائدہ اٹھایا، اور گھر پر ایک مقدمہ کے سلسلہ میں کپتان پولیس اور آئی۔ جی دونوں سے ملاقات کر لی۔

واقعہ یہ تھا کہ پالم کے ایک پادری صاحب دو جوان لڑکیوں اور چار بچوں کو لا کر میرے

---

[1] رفیع صاحب۔

پاس چھوڑ گئے کیونکہ اب زیادہ دنوں تک حفاظت کرنے کی ان میں طاقت نہ تھی اور ان کے لیے بھی جان کا خطرہ تھا بلکہ اسی حفاظت کے درمیان ایک عورت، یعنی ان سب کی ماں لاپتہ بھی ہو گئی تھی، اس لیے وہ پریشان ہو کر سب کو میرے سپرد کر گئے۔

اس خاندان میں کل ۱۲ افراد تھے، ماں اور دو بیٹے مارے گئے۔ ایک بھتیجا اور باپ جیل میں تھا، اور نوجوان بہو، ان بچوں کے ساتھ آئی تھی۔ پہلے ایک بیٹا غائب ہوا۔ دوسرا سائیکل لے کر اس کو ڈھونڈھنے گیا۔ وہ بھی لاپتہ ہو گیا۔ پھر پولیس آکر باپ کو پکڑ لے گئی۔ اور سازش کے الزام میں بھتیجہ کو بھی جیل بھیج دیا گیا۔ پادری صاحب نے یہ حال دیکھ کر سب کو پناہ میں لے لیا۔ ان کی غیر موجودگی میں ایک فوجی نے آکر ماں سے کہا کہ روپیہ لے کر چلو، اپنے آدمی کو چھڑا لاؤ۔ میں مدد کروں گا، غرضمند عورت ساری جمع پونجی سینہ پر باندھ کر اس کے ساتھ ہو لی اور اس طرح خاندان کے ۵ آدمی ختم ہو گئے۔

مسٹر مہرا آئی۔ جی۔ پولیس فساد کے بعد دہلی آئے تھے، وہ خود بھی فرینٹر کے مصیبت زدہ تھے۔ غیر متعصب۔ شریف اور دلیر آدمی تھے۔ پہلے دن تو ان کی بات چیت سے میری بدگمانی دور نہ ہو سکی تھی مگر جلد ہی مجھے اور میرے تمام ساتھیوں کو اندازہ ہو گیا کہ وہ بھروسہ کے قابل ہیں، اور جہاں تک ہو سکتا ہے، اپنے فرائض دیانتداری سے انجام دیتے ہیں، بہرحال ان کی کوششوں سے مقتول ماں کے کپڑے اور کچھ زیور بھی مل گیا، اور دونوں مظلوم جیل سے رہا بھی ہو گئے۔ یہ خاندان کئی ماہ ہمارے یہاں رہ کر، پھر شاید پاکستان چلا گیا۔

لیکن اس ملاقات کا خوشگوار اثر یہ ہوا کہ اب میری تحریر بھی کام کر جاتی تھی، اور پولیس اسٹیشن کے لوگ مجبور ہو جاتے تھے، کہ ہمارے والنٹیروں کی طرح توجہ کریں۔

اور پھر ایک دن خبر ملی، پرارتھنا سبھا میں بم پھٹ گیا۔ پھینکنے والا موقع پر پکڑ لیا گیا۔ اس کا نام تھا مدن لال۔ آج سارے حالات منظر عام پر آچکے ہیں، اور سب کو معلوم ہے کہ بم پھینکنے والا اکیلا نہ تھا۔ باپو کے دائیں بائیں ہتھیار بند لوگ بھی تھے، جو اس معرفت الٰہی سے بھرپور سینے کو گولی کا نشانہ بنانا چاہتے تھے، مگر ان کے دل دہل گئے۔ ہاتھ کانپ اٹھے۔ داہنے بائیں دشمن، بم کا دھواں بھرا ہوا۔ لوگ سراسیمہ اور پریشان، اور وہ روشنی کا مینار بدستور اپنی جگہ پر سکون۔ مطمئن، کہہ رہا تھا "شانتی، شانتی" الٰہی اس بڈھے، کمزور جسم کے اندر کونسا دیا جگمگا رہا تھا کہ اتنے اندھیرے میں بھی اجالا ہی رہا۔

اور پھر قطب صاحب کے عرس کے دن، ہم سب مہرولی گئے۔ لڑکے بھلا کیوں پیچھے

بیٹھتے۔ انھوں نے ٹوٹی قبروں میں بھی چہل قدمی کی۔ ایک انسانی ہاتھ پڑا دیکھ کر انھیں خیال ہوا کہ باقی اعضا بھی یہیں کہیں ہوں گے، انھوں نے ڈھونڈھ کر سب جمع کیے۔ ان کو اکٹھا کر کے انسانی ڈھانچہ تعمیر کیا اور ایک خالی قبر میں اتار دیا۔ یہ سن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "اتنا خوفناک کام تم نے کیا اور کیسے کیا" میں پوچھ اٹھی لیکن وہ ہنس رہے تھے، ان کے دل مضبوط تھے، سیکڑوں لاشیں قبر میں اتارنے کے بعد ایک ہڈیوں کے ڈھانچہ کی ان کی نظر میں اہمیت ہی کیا باقی رہی تھی۔

اور پھر ۳۰ جنوری کو تو علی الصبح ابا جان[1] کی حالت خراب سن کر میں لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئی۔ گھر سے نکلتے وقت، سوار ہوتے وقت، راستے میں، کئی بار خیال آیا کہ زندگی اور موت کا کچھ اعتبار نہیں، دیکھو میں باپو سے ملے بغیر چلی جا رہی ہوں، کیا پتہ کیسا اتفاق پیش آئے۔ آخر کل کیوں نہیں گئی؟ مگر اس وقت ملنے کا سوال ہی کیا تھا۔ پانچ تو بجے تھے۔ صبح تڑکے۔

اور شام کو وہ بیچائی۔ محبت اور شانتی کا آفتاب غروب ہو گیا۔ ابا جان دم توڑ رہے تھے کہ باپو کے رخصت ہونے کی خبر پہنچی۔ کچھ دیر تک تو یقین ہی نہیں آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر پھر پاگل پن دیکھیے میں نے فون پر بھائی صاحب سے کہا۔ میں بھی دہلی آؤں گی۔ انھوں نے میری بیوقوفی پر حیران ہو کر پوچھا:

"ارے میاں جان کو اس حالت میں چھوڑ کر!"

اور میں شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ کس سے ملنے جاؤں گی؟ کس کو دیکھنے جاؤں گی؟ سکون کا دریا تو اپنا رخ بدل چکا۔ اب تسکین کہاں ملے گی؟ وہ بے شمار آہیں، وہ آنسو، وہ چیخیں، وہ سارے درد بھرے دلوں کی فریادیں آسمان سے ٹکراتی رہیں اور پاک روح اپنے مستقرِ اعلیٰ کو پرواز کر گئی۔

ابا جان آخری ہچکیاں لے رہے تھے، اور میں ریڈیو سے لپٹی ہوئی خبر کی تفصیل سن رہی تھی۔ جواہر لال جی کی کانپتی ہوئی آواز نے سب کچھ کہہ سنایا۔ ادھر سے ہٹی تو ابا جان کے پاس سورہ یٰسین سنی، زمین سخت تھی، آسمان دور۔ میں تو اپنا زخمی دل لے کر موجودہ زمانہ کے سب سے

---

[1] - امتیاز علی صاحب قدوائی، رفیع صاحب کے والد اور میرے تایا۔ ہم خورد سال بھائی بہنوں کی ماں باپ بن کر انھوں نے پرورش کی تھی اور اپنے بچوں سے زیادہ محبت و پیار ہمیں دیا تھا کیونکہ ہمارے والدین ختم ہو چکے تھے اور پانچ بچے یتیم و یسیر تھے۔

بڑے مسیحا کے پاس گئی تھی، اور آناً فاناً زخم مندمل بھی ہو گیا تھا مگر اب یہ نیا گھاؤ۔ نیا چر کا کیسے اچھا ہو گا؟ اس درد کا مداوا کہاں ملے گا؟

ابا جان کو دیکھتی تو ماضی کی ساری داستان یاد آجاتی۔ ان کی شفقتیں، ان کی بے پناہ اور بے نظیر محبت، ان کا غیر معمولی ایثار، سب نظروں میں سمایا ہوا تھا، دل پر نقش تھا، مگر سوچتے ہی سوچتے انھوں نے بھی الوداع کہی۔ سلک کے باپ اور اپنے باپ دونوں سے گھنٹوں میں، ہمیشہ کے لیے محروم ہونا پڑا۔

میرے لیے یہ حادثہ دہرا تھا۔ مندمل زخم پھر ہرے ہو گئے۔ بھولی ہوئی داستان پھر یاد آگئی گزرے ہوئے حادثہ کا اب تک دماغ پر اثر تھا۔ اب بھی بعض وقت دل چاہتا تھا سب کچھ بھول جاؤں لیکن کبھی ایسا بھی وقت آجاتا تھا کہ سب بھولا ہوا سمیٹ لینے کو جی چاہتا تھا۔

مگر اب تو زندگی ایک بار پھر مصیبت بن کر سامنے آگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا قیامت آجائیگی، آسمان ٹکڑے ہو کر گر پڑے گا۔ زمین پھٹے گی اور اس میں سے سوتے ابل کر اس پاپی ملک کو غرق کر لیں گے۔ یہ چھت آخر رکی کیوں ہے۔ یہ لوگ چل پھر کیوں رہے ہیں۔ ساری دنیا واویلا کیوں نہیں کرتی؟

لوگ کہتے ہیں۔ اندر گاندھی جی کی لاش پڑی تھی اور شہر میں شہرہ تھا کہ مسلمان نے قتل کیا ہے۔ میرے بھائی[1] نے خود اس مجمع میں ایک شخص کو دیکھا۔ جو یہ کہتا پھر رہا تھا قاتل مسلمان ہے، اور جواہر لال جی اور سردار جی اگر دل کو سنبھال کر ریڈیو سے اعلان نہ کر دیتے تو صبح تک نہ جانے کتنے مسلمانوں کی لاشیں تڑپ کر ٹھنڈی ہو چکی ہوتیں۔

پھر بھی تین پر چھرے چل گئے مگر اب بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو بپھر رہے تھے۔ مسلمانوں کی وجہ سے یہ ہوا۔ ان کے سبب سے گاندھی جی کی جان گئی۔ انھیں کی محبت اور ہمدردی میں اپنے کو قربان کر دیا۔ انھیں قاتل پر غصہ کم تھا، اور مسلمانوں پر زیادہ۔ مولانا لوگوں کی کھسر پھسر کو وہ قتل کا ذمہ دار قرار دیتے تھے کہ اگر یہ لوگ جا کر ذرا ذرا سی بات نہ جڑتے رہتے تو گاندھی جی کے ہندو دشمن نہیں ہو سکتے تھے۔

ؑ1۔ مصطفٰے کمال قدوائی ان دنوں دہلی میں تھے۔ انھوں نے جب اس شخص کو یہ پروپیگنڈا کرتے دیکھا اور دوڑ کر رفیع بھائی سے جو آگے تھے یہ بتایا۔ انھوں نے فوراً جواہر لال جی کو جو کمرہ میں پہنچ چکے تھے، اطلاع کی۔

اور مسلمانوں نے کلیجہ تھام لیا۔ "خدایا، وہ ظالم مسلمان نہ ہو۔ یہ گناہ کسی مسلمان کے ہاتھ سے نہ ہوا ہو ورنہ قیامت تک یہ لعنت ہمارے سر رہے گی، یہ محسن کشی ہمارا نام و نشان مٹا دے گی۔"

اور جب نام سنا تو سناٹے میں رہ گئے۔ سکھوں نے قاتل کا نام سنکر اطمینان کا سانس لیا۔ واہ گورو نے بڑی خیر کی قاتل سکھ نہیں ہے، ورنہ آج ہم سب مرے تھے۔

لکھنؤ کے ایک نواب صاحب نے جس وقت سے سنا روتے ہی رہے۔ صبح ارتھی کا جلوس چلا تو ننگے سر ننگے پیر ساتھ ہو لیے اور کہا۔ "میں بھی وہیں جا رہا ہوں، جہاں گاندھی جی گئے ہیں۔" راستے ہی میں گرے اور جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

ایک ہفتہ بعد دہلی واپس گئی۔ مگر اب نہ کوئی حال نظر آتا تھا نہ مستقبل۔ طوفان کے بعد سکون آندھی کے بعد سناٹا۔ جہاں بیٹھو باپو کا ذکر، انھیں کے قصے۔

رو میں ہے رخش عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

تیرھویں تک تو رونے کے سوا کوئی کام ہی نہ کر سکی۔ روتی صرف گاندھی جی کو تھی، ان کے سوا کس کو روتی۔ میں تو اب باقی زندگی ان کے قدموں میں بتانے آئی تھی۔

اب بھی راج گھاٹ جاتی ہوں۔ اپنے مرشد اور اپنے گورو کی چتا پر آنسو بہا آتی ہوں، مگر ان کی زندگی میں جو کچھ ملتا تھا۔ اس سے محروم ہوں۔ برلا ہاؤس بھی کئی بار گئی، اور اس جگہ بھی جہاں راہ حق میں چلتے ہوئے "مسافر کو نیند آئی تھی۔" اس پر اب بھی پھول بکھرے رہتے ہیں ؎

بر زمینے کہ نشانے کف پائے تو بود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

اس تختہ اور اس چادر کو بھی آنکھوں سے لگایا، جس پر باپو بیٹھا کرتے تھے مگر تسکین نہ ملی، اور کب تک نہ ملے گی اللہ ہی جانے۔ تختہ پر گاؤ تکیے سے لگی ان کے بجائے ان کی بڑی سی تصویر تھی، لیکن میری ہمت نہ پڑی کہ اسے دیکھوں، اقبال کا شعر یاد آگیا ؎

ذوقِ حضور در جہاں رسم صنم گری نہاد
عشق فریب می دہد، جان امیدوار را

وہی کمرہ، وہی سامان، وہی تخت، وہی تکیہ، ارد گرد وہی کتابیں۔ صرف وہ نہیں، مگر ان کی مسکراتی ہوئی تصویر، حضوری کا سارا لطف حاصل ہو سکتا تھا، لیکن میں ڈر گئی۔ کہیں میں پوجنے نہ لگوں۔ ادھر آنکھ نہ اٹھائی۔ ہزار موقع ہیں، ان کی تصویر کو ہی دیکھ سکتی ہوں مگر اس ماحول

میں اسے دیکھ کر جو جذبات پیدا ہوتے، وہ تو دوسرے ہی ہوتے۔ اور اس لیے ایک سچے موحد کی طرح اس طرف سے پیٹھ کر کے روئی۔ جو جا چکا وہ تصور میں بھی آسکتا ہے۔ ان ظاہری آنکھوں کے روبرو کیوں بلاؤں۔

تیرھویں سے ایک روز پہلے جامعہ کے ایک آرٹسٹ نے کھری پلائی کا باپو کا قدآدم مجسمہ تراش کر سبھدرا کو بھیجا۔ مجسمہ کانگرس آفس میں رکھ دیا گیا۔ اتنا ہی قد، وہی جسم۔ ایسا لگتا تھا باپو اخبار لیے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ عین مین وہی چہرہ وہی مسکراہٹ!

محلہ میں خبر اڑی تو دو برقع پوش عورتیں آئیں اور تصویر کے قدموں میں بیٹھ گئیں بڑی دیر تک ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔ ہا، کیسے اچھے آدمی تھے... پٹیل نے مروادیا!

سبھدرا نے کہا۔ ذرا دیکھئے تو عوام کی حالت۔

تیرھویں کے دن کانگرس پارٹی کے ایک صاحب نے بہ اصرار مجھے اس رتھ پر بٹھایا جس پر مجسمہ پھولوں سے لدا ہوا رواں تھا۔ یہ سین ناقابل برداشت تھا۔ آگے آگے استھیاں تھیں، پیچھے پیچھے تصویر۔ آج موت آگے تھی اور زندگی پیچھے۔ بَین و بکا کا یہ سین شاید چشم فلک نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ سارا ہندوستان باپو کا غم منا رہا تھا اور دلی کی سرزمین ایک مکمل انسان کا خون پی کر ساکت تھی۔ اب اس نے ایک بے گناہ کی متبرک خاک کو اپنی مٹی میں ملا لیا یہی شاید وہ مانگتی تھی۔ اسی قربانی کی شاید ضرورت تھی۔

دنیا میں جب کبھی فتنہ فساد انتہا کو پہنچا کسی نہ کسی عظیم شخصیت نے گناہ کی دہکتی ہوئی بھٹی کو سرد کرنے کے لیے اپنے خون کے چھینٹے دیے ہیں۔

کچھ نہیں معلوم کون آیا اور ابھی کتنے آئیں گے۔ لوگ کہتے ہیں۔ عیسیٰ پھر آئیں گے۔ مہدی آخر الزماں آئیں گے۔ سری کرشن آئیں گے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے مگر مجھے یقین ہے جو آئے گا یہی کرے گا جو آچکے وہ یہی کرتے رہے۔

حسین نے کربلا میں بال بچوں کو قربان کر کے، اپنا سر دیکے، ابراہیم نے آگ میں کود کر، عیسیٰ نے سولی پر چڑھ کر اور بہتوں نے جان دیکر، زندہ آگ میں جل کر ان سے پہلے سچائی کو زندہ رکھا تھا۔ کیا ہماری آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہوا، یہ اس سے الگ کوئی چیز تھی۔

میں اکثر سوچا کرتی تھی، وہ کیسے ہاتھ ہوں گے جنھوں نے عیسیٰ کو سولی پر چڑھایا۔ وہ کیسے دل ہوں گے جو حسین، نواسہ رسولؐ کو بے آب و دانہ شہید ہوتے دیکھتے رہے، لیکن وہ ہاتھ

ہم نے دیکھ لیا۔ یہ شیطانی ہاتھ جو ہمیشہ کام کرتا رہا ہے، اس صدی میں بھی نمودار ہوا، اور نیکی کا گلا گھونٹ دیا۔ مگر نیکی مر نہیں سکتی۔ سچائی فنا نہیں ہو سکتی۔ وہ تو امر ہے ؎

ابر رحمت تھا، کہ تھی عشق کی بجلی یارب
جل گئی مزرعۂ ہستی تو اُگا دانۂ دل

استھی کے جلوس کے پیچھے گاندھی جی کے قاتل کی تصویر ہنس ہنس کر بیچی جا رہی تھی، اور اس سے پہلے ارتھی کے پیچھے لوگ ہنستے، اور تالیاں بجاتے بھی چل رہے تھے، زمین پر شاید ہی کسی انسان کا جنازہ اس شان سے اٹھا ہو گا۔ ہر آنکھ آنسوؤں سے لبریز تھی، اور دل غموں سے چور، چور، مگر چند انسانیت کے دشمن اس وقت بھی مٹھائیاں بانٹ رہے تھے۔

وہ شیطانی ہاتھ جو بہتوں کو سولی پر چڑھا چکا تھا، جو مردانِ حق کو شہید کر چکا تھا، جو اولیاء اللہ کو خاک و خون میں تڑپا چکا تھا، جو گاندھی جی کو گولی مار چکا تھا، ابھی کچھ اور بھی کرنا چاہتا تھا، اس کے عزائم بلند تھے، ارادے زوردار تھے۔ مگر غیرتِ الٰہی آخر کہاں تک برداشت کرتی ؟

سارا ہندوستان چونک پڑا۔ دل بدلے، دماغ بدلے اور پھر ہم سب بدل گئے۔

کیا خبر تھی، وہ آنکھ جو ماضی و حال سے گزر کر مستقبل کی جھلک بھی دیکھ لیا کرتی ہے، صرف چند دن کی مہمان ہے، اور مجھے، ان کو رونا پڑے گا، جو دنیا کے آنسو پونچھتے تھے۔

"غم نصیب اقبالؔ کو بخشا گیا ماتم ترا !!
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ جو تھا غم بھرا"

8

اغوا شدہ لڑکیاں

اس درمیان میں ایک بہت بڑا مسئلہ ہمارے سامنے اور بھی آگیا تھا جس کا میں نے اب تک ذکر نہیں کیا اور وہ تھیں "مغویہ لڑکیاں" پرانے قلعے اور مقبرہ ہمایوں اور... جامع مسجد کے سامنے والے الور اور پٹیالہ کے پناہ گزینوں نے مجھے ایسی بہت سی لڑکیوں کے نام لکھائے تھے جو ہنگامے کے دوران ان سے چھین لی گئیں یا بھاگنے میں بچھڑ گئیں۔ نام میں لکھتی جا رہی تھی مگر اب تک دو ایک کے سوا کسی کو حاصل نہ کر سکی تھی۔

باپو کے سامنے ہی یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ اغوا شدہ لڑکیاں اگر واپس لائی جائیں تو ان کے اعزہ انھیں قبول بھی کر لیں گے؟ کیونکہ ہندو لڑکیاں جب پاکستانی مسلمانوں کے پاس سے لائی گئیں تو ان کے اعزّہ نے انھیں رکھنے سے انکار کر دیا۔ مہاتما جی کو معلوم ہوا تو انھیں بڑی سخت تکلیف ہوئی۔ سب کے سامنے بھی کہا اور شام کی تقریر میں بھی کہا کہ جوان مصیبت کردہ عورتوں کو لینے سے انکار کرتے ہیں وہ سب سے بڑے پاپی ہیں۔ وہ لڑکیاں تو پوتر ہیں، مجھ سے زیادہ پوتر۔ وہ گناہ اور برائی سے بھاگ کر آئی ہیں اور دوسرے کے گناہ کا ان پر کیا دوش۔

لیکن مقبرہ میں ایسے تین چار کیس میرے سامنے آئے، اور یہ دیکھ کر بہت ہی اطمینان اور خوشی ہوئی کہ عام طور پر مسلمانوں میں یہ ذہنیت نہ تھی۔ وہ خود تلاش کراتے اور جب مل جاتی تو اسے خندہ پیشانی سے اپنا لیتے۔

نومبر میں ایک روز زار و قطار روتا ہوا ایک جوان میواتی میرے پاس آیا۔ ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں اور اونچی آواز سے رو رہا تھا۔ بہت پوچھنے اور دلاسا دینے پر بمشکل اس نے کہا "حضور میری عورت کو دو ماہ سے سکھ اٹھا لے گئے تھے اس کی تلاش میں اکثر پھرتا رہتا ہوں۔ آج جب میں علی گنج کی طرف سے گزرا تو کوارٹر میں وہ کھڑی نظر آئی مجھے دیکھ کر

۔وپڑی۔ میں دوڑا کہ اس کو پکڑ لوں مگر تلواریں لے کر بہت سے لوگ دوڑ پڑے اور میں نہتا تھا، جان بچا کر بھاگا۔ اس نے بتایا کہ واقعے کو بمشکل آدھ گھنٹہ ہوا ہے۔ سیدھا وہیں سے آرہا ہوں۔ میری مدد کیجیے۔ میری عورت۔ کہہ کر وہ پھر رونے لگا۔

کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ ابھی تک تو میں زیادہ لوگوں سے واقف نہ تھی۔ یہی تدبیر سوجھی کہ برلا ہاؤس لے چلوں۔ وہیں کوئی حل نکل آئے گا۔ برج کشن جی چاندی والا نے کہا کہ یہ پولیس کا کام ہے لیکن میں دہلی کی پولیس سے واقف بھی تو نہ تھی۔ انھوں نے صلاح دی کہ اندرا گاندھی سے کہیے وہ یہ کام کرا دیں گی۔ میواتی کی خوش قسمتی کہ یہ باتیں ختم ہی ہوئی تھیں کہ اندرا باپو سے ملنے آگئیں۔ انھوں نے کہا چند منٹ انتظار کیجیے باپو سے مل کر ابھی آتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میواتی کو لے کر اندرا کے ساتھ پنڈت جی کی کوٹھی گئی۔ اندرا نے ایس پی کو فون کر دیا اور میں نے محسوس کیا کہ اب ٹھہرنا بے کار ہے۔ اس لیے میواتی کو ان کے سپرد کر کے میں چلی آئی۔ مگر فکر وہی کہ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ چند گھنٹے بعد دیکھا میواتی خوش خوش چلا آرہا تھا۔ عورت فوراً ایس پی نے برآمد کرائی۔ اس کوارٹر میں تو نہیں ملی مگر انھوں نے آس پاس کے تین چار کوارٹروں کی تلاشی لے کر اسے ڈھونڈ ہی نکالا۔

ایک دوسرا واقعہ اور ہوا۔ مہاجرین میں سے ایک نوعمر لڑکا جس کی شادی کو صرف سوا سال ہوا تھا اور بیوی کی گود میں دو ماہ کا بچہ بھی تھا اپنی عورت کو تلاش کرتا رہتا تھا۔ ایک روز اسے کسی نے خبر دی کہ بھوگل میں کسی جاٹ کے پاس وہ لڑکی ہے اور یہ خبر ایک بڈھی چماری نے اسے پہنچائی تھی چماری کا دل لڑکی کے رونے بلبلانے پر تڑپ اٹھا اور اس نے پیغام پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ لڑکے نے بتایا کہ اس نے میرا پھولٹر (فوٹو) بھی مانگ بھیجا تھا اور کل اپنی تصویر کھنچوا کر میں نے بھیج دی تو اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کے روئی چماری کہتی ہے۔ تیری یاد میں دیوانی ہے۔ بلک رہی ہے وہ مٹھن سالا[1] اسے کھیت میں کام کرانے لے جاتا ہے۔ وہاں وہ شام تک رہتی ہے میں بھی دور سے چھپ کر اسے دیکھ آتا ہوں مگر لانے کا موقع نہیں لگتا۔

یہ بھی بتلایا کہ مٹھن کہتا ہے۔ یہ عورت محنتی نہیں ہے۔ اس کو بیچ ڈالوں گا۔ دو سو روپیہ مانگتا ہے۔ ابھی وہ کھیت میں ہو گی۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔ پولیس بھیج کر اس کو منگا لیجیے۔

---

[1] وہ جاٹ جو اسے لے گئے تھے۔

اس وقت ڈاکٹر سوشیلا نائر دوبارہ کیمپ آگئی تھیں ۔ انھوں نے کہا چلو میں خود چلتی ہوں کدھر ہیں وہ کھیت؟ معلوم ہوا او کھلے کی طرف۔ مگر دن بالکل تھوڑا رہ گیا تھا۔ یقیناً پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی۔ میں اکیلی ہوتی تو شاید صبح پر ملتوی کرتی۔ میں نے کہا بھی، سوشیلا کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم ایک پولیس مین کو ساتھ لے لیں مگر انھوں نے لاپروائی سے جواب دیا۔ پولیس کی کیا ضرورت ہم دونوں چلیں گے۔ کیا آپ ڈرتی ہیں؟ اور مجھے یہ اقرار کرتے شرم آئی کہ ہاں کچھ خوف کا شائبہ تو معلوم ہو رہا ہے یہ دبلی پتلی پاکیزہ متبسم چہرہ والی لڑکی غضب کی سنجیدہ اور بہادر تھی۔ ایک پر وقار خاموشی اور بلا کی نرمی نے سوشیلا کو ہم چشموں میں بہت ہی ممتاز و نمایاں کر دیا تھا۔

او کھلے پہنچے تو اندھیرا شروع ہو چکا تھا مگر سوشیلا۔ نڈر بے جھجک مجھ سے بیس قدم آگے جھاڑیوں میں گھستی، کھیتوں کو روندتی آگے بڑھتی رہی۔ اور بہت سی عورتیں ملیں مگر اوصاف[1] کی محبوبہ ان میں نہ تھی۔ اور اوصاف روئے دیتا تھا۔ ہم اسے دلاسا دیتے۔ مگر وہ ایک ایک سے سوال کرتا۔ اتنا تو پتہ چل ہی گیا کہ آتی روز ہے مگر آج نہیں ہے۔ سہ پہر تک تھی۔ اب گاؤں میں ملے گی اس لیے بھوگل جانا پڑا۔

اور بھوگل[2] وہ جگہ تھی جہاں مکمل قبضہ شرنارتھیوں کا تھا۔ اس علاقہ میں سنگھ[3] کا بڑا زور رہ چکا تھا اور چند ہی مسلمان بہت ہی کشت و خون کے بعد یہاں سے بچ کر جا سکے تھے۔ سوشیلا بے تکلف گھر کے اندر چلی گئیں اور ان کے پیچھے پیچھے میں بھی۔ اب اس وقت وہ سامنے نہیں ہیں اس لیے اقرار کرتی ہوں کہ کتنے شرم کی بات تھی۔ میرے قدم گھر کے اندر گھستے ہوئے ڈگمگا رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی۔ باپو نے کونسی روح سوشیلا کے جسم میں پھونک دی ہے کہ موت، تکلیف، نقصان کسی چیز کا ڈر ہی نہیں باقی رہ گیا اور میں جو اپنے کو مسلمان کہتی ہوں اتنی بزدل!؟ اپنے اوپر نفرین بھیجتی ہوئی دونوں مکانوں میں ساتھ ساتھ گئی۔ اوصاف زور زور سے پکار رہا تھا "جان بی" "جان بی" مگر جواب کوئی نہ ملا اور سوشیلا گھر والوں کو ڈانٹ رہی تھیں۔ "اگر لڑکی تمھارے پاس ہے، تو فوراً ہمارے ساتھ کر دو، ہمیں بتاؤ، کہاں ہے، ابھی تو میں آئی ہوں، لڑکی لے جاؤں گی، تمھیں کوئی نقصان

ع[1] - اوصاف اس میواتی لڑکے کا نام تھا۔

ع[2] - موجودہ جنگ پورہ۔

ع[3] - آر - ایس - ایس۔

نہیں پہنچے گا ورنہ پھر پولیس آئے گی، اور تم سب کے ساتھ وہ ہو گا جو مجرموں کی سزا ہے، مگر لڑکی کہیں نظر نہیں آئی۔ شاید نو بجے رات کو ہم بے نیل و مرام واپس آئے۔

تقریباً ایک ہفتہ بعد اوصاف پھر مجھے ملا۔ بہت ہی خوش تھا۔ کہنے لگا۔ آپا جی، چلیے میں جان بی کو لے آیا۔ میں نے پوچھا۔ کہاں ملی؟ کیسے ملی؟ جواب دیا۔ بڑی دور سے لایا ہوں۔ جس وقت بھوگل میں آپ کے ساتھ گیا تھا۔ جان بی کہتی ہے وہ ایک بھس کی کوٹھری میں بند تھی۔ منھ میں کپڑا اٹھسا ہوا تھا، اس لیے نہ بول سکی۔ مٹھن کو کسی نے کھبر (خبر) بھیجدی تھی۔ بس پہلے سے پھکر (فکر) کر لی۔"

مٹھن راتوں رات جان بی کو لے کر یو پی بھاگا۔ کسی گاؤں میں لے جانا چاہتا تھا۔ رستہ میں ایک ٹھکانے مسلمان نماز پڑھ رہے تھے۔ جان بی نے جو یہ دیکھا تو ہاتھ چھڑا کر ان کے بیچ میں بھاگ گئی اور مسلمان بہت تھے اس لیے مٹھن بھاگ گیا۔ میں تو اس پھکر میں پیچھے لگا ہوا تھا۔ کئی دن سے میں بھی چل رہا تھا۔ اور میں نے سب حال بتایا۔ مسلمانوں نے میرے ساتھ کر دیا۔ وہاں خیمہ میں لیٹی ہے۔ آپ جرا (ذرا) چل کر دیکھیے تو بڑی کمجور (کمزور) ہو گئی ہے۔ وہ کہتا رہا اور ساتھ چلتا رہا۔

جان بی خیمہ میں لیٹی ہوئی تھی۔ لحاف کو دہرا کر کے اس پر چادر بچھا دی گئی تھی اور کمبل اوڑھے پندرہ سولہ سال کی دبلی پتلی نکھرے رنگ والی لڑکی نیم جان سی پڑی تھی۔ اوصاف نے بے تابی کے ساتھ اس کا دبلا پتلا ہاتھ اٹھا کر مجھے دکھایا۔ دیکھیے کیا حال ہو گیا ہے۔ کلائی کتنی پتلی ہو گئی ہے۔ حرامزادے نے میرا بچہ بھی مار ڈالا اور یہ کہتے کہتے دونوں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

اسے نرم و گرم بستر پر لٹا کر اوصاف ٹھنڈی زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ خیمے میں اور کچھ نہ تھا۔ شاید ایک گلاس اور ہو گا۔ بس۔ اپنی کل پونجی اس نے جان بی کے آسائش کے لیے وقف کر دی حتیٰ کہ وہ صدری بھی۔ جو قمیص کے اوپر وہ پہنے رہتا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ تین دن وہ اپنے بچے کی فکر میں بالکل نہ سوئی۔ ہر وقت اپنے سینے سے اسے چمٹائے رکھتی تھی۔ مگر چوتھی رات تھک کر غافل ہو گئی اور جب آنکھ کھلی تو بچہ غائب تھا۔ اس کے رونے چیخنے پر ان لوگوں نے کہا بچّہ تو بلّی کھا گئی اور پھر وہ نہ ملا۔

میرے سوال پر اس نے بتایا کہ اس روز جب ہم لوگ کھیتوں میں اسے تلاش کر رہے تھے تو کسی نے جا کر اسے خبر کر دی اور یہ سنتے ہی اسے کوٹھری میں ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دیا گیا۔

میں تھوڑی دیر خاموشی کے ساتھ ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ ان کی پہلی محبت، ان کا پہلا بچہ، اور بیرحم انسانوں کے ہاتھوں اس کا یہ حشر! ؟ خدایا انسان کب تک بھیڑیئے کا جامہ پہنے رہے گا۔

چونکہ پولیس کے افسروں سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہو چکی تھی اس لیے میں نے وہ بہت سے نام جو نوٹ بک پر درج تھے۔ ان کو بھیج دیے اور اس طرح کئی لڑکیاں اور بھی برآمد ہوئیں۔ لیکن یہ سب کوششیں انفرادی اور اتنی حقیر تھیں کہ اتنے بڑے اہم معاملہ میں کوئی حقیقت نہ رکھتی تھیں۔

مس مردولا[1] سارابھائی نے اس کی اہمیت کا ذرا پہلے سے اندازہ کر لیا تھا اور وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ باقاعدہ کام شروع کرانا چاہتی تھیں۔ ادھر ہمیں یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ جس گاؤں سے ہم ایک لڑکی برآمد کرتے ہیں وہاں کی دوسری لڑکیاں کہیں قتل نہ کر دی جائیں۔ سزا کے ڈر سے لوگ یا انھیں فروخت کر دیتے تھے یا ختم کر دیتے تھے۔

جامع مسجد کے سامنے پٹیالہ اور نابھ کے لوگوں کا گروہ تھا اور مسجد کے تمام برآمدے ان سے بھرے رہتے تھے۔ ان میں سے کسی کے ساتھ جوان عورت یا لڑکی نہ آئی تھی اور یہی حال دلی صوبہ کے دیہاتوں کا ہوا تھا۔ گوجر اور جاٹ دلی کی بہادر قومیں ہمیشہ دلی کو لوٹتی رہی تھیں مگر لڑکیوں کی لوٹ تو ان کو پہلی بار ہی نصیب ہوئی تھی۔ جی کھول کر انھیں لوٹا تھا اور دھڑلے سے تجارت کر رہے تھے۔ لیکن خود گورنمنٹ کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ کارکن پاکستان اور ریاستوں میں اپنی عملی مشکلات کا ذکر کرتے تھے اس لیے مردولا جو کام، جنگ، اور عزم و ارادہ میں غیر معمولی جرأت کی مالک ہیں باپو کی زندگی ہی میں پاکستان گئیں۔ لاہور اور کراچی وغیرہ کے حکام سے ملیں اور پھر جلد ہی دونوں حکومتوں نے اس پر رضامندی ظاہر کر دی کہ اس ظلم کی تلافی کی جائے اور ایسی تمام لڑکیاں اپنے عزیزوں کو واپس دلائی جائیں۔ اس سیاسی اغوا کو کسی طرح جائز نہ قرار دیا جائے۔

باپو نے سوشیلا کو ریاستوں کے لیے تجویز کیا تھا۔ دہلی میں ویمین[2] سیکشن نے اسے

ع۱ - گاندھی جی کے ساتھ ہی مردولا سارابھائی بھی دہلی آ گئی تھیں اور کانسٹی ٹیوشن ہاؤس میں مقیم تھیں۔

ع۲ - وزارت امداد بحالی کے ویمین سیکشن کے ماتحت۔

سنبھالا اور دوسرے صوبوں کا حال معلوم نہیں۔ یہاں ویمن سیکشن کی انچارج مسز نہرو[۱] تھیں۔ مردولا پہلے ہی پاکستان کی دوڑ لگا رہی تھیں اور باپو کے جاتے ہی سوشیلا نے ریاستوں کا رخ کیا۔ پہلا نمبر پٹیالہ کا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کام دیر سے شروع ہوا۔ اور جب ہونے لگا تو کبھی پولیس نے روڑے اٹکائے، کبھی حکام نے، کبھی سرپھرے عوام نے۔ خود کام کرنے والوں کی کمزوری اور عوام کے عدم تعاون نے بھی بہت پریشان کیا۔

مشکل یہ تھی کہ سارے "چور چور موسیاں بھائی" تھے۔ دہلی کا سارا ایڈمنسٹریشن "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" تھا۔ کس کو پکڑا جاتا اور کون پکڑتا۔ اوپر سے لے کر نیچے تک سب ہی اس حمام میں ننگے تھے۔ نہ صرف دہلی بلکہ ریاستیں اور پاکستان سب جگہ یہی حال تھا اور اس پاپ کی ابتدا ہوئی تھی۔ نواکھالی سے۔

پھر بھی مردولا کی ہمت، سوشیلا نائر کی ان تھک محنت اور ایسٹ و ویسٹ پنجاب کی بہت سی بہنوں کی بے پناہ کاوش نے ہزاروں لڑکیاں برآمد کرا دیں۔

کئی کئی سو عورتوں کے گروہ پاکستان سے آئے[۲] اور ہزاروں کے غول ہندوستان کی ریاستوں سے۔ مگر دہلی سے میرا خیال ہے دو سو کے اندر ہی اندر لڑکیاں برآمد ہوئی ہوں گی۔ ان میں سے کچھ کو تو ایک باہمت چمار تنہا برآمد کر کے ان کے رشتہ داروں کو دے آیا۔ کاش مجھے اس شریف انسان کا نام معلوم ہو سکتا۔ لیکن وہ تو اتنے چپکے سے لڑکی رشتہ داروں میں پہنچا دیتا کہ کوئی نہ جان سکا وہ کون ہے۔ لڑکی صرف یہ بتاتی تھی بڈھا ہریجن مجھے چھوڑ گیا ہے۔ باپو کا سچا بھگت "نیکی کر اور دریا میں ڈال" پر عمل کر رہا تھا۔ کچھ لڑکیاں سوشل ورکرس

ع۱ - مسز رامیشوری نہرو پاکستان سے آنے والی اور برآمد ہونے والی عورتوں کی انچارج تھیں۔ ان کی امداد و بحالی کی ذمہ دار۔

ع۲ - جلد ہی سنٹرل رکوری آرگنائزیشن کا قیام عمل میں آیا اور دونوں حکومتوں یعنی ہندوستان و پاکستان میں لڑکیوں کی برآمدگی کا کام شروع ہو گیا۔

ع۳ - یہ تو صرف سوا سال کے اعداد و شمار تھے۔ بعد کو ۱۹۵۷ء تک رکوری آرگنائزیشن کام کرتی رہی اور تقریباً سترہ ہزار ہندو لڑکیاں پاکستان سے برآمد کر کے ہندوستان بھیجی گئیں اور بیس ہزار سے اوپر مسلم لڑکیاں پاکستان بھیجی گئیں۔

اور جمعیۃ کے کارکنوں نے برآمد کرائیں اور چند محکمۂ پولیس کی کارگزاری کی مرہون منت ہیں۔ حالانکہ کیمپ کے مسلمانوں کی زبانی جو کچھ سنا تھا اور جو حال دیکھا تھا اس حساب سے کم از کم پندرہ سو لڑکیاں صوبہ میں غائب تھیں۔ وہ سب کیا ہوئیں۔ کہاں گئیں؟ میں باوجود کوشش پتہ نہ لگا سکی۔ لیکن دو ایک کے سوا صوبہ میں باقی نہیں رہیں۔ یہ مجھے یقین ہے۔ میں خود دیہاتوں کا دورہ کر چکی ہوں۔ اب بھی کچھ نام باقی ہیں ان کے پتے بھی ملے مگر ان کی تعداد اتنی قلیل ہے کہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

کچھ مبالغہ بھی کیا گیا یعنی انفرادی طور پر میری کوششوں سے مارچ ۱۹۴۸ء تک صرف پندرہ بیس لڑکیاں آئی تھیں اور یونائیٹڈ ریلیف اینڈ ویلفیئر سے میرے پاس ایک صاحب آئے کہ ہمیں ویمن سیکشن سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۲۵ لڑکیاں آپ نے نکلوائیں۔ میں نے کہا خدا کے لیے مجھے مشکل میں نہ ڈالیے۔ میں اس وقت تو اپنی واہ واہ کروالوں مگر جب آپ مجھ سے ان کے رشتہ داروں کے پتہ مانگیں گے یا پاکستان گورنمنٹ تفصیل مانگے گی تو میں کہاں سے دوں گی۔ میرا تو خیال ہے ان کی تعداد پندرہ سے آگے نہیں بڑھی۔ باقی پولیس از خود چار لڑکیاں میرے پاس لائی تھی۔

پنجاب کی مصیبت زدہ لڑکیاں اور یہاں کی تباہ حال عورتیں سب کی داستان ایک تھی۔ چھوٹے دیہاتوں کو خالی کرا کے، کسی بڑے گاؤں میں کیمپ قائم کرنا، پھر پولیس کے حکم سے قافلہ کا اس کیمپ سے روانہ ہونا، پھر راستے میں حملہ اور عین حملہ کے دوران سب جوان لڑکیوں کا اٹھا لیا جانا اور ان کا بطور مال غنیمت حملہ آوروں، فوجیوں اور پولیس کے آدمیوں میں تقسیم ہو جانا۔ یہ تھے وہ ہتھکنڈے جن پر ہندوستان و پاکستان ہر دو جگہ عمل ہوا تھا۔

اس سارے ہنگامہ میں بمشکل کوئی لڑکی ماری جاتی، البتہ زخمی ہو جاتیں۔ اچھا مال پولیس اور فوج میں بٹتا، کانی کھدری اور سب کو ملتیں۔ اور پھر یہ لڑکیاں ایک کے ہاتھ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتی ہوئی چار پانچ جگہ بک کر کے آخر میں ہوٹلوں کی زینت بھی بنتیں یا کسی مکان میں پولیس کے افسروں کی تفریح طبع کے لیے محفوظ کر دی جاتیں۔

ان میں کی ہر لڑکی چونکہ سازش سے بے خبر ہوتی تھی اس لیے وہ اس آدمی کو فرشتۂ رحمت سمجھنے پر مجبور ہوتی جو عین مار دھاڑ کے وقت اسے اپنے مضبوط بازوؤں کی گرفت

میں لے کر اس کی جان بچالیتا اور جب یہ بھلا آدمی اس کے برہنہ جسم کو (جسکے کپڑے لٹیروں کے حصے میں آچکے ہوتے) تن ڈھانکنے کے لیے اپنا انگوچھا یا بنیائن پہنا دیتا تو وہ ماں کی کٹی ہوئی گردن اور باپ کا خون میں لت پت جسم یا شوہر کی تڑپتی ہوئی لاش سب کچھ بھول کر اس آدمی کا شکریہ ادا کرنے لگ جاتی۔ وہ ایسا کیوں نہ کرتی۔ درندوں سے چھڑا کر تو ایک شریف آدمی اسے اپنے گھر لایا ہے، تسکین دلاسا دے رہا ہے۔ عمر بھر کا ساتھی بننے کو کہتا ہے۔ آخر وہ کیسے اس دیوتا کی پجارن نہ بنے؟

بہت دنوں کے بعد جا کر کہیں یہ بھید کھلتا ہے کہ لٹیروں میں بھی بھلا مانس نہ تھا اور پولیس والوں میں بھی اکیلا شریف آدمی نہ تھا۔ تقریباً سب ہی ایسے جیالے سورما اور بھگت تھے۔ سب ہی کسی نہ کسی عورت کی عزت بچانے کے لیے جان پر کھیلے تھے اور اس کی جیسی سیکڑوں لڑکیاں بہادروں کی ماں بہنوں کو کوس رہی ہیں۔

مگر اس وقت جب یہ راز ظاہر ہوتا ہے، پانی سر سے گزر چکا ہوتا۔ اب تو وہ بھاگ بھی نہیں سکتی۔ وہ ماں بننے والی ہے۔ یا دو تین آدمیوں کے ہاتھ بک چکی ہے۔ اتنے مردوں کا منہ دیکھ کر ہندوستان کی بیٹی اب کیسے اپنے والدین یا شوہر کو منہ دکھائے۔

میں ان تین کمسن لڑکیوں کو نہیں بھول سکتی۔ جو علاقہ نجف گڑھ کی رہنے والی تھیں۔ ان میں سے ایک کو گاندھی جی کے سچے بھگت سوامی جی اور نائر جی[ع۱] نے نکال کر میرے پاس بھیجا۔ پٹھان کی خوددار بیٹی نے حسرت کے ساتھ مجھ سے کہا۔ میری دو سہیلیوں کا موقع لگ گیا اور ان کا کام بن گیا۔ میرا نہ ہو سکا ورنہ میں بھی وہی کرتی۔

اس نے بتایا کہ ہم تینوں ایک ہی گاؤں میں لے جائی گئیں۔ وہ دونوں ایک ہی آدمی کے پاس تھیں۔ میں دوسرے کے۔ بڑی سخت نگرانی ان دونوں کی ہوئی تھی مگر ہم تینوں جب اکٹھے ہوتے تو صلاح کرتے کہ کیا کرنا چاہیئے۔ ایک دن ان دونوں نے شام ہی سے گنڈاسا چھپا کر رکھ دیا۔ اور رات میں جب جاٹ خراٹے لینے لگا تو کمسن لڑکیوں نے گنڈاسا اس کی گردن پر رکھ کر اپنی پوری طاقت سے اسے دبا دیا۔

بھلا خیال تو کیجیے۔ چودہ پندرہ سال کی لڑکیاں اور خونی کھیل قتل کی سازش کرتی ہیں۔ تو مہینوں ہمت کرنے میں لگ جاتے ہیں ہاتھوں میں اتنی قوت کہاں سے لائیں

ع۱۔ پرانے کانگریسی کرشن نائر دہلی پی سی سی کے ممبر بعد کو پارلیمنٹ کے ممبر بنے۔

اس لیے دونوں مل کر اپنا زور صرف کرتی ہیں مگر فوراً ہی جو خوفناک آواز حلق سے نکلتی ہے وہ ان کے ہاتھ پیر ڈھیلے کر دیتی ہے اور بھاگ کھڑی ہوتی ہیں۔

مگر آواز گھر والوں کو حقیقتِ حال سے مطلع کر چکی ہے۔ یہ کمزور پیر کہاں تک بھاگ سکتے تھے، تھوڑی ہی دور پر پکڑی گئیں اور غضبناک مجمع کا شکار بن گئیں پھر بھی تیسری سہیلی کو حسرت ہے کہ کاش وہ بھی یہی کر سکتی۔ اور میں بحیثیت ایک عورت کے بول اٹھی۔ کاش ہندوستان و پاکستان کی سب بیٹیاں ایسی ہی ہوتیں!؟

شاید دسمبر میں باپو نے اعلان کیا تھا کہ اس پاپ کا کفارہ اسی صورت سے ادا ہو سکتا ہے کہ لوگ لڑکیاں اور لوٹ کا مال رضا کارانہ طور پر از خود واپس کریں چند خدا کے بندوں نے اس پر خلوص کے ساتھ عمل بھی کیا۔ باڑہ ہندو راؤ میں تو ایک مکان کا صحن ایسے واپس کیے ہوئے سامان سے بھر گیا تھا، اور جب مسلمان دوبارہ گاؤں میں آباد ہونے لگے تو سبھدرا نے چھکڑوں پر لدوا کر وہ متفرق چیزیں ان میں لے جا کر تقسیم کرا دیں۔ لڑکیاں بھی کچھ باپو کے پاس سنا ہے لائی گئیں۔ ادھر گورنمنٹ بھی باپو کے بار بار کہنے سے چونکی۔ گناہ کو گناہ سمجھنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہوئی۔ اور اس سلسلے میں جو مدد ہم لوگ مانگتے تھے وہ ہمیں ملنے لگی تھی۔

لیکن اب ایک دشواری اور آن پڑی۔ اکثر لڑکیاں واپس آنا نہ چاہتی تھیں۔ مسلمان دانت پیستے اور یہ سن کر نوجوانوں کے چہرے قومی غیرت سے سرخ ہو جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے لعنت ہے ایسی بیٹیوں پر۔ اسی دن کے لیے لوگ بیٹے کی دعا مانگتے ہیں کہ وہ زندگی میں دست و باز و ہوتا ہے اور باپ کے مرنے پر خاندان کی عزت کا محافظ۔ بیٹے کے دل میں اس وقت صرف انتقام کا جذبہ ہوتا اور یہ بے غیرت نفس پرست لڑکیاں اپنے اعزہ کے قاتلوں کے پاس ٹھہرنا چاہتی ہیں۔

قارئین اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ سن کر بحیثیت ایک عورت کے میری کیا حالت ہو جاتی تھی۔ میں ان سے کہتی۔ خدارا ذرا ان کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی میری بات نہ سنتا اور سب اپنی اپنی کہتے رہتے۔

اور پھر مجھے خود ہی تحقیق کرنا پڑی۔ ان عام شریف النفس اور ذی حس لڑکیوں کو چھوڑ دیجیے جو خود نکلنے کے لیے بے پتہ ٹھکانے خط بھیج رہی تھیں جو ہر لحظہ اس فکر میں تھیں کہ

کب موقع ملے اور اس کیچڑ سے نکل بھاگیں۔ جن کے دلوں میں مذہب، اعزّہ اور عزت سب کی محبت تھی جو حقیقتِ حال سے پورے طور پر واقف تھیں۔

صرف ایسی پردہ نشین ربی دبائی لڑکیوں کو دیکھیے جنھوں نے اس سے پہلے باپ بھائی کے سوا کسی مرد کی شکل بھی نہ دیکھی تھی اور اب وہ اپنی حیثیت ایک آوارہ بدمعاش لڑکی کی سمجھ رہی تھیں۔ جو غیر مردوں کے ساتھ مہینوں رہ کر، عزت گنوا کر پھر واپس لائی جا رہی ہے۔ ہندوستان کی روایتی شرم اور غیرت اس کے قدم پکڑتی ہے اور وہ سوچتی ہے کیا اس کے ماں باپ شوہر اور سماج اسے دوبارہ قبول کر لیں گے۔ اس میں اسے شبہہ ہے اور اس ڈر سے وہ انکار کر رہی ہے۔

اس گروہ میں کچھ ایسی لڑکیاں بھی تھیں جن کا فطری رجحان یہی تھا۔ اس افراتفری کی بدولت انھیں من مانی کرنے اور موج اڑانے کا موقع مل گیا اور جب ایک بار وہ کھل کر گناہ کی دلکشی سے لذت اندوز ہو چکیں تو اب پرانی محتاط شریفانہ زندگی کی طرف لوٹنے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا وہ ماحول چاہے جتنا گندہ ہو مگر تھا تو ان کی فطرت کے مطابق۔

ان میں ایسی بیاہی ہوئی عورتیں بھی تھیں جو اپنے غیرت دار شوہروں کو جیون مرن کا ساتھی جانتی تھیں اور سوچتی تھیں یہ کالک لگا منھ لے کر اس کے سامنے کیسے جائیں۔ اتنی بڑی بیوفائی کو کیا اس کا شوہر برداشت کر سکے گا؟ کیا اب اس کی نظر میں ان کی کوئی عزت باقی رہ جائے گی۔ یہ احساس ان کے پیروں کو آگے بڑھنے نہیں دیتا اور وہ کہتی تھیں: جو تقدیر کا لکھا تھا پورا ہو چکا۔ ہمیں یہیں زندگی کے دن پورے کرنے دو۔

ان سب کے علاوہ کچھ ایسی لڑکیاں بھی تھیں جنھوں نے مفلس گھروں میں آنکھیں کھولیں۔ آدھا پیٹ کھایا اور چیتھڑے لگا کر تن ڈھانپا۔ اب وہ ایسے دیالو آدمیوں کے ہاتھ پڑی تھیں جو ان کے لیے ریشمی شلواریں، جالی کے دوپٹے لاتے تھے، جنھوں نے ٹھنڈی آئس کریم اور گرم کافی کا مزہ ان کو چکھایا۔ دن بھر میں سنیما کے دو دو شو دکھلائے ایسے بھلے آدمیوں کو چھوڑ کر وہ پھر چیتھڑوں سے جوانی چھپانے اور کھیتوں میں دھوپ کی تمازت سے کھوپڑی پگھلانے اماں باوا کے گھر کیوں جائیں۔ یہ وردی پوش شاندار آدمی اگر وہ چھوڑ دے تو وہاں کیچڑ میں لت پت کاندھے پر ڈنڈا رکھے کوئی گنوار شوہر ہی تو اسے ملے گا۔ اس لیے وہ بھیانک ماضی اور ڈراؤنے مستقبل کو بھول کر حال میں خوش

رہنا چاہتی تھیں۔

انھیں ایک اندیشہ اور بھی تھا کچھ لے جانے والے دوست ہوں یا دشمن کیا پتہ کہیں یہ بھی لڑکیوں کی تجارت نہ کرتے ہوں۔ ابھی تک جو انھیں لے گیا ہے اس نے کسی نہ کسی کے ہاتھ بیچ ہی دیا ہے۔ آخر کہاں تک وہ بکتی رہیں گی۔ ایسی ہی پولیس کی وردیاں کتنی بار انھیں ادھر سے ادھر لے جا چکی ہیں۔ وہ اس طرۂ دار پگڑی پر کیسے اعتبار کریں کہ یہ ان کے عزیزوں کے یہاں سے آئی ہے، یا مسلمان کے بھیس میں کوئی بردہ فروش نہیں ہے۔ بدگمانی اس وقت تک رفع نہ ہوتی جبتک کہ وہ گھسیٹ کر نہ لائی جائیں اور دو ایک دن نہ رہتیں۔

رہا مذہب تو اس کے بارے میں وہ جانتی ہی کیا تھیں، مرد تو جمعہ پڑھنے، الوداع پڑھنے، عید کا دوگانہ پڑھنے، مسجد جایا بھی کرتے تھے اور ملّاجی کا وعظ بھی سنا کرتے تھے مگر عورتوں کو تو کبھی ملّاجی نے کھڑا ہی نہ ہونے دیا۔ جوان لڑکیوں کو دیکھتے ہی نہ جانے کیوں ان کی آنکھ میں خون اتر آتا تھا۔ 'بھاگو، چلو، تمھارا یہاں کیا کام، جیسے وہ کتا ہیں کہ ہر جگہ سے دھتکاری جائیں۔ چور تھا اپنے جی میں اور بھگائی جاتی تھیں وہ مسجد میں آگئیں تو سب کی نماز خراب ہوں گی۔ وعظ سننے آئیں گی تو لوگوں کا دھیان بٹ جائے گا۔ درگاہ میں جائیں گی تو مردوں سے دھکا پیل ہوگی اور قوالی کی محفل میں شریک ہوں گی تو صوفیوں کے دل حقیقت کے بجائے مجاز کی طرف رجوع ہو جائیں گے۔ کیفیت طاری نہ ہو گی۔

انھیں کیا پتہ مذہب کیا ہے؟ تھوڑی سی نماز اور کلمہ کے سوا ان کو سکھایا بھی تو کچھ نہیں گیا تھا اور نہ جانے اس کے معنی کیا ہیں۔ کیا مطلب ہے۔ انھوں نے رٹ کر یاد تو کر لی مگر دل سے اس کا کیا تعلق۔ اس کا اپنا نام رحیمن ہے اس کے ابا کا رمضانی اور شوہر کا نواب ادریس۔ اسلامی ناموں کے سوا اور اس کے پاس کیا رکھا ہے جس کی حفاظت کی خاطر جان دے۔

اور پھر اس مذہب کے خدا نے تو اس کو اتنی آرام سے کبھی رکھا بھی نہ تھا۔ اس نئے آدمی کا ایشور تو بڑا ہی ان داتا ہے۔ بکنے دو سب کو وہ ہرگز اس نئے آدمی کو نہ چھوڑے گی جس نے اس کی دنیا اتنی رنگین بنا دی ہے۔

چند نئے زمانے کی تعلیم یافتہ لڑکیاں بھی تھیں۔ جن کے نزدیک انٹرنیشنل شادیوں کے بغیر دنیا کے مسائل حل ہی نہ ہو سکتے تھے۔ جو ہنگامہ سے پہلے ہی مذہب اور سماج کے بندھن توڑ کر اپنی آزاد خیالی کا ثبوت دینا چاہتی تھیں اور اب موقع پاکر انھوں نے بھی

بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیے تھے۔ ان پڑھے لکھے شیطانوں کو رام کرنا بھلا سوشل ورکرس کے بس کی بات تھی؟

مجھے کچھ نوجوان عورتیں ایسی بھی ملیں جنھوں نے حقارت اور غصہ کے ساتھ ان شوہروں کے پاس جانے کی تجویز رد کر دی۔ جو اتنے بزدل ثابت ہو چکے ہیں کہ اپنی عزت خاندان کی لاج اور اپنے بچوں کی ماں غیروں کے ہاتھوں میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ پچھلے واقعات یاد کر کے غصے سے پاگل ہو جاتیں اور کہتیں۔

"ہم ان نامردوں کے پاس واپس جائیں؟ ہم ان کو پکارتے رہے۔ ہم نے کہا بچاؤ للہ بچاؤ۔ تم ہمیں چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہو۔ ان بدمعاشوں کو مارتے کیوں نہیں ہو۔ ٹھہرو۔ ہمیں بھی ساتھ لیتے چلو۔ مگر ان کو اپنی جان پیاری تھی۔ ہم سے نہ کچھ محبت تھی نہ خیال۔ ہم تو اب ان کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ ہم کو اپنے ہاتھ سے مار کیوں نہ گئے" عورت آفرینش عالم سے آج تک ہمت و بہادری کی قدر دان ہے۔ وہ اس شوہر کو یاد کر کے تڑپتی ہے اور اس یاد پر دین و دنیا نچھاور کرتی ہے، جو اس کو بچانے کے لیے اپنی جان دے دیتا ہے۔ وہ اس کی بھی پرستش کرتی ہے جو اپنے ہاتھ سے اس کو گولی مار دیتا ہے۔ مگر اس بزدلی کو معاف کرنا اس کا دل گوارا نہیں کرتا جو اسے چھوڑ کر بھاگ جائے۔ قدرت تو عجیب عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ کیوپڈ کے تیر بھی انھیں دلوں زخمی دلوں میں پیوست ہوتا تھے اور پیچ پیچ دو چار کے محبت کا تیر بھی لگ گیا۔ ہٹ دھرمی کی بات دوسری ہے مگر ان سچے واقعات کی سچائی کو جھٹلانا میرے لیے ناممکن ہے۔

بہر حال یہ حالات ہمیں بتاتے تھے کہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا سمجھ رکھا تھا۔ اب یہ کارکنوں کا کام تھا کہ ان کو اطمینان دلائیں۔ تسلی دیں۔ بھروسہ پیدا کریں اور نرمی کے ساتھ ان کا دل بدلیں۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم سب نااہل تھے ہم میں وہ اسپرٹ نہ تھی جو عیسائی مشنریز کا خاصہ ہے اور جس کی اس وقت ضرورت تھی۔ نفسیات کو سمجھنے کی صلاحیت ہم میں سے کسی میں نہ تھی۔ نہ ہم نے کوشش کی وہ چند رٹے ہوئے جملے جو ایسے مواقع کے لیے مخصوص ہو گئے تھے اکثر جگہ بے اثر ثابت ہوتے اور ہم ناکامیاب ہو کر الٹے انھیں لڑکیوں کو برا بھلا کہنے لگتے تھے۔

ادھر پولیس زیادہ تر لڑکیوں کی بے جا ہٹ اور اغوا کرنے والوں کی بے جا حمایتی بن جاتی تھی اور پھر حکام تھے جن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اگر ممکن ہو تو خود کارکن کو کسی کیس

میں پھانس کر جیل کی ہوا کھلادیں ورنہ عوام اور گورنمنٹ کی نظر میں تو ضرور ہی مجرم ٹھہرا دیں۔ اور پھر اندھی پبلک جو یہ بھول جاتی تھی کہ جس لڑکی کو روکنے کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں ان کی اپنی کسی ایسی بہن کی تمثیل ہے جو پاکستان میں اپنے جسم اور بھائیوں کے کرم کو رو رہی ہے۔ ہزاروں کے گروہ ہندوستان و پاکستان سے آئے اور گئے مگر ان میں پڑھی لکھی لڑکیاں بہت ہی کم آئیں۔ کسان، مزدور پیشہ اور مڈل کلاس کی جاہل لڑکیاں زیادہ تر دیہات کی رہنے والی آتی تھیں۔ میں نے جہاں تک تحقیقات کی یہی پتہ چلا کہ زیادہ تر پڑھی لکھی لڑکیاں ماردی گئیں۔ جو بچ رہیں وہ اونچے افسروں، حکام، یا تعلیم یافتہ لوگوں کے پاس ہیں۔ اور قابل مجسٹریٹ کی عدالتیں، لٹیروں گنڈوں اور ڈاکو چوروں کو سزا دینے سے زیادہ یہ کام ضروری سمجھتی رہی ہیں کہ ان کو دو تین سال پہلے سول میرج کا سرٹیفکیٹ عنایت کریں۔ ہر جگہ عدالتوں نے اس کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا۔ خود دہلی کے ایک بڑے لوکل افسر کے پاس ایسی لڑکیاں موجود ہیں مگر ان پر ہاتھ کون ڈال سکتا ہے۔ زبیدہ نامی ایک لڑکی تو کنٹونمنٹ کے ہسپتال میں بھی کئی دن رہی تھی لیکن میں اس کو نہیں نکلوا سکی۔

تعلیم یافتہ لڑکیوں نے شرم وغیرہ کی وجہ سے اکثر اپنے نام بھی تبدیل کر لیے اور چند اپنی ذاتی کوشش سے نکل بھی آئیں۔ اسی طرح کی ایک لڑکی نے ایک دن مجھے ٹیلیفون کیا۔ وہ بات کر رہی تھی کہ کوئی آگیا اور اس نے کھٹ سے رسیور رکھ دیا۔ جملہ پورا نہ ہوا تھا مگر پتہ وہ بتا چکی تھی اور پولیس بھیج کر اس کو منگوا لینا آسان ہو گیا۔

زیادہ تر با اثر لوگوں نے تعلیم یافتہ لڑکیوں کو اپنایا۔ کچھ نے باقاعدہ سول میرج بھی کر لی۔ مگر وہ کتھا لی کا ہنگس نہ بن سکیں اور جہاں ایسی صورت پیدا ہوئی انھوں نے سخت مزاحمت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قتل کر دی گئیں۔

مجھے ڈاکٹر سید مصطفیٰ (پانی پت) کی لڑکیوں کے بارے میں دریافت کرنا تھا ایک طالب علم بنارسی شرما چھٹیوں میں مشرقی پنجاب جا رہے تھے۔ ان سے کہہ دیا کہ ذرا حالات کی تحقیق کرتے آنا۔ وہاں سے جو خط انھوں نے لکھا۔ اس کا کچھ اقتباس یہ ہے۔

"ڈاکٹر سید مصطفیٰ گورنمنٹ ڈسپنسری میں ڈاکٹر تھے جب فساد شروع ہوا تو انھوں نے ایک ویش دوست کے گھر پناہ لی بلکہ وہ خود اصرار کر کے انھیں اپنے گھر لے گیا اور در پردہ فسادیوں کو خبر کر دی۔ ڈاکٹر ان کی بیوی اور گھر والوں کو قتل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر کو ایک تختے پر لٹا کر ہاتھ پیروں میں کیلیں ٹھونک کر

مسیح کی طرح صلیب دی گئی اور دو نوجوان لڑکیوں کو لے کر بلوائی چلے۔ بلوائیوں میں سے دو ایک نے کہا۔ "کیا کرتے ہو۔ یہ پڑھی لکھی لڑکیاں آستین کا سانپ نہ ثابت ہوں۔ ہٹاؤ ان کو بھی مار دو۔ پکا یقین ہے کہ باہر ہی وہ دونوں بھی قتل ہو گئیں۔"

بنارسی نے مولانا لقاء اللہ[1] سے بھی مل کر تصدیق کی ان کو بھی شبہہ تھا کہ زندہ نہیں ہیں۔ اور برہمن دوست نے بھی رو رو کر یہی کہا کہ ان کی طرف سے مزاحمت اور افشائے راز کا اندیشہ تھا اس لیے زندہ نہ چھوڑا گیا۔ سنا ہے گورنمنٹ بھی انکوائری کر چکی ہے۔

جاہل اور تعلیم یافتہ دونوں لڑکیاں ایک اور مصیبت میں بھی گرفتار تھیں جب انھیں لینے پولیس یا کارکن پہنچتے تو وہ اس سوچ میں پڑ جاتیں کہ آیا اس ہونے والے بچے کو بھی والدین یا شوہر برداشت کر سکیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو قومی غیرت ان کو اس کے قتل پر مجبور کر دے۔ غرض یہ تھا پس منظر اس انکار کا۔ جو ہم سب کے لیے باعث حیرت ہو رہا تھا۔

جنوری ۱۹۴۸ء سے لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی سرکردگی میں باقاعدہ ایک محکمہ کھل گیا تھا جس کی ماتحتی میں سارے ہندوستان اور کل پاکستان میں لیڈی ورکر کام کر رہی تھیں۔ اور اس محکمہ کا تعلق سنٹرل رکوری[2] سے تھا۔ بعد کو گورنر جنرل کا آرڈیننس بھی نکل گیا۔

پہلے دونوں حکومتوں نے طے کر لیا تھا کہ جو لڑکی کسی دوسرے فرقہ کے پاس ہو برآمد کر لی جائے لیکن نوکر شاہی نے اس معاہدہ کی تکمیل اس طرح کی کہ ہر لڑکی کا بیان مجسٹریٹ کے سامنے ہو۔ اگر وہ جانا چاہے تو اعزہ کے پاس پہنچا دی جائے۔ نہ جانا چاہے تو اسی شخص کے پاس واپس کر دی جائے۔

اس اصول پر کافی دن عمل ہوتا رہا اور بہت سی لڑکیاں انھیں بدمعاشوں کے گھر پھر واپس ہو گئیں۔ مگر جب آرگنائز طریقہ سے انکوائری شروع ہوئی یہ مصیبت بھی کم ہوئی۔ اس سے پہلے ایک انسپکٹر صاحب نے دو لڑکیاں کسی دیہات سے برآمد کیں۔ لیکن نہ وہ ہمارے پاس آئیں نہ پتہ چلا کہاں بھیجی گئیں۔ انسپکٹر صاحب ایک بار اتفاقیہ مل گئے تو اپنی کارگزاری یوں

ع[1] ۔ مولانا لقاء اللہ مشہور قومی کارکن۔

ع[2] ۔ سنٹرل رکوری آرگنائزیشن جس کا تعلق براہ راست گورنر جنرل یا گورنمنٹ ہاؤس سے تھا آرڈیننس کے تحت

کی فہرست گنوانے لگے کہ میرا علاقہ صاف ہے۔ جتنی تھیں میں نے بھیجدیں۔ میں نے پوچھا۔ مگر وہ دونوں لڑکیاں جو فلاں مہینے میں آپ لائے تھے ان کو کہاں بھیجا ہے ہمیں علم نہ ہو سکا۔ کہنے لگے۔ ان کو ہم نے جامع مسجد پر چھوڑ دیا کہ اپنے عزیزوں کو یہاں تلاش کر کے چلی جاؤ۔ وہ کون تھیں؟ کہاں سے آئیں؟ اور کہاں گئیں؟ اس کے بتانے کی نہ ان کو فرصت تھی نہ ضرورت۔ اتنا کافی تھا کہ تعداد رجسٹر ہو چکی ہے۔

یہی انسپکٹر صاحب ایک لڑکی اور لے کر آئے اور کہلا بھیجا کہ لڑکی اسی آدمی کے گھر واپس جانا چاہتی ہے۔ یہ دیکھیے اس کا بیان ہے جو اس نے مجسٹریٹ کے سامنے دیا ہے۔ لڑکی انسپکٹر صاحب سے چمٹی کھڑی تھی اور چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ بلانے سے کسی طرح نہ آئی تو میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے تھانیدار صاحب سے الگ کیا اور بہلاتی پھسلاتی اندر لے چلی۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے اس نے آنسو روک کر پوچھا۔ تم ہندو ہو کہ مسلمان؟ میں نے کہا۔ کیا تو ہندو سمجھ رہی ہے۔ کہنے لگی۔ توبہ۔ میں سمجھی مجھے سکھوں کو دینے کے لیے لے جا رہے ہیں۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ اپنے مسلمانوں میں آگئی۔ غضب ہے اسے یہ تک نہ بتایا گیا تھا کیوں لیے جا رہے ہیں۔ کہاں لیے جا رہے ہیں۔

پھر تو وہ پیر پھیلا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ میری سسرال والے اگر زندہ ہوں گے تو ان کے پاس بھیجدو گی۔ میں نے اطمینان دلایا کہ ضرور۔ تجھے لے کر میں کیا کروں گی۔ اسی لیے تو بلایا ہے۔ بس خوش ہو گئی۔ اپنے سب زیورات اتار کر اس نے انسپکٹر کو بھجوا دیے اور کہدیا کہ اب کہیں نہیں جانے کی۔ یہیں رہوں گی۔ زیور اسی آدمی کے تھے اس لیے واپس کر دیے۔

یہ سب بمشکل ۵ ہم منٹ میں ہوا ہو گا۔ مجسٹریٹ کے سامنے جو بیان اس نے دیا تھا وہ اس لیے دیا تھا کہ ایک ٹھکانے جیسی رہ رہی ہے، بھلی ہے۔ دس گھر کیوں دیکھے بیان انسپکٹر صاحب کو واپس کر دیا گیا اور لڑکی دوسرے دن کیمپ میں اپنے سسرال والوں کے پاس پہنچ گئی۔ اس کا شوہر بھی زندہ تھا۔

انسپکٹر صاحب اس علاقہ میں تعینات تھے جہاں کئی سو اغوا شدہ لڑکیاں اس وقت موجود تھیں اور ان میں سے دو خود انسپکٹر صاحب کے لیے مخصوص بتائی جاتی تھیں جو کسی ذیلدار کی امانت میں تھیں۔ گورنمنٹ کا حکم تھا اور ایک بڑے لوکل آفیسر سے ان کو اپنی پچھلی بدمعاشیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کارگزاری کا بہترین سرٹیفکیٹ بھی حاصل کرنا تھا۔ اس لیے ایک بار انھوں نے دو لڑکیاں اور بھجوائیں۔ لڑکیاں انگلو انڈین

ایس پی کے سامنے پیش کیں مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے پاس نہیں جانا چاہتی ہیں۔ مجسٹریٹ کا دستخطی بیان ساتھ ہے۔ دہلی کے ایک مجسٹریٹ صاحب مستقل طور پر شاید یہی کام کرتے تھے۔ کہ بیان لکھوائیں اور اپنے دستخط ثبت کریں۔

اتفاق سے سبھدرا وہاں موجود تھیں انھوں نے میرے پاس بھیجنے کی سفارش کی۔ تھانیدار پریشان ہو کر کہہ اٹھا۔ وہاں نہ بھیجیے۔ وہ روک لیتی ہیں۔ پھر واپس نہیں آنے دیتیں۔

ایس پی نے ڈانٹا۔ نہیں نہیں۔ وہاں لے جاؤ۔ ان کا فیصلہ ٹھیک ہوگا وہ سمجھا لیں گی۔

مجبوراً لڑکیاں لائی گئیں۔ اور سچ مچ وہی ہوا، میں نے ایک رات کی مہلت لی اور اسی وقت ان دونوں کو لے کر پرانی تحصیل گئی جہاں ان کے اعزہ موجود تھے۔ ایک نے تو اردو بازار ہی میں بھائی کو دیکھ کر چیخنا شروع کر دیا اور مجمع سے گھبرا کر بمشکل میں تحصیل تک پہنچ سکی۔ عزیزوں سے مل کر ان کے گلے لگ کر۔ انھوں نے صاف منع کر دیا کہ اب ہم واپس نہیں جائیں گی۔

اسی طرح ایک دوسرے علاقہ کے تھانیدار صاحب چار لڑکیاں لے کر آئے۔ آدمی معقول تھے۔ نہ بیان کا ذکر کیا نہ واپسی کا، صرف میرے سپرد کر کے چلے گئے تو میں خوش ہوئی کہ چلو ایک بھلا آدمی تو دیکھا۔

مگر حیرت ہوگئی جب دوسرے دن اخبار میں دیکھتی ہوں کہ .... انسپکٹر صاحب نے چار سو لڑکیاں .... علاقہ سے برآمد کرائیں۔ لیکن یہ جب کا ذکر ہے جب تک گورنمنٹ نے باقاعدہ کیمپ نہ کھولا تھا اور دہلی میں کہیں رکھنے کا ٹھکانہ نہ تھا۔ لڑکیاں کس کے پاس ہیں؟ کہاں ہیں؟ جانتے سب تھے مگر پکڑنے کی ہمت ان دونوں کسی میں نہ تھی۔ ادھر گاندھی جی کا اور کوئی کہنا تو حکام نے مانا نہیں — یہ مان لیا کہ جس کے پاس سے لڑکی برآمد ہو اس کو کچھ نہ کہو۔ حالانکہ میرے سامنے کی بات تھی بلکہ ہمیں سب نے باپو سے کہا تھا کہ اگر آپ یہ اعلان کرا دیں کہ جو اپنے پاپ پر پچھتا کر لڑکی واپس کر دے اس کو سزا نہ دی جائے تو اس لالچ میں شاید بہت سی لڑکیاں مل جائیں گی۔ کہ سزا سے بچ جائیں گے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ جس محلہ یا گاؤں سے پولیس ایک لڑکی نکال لائے گی وہاں دوسری مغویہ لڑکیاں جتنی ہوں گی قتل کر دی جائیں گی۔

اس اعلان کو مہینوں گزر گئے۔ جو از خود پہنچا گئے ان کی بات دوسری تھی مگر اور کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ لیکن اب ان کو باپو کا کہنا یاد آر ہا تھا اور گورنمنٹ کے ملازم تک جو معمولی سے جرم پر بھی قانوناً سزا کا مستحق قرار پاتے ہیں، اتنے بڑے جرم پر چند دن کے لیے معطل تک نہ کیے گئے۔

کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر حکومت اتنے بڑے پاپیوں کے بل بوتے پر کیسے اپنا نظام چلائے گی۔ خود خلاف قانون حرکتیں کرنے والے کیسے دوسروں سے قانون کی پابندی کرا سکیں گے۔ عام لوگوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اچھی بات ہے۔ ان میں بہتیرے بہکے ہوئے ہیں جاہل ہیں۔ وہ تو ہوا کے ساتھ اڑنے والے تنکے ہیں۔ اپنے انفرادی اعمال کے ذمہ دار بھی وہ خود ہیں۔ مگر یہ علاقئیں یہ مجسٹریٹ۔ یہ پولیس کے افسر۔ یہ جو دیس کے رکھوالے امحافظ اور کرتا دھرتا ہیں یہی جب پاپیوں کی پیٹھ پر ہاتھ دھریں گے، ان کے ساتھی اور مددگار بنیں گے تو آخر انصاف کرنے والے کہاں سے آئیں گے اور مجرم کس کا نام رکھا جائے گا۔

اور تب ہمارا ذہن ماضی کی طرف بھٹکنے لگتا۔ ہمیں یاد آتا کہ اس بدنام انگریز گورنمنٹ کے وقت میں اگر کوئی واقعہ اغوا کا ہوتا تھا تو بھاگنے والا۔ بھگانے والا اور مدد کرنے والا سب ہی قانون کی زد میں آجایا کرتے تھے۔ ابھی تو شاید پرانا قانون ہی رائج ہے۔ نیا تو ابھی بنا بھی نہیں ہے۔ پھر یہ اندھیر نگری کیسی کہ چودہ برس کی نابالغ لڑکی سے عدالت میں بیان دلوایا جائے اور اس کا بیان دونوں حکومتوں[1] کے معاہدہ اور ملکی وسماجی قانون سب پر حاوی سمجھا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں یہ دشواریاں دونوں طرف تھیں دونوں طرف کی نوکر شاہی ایک ہی فیکٹری میں تیار ہوئی تھی اور دونوں جگہ اپنے ملازمین کے اخلاقی جرائم سے چشم پوشی کی جارہی تھی۔

جہاں تک سوچا اور سمجھا یہی اندازہ ہوا کہ گاندھی جی چاہتے تھے ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔ انفرادی طور پر بدلہ لینے کا خیال دل میں نہ لائیں۔ اگر کسی کو نقصان پہنچا ہے تو اس کو معاف

ع۱ ۔ ہندوستان وپاکستان کی حکومتوں نے آپس میں یہ طے کیا تھا کہ جو لڑکی کسی دوسرے فرقہ کے پاس ہو جبراً برآمد کر کے رشتہ داروں کو اور جب تک رشتہ دار نہ ملیں اس وقت تک حکومت کو دے دی جائے۔ یعنی حکومت کے قائم کردہ کیمپ میں رکھ دی جائے۔

کر دیں۔ وجہ ظاہر تھی کہ پھر بدلہ کا چکر اور انتقام در انتقام کا سلسلہ چل پڑے گا اور فتنوں کا دروازہ کھل جائے گا۔ اس لیے وہ سزا کا حق قانون کو سونپ دینے کے حق میں تھے۔ لیکن وہ گورنمنٹ کے عہدہ داروں کو اخلاقی مجرمین کی صف میں دیکھنا ہرگز پسند نہ کرتے۔ وہ تو جنگ آزادی کے سیاسی مجرمین تک کو صلاح دیتے تھے کہ سزا سے بچنے کی کوشش نہ کرو۔ اور ایک مشہور ہستی[1] کو انھوں نے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ وہ تو انصاف کو سچائی کی ترازو میں تولنے کے شیدائی تھے۔ ان کا رام راج یا خدائی راج تو آنکھوں والا، دلیر اور منصف راج تھا۔ یہ اندھیر نگری چوپٹ راج تو باپو کا خواب ہو نہیں سکتا۔

لیکن اب ان دنوں تو باپو کے پیر دھبول ہی گئے تھے کہ کانگرس گورنمنٹ کی بنیاد دھرم سچائی اور اہنسا پر ہونی چاہئے اور ملک کو یاد بھی نہ تھا کہ اس حکومت اور آزادی کے جنم داتا باپو ہیں اسی لیے تو وہ آخر وقت کہتے تھے :۔

"کیا ان لوگوں نے جو آج ہمارے بیچ میں نہیں ہیں مصیبتیں اس لیے بھوگی تھیں۔ اور جیون کے تمام عیش آرام چھوڑ کر اسی لیے بلیدان کیا تھا کہ گوروں کے بدلے کالوں کے لٹیرے پن کا دور دورہ ہو جائے۔"

(۱۱ جنوری ۱۹۴۸ء پرارتھنا سبھا)

ایک بار انھوں نے برت کے بعد اس طرح اپنے دکھ کا اظہار کیا تھا۔

"جنگ آزادی میں لڑنے والوں نے اپنے کو تمام اخلاقی پابندیوں سے آزاد کر لیا ہے اور ان لوگوں کے ساتھی بن گئے ہیں۔ جو تحریک کے کھلے ہوئے مخالف تھے۔"

(۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء)

بہرحال نہ میں کوئی کانگرس لیڈر تھی۔ نہ گورنمنٹ آفیسر۔ ایک عام شہری کی حیثیت سے جو دیکھا اور محسوس کیا لکھ رہی ہوں۔ ہم بھی یہی سوچتے تھے کہ جو برائی ہمارے ساتھ ہو اس کا بدلہ لیں۔ اور ہماری گورنمنٹ بھی یہی سوچتی تھی کہ جتنا قدم فریق مخالف کا اٹھے، ہم بھی اٹھائیں۔ ساری بھلائی کے ٹھیکدار ہم ہی تھوڑی ہیں۔ جب وہ نہیں کرتے تو ہم کیوں کریں۔ دونوں[2]

---

[1] ۔ مسٹر کامتھ۔

[2] ۔ ہندوستان و پاکستان کی حکومتیں۔

حکومتیں اپنے افسران کی بدمعاشیوں کو سراہتی رہیں اور اگر حالت یہی قائم رہتی تو پتہ نہیں کیا ہوتا۔ وہ تو کہیے خیر گزری کہ جلد ہی کانگرس گورنمنٹ کو بھولا سبق یاد آنے لگا۔

مارچ میں حسن بی نام کی ایک بیس سالہ لڑکی میرے پاس کسی پولیس مین کے گھر سے لائی گئی۔ حسب معمول رٹی ہوئی احسانات کی کہانی اس نے بھی سنائی۔ لیکن اس کے شوہر کا نام میں نے لیا تو آنکھ میں آنسو آگئے۔ ضبط کر کے بولی۔ مجھے یقین ہے وہ قتل ہو گیا۔ اگر وہ زندہ ہو یا میرا چچا جو میری دیورانی کا باپ ہے مل جائے تو میں اس کے پاس جا سکتی ہوں ورنہ اور کہیں نہیں جاؤں گی۔

جو فہرست ہمارے پاس تھی اس میں حسن بی کی گود میں دو سال کی بچی بھی لکھی تھی مگر بچی ساتھ نہ تھی۔ وہ پولیس مین نے اپنے پاس رکھ لی تھی اور مجسٹریٹ کے سامنے بھی اس کا ذکر نہ آیا تھا۔ تمام دن تڑپتی رہی۔ روتی رہی۔ شام ہونے پر تو بچی کی یاد نے اسے بہت ہی بے قرار کر دیا۔ معلوم نہیں بچی وہاں کس حال میں ہو گی۔ مشکل یہ تھی۔ مجھے اس گھر کا پتہ بھی معلوم نہ تھا۔ ایک دن اور ایک رات کے بعد اسے پولیس کے سب سے بڑے آفیسر کے سامنے پیش ہونا تھا اور مجھے دوسرے دن الہ آباد بھی پہنچنا تھا۔ صبح میں الہ آباد چلی گئی۔ مولانا محمد میاں[1] کو جمعیۃ کے آفس میں فون کر دیا اور سب سے بھی کہہ گئی کہ کل جب افسر کے سامنے پیش ہو تو بچی اس کی گود میں دلوا کر بیان لیا جائے۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ اولاد کی مامتا میں تڑپتی ہوئی ماں نے کہدیا کہ میں پھر وہیں واپس جاؤں گی اور یہ بیان درج رجسٹر ہو گیا۔ حسن بی اب تک پولیس مین کے قبضہ میں ہے۔ میں نے ہر چند کوشش کی مگر اسے نہ نکلوا سکی۔

اور سنیے دو سکھ پولیس والوں کے پاس سے دو لڑکیاں آئی ہیں۔ کیمپ قائم ہو چکا ہے مگر یہ لڑکیاں چونکہ پولیس کی منظور نظر ہیں اس لیے وہ کیمپ میں نہیں بلکہ نرسنگ ہوم میں رکھی جاتی ہیں جہاں ان دونوں سکھوں کو ملنے اور کھانا پہنچانے کی بھی اجازت دی جاتی ہے۔ ایک لڑکی بیس بائیس سال کی بدمعاش دیہاتن ہے... دوسری ایک بہت ہی معزز خاندان کی غیر معمولی حسین کمسن لڑکی ہے۔ پندرہ دن نرسنگ ہوم میں ساتھ رہ کر دونوں

---

[1] - جمعیۃ العلماء ہند کی ایک مقتدر ہستی اور کئی کتابوں کے مصنف ان دنوں آفس کے انچارج تھے۔

گہری دوست بن جاتی ہیں۔ بڑی لڑکی چھوٹی کو سکھاتی ہے کہ ہم دونوں بھوک ہڑتال کر کے اپنا مطالبہ منوالیں گے۔ اگر اس پر بھی نہ مانا تو بھاگنے کا بندوبست مکمل ہے نکل آئیں گے۔ مگر ہاں نہ کرنا۔

میں الہ آباد سے آئی تو دونوں لڑکیاں میرے پاس لائی گئیں۔ بڑی کی بدتمیزی بے حیائی اور سدھرنے کی امید نہ دیکھ کر میں اسے دوسرے ہی دن لانے والوں کی منشا اور امید کے خلاف کیمپ میں چھوڑ آئی۔ چھوٹی لڑکی کے رشتہ دار بلکہ باپ مجھے معلوم تھا کہ زندہ ہے اس لیے ان کو جمعیتہ کے ذریعہ خبر بھجوائی اور ایک دو دن اس لیے اپنے پاس روک لیا کہ سمجھا بجھا کر اسے راہ راست پر لے آؤں۔ پڑھی لکھی لڑکی ہے بری صحبت کا اثر زائل ہوتے ہی ٹھکانے آجائے گی۔

گھر میں دونوں طرف پولیس کا پہرہ ہے۔ سامنے پھاٹک پر مسلح گارڈ تعینات ہے۔ مگر پندرہ برس کی لڑکی رات کے اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے اور اس وقت ایسا لگتا ہے پولیس زمین الٹ پلٹ کر دیگی۔ آسمان کے چھلکے ادھیڑ ڈالے گی۔ مگر پورا ہفتہ بیت گیا اور لڑکی کا پتہ نہ لگا۔

اور پھر ایک روز ایک مسلم وکیل آکر خبر دیتے ہیں کہ آج فلاں مجسٹریٹ کے سامنے کملا کے فرضی نام سے لڑکی سے بیان دلوایا جارہا تھا۔ وہ اقرار کر رہی تھی میں سکھ بن چکی ہوں۔

میں نے یہ سنتے ہی ایک ذمہ دار آفیسر کو فون کیا کہ آپ لڑکی کہاں تلاش کروا رہے ہیں۔ وہ تو اپنے ٹھکانے پہنچ چکی ہے اور ایک لوکل آفیسر کی مدد سے قانونی کاروائیاں ہو رہی ہیں۔ لیکن اب وہ اس گھر میں نہیں ہے۔ افسر، ان کے سکریٹری اور مجسٹریٹ سب اس معاملہ میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

بہر حال پھر کوشش ہوئی اور لڑکی اسی دن پھر لائی گئی۔ اب کی بار پولیس مین بھی گرفتار ہوا۔ مگر یہ طے نہ ہو سکا کہ اسے رکھا کہاں جائے۔ میں اس لڑکی کو بدمعاشی پر مجبور کرتی تھی اور کیمپ کی مہتمم بہت ہی ظالم تھیں۔ غرض اس قسم کی بہت سی وجوہات بیان ہوئیں۔

اور پھر ایک بڑے حاکم کے حکم سے پولیس مین کو رہا کر کے لڑکی پھر اسے سونپ دی جاتی ہے۔ مگر اس شرط پر کہ جب طلب کی جائے فوراً حاضر کرو۔

پولیس افسر نے مجھ سے کہا۔ فوراً اس کے باپ کو بلائیے۔ میں جو کچھ کر سکتا تھا میں

نے کر دیا ہے۔ آخر کار اس کا باپ اور چچیرا بھائی دونوں آکر اسے لے جاتے ہیں مگر معاملہ ختم نہیں ہوتا۔ پرائم منسٹر کو رپورٹ پہنچتی ہے کہ لڑکی ہاتھ پیر باندھ کرے جائی گئی۔ ظاہر ہے یہ خبر ان کی ناگواری کا باعث ہوئی۔ اور پھر سنا انکوائری ہوئی لیکن جو ہونا تھا ہو چکا۔ اس لڑکی کو مسلمان کسی حالت[1] میں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پوری قوم اسے اپنی توہین سمجھے گی۔ اگر اس میں مداخلت کی گئی۔ مگر حکام جتنے اڑنگے لگا سکتے تھے لگاتے رہے۔

اس تمام فتنہ فساد میں سب سے زیادہ شرم ناک چیز عورتوں کا اغوا تھا، جو اتنے بڑے پیمانہ پر اور اس قدر بے حیائی و بزدلی کے ساتھ کیا گیا کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ باپو کے سامنے صرف اس کے تذکرے ہی رہے اور اکا دکا انفرادی کوششیں جاری رہیں۔ یہ سب کو معلوم تھا کہ یہ پاپ، ہندو مسلمانوں کا یہ گناہ ان کی زندگی تلخ کیے ہوئے ہے اور اسی لیے قوم پرست طبقہ ہر لحہ اس فکر میں رہتا تھا کہ کوئی ایک کام تو وہ ایسا کر لیں جس سے باپو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجائے۔ اپنی زندگی ہی میں انھوں نے ڈاکٹر سوشیلا نائر کو ریاستوں کے لیے تجویز کیا تھا۔ مردولا پاکستان کی دوڑ لگا رہی تھیں اور بہت سے کارکن مشرقی پنجاب اور دہلی کی فہرست بنانے میں مصروف تھے۔ جمعیۃ کے والنٹیر سرگرمی کے ساتھ منہمک تھے اور کافی لڑکیاں واپس بھی دلا چکے تھے۔ کچھ کانگریسی بہن دیہاتوں میں اپنی کوشش جاری کر چکے تھے۔ مگر اس پاپ کو مٹانے کا سہرا قوم پرست نوجوانوں کے سر ہے۔ بڑھے تو ایسا لگتا تھا شل ہو گئے ہیں۔ بجائے مدد کے اکثر وہ ہماری راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے تھے مگر اب باپو کے بعد یہ مسئلہ جادو کی طرح سب کے سر پر سوار ہو گیا تھا۔ شوشیلا نائر نے پٹیالہ کا رخ کیا۔ مردولا سارابھائی کی دوڑ دھوپ اور بڑھ گئی اور حکومتوں نے کروٹ لی۔ دریا گنج میں ایک اسکول کی خالی عمارت کو کیمپ قرار دیا گیا۔ شہر کے دوسرے محلوں میں پاکستان سے آنے والی عورتوں کے لیے ہوم کھولے گئے اور یونائیٹڈ کونسل ریلیف اینڈ ویلفیئر کے ماتحت یہ کام شروع ہو گیا۔ پہلے لیڈی ماؤنٹ بیٹن اس کی سرپرست تھیں اور اب گورنر جنرل ہیں۔ لڑکیوں کے غول جنھیں "گلہ" کہنا زیادہ مناسب ہے، ریاستوں سے لائے جاتے اور دریا گنج کیمپ میں بھر دیے جاتے تھے۔ نوجوان مہتمہ وہ

---

[1] لڑکی معزز خاندان کی سیدزادی تھی اس لیے۔

مادرانہ شفقت کہاں سے لاتی جس کی اس وقت ضرورت تھی۔ ان کا زیادہ وقت انتظام خانہ داری اور دفتر کی لکھت پڑھت میں گزرتا۔ ویسے ہی کم سخن تھیں اس پر ...... کی ممانعت کہ آنے والوں سے کوئی بات نہ کرے۔ ان سے کچھ پوچھا نہ جائے۔ ان کو چھیڑا نہ جائے۔ پچھلے واقعات کا کوئی ذکر نہ آئے۔

آنے والیاں دکھے دل اور بگڑا ہوا دماغ لے کر آتی تھیں۔ یہاں دل کی بھڑاس نہ نکلتی۔ کوئی کام نہ ملتا۔ کوئی بات نہ کرتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ سوائے اوپر سے نیچے تک قلانچیں مارنے آپس میں لڑنے یا پچھلے دن یاد کر کے رونے کے اور کوئی مشغلہ ان کے پاس نہ تھا۔

میرا چونکہ کیمپ سے براہ راست تعلق نہ تھا اس لیے کبھی کبھی جاتی تھی تو مجھے دفتر ہی میں یہ ہدایت مل جاتی تھی کہ ان سے بات نہ کیجیے گا۔ بہت بدتمیز ہیں۔ بہت گالیاں بکتی ہیں۔ ناچار ایک نظر دیکھ کر کیمپ کا جائزہ لے کر واپس آجاتی تھی۔

لیکن اس طرز عمل کا ان پر بہت خراب اثر پڑا۔ وہ اپنے دل کا بخار نہ نکال پائیں اور ان کا غصہ بڑھتا ہی گیا۔ کسی نے ان کو سمجھایا نہیں۔ کسی نے ان کو تسلی نہیں دی۔ ان کو کوئی امید نہیں دلائی گئی جو انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے لیکن وہ تنکا بھی ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ ان کو یہ بھی تو نہ معلوم ہو سکا کہ اس کے بعد ان کا کیا حشر ہوگا۔ جن کے رشتہ دار آجاتے وہ چلی جاتیں۔ خوش خوش جاتی تھیں مگر سیکڑوں ایسی بھی تھیں جو بلا کسی امید سہارے اور روشنی کے پاکستان بھیجدی گئیں اور جاتے وقت چیختی بکتی اور گالیاں دیتی سوار ہوئیں۔

کیمپ کے پھاٹک پر مسلح پولیس تھی۔ مگر اغوا کرنے والے بدمعاش ان کو دوبارہ واپس لے جانے کی امید میں ہر وقت جمع رہتے۔ لڑکیاں اندر سے چیخ کر اشارہ کنایہ میں اپنا پیغام پہنچا دیا کرتیں اور وہاں سے پہرہ داروں کے ہاتھ مٹھائی اور پھل بھی آجاتے۔ یہ صورت حال اس لیے تھی کہ آفس بھی یہیں تھا اور آفس میں عذر معذرت کرنے کے بہانہ وہ آجایا کرتے تھے۔

اور ایک روز پاکستان سے ۱۱ سو ہندو عورتوں اور بچوں کا قافلہ دہلی آیا۔ مجھے نہیں معلوم کتنی یہاں رہیں اور کتنی اپنے رشتہ داروں کے یہاں گئیں۔ لیکن میں نے دو کیمپ دیکھے جو بھرے ہوئے تھے۔ پڑھی لکھی ہندو سکھ عورتیں اپنی قوم کا بوجھ اٹھانے کے لیے تن من دھن سے کوشش کر رہی تھیں۔ عارضی پڑھائی کا بھی بندوبست انھوں نے کر لیا تھا۔

دستکاری بھی سکھائی جارہی تھی. کیمپ صاف ستھرا تھا اور بہت اطمینانی حالت تھی۔ وہاں بھی خرد ماغ لڑکیاں آئی تھیں جو بپھری ہوئی تھیں مگر ان کو سمجھا بجھا کر رام کیا جاتا تھا۔ انھیں ان کے حال پر نہیں چھوڑ دیا گیا تھا اگرچہ مستقبل کی طرف سے ان کو بھی یاس تھی۔ ان کو بھی اندیشہ تھا کہ وہ پھر اپنے شوہروں یا ماں باپ کے گھر عزت کے ساتھ نہ رہ سکیں گی۔

میں نے خود تو نہیں دیکھا مگر والنٹیئر نے مجھ سے بیان کیا کہ بہت سی عورتوں کی پیشانیوں پر "پاکستان زندہ باد" کھدا ہوا ہے اور ہاتھوں یا سینوں پر نہ جانے کتنوں کے نام گدے ہوئے ہیں ؏۱۔

لیکن مسلمان لڑکیاں ایسی سیکڑوں میرے پاس لائی گئیں جن کے ہاتھوں پر بدمعاشوں نے اپنے نام اور گناہ کی تاریخ تک ثبت کر دی تھی. پٹیالہ سے بھاگ کر آئی ہوئی ایک لڑکی نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا، جو اس نے تیزاب سے جلا ڈالا تھا تاکہ بدنامی کے اس داغ کو مٹا سکے جو غنڈوں نے زندگی بھر کے لیے سر بمہر کر دیا تھا۔ یہ لڑکی ایک منسٹر ؏۲ کے گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ اس کی دو بہنیں اور ماں بھی اسی گھر میں تھیں۔ اور کچھ دن بعد اس کی ماں بھیجی گئی کہ منا پھسلا کر لڑکی کو واپس لے آئے ورنہ اس کی ڈیڑھ لاکھ کی جائیداد جس کی واپسی کا وعدہ کیا جا چکا ہے اور دونوں جوان لڑکیاں واپس نہ ملیں گی۔ حریص ماں جو خود بھی حاملہ تھی اور اس حالت میں کسی عزیز کے پاس جانے یا رہنے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتی تھی۔ آئی اور لڑکی کو دھوکہ سے واپس لے گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ سنتی ہوں کہ لڑکی کے شوہر نے پانچسو روپے نقد انعام کا بھی اعلان کیا تھا۔

بہر حال وہ کیمپ بدمعاشوں کی بنا پر مصیبت بن گیا اس لیے اسے کنٹونمنٹ کی فوجی بارکوں میں منتقل کر دیا گیا اور وہاں پہنچنا چونکہ دشوار تھا اس لیے مجمع غائب ہو گیا مگر لڑکیوں میں پاگل پن کے آثار شروع ہو گئے، وہ ماریں، کاٹتیں، مہتمہ کو گالیاں دیتیں اور وزیروں تک کو بے نقط سنائی تھیں۔

میں کہتی تھی اس کا علاج یہی ہے کہ ان کا دکھ درد سنو ان کی گالیاں سنو مگر سمجھانے سے باز نہ آؤ۔ دلاسا دیکر، تسلی دیکر، ہم انھیں راہ راست پر لا سکتے ہیں بشرطیکہ ہمارے اندر

؏۱۔ کچھ عرصہ بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

؏۲۔ پٹیالہ کے وزیر۔

صبر وضبط کا مادہ ہو۔ لیکن ہم کس برتے پر اس انتظام میں مداخلت کرتے۔ جمعیۃ کے علماء جب مجھ سے استفسار کرتے تو مایوس ہو کر کہتے۔ مسلمان عورت بھلا کہاں مل سکتی ہے۔ ان میں سے کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ اپنی بیویوں بہنوں میں سے ایک کو اس پر تیار کر سکیں۔ سچی بات تو یہ ہے اصل کمزوری ان کی اپنی تھی۔ وہ خود ہی اس پر تیار نہ تھے ورنہ عورتیں ذرا سا اشارہ پا جاتیں تو اسی وقت کام کرنے کو نکل پڑتیں۔ اتنا سب کچھ ہو گیا مگر اب بھی لوگ چونکے نہ تھے۔ فروری اور مارچ ہم سب کے لیے اس واسطے اور بھی سخت مہینے تھے کہ لاوارثی کے احساس نے کمر توڑ رکھی تھی۔ قدامت پسندی کی اس دلدل میں پھنسے ہونے کے باوجود ہم جس وقت محسوس کرتے تھے کہ اب قدم نیچے کی طرف دھنس رہے ہیں تو باپو کا سہارا ڈھونڈتے تھے مگر اب وہ سہارا باقی نہ تھا اور سارا ترقی پسند گروپ اور قوم پرست طبقہ اس وقت اپنے کو بے یار و مددگار محسوس کرنے لگا تھا۔ مگر ہندوستان کا باپ اپنا ایک فرزند معنوی بھی چھوڑ گیا تھا اور وہ ہم سب کے لیے مضبوط ستون بن گیا۔ ادھر ان کے روحانی جانشین ونوبا جی ہمارے شریک کار ہو گئے۔ ان کی دعاؤں۔ اور امداد نے بھی ڈھارس بندھا دی۔

کیا ہوتا؟ اگر ہندوستان کی باگ ڈور اس وقت پنڈت جی کے بجائے کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی؟ مگر باپو کا مشن اگر سچا تھا تو ان ہاتھوں سے بہتر ہاتھ ہندوستان میں اور کون ہو سکتے تھے۔ اور دو مہینے کے اندر ہماری کوشش، عزم اور ارادے نے پھر سنبھالا لیا کیونکہ قدامت پسندی، رجعت پسندی اور مذہبی جنون کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے ساتھ، جدید صحت مند نظریہ اور نئی قدروں کا علم بردار بھی تھا۔

9

فروری سے مارچ تک

میں اس سے پہلے ذکر کر چکی ہوں کہ عورتوں میں میل محبت بڑھانے کے خیال سے میں نے ایک سیونگ سنٹر کا ڈول بھی ڈالا تھا۔ بہت تھوڑے سے پیسے پاس تھے۔ سلائی کی ایک مشین سبھدرا کی اٹھا لائی۔ اون جتنا مل سکا گھر سے سمیٹ لے گئی۔ دو چرخے اور ایک مشین سنٹرل ریلیف کمیٹی سے ایک کانگریسی بہن کی معرفت حاصل کر لی اور سب محلوں اور کوارٹروں کا گشت شروع کر دیا کہ دھوا اور غریب عورتیں آ کر ہمارے سنٹر سے کام لے جائیں۔

اس سلسلہ میں ہر طبقہ و مذہب کی عورتوں سے میں ملی اور بہت کچھ شرنارتھیوں کی حالت بھی سمجھنے کا موقع ملا۔ یہ سنکر یا محسوس کر کے کہ میں مسلمان ہوں ان کی آنکھوں سے بدگمانی ٹپکنے لگتی۔ تیوریوں پر بل پڑ جاتے لیکن تھوڑی دیر بات چیت کے بعد وہ محسوس کرتیں کہ ہم اب تک جس مسلمان کو دیکھتے رہے تھے شاید یہ ان کے علاوہ کوئی چیز ہیں۔ اور وہ تجربتاً آنے کا اقرار کر لیتیں۔

مسلم علاقوں میں کافی پروپیگنڈہ کرنے کے باوجود بہت ہی تھوڑی عورتیں آئیں۔ کسی طرح گھر سے نکلنے کی ہمت ہی نہ پڑتی تھی۔ گھروں میں کثیف کپڑے پہنے فاقہ کرتی ہوئی عورتیں چاہتی تھیں کہ گھر بیٹھے ہم ان کو کام دے آئیں اور تیار مال لے آئیں۔ برقعہ اتنا گندہ کہ چھوتے بھی گھن آئے مگر اس کا سر پر ڈالنا ضروری تھا۔ وہ بھی پورا سر چھپانے کے لیے نہیں صرف جسم کے پچھلے حصّہ کو سر سے پاؤں تک بند رکھنے کے لیے شاید زندگی کے آخری لمحہ تک اس غریب برقعہ کو پانی کی شکل دیکھنا نہ نصیب ہوتی ہو گی۔ اتنا سب کچھ ہو گیا مگر بے پردگی کا خیال ہر وقت غالب تھا۔ بمشکل آٹھ عورتوں نے آنے کا وعدہ کیا اور چار نے داخلہ کرایا مگر شرنارتھی بہنیں آٹھ دس تو پہلے

بھی دن اگئیں۔ وہ بھی جو ضرورت مند تھیں اور وہ بھی جو کھاتی پیتی تھیں۔ سب کی سب سنٹر میں گھس آنا چاہتی تھیں۔ اب ان میں حاجتمندوں کو چھانٹنا ہمارا کام تھا۔ تھوڑے ہی دن میں ان کی تعداد پینتیس تک پہنچ گئی۔ اسٹوڈنٹ کانگریس کے جو لڑکے ہمارے ساتھ کام کر رہے تھے وہ اپنی ساتھی لڑکیوں کو بھی لے آئے اور ایک کانگریسی بہن کی مہربانی سے ہم کو کئی تھان بھی مل گئے۔ جو ان تمام عورتوں کو قطع کر کے روزانہ دیے جاتے تھے پنجابی بہنیں تقریباً بارہ روز کا روز کپڑا تیار کر کے لے آتیں اور سلائی ہاتھ کی ہاتھ انھیں دیدی جاتی۔ لیکن مسلمان عورتیں لیجاتیں تو دوسرے تیسرے دن کپڑا سی کر لاتیں۔ اس میں کوئی شک نہیں سلائی باریک صاف اور بہتر ہوتی تھی مگر اس حساب سے ان کی آمدنی نصف رہ جاتی تھی۔ وہ ایک کپڑے کی مزدوری تیسرے دن حاصل کرتیں اور شرنارتھی بہنیں روز کے روز۔

ریلیف کمیٹی کا سارا کپڑا اسل گیا اور مزدوری سنٹر سے دیجاتی رہی۔ آخر کار تیار کپڑے اور بل بنا کر بھیجدیا گیا۔ یہ بھی سنا کہ منظور ہو گیا مگر لڑکے دوڑتے ہی رہے۔ پیسے کسی طرح نہ ملے اور پہلے ہی مہینہ پچیس روپیہ کا نقصان سنٹر کو اٹھانا پڑا۔

انھیں دنوں دریا گنج میں مسلم لڑکیوں کا کیمپ قائم ہو گیا تھا۔ میں بھی کسی کسی دن جایا کرتی تھی۔ ریاستوں سے آنے والی عورتیں اور بچے گرلز اسکول کی اس عمارت میں اوپر سے نیچے تک بھرے تھے۔ ایسے بہت سے بچے تھے جن کی مائیں ساتھ نہ تھیں۔ یہ وہ لاوارث بچے تھے جن کے والدین مار ڈالے جا چکے تھے اور یہ بطور مال غنیمت حملہ آوروں میں بٹ گئے تھے۔

میں نے دیکھا کہ سب اس وقت تک انھیں کپڑوں میں ہیں جو پہن کر آئے تھے۔ لڑکیاں بدستور کثیف گھگھری پہنے گھوم رہی تھیں مگر جوان عورتوں کے لباس صاف ستھرے تھے۔ میرے سوال پر منتظمہ نے بتایا کہ یہاں سب ایک ہی ناپ کے سلے ہوئے ہوئے جوڑے گورنمنٹ کی طرف سے آئے ہیں۔ چھوٹے جوڑے موجود نہیں ہیں اس لیے بچوں کا لباس تبدیل نہیں کرایا جا سکا۔ میں نے کہا کہ ہمارے سنٹر میں بچوں کے بہت سے جوڑے ہیں اگر کہو تو بھجوا دوں۔ انھوں نے کہا ضرور۔ ہمیں خود ان کو گندہ دیکھ کر تکلیف ہو رہی ہے مگر مجبور ہیں۔

ع۱ - پہلے ہندو مسلمان یعنی پاکستان سے آنے والی اور ہندوستان سے برآمد ہونے والی ایک ہی کیمپ میں رکھی جاتی تھیں۔ ان میں سخت لڑائیاں ہوتی تھیں۔ پھر دونوں کیمپ الگ کر دیے گئے۔ مسلم لڑکیوں کے لیے ٹڑدی ہاؤس دریا گنج میں کیمپ قائم ہوا۔

دوسرے دن صبح میں ۳۰ جوڑے لیکر پہنچی اور جس بچے کے جو ٹھیک اترا، اس کو پہنا دیا۔ کپڑے تقسیم کر کے جیسے ہی اٹھی ہوں۔ ایک ہندو بہن جنکا کیمپ کے منتظمین میں شمار تھا آگئیں۔ انھوں نے بہت اظہار مسرت کیا کہ بڑا اچھا ہوا آپ نے ان سب کو ستھرا کر دیا۔

آفس کے انچارج سے میں نے کہا۔ ۳۰ جوڑے میں اندر دے آئی ہوں۔ ان کا بل آپ کو بھجوادوں یا خود لکھ لیجیے گا۔ انھوں نے جواب دیا۔ بل بھیجد یجیے تو اچھا ہے۔

لیکن مسز ..... بولیں۔ کیا یہ کپڑے آپ نے قیمتاً دیے ہیں۔ میں تو سمجھی آپ یونہی دینے لائی ہیں۔ میں نے کہا یہ تو میں کل ہی بتا گئی تھی کہ جامعہ کے سیونگ سنٹر میں تیار ہوئے ہیں۔ قیمت ان کی مقرر ہے اور ان تمام پرچیوں پر درج ہے جو آپ کے سامنے ڈھیر ہیں۔ شرنارتھی عورتوں کے لیے سلائی مقرر ہے۔ اگر ان کو سلائی نہ ملے گی تو فاقہ کریں گی۔

بہت ہی تیز ہو کر کہنے لگیں۔ نہیں صاحب گورنمنٹ ہرگز آپ کو پیسہ نہ دیگی۔ آپ کا دل چاہے تو کپڑا اتروا لیجیے۔ گورنمنٹ کا کام تو آپ جانتی ہیں کتنا مشکل ہوتا ہے۔ مہینوں لگ جاتے ہیں۔

میں نے پھر کہا۔ مہینوں لگ جائیں مگر یہ سارے کپڑے جو کیمپ میں استعمال ہو رہے ہیں کہیں نہ کہیں سے سل کر آئے ہیں۔ اور مجھے معلوم ہے اسی طرح کے اور سنٹروں میں رفیوجی عورتوں سے سلوائے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ نے خود تو درزی نوکر نہیں رکھے ہیں۔ ان کپڑوں کی بھی یہی صورت ہے۔ غریب عورتوں کے تیار کیے ہوئے ہیں۔

آفیسر انچارج نے کہا بھی کہ ان کے سنٹر کا تعلق بھی رفیوجیز سے ہے۔ لیکن مسز .... بدستور تیز تیز بولتی رہیں۔

نہیں صاحب یہ نہیں ہو سکتا۔ گورنمنٹ ہرگز آپ کا بل پے نہ کریگی۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ آپ کو شکریہ کا خط لکھدیں مگر روپیہ نہیں دلوا سکتے۔ مجھے تو یہی غلط فہمی تھی کہ آپ خود لائی ہیں۔ مجھے بھی یہ تلخ گفتگو ناگوار ہو رہی تھی۔ جل کر صرف اتنا کہا کہ امداد کے لیے محلہ اور گاؤں کے غریب کیا کم ہیں جو میں گورنمنٹ کے قائم کیے ہوئے کیمپ میں خیرات بانٹنے آئی۔ بہر حال کچھ پرواہ نہیں نقصان ہم بھگت لیں گے۔ اور جو کچھ کہا ہو یاد نہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ٹیڑھی میڑھی باتیں ہوتی رہیں۔

لیکن کپڑے اتروا لینا میرے دل نے گوارا نہ کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بہت لوگ یہاں آتے ہیں اور ان لڑکیوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں اس کو پسند نہیں کرتی کہ کوئی

ان سے بات کرے یا ملے۔ ان کو تنہا چھوڑ دینا ٹھیک ہے۔

آگے چلکر میں بتاؤں گی کہ اس پالیسی کا کیسا برا اثر ان عورتوں پر پڑا۔ بہرحال میں وہاں سے پلٹی تو بے حد غصہ تھا۔ دوبارہ مجھے ان لوگوں سے سابقہ پڑا مگر تنگ نظری نے دونوں بار ان کو اسی پر مجبور کیا کہ سیونگ سنٹر کا چونکہ جامعہ اور مجھ سے متعلق ہے اس لیے کسی امداد کا مستحق نہیں۔ حالانکہ میں نہ ہندو مسلمان کی تفریق کرتی تھی نہ مصیبت کے وقت اس بات کو سوچنے کی عادی تھی مگر وہ کیوں دیکھنے اور سوچنے کی زحمت اٹھاتیں۔ ان کے دماغ تو کسی وقت بھی اس سے غافل ہی نہ ہوتے تھے کہ ہر چیز پر ہندو اور مسلمان کی چھاپ لگاتی رہیں۔ اس وقت غالب تعداد ہمارے ہاں ہندو عورتوں کی تھی۔ میرے لیے تو عزیب دکھی سب برابر تھے۔ میرے رسولؐ نے تو کہا تھا:

"ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور خدا کو ساری مخلوق میں پیارا وہ ہے جو اس کے کنبے کی خدمت کرے اور اس پر احسان کرے۔"

مقصد تو امن و اتحاد قائم کرنا ہے کوئی ادارہ قائم کرنا یا پیسہ کمانا تو ہے نہیں۔ ابھی تک تو کوئی استاد بھی نہیں رکھا جا سکا ہے۔ کام کرنے والے آنریری ہیں جتنے دن اس طرح چلا سکوں گی چلاؤں گی۔

یہ سوچ کر اسّی نوّے روپے کا نقصان بھی پی گئی۔

ہندو اور مسلمان بہنیں جو ایک دوسرے کے سائے سے بھاگتی تھیں آج ایک ماہ بعد میری آنکھوں کے سامنے پاس پاس بیٹھی ہوئی آپ بیتی اور جگ بیتی ایک دوسرے کو سنا رہی تھیں، ہنس بول رہی تھیں۔ دونوں اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر ان غنڈوں لیڈروں کو کوس رہی تھیں جنھوں نے ان کے دلوں کو چھلنی کیا تھا۔ یہی میری سب سے بڑی کامیابی تھی۔

پہلے دن جب یہ اکٹھی ہوئی تھیں تو کیسی کیسی نفرت اور طنز کی باتیں کی تھیں اور اب ایک دوسرے کی دوست ہیں۔ وقتاً فوقتاً، سوشل سروس کرنے والی لڑکیاں اور تقریباً روزانہ کچھ منٹ تک میں خود امن، محبت اور ایکتا کا سبق انھیں آہستہ آہستہ بتاتی تھی۔ ہم نے انھیں یقین دلایا تھا کہ تم دونوں دکھی ہو اور دکھی دلوں میں بیر نہیں ہوا کرتا۔

فروری سے لے کر وسط اپریل تک میں اسی طرح شہر میں کام کرتی رہی۔ کیمپ کا

سلسلہ بھی اب تک قائم تھا۔ اگرچہ گاندھی جی کی شہادت نے عوام کی حالت بدل دی تھی مسلمان اب آزادانہ پھرنے لگے تھے۔ حکام کے دلوں میں جو بھی چور ہو بظاہر ان کا رویہ بھی کسی قدر بدلا ہوا تھا اور مسلم زون (جو باپو کی زندگی میں قائم ہو گئے تھے) اب ہر خطرہ سے محفوظ تھے۔ رفیوجیز کا رویہ بھی مصالحانہ ہو رہا تھا اور بتدریج حالات سدھر رہے تھے۔ سب کچھ کھو کر لوگوں کو ہوش آ رہا تھا۔

ادھر لیگی مسلمانوں نے بھی اپنا پروپیگنڈا بند کر دیا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ وہ باقی بھی کم ہی رہ گئے تھے۔ لیکن پھر بھی ہم حیرت کے ساتھ دیکھا کرتے تھے کہ جس دن ٹرین پاکستان جانے والی ہوتی ہے، بے شمار لوگ ایک رات پہلے آ کر عیسیٰ خاں[2] کے مقبرہ میں مقیم ہو جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ان کو پاس کون دیتا ہے؟ اجازت کہاں سے ملتی ہے؟ کیمپ میں نئے آنے والوں کی گنجائش نہیں ہے اس لیے ان کو گھسنے نہ دیا جاتا تھا۔ پھر شہر میں کیا پاکستان آفس سے پاس تقسیم کروائے جاتے ہیں؟ آخر کیا ہوتا ہے؟ کہ کیمپ والے رہ جاتے ہیں اور ریل شہریوں سے بھر جاتی ہے۔

یہ بھید ایک دن ٹرین جاتے وقت کھلا۔ کیمپ میں چونکہ اب کارکن بہت کم ہو گئے تھے اس لیے ریل کی روانگی کی خبر سنکر پرانے ساتھی مدد کے لیے آ گئے تھے اور انھوں نے دیکھا کہ سوار ہوتے وقت لوگوں نے جلد جلد اپنے پاس پولیس اور والنٹیروں کو دینے شروع کر دیے۔ لڑکوں کو شبہ ہوا۔ انھوں نے سب سے چھین لیے، شمار کیا تو کئی سو تھے۔ پاس میرے پاس لائے گئے اور تحقیقات شروع ہوئی تو پتہ لگا کہ یہ پاس بعینہٖ شہر لیجا کر دس دس، پانچ پانچ روپیہ میں دوسروں کے ہاتھ بیچ دیے جاتے ہیں۔ ایسا ایک ہی مرتبہ

ع۱۔ میں شاید اس سے پہلے ذکر کر چکی ہوں کہ جب رفیوجیز نے محلوں میں یورش شروع کی تو خوف و دہشت سے مسلمانوں نے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ ستمبر اکتوبر میں فساد زدہ علاقوں سے بھاگ کر مسلم اکثریت کے علاقوں میں پناہ لینے والے مصیبت زدہ اب دوبارہ اجڑ رہے تھے۔ اس صورت حال سے جب باپو اور پرائم منسٹر کو مطلع کیا گیا تو سب کے مشورہ سے انھوں نے مسلم زون قائم کروائے مگر برت سے پہلے مسلم زون بھی توڑنے کی کوشش شروع ہو گئی، جو شہادت کے بعد کچھ دنوں کے لیے ملتوی ہو گئی تھی۔

ع۲۔ مقبرہ ہمایوں کے نزدیک عیسیٰ خاں کا مقبرہ ہے۔

نہیں ہوا اکثر ہوتا رہتا تھا۔ کیمپ کے والنٹیر اور پولیس مین دونوں مستعدی کے ساتھ یہ کام کرتے ہیں اور انھیں کو خرید کر اگلی ریل سے دوسرا قافلہ روانہ ہو جاتا ہے۔ بمشکل تھوڑے کیمپ کے باشندوں کو جگہ مل سکتی ہے۔ باقی جگہ نئے آنے والوں سے بھر جاتی ہے۔ شہر کا ریلا اتنی جگہ چھوڑتا ہی نہیں کہ وہ جا سکیں۔ جو غریب چار چار مہینہ سے مصیبت بھوگ رہے تھے وہ ہی رہ جاتے تھے۔ ایک صاحب کے بارہ میں ہم کو بتایا گیا انھیں اسّی آدمیوں کو ساتھ لے جانے کا اجازت نامہ پاکستان آفس سے مرحمت ہوا ہے۔

اس دن اسٹیشن پر اتنا اژدہام تھا کہ کئی آدمی کچلے گئے۔ نظام الدین کا چھوٹا سا اسٹیشن اس میں بھلا اس انبوہ کی گنجایش کہاں تھی۔ یہ سب حال سن کر اور دیکھ کر یہی صورت سمجھ میں آئی کہ ہائی کمشنر صاحب سے مل کر اس مصیبت کا کوئی علاج ڈھونڈوں اور اسی وقت وہاں پہنچی۔

ہائی کمشنر صاحب[1] سے ملاقات کوئی آسان کام نہ تھا۔ ان سے ملنا گورنر جنرل سے زیادہ مشکل تھا۔ ہر آدمی شکایت کرتا تھا کہ وہ لوگوں سے ملتے نہیں ہیں، زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ ہر وقت ان پر ایک اختلاجی کیفیت طاری رہتی ہے اور وہ بے تابی کے ساتھ اس دن کے منتظر ہیں جب انھیں اس عہدہ سے سبکدوش کر دیا جائے۔

میرا کوئی ذاتی تجربہ نہ تھا۔ اس سے پہلے دو ایک بار ملی تھی مگر ہمیشہ سرسری ملاقات ہوئی۔ کوئی کام تو پڑا نہ تھا، دیکھنے میں تو بھلے آدمی لگتے تھے۔

اسی زمانے میں ایک پرجوش لیگی نوجوان یو پی سے آیا تھا۔ وہ ہندوستان کو دارالکفر سمجھ کر ایک منٹ یہاں ٹھیرنے پر راضی نہ تھا شاید اس کو امید تھی کہ جونہی وہ کوٹھی کے قریب پہنچے گا پاکستان کے حکام اس مجاہد کا شاندار استقبال کریں گے لیکن اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی جب صبح سے شام تک سرگرداں رہنے اور منت خوشامد کرنے کے بعد بھی ہائی کمشنر صاحب تک رسائی نہ ہو سکی اور شام کو وہ برابر اپنا سر سہلا رہا تھا ٹہل رہا تھا اور مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ بتایئے میں کیا کروں؟ اور مجھے ہنسی آ رہی تھی۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

---

[1]۔ زاہد صاحب۔

عوام کا کثیر مجمع ہر وقت ہائی کمشنر کی کوٹھی کو گھیرے رہتا تھا۔ اندر کے صحن میں کچھ خیمے بھی لگا دیے گئے تھے جن میں اجازت نامہ کے طلب گار کئی کئی دن پڑے رہتے تھے اور شکایت کرتے تھے کہ ہمیں کوٹھی سے دھکے دیکر نکال دیا گیا۔ ہائی کمشنر صاحب بچارے کو خبر بھی نہ ہوتی ہو گی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جو زیادہ ضرورت مند ہوتا اور زیادہ خوشامد کرتا وہ ضرور ہی گردن پکڑ کر دوڑا دیا جاتا تھا کیونکہ سارے ملک کی طرح یہاں بھی سکہ کا کھیل جاری تھا۔ اور چاندی ایک کیا سو پاس دلا سکتی تھی۔

میں جہاں تک اندازہ کر سکی موصوف بذاتِ خود شریف اور خود دار آدمی تھے بے رحم نہ تھے، مگر شاید اس فضا، اس ماحول، اور اس عہدہ کے قطعی نا اہل تھے۔ یہ ناگوار فرائض اور یہ پُر ہول زمانہ سب ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ یہ بھی مسلمانوں کی ایک اور بد قسمتی تھی کہ جہاں سب مصیبتیں تھیں وہاں مسیحا بھی ایسا ملا جو خود ہی بیمار تھا۔ ان کی غلطی صرف یہ تھی کہ جان سے بیزار بیٹھے رہتے تھے اور ملنے سے انکار کر دیتے تھے اکثر یہی کہہ دیا جاتا کہ نہیں ہیں۔ فون پر بھی مشکل سے بات کرتے اور معمولی زبانی ہمدردی بھی شاید اب ان کے بس میں نہ تھی۔

بہر حال سب جانتے ہوئے بھی اس وقت ملنا ضروری تھا۔ پھاٹک سے رہائی ہوئی تو برآمدہ میں رکنا پڑا۔ اور برآمدہ کے منتظمین سے گلہ خلاصی ہوئی تو ڈپٹی سکریٹری نے اصرار شروع کیا کہ آپ مجھے بتا دیجیے ہائی کمشنر صاحب تو اس وقت بہت مصروف ہیں۔ بمشکل اس پر راضی ہوا۔ اچھا ہائی کمشنر صاحب نہ سہی ان کے سکریٹری ہی کو بتا دیجیے گا۔

بہت دیر انتظار کیا۔ سکریٹری انکار بھی نہ کرتے تھے اور اقرار سے بھی گریز تھا۔ ہمیں جلدی تھی۔ اس لیے یہی مناسب سمجھا کہ سب کچھ ان سے کہہ دیں۔ اتنی آدمیوں کے پاسوں کے نمبران کو نوٹ کرائے اور ان سے پوچھا کہ آخر آپ کے آفس سے پاس جا کر بکتے کیسے ہیں۔ اس کا پتہ لگائیے۔ بد انتظامی کی حد ہے۔ ایک زبان سے تو آپ لوگ یہ کہتے ہیں کہ دلی والوں کو دیکھیے ان کی اب پاکستان میں گنجائش نہیں ہے اور دوسری طرف اسی آدمی ساتھ لے جانے کا اختیار ایک شخص کو دیدیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کیمپ کے لوگ پڑے رہ جاتے ہیں اتنی تکلیف بھی آپ کا دفتر گوارہ نہیں کر سکتا کہ ان پر تاریخ ڈال دے یا وقت کے وقت کسی کو اسٹیشن بھیجدیں جو پاس قطع کرتا جائے تاکہ اس بدعت کا خاتمہ ہو۔

سکریٹری صاحب ہاں ہاں ضرور۔ میں فوراً پتہ لگاؤں گا، آپ ٹھیک کہتی ہیں، میں ضرور دیکھوں گا یہی سب کہتے رہے اور کچھ بھی نہ کیا۔ یہ خرید و فروخت کا سلسلہ پھر بھی چلتا رہا اور بد اعمالیاں اس وقت تک بند نہ ہوئیں جب تک کیمپ ختم نہ ہو گیا۔

دو بار اس سلسلہ میں وہاں گئی۔ ہائی کمشنر صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اچھا ہوا ورنہ اب تو طبیعت بہت جلی ہوئی تھی۔ گفتگو شاید تلخ ہی ہوتی۔ اور مجھے ہمیشہ افسوس رہتا کہ بیماری اور کمزوری کی حالت میں مجھ سے بھی ان کو تکلیف پہنچی۔

فروری کے آخر میں ہمارے پاس کچھ لوگ علاقہ شاہدرہ[1] سے آئے اور انھوں نے اپنے مصائب کا حال بیان کیا کہ کس طرح وہ ایک پرانی تحصیل کی عمارت میں پڑے ہیں جہاں نہ انھیں راشن ملتا ہے نہ ضروریاتِ زندگی کا کوئی بندوبست ہے۔

ہم نے جا کر انھیں دیکھا۔ اور ان کی مشکلات سے متاثر ہو کر یہ طے کیا کہ اب پہلا قدم اٹھانے کا وقت آگیا ہے ان اجڑے ہوؤں کو دوبارہ بسانا چاہیے۔ حکام تک بات پہنچائی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ ذمہ داری لینے پر تیار نہ ہوئے نہ یہ اطمینان دلایا کہ کسی قسم کی مدد دیں گے۔ جمعیۃ والوں سے ذکر ہوا تو ایک مولانا[2] نے کہا "دتا بہن[3] تم انھیں مرواؤ گی۔"

مگر ہمارے کانوں میں تو باپو کے بول گونج رہے تھے کہ جب تک لوگ پھر اپنے گھروں میں بس نہ جائیں گے ان کو سکون نہ ہوگا اور ملک میں شانتی نہ ہوگی۔ ہم جانتے تھے حکام مدد کرنا کیسا، شاید ہماری راہ میں روڑے بھی اٹکائیں گے۔

اگر اس وقت ہمارے بس میں ہوتا تو ان سارے شرنارتھیوں کو بھی کا ہم پاکستان لوٹا آئے ہوتے اور سارے مشرقی پنجاب والوں کو ان کے گھروں میں آباد کر آتے۔ لیکن ہم میں اتنی طاقت کہاں تھی، اتنے اختیارات کب تھے، اس لیے بس لے دے کر اپنا زور تو دلی پر چلنا تھا۔ وہ بھی صرف تھوڑے سے لوگوں پر۔ یہیں جو چاہیں کر لیں۔ دائرہ محدود سہی، قوتِ عمل تھوڑی سہی، مگر ہمارے دل اور دماغ محدود نہ تھے اور اب تو ہماری طاقت پہلے سے آٹھ گنا بڑھ گئی تھی۔ باپو نے مر کر ہمیں جینے کا راستہ دکھا دیا تھا اور ہمارے ہاتھ مضبوط کر دیے تھے۔

آخر کار ہم نے اپنے ہی عمل اور ساتھیوں پر بھروسہ کیا۔ اور یہ قدم اٹھانے کی ٹھان لی۔ اور شام کو اس گاؤں میں پہنچ کر وہاں کے ذیلدار سے ملے۔

---

[1] ۔ جھیل کر نجہ اور خریجی دو گاؤں پاس پاس تھے

[2] ۔ مولانا احمد سعید

[3] ۔ سبھدرا کو لوگ عام طور پر دتا جی کہتے تھے۔

ابھی ٹھنڈک کافی تھی اور شام کے وقت چوپال میں گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو موٹے دوہر لپیٹ کر بیٹھنے کی ضرورت پڑا کرتی تھی۔ حقہ کا دور چل رہا تھا اور اس وقت ایک شرنارتھی شاید ڈیرہ اسمٰعیل خاں کا باشندہ اپنی رام کہانی سنا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر باتیں بند ہو گئیں۔ پہلے تو اچھی طرح ہمارا سواگت کیا۔ مگر یہ جانکر کہ ہم کس نیت سے آئے ہیں کسی قدر رخ بدل گیا۔

پناہ گزین یہاں کسی سے واقف نہ تھا۔ کسی سے ملنے نہیں آیا تھا۔ یونہی شاید سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈھتے تلاش کرتے یہاں پہنچ گیا تھا۔ لیکن اس گاؤں کی حالت اس وقت ایسی تھی کہ اس حالت کو دیکھ کر اسے کوئی خوشی نہ ہوئی ہوگی۔ پھر بھی اس نے مخالفانہ انداز اختیار کر لیا اور پاکستان کے گذرے ہوئے حالات و واقعات کا حوالہ دینے لگا۔

لیکن ایک مقامی پنڈت نے سب کچھ سن کر کہا۔ صاحب۔ گورنمنٹ اگر بسانا چاہتی ہے تو لائے۔ ہمارا کچھ زور نہیں۔ نہ ہم سے کوئی لڑائی جھگڑا ہوا تھا۔ اس گاؤں سے تو لوگ ..... سب انسپکٹر کے کہنے سے نکلے ہیں۔ یہاں سے لیجا کر انھوں نے پاس پاس کے سارے گاؤں کے لوگوں کو اس سامنے والے قصبہ میں رکھا اور پھر وہاں سے بھی نکالا پیچھے کو گنڈوں نے سارے مکان کھود ڈالے۔ ہم نے تو کچھ کیا نہیں۔

تھوڑی دیر بات چیت کر کے ہم نے گاؤں دیکھا اور اپنے جی میں یہ سوچ لیا کہ

"ہر چہ باد آباد کشتی ما در آب انداختیم "[1]

اب وہ مریں یا جئیں۔ ان پچاس ساٹھ آدمیوں کو کل ہی یہاں لا کر بسانا ہے۔ ٹرک کرایہ پر لیے گئے اور دو والنٹیر ساتھ لیکر ان سب کو گاؤں پہنچا دیا گیا۔ صرف ایک مکان ان کا صحیح سالم تھا۔ باقی سب ٹوٹ چکے تھے۔ قہر خداوندی نے جمنا کی باڑھ کی شکل میں ان سارے گھروں کو مسمار کیا تھا۔ اب ان سب کے لیے خیموں کی ضرورت تھی۔ جامعہ سے بلاہراد پچاس خیمہ حاصل کیے گئے اور ان خیموں کو لے جانے کے لیے ٹرک احرار پارٹی نے دیا۔ ان میں سے دو خیمے تو سبھدرا اور دونوں لڑکوں کے لیے ریزرو کر دیے گئے۔ باقی پناہ گزینوں کے استعمال میں آئے۔

---

[1]۔ جو بھی نتیجہ ہو ہم اپنی کشتی دریا میں ڈال دیں گے۔

اب ہم سب کا کام یہ تھا کہ ضرورت کی چیزیں اور راشن وغیرہ شہر سے لیجا کر ان کو پہنچائیں۔ کیونکہ پچھلی تیار فصل جو وہ چھوڑ کر گئے تھے لٹیروں نے کاٹ لی تھی، اور نئی فصل اب ان کی زمینوں پر مقامی لوگ تیار کر رہے تھے۔ وہ از خود دینے والے نہ تھے جب تک ان پر دباؤ نہ ڈالا جائے۔

جو لوگ گئے تھے۔ ان کے پاس نہ تن ڈھکنے کو کپڑا تھا نہ کھانے کو اناج کا دانہ۔ ایک ماہ تک ان پچاس آدمیوں کو کھانا پہنچانا بڑا مشکل کام تھا، لیکن خدا کی مدد اور ساتھیوں کی ہمت نے مشکل آسان کر دی کسی کسی دن جمعیتہ سے راشن کی بوریاں آجاتی تھیں۔ کسی دن ہم میں سے کوئی اکٹھا کر کے لے جاتا تھا اور کبھی سبھدرا خود کاسۂ گدائی لے کر شہر میں پہنچ جاتیں اور کئی دن کا ٹھکانا کر لیتیں ان کی ہمت نے سب کی ڈھارس بندھائی۔

اس عرصے میں ہم نے دو تین چھوٹے چھوٹے اجتماع صلح صفائی کے لیے۔ ایک بڑا جلسہ بھی ہوا اور پھر چوبیس گاؤں کی ایک پنچایت بلائی گئی۔ اتفاق سے مجھے اس دن الہ آباد جانا پڑ گیا اور اس میں شریک نہ ہو سکی۔ واپسی پر سب حال سنا۔ ساتھیوں نے بتایا کہ اب عام فضا مخالفانہ نہیں ہے لوگوں کو صرف یہ ڈر ہے کہ لوٹ کا مال تو سب کے پاس ہے۔ اسی گاؤں کے رہنے والے ایک دوسرے کے پرانے پڑوسی سب کچھ جانتے ہیں۔ کس نے کیا کیا اور کیا لیا ہے۔ چیزوں کو پہچان کر کہیں یہ ہم سب کو پکڑا نہ دیں۔

یہ دیکھ کر ہمیں اعلان کرنا پڑا کہ تمھارے ساتھی، تمھارے بھائی واپس آئے ہیں۔ وہ صرف تمھاری محبت اور ہمدردی کے بھروسہ پر آئے ہیں۔ حکومت یا پولیس کا سہارا لے کر نہیں آئے ہیں۔ تم خود ان کی مدد کرو۔ چاہے ان کی چیزیں واپس کر کے ان کی امداد کرو۔ چاہے اپنے پاس سے دے کر ان کو احسان مند بناؤ۔ ان تمام اپیلوں کا یہ اثر ہوا اور پنچایت نے یہ فیصلہ کیا کہ تازہ فصل میں سے آدھا بٹوارہ کرا دیں گے اور فی الحال اپنے پاس سے اناج دے کر ان کے کھانے کا بندوبست کریں گے۔

ہم نے وزیروں تک یہ بات پہنچائی کہ لوکل گورنمنٹ نے ہماری مدد نہیں کی لیکن پھر بھی وہ لوگ بس گئے ہیں۔ پاکستان نہ ان میں سے کوئی گئے ہیں نہ جانا چاہتے ہیں۔ ہندی

عا۔ اس گاؤں کے مقامی ہندوؤں نے شرنارتھیوں کو بھی بسانا اور کچھ دینا پسند نہ کیا تھا خود سب چیز پر قابض ہو گئے تھے۔

ہیں ان کو ٹھکانا ملنا چاہیے تھا اور یہ سوچ کر ہم نے ان کو ان کے وطن پہنچا دیا ہے، اب ان کی امداد کی سخت ضرورت ہے۔

حکومت کے ایک ذمہ دار رکن سے ہم نے چھ سو روپیہ حاصل کیے اور انھیں چھت کو اڑ اور بانسوں وغیرہ کے لیے تقسیم کر دیا۔ مٹی کی دیواریں انھوں نے خود تیار کر لیں، یہ سب کئی مہینہ میں ہوا۔ اور بھی بہت سے لوگ آ گئے۔ معاملہ چلتا رہا مگر وہ سب بس گئے۔

لیکن جلد ہی فصل کٹنے لگی اور بٹوارہ کا وقت آیا تو پولیس نے گاؤں والوں بھڑکا دیا کہ ایسا کوئی حکم اوپر سے نہیں آیا ہے۔ یہ لوگ تو اپنی اپنا کر رہے ہیں تم کیوں بانٹ کر دو گے۔ کچھ حکومت سے تھوڑی حکم آیا ہے۔

ایک ماہ رہ کر ہمارے ساتھی تو واپس آ گئے تھے۔ لوگ دوڑے آئے کہ تھانیدار نے بھڑکا دیا ہے اور ہریجنوں و مسلمانوں ایک چھوٹی سی جھڑپ بھی ہو گئی ہے ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں سب کیا دھرا اکارت نہ ہو جائے۔ اس علاقہ کی پولیس سے کیسے نپٹنا چاہیے۔ تعلقات خراب تھے۔ ہم سے پہلے کانگریس اور اس سے پہلے نوجوانوں کی اس جماعت سے بھی جھگڑا رہ چکا تھا۔ جو ستمبر میں کام کر رہی تھی۔ وہ سب یہاں کی پولیس سے ہار چکے تھے اور شاید ہمیں بھی ہارنا تھا۔

لیکن ہماری خوش قسمتی تھی کہ کچھ بھلے افسران بھی ان دنوں دہلی میں تھے اور معاملے کے دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالتے تھے۔ تھانہ انچارج ہمارے راستہ کا بہت بڑا پتھر تھا۔ اگر ہم اب بھی اس کو نہ ہٹا سکے تو یہ سارے گاؤں اجڑے ہی پڑے رہیں گے۔ اور یہ سوچ کر متفقہ کوشش شروع کر دی گئی۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا کہ ہمارے مخالف کو لوکل گورنمنٹ سے کارگذاری کے سارٹیفکیٹ ملے اور اسے ترقی دیکر دوسری جگہ ہٹا دیا گیا۔ اس وقت تو ہمیں ایک علاقہ میں اپنا کام نکالنا تھا اور ہم صرف اس علاقہ کو اس کی مہربانیوں سے محروم کرنا چاہتے تھے تاکہ قوم پرست طبقہ کے قدم یہاں جم سکیں۔

ایک ایسے گاؤں میں امن و امان کے ساتھ لوگوں کو بسا دینا اور پھر ان میں میل جول بھی قائم کرا لینا شانتی دل کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اور اس پر ہمیں بے حد فخر تھا بسنے والوں کی تعداد اب ۹۰ تک پہنچ گئی تھی اور بے شمار خط پاکستان سے آ رہے تھے کہ ہم واپس آنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم نے سختی کے ساتھ روکا کہ کہیں بہت بڑی مصیبت نہ پیدا ہو جائے۔ ہمارے تین ساتھی حالات کے مطالعہ اور مدد کیلئے وہاں ٹھہر گئے تھے۔

چار ہفتہ انتہائی تکلیف مگر بڑے لطف کے ساتھ ان تین آدمیوں نے وہاں گذارے۔ دوسرے تیسرے دن ہم میں سے کئی لوگ وہاں پہنچتے تھے۔ مقامی کانگریس مین بھی ہماری پوری مدد کر رہے تھے اس قیام کا بہت اچھا اثر یہ پڑا کہ پاس پڑوس کے دیہاتوں میں ہمارا رسوخ قائم ہوگیا۔

لیکن عورت بس کی گانٹھ تو ہوتی ہی ہے۔ اسی زمانہ میں دو لڑکیاں لائی گئیں۔ ان میں سے ایک اس گاؤں کی بھی تھی۔ اصل میں اس کے سسرالی خاندان کے لوگ یہاں تھے مگر شوہر پاکستان چلا گیا تھا۔ لڑکی گاؤں پہنچی تو یہ سوال اٹھا کہ شوہر کے آنے تک اس کو کہاں رکھا جائے۔ خبر پاتے ہی وہ آئے گا ضرور اور اس پاکستان سے آنے والے کو اس گاؤں میں ٹھہرنے کا حق دینا ہمارا کام نہ تھا۔ مگر ہم دونوں عورتیں تھیں اور ایک عورت کا گھر بسا دینا، اس کی دنیا سنوار دینا، اور اسے پھر عزت کی زندگی کی طرف لوٹا دینا ہمارا فرض تھا اور دلی خواہش تھی۔ اس معاملہ میں ہم نے قانون کا لحاظ نہیں کیا۔ اپنا اخلاقی فرض دیکھا اور عورت کے جذبات پر غور کیا۔ ہم نے کہہ دیا۔ وہ آجائے۔ ہم اس چیز کو چھپا ڈالیں گے۔ حکام سے نہ بتائیں گے بشرطیکہ وہ اپنی بیوی کو رکھ لے۔

اس درمیانی وقفہ میں وہ کارکنوں کا کھانا بھی پکایا کرتی تھی اور ایک بڈھی چچی کی حفاظت میں رہتی تھی۔ چمکدار آنکھوں والی تیز طرار لڑکی کو دیکھ کر بہت سی ماؤں نے اپنے نوجوان بیٹے نکاح کے لیے پیش کر دیے اور جب تک شوہر آئے آئے، نہ جانے کتنے رنڈوے عقد پر تل گئے ہم ایک ایک کو یقین دلاتے رہے کہ شوہر قطعی زندہ ہے۔ خط پاتے ہی وہ ضرور آئے گا لیکن لوگوں نے بڈھی چچی کو گانٹھ لیا اور ایک روز معلوم ہوا۔ وہ شہر گئی ہے۔ سبھدرا نے بہت ڈانٹا، دھمکی دی، برا بھلا کہا تب لڑکی واپس لائی گئی اور بتایا کہ ہم نے اس کا نکاح کر دیا ہے۔

یہ غلط تھا وہ صرف ہمیں دھوکہ دیکر خاموش کر دینا چاہتے تھے۔ لعنت ملامت سنکر ان میں سے ایک نے راز فاش کر دیا۔ ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کا اخلاقی معیار اتنا پست ہے۔ دوسرے ہی دن اس کا شوہر آگیا اور اس نے ان سب کی خبر لی۔ بیوی کو بھی ٹھونکا اور رقیبوں سے بھی گتھم گتھا ہوئی۔ بھری برادری میں ان سب کو رسوا کیا۔ جو اس کی بیوی کو ہتھیانے کی فکر میں تھے۔ مگر وہ خوش تھا کہ اب کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔

دیہات کے سادہ لوح انسان اتنے بے رحم، مکار اور لچّے کیسے ہو گئے تھے؟ دوسروں کی بہو بیٹیوں کو اپنی بیٹی بہو سمجھنے والے دیہاتی دوسری قوم سے نہیں خود اپنی قوم سے بھی اپنی اخلاقی گراوٹ چھپا نہ سکے۔

شہر کے بیشتر حصوں میں پناہ گزین آباد ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے سب مکان ان سے بھرے پڑے تھے اور پرانی عمارتوں کے کھنڈر، قدیمی محلوں کے پھاٹک مٹھ، شوالے اور مسجدیں سب میں خانماں برباد بس رہے تھے۔ سارے شہر کے اسکول بند پڑے تھے۔ اور بچے گلیوں سڑکوں پر آوارہ گردی کر رہے تھے۔ آوارہ گردی کرنے والوں میں مقامی اور نئے آنے والے سب ہی بچے تھے۔ اگرچہ سوشل سروس والے لڑکے لڑکیوں نے شہر کے مختلف حصوں میں پڑھائی کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں شروع کر رکھا تھا، کیمپوں میں بھی چھوٹے چھوٹے اسکول چلائے جا رہے تھے مگر کہیں بوند ابوندی سے ندی بھرتی ہے میونسپل اسکول، گورنمنٹ اور پرائیویٹ اسکول زیادہ تر بند پڑے تھے اور ان کی عمارتوں میں شرنارتھی مقیم تھے۔

مگر اب آہستہ آہستہ اسکول کھلنا شروع ہوئے انھیں جبراً ان عمارتوں سے ہٹایا گیا۔ اور آنند پربت کی فوجی بارکوں اور دوسرے حصوں میں پہنچا دیا گیا۔

دیوان کینٹین، آنند پربت، بیلا روڈ اور کنگزوے کیمپ سب جگہ دیکھ کر تو ایسا لگتا تھا شاید ایک بھی ہندو یا سکھ پاکستان میں باقی نہ رہ گیا ہوگا۔ دسمبر تک تو خیر میں کیمپ کے علاوہ کہیں نہیں گئی اس لیے ان سب کا حال نہ دیکھ سکی تھی مگر جنوری سے میرا تعلق ان سے بھی تھا باڑہ کے اسکول اور تعلیمی مرکزوں کی توسیع کے سلسلہ میں مجھے بہت سے پناہ گزین عورتوں اور مردوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بچوں کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ ان کے کوارٹروں میں جا کر میں ان کی صبر آزما ہا ئش اور ناقابل بیان مصیبت کو بھی دیکھ چکی تھی۔

فروری شروع ہوتے ہی لڑکوں نے کوشش شروع کر دی تھی کہ مرکز کا دائرہ وسیع کیا جائے۔ بات یہ تھی کہ اسکول تو سارے بند پڑے تھے۔ جو چند کھلے تھے اور کھولے جا رہے تھے وہ سب رفیوجیز سے بھرے پڑے تھے۔ یہ خیال تو اس وقت کسی کے دل میں آتا بھی نہ تھا کہ کوئی نیا تجربہ کیا جائے اور ان دو خون کے پیاسوں کو مجبور کیا جائے کہ اکٹھا بچوں کو

پڑھنے بھیجیں۔ باڑہ ہندو راؤ میں پہلا تجربہ جامعہ والوں نے کیا اور کامیابی ہوئی اس کامیابی نے ہمت بڑھادی۔

سب سے زیادہ اس وقت قصاب پورہ کے لوگ پریشان تھے۔ اس لیے وہاں تعلیمی مرکز کھول کر بیچ بازار میں ترلوک سنگھ کی ڈیوٹی لگادی گئی۔ مسلم محلہ میں پہلا سکھ خود بھی گھبرایا ہوگا۔ اور محلہ والے تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے مگر اس گروہ پر سب کو بھروسہ تھا اس لیے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔

ایک ہفتہ کے اندر ترلوک سنگھ نے اتنا رسوخ پیدا کر لیا کہ دعویٰ کرتے تھے میری ایک آواز پر سارا محلہ نکل سکتا ہے۔ ایک دن قصاب پورہ کے ایک چرواہے نے جو سارے محلہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا عجیب حرکت کی اس نے آکر بیان کیا کہ میں سوگیا اور ساری بکریاں کوئی آکر ہانک لے گیا۔

لوگ ترلوک سنگھ سے کہنے لگے کہ ہم تو لٹ گئے۔ ایک دم سے ۴۰ بکریاں غائب ہوگئیں ہیں جلدی کوئی فکر کرو۔ ترلوک نے تلاش شروع کردی اور دوسرے دن اس باہمت لڑکے نے ساری بکریاں پڑوس کے محلہ سے بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے برآمد کرالیں۔

بکری کی کاف کو زبر کے ساتھ بولتے ہوئے میرے پاس آئے کہ "آپا جی۔ رات بھر بکریاں ڈھونڈھتا پھرتا رہا ہوں۔ آخر لے ہی آیا"

دوستوں نے اس کارنامہ پر خوب ان کی پیٹھ ٹھونکی اور قصاب پورہ کا تعلیمی مرکز ان کی زیر نگرانی ترقی کرنے لگا۔ ایک ماہ بعد دوسرا اور پھر تیسرا لڑکا اس کا انچارج ہوا مگر مرکز کے کرتا دھرتا وہاں کے کسی جھگڑہ میں نہیں پڑے۔ سب کے دوست رہ کر سوشل اور تعلیمی ترقی کی کوشش کرتے رہے۔

بہت ہی جلد تیسرا مرکز تعلیم پل بنگش پر بھی کھولا گیا اور اس طرح سارے علاقے کو گھیر کر تعلیمی مہم شروع کردی گئی۔

نٹنگ سنٹر کے سلسلہ میں مجھے عورتوں کا اعتماد بھی حاصل ہوگیا تھا اور اب اکثر وہ اپنی مشکلوں اور ضرورتوں میں مجھ سے امداد و مشورہ لینے آتی تھیں۔ لیکن افسوس یہ ہے میں ان کی کوئی قابلِ قدر امداد نہ کرسکی کیونکہ میرا تعلق نہ ریلیف کمیٹی سے تھا نہ ری ہیبلیٹیشن منسٹری سے۔ اور ان کی مشکلات کوئی فوری یا عارضی تو تھیں نہیں جو آسانی سے رفع ہوسکیں۔

چھوٹی موٹی مشکلیں رفع کردیتی تھی۔

انھیں دنوں کنگز وے کیمپ میں آگ لگ گئی۔ قدرت شاید ان دنوں صرف بربادیوں پر تلی ہوئی تھی۔ آگ آناً فاناً پھیلی اور شعلوں کی زبانیں چند منٹ میں ساری بچی کھچی پونجی نہینوں کی محنت اور گورنمنٹ کی امداد سب کو چاٹ کر صاف کر گئیں۔

جلی ہوئی جھونپڑیاں، جھلسے ہوئے کپڑے اور دھوئیں سے سیاہ برتنوں کے ڈھیر جابجا لگے ہوئے تھے۔ بچوں کا بلک بلک کر رونا، ماؤں کی آہیں اور ضعیفوں کی بے کسی دیکھ کر فرشتے بھی تڑپ اٹھے ہوں گے مگر انسان تو بڑا ہی بے رحم ہے اس نے ایسے وقت بھی اپنی بے دردی، خود غرضی اور سیاہ دلی کا مظاہرہ کیا۔

ایک عورت رو رہی تھی کہ جو کچھ گہنا زیور پاکستانی سکّوں سے بچا کر یہاں لائے تھے وہ پاپیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ میں نے پوچھا؟ کیا جل گیا؟ کہنے لگی نہیں جب آگ لگی ہے تو جلدی جلدی ہم سب اپنا سامان نکالکر باہر رکھنے لگے۔ ہم بھاگ دوڑ میں رہے اور یہاں چوروں نے ہاتھ مار دیا۔ کسی کے برتن اٹھ گئے، کسی کا بکس، کوئی گہنے کو رو رہا تھا تو کوئی کپڑے کو چور کہیں باہر سے تھوڑی آئے تھے، وہ بھی اسی کیمپ کے باشندے تھے، خود بھی مصیبت زدہ ہوں گے مگر اس میدان حشر میں بھی ان کو یہی سوجھی۔

سیکڑوں ایسے تھے کہ اب ان کو سر چھپانے کی جگہ، ایک وقت کی روٹی اور ایک جوڑا کپڑا حاصل کرنے کے لیے از سر نو ہی پاپڑ بیلنا تھے جواب سے تین ماہ پہلے جب وہ نووارد تھے کرنا پڑے تھے۔ ان چند دنوں میں جب سے پھوس، ٹین اور سمینٹ کی چادریں پڑ گئیں تھیں۔ ان کو ذرا سا سایہ نصیب ہو گیا تھا۔ اب پھر وہی سوا نیزہ پر آفتاب ہو گا اور اس کی تمازت سے چکراتے ہوئے، پگھلتے ہوئے ان کے سر۔

یہ دردناک حالت دیکھ کر تو میں پکار اٹھی۔ او خدا تو رحیم و کریم ہے۔ آخر تجھے اب تک کیوں ان پر رحم نہیں آیا۔ ۴۴ ہزار[۱] انسان ان کی مدد سوائے خدا کے کون کرسکتا ہے۔ وہی ان کی مصیبتیں کاٹے۔ انھیں میں سے ایک شخص وہ بھی تھا جو اپنے دس ہزار روپیوں کا ماتم کر رہا تھا اور کیمپ کمانڈر کہہ رہے تھے یہ آدمی راشن تو اب تک گورنمنٹ سے لیتا رہا ہے۔۔ دس ہزار روپیہ اس کے پاس کہاں سے آئے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ شاید

۱۔ کنگز وے کیمپ میں اس وقت ۴۴ ہزار شرنارتھی تھے۔

یہ دس ہزار اس نے پچھلی رات ہی کو کمائے ہوں اور پھر چور کے گھر چھوڑ آ گیا ہو؟

وہ اس وقت خدا سے مدد بھی نہیں مانگ رہے تھے بلکہ غصہ میں اس کو صلواتیں سنا رہے تھے۔ ان کے دل کی حالت سمجھنا کچھ دشوار نہ تھا۔ تکلیفوں نے اب ان برداشت کی طاقت ختم کر دی تھی اور اس واقعہ کے بعد مستقبل کا بھیانک چہرہ انھیں نظر آ رہا تھا۔ کہیں سے امید کی کرن پھوٹتی نظر نہ آتی تھی۔ پھر وہ کیوں نہ تڑپتے۔ جلد سے جلد ان سب کو شہر کے مختلف اسکولوں اور خالی کوارٹروں میں پہنچا دیا گیا اور ایک بار پھر وہ مہینوں بھلے دنوں کے انتظار میں وقت کاٹنے لگے آہستہ آہستہ خیمے مہیا ہوئے، جھونپڑیاں ڈالی گئیں، کوارٹر بنے اور کچھ دن بعد ان کو پھر ترتیب کے ساتھ کنگزوے کیمپ لایا گیا۔ اس وقت ان کی اندرونی، بیرونی بد ترتیبی انتہا تک پہنچ گئی۔ خدا ہی جانے کب تک ان کی زندگی کا یہ چکر چلتا رہے گا اور کب ایشور ان کی مدد کرے گا۔

شہر میں ہر طرف سے ان کی امداد ہو رہی تھی، مگر وہ سب دریا کے لیے قطرہ ثابت ہوتی۔ میں نے بھی سیونگ سنٹر کے تیار کیے ہوئے ۲۰ جوڑے آدمیوں کے لیے اور ۲۰ جوڑے چھوٹے بچوں کے دلوں گنتیں بھیج دیے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکی۔

فروری میں دو آدمی بھاگ کر ایک گاؤں سے مقبرہ ہمایوں کیمپ میں آئے اور انھوں نے اپنے منڈے سر پر لٹکتی ہوئی چوٹیاں دکھا کر مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا کر دیا۔ گروہ اکھٹے ہو ہو کر ان کی داستان سنتے اور پھر کیمپ کے ایک کونے سے دوسرے تک اس کو پھیلاتے۔

چند بڈھے دیہاتی ان دونوں کو میرے پاس لائے اور بیان کیا کہ مہرولی، نجف گڑھ اور نریلہ کے بہت سے گاؤں ایسے ہیں، جہاں مسلمانوں کو نکلنے نہیں دیا جاتا۔ ان کو جبراً شدھی کر لیا گیا ہے اور اس وقت بظاہر وہ ہندو بنے ہوئے موقع کے منتظر ہیں۔ ان سب نے ہم سے درخواست کی کہ جس طرح ہو سکے آپ ان کو وہاں سے بلوا کر پاکستان بھجوا دیجیے۔

میں نے کہا، بھئی یہ بات غلط ہے۔ میں تو تم سب کو منع کر رہی ہوں، ان کو پاکستان جانے کے لیے کیوں بلوانے لگی۔ ہاں یہ کر سکتی ہوں کہ کچھ عرصہ کے لیے جب تک حالات بالکل پر امن نہ ہو جائیں۔ ان کو دہلی بلوا لوں۔ اور پھر وہ اپنے گاؤں مہینہ دو مہینہ بعد واپس چلے جائیں۔ اس وقت مسلم زون میں مکان خالی ہیں لیکن امن ہوتے ہی انکو

پلٹ جانا ہوگا۔ وہ لوگ اس پر راضی ہو گئے۔

میری ناتجربہ کاری کہ اس دشوار کام کو اتنا آسان سمجھ بیٹھی۔ دونوں چوٹی والے تو بات پکی کر کے چلے گئے اور ہم نے حفاظتی گارد پولیس اور ٹرک بھیج کر ان دیہاتوں سے خوفزدہ مسلمانوں کو نکلوانا شروع کر دیا۔

واقعہ یہ تھا کہ برابر حیثیت کے مسلمان زمیندار اور کاشتکاروں کے چلے جانے پر ہندو بھائیوں کو اعتراض نہیں ہوا تھا بلکہ اکثر خود ہی نکالا تھا۔ لیکن مسلمان اہل حرفہ، بڑھئی، لوہار، تیلی وغیرہ کو انھوں نے جبراً روک رکھا تھا۔ اگر وہ چلے جاتے تو ان کے ہل بیل کون ٹھیک کرتا۔

یہ لوگ شہر میں آکر بیکار بھی ثابت نہ ہوتے۔ جس جگہ ٹھہرتے، محنت کر کے کھا کما نکلتے تھے۔ مگر یہ سلسلہ شروع ہو گیا تو پھر بڑھتا ہی جا رہا تھا اور جمعیۃ میں اب ایسے دیہاتوں سے بھی درخواستیں آ رہی تھیں جہاں کئی کئی سو آدمی شدھی تھے۔

ایک طرف مسلمانوں کا اصرار تھا کہ ایک بھی شدھی ہو جانے والا مسلمان دیہات میں باقی نہ رہنے پائے ادھر حکومت نے پولیس اور ملازمین کو ہدایت کر رکھی تھی جو آنا چاہے اس کو جبراً کوئی روک نہ سکے۔ مظلوم کی ہر ممکن مدد کی جائے۔ ہدایت تو پہلے سے تھی مگر اب کچھ دنوں سے اس پر عمل ہو رہا تھا۔ دراصل ہدایت تو یہ تھی کہ جو رہنا چاہے وہ بلا تبدیل مذہب کے بے خطر رہ سکتا ہے۔ کسی کو زبردستی نکالنے کا حق نہیں۔ اسی حکم کو عملی جامہ اس طرح پہنایا گیا تھا کہ افسران محصل نے اپنی موجودگی میں ۸ھ گاؤں کی پنچایت کرا کے دو سالم گاؤں شدھی کرا دیے اور مقامی حکومت نے ان کو کارگزاری کی سند بھی عطا کر دی کہ اس علاقہ میں انھوں نے امن قائم رکھا اور وہاں کا ایک آدمی بھی بھاگا نہیں نوکر شاہی اس زمانے میں بھی پرانی ذہنیت اور قدیمی چالیں چل رہی تھی۔

ایک گاؤں کے لوگوں کو لینے میں خود گئی۔ وہاں کسی قدر جھگڑے کا اندیشہ تھا۔ آدمیوں کی تعداد بھی پچاس ساٹھ تھی۔ ایس۔ پی معہ پولیس پارٹی کے ہمراہ تھا اور دو تین ساتھی ہمارے اپنے تھے۔ پولیس نے گاؤں گھیر لیا اور آواز دیتے ہی سارے مسلمان اکٹھا ہو گئے۔ صرف تین نے آکر کہا کہ ہم ہندو بن چکے۔ اب نہ گاؤں چھوڑنا چاہتے ہیں نہ مذہب۔ ہمیں ان سے کوئی تعرض نہیں کرنا تھا۔ بس جبر یہ کچھ نہ ہونے پائے۔ خوشی خوشی جس کا جو دل چاہے کرے۔ یہی ہمارا اصول تھا۔ جان کے ڈر سے سہمے ہوئے لوگ جو اندر ہی اندر

سازش کر رہے ہوں ہمارے نزدیک ملک وقوم دونوں کے لیے خطرناک تھے اور انصاف وانسانیت کے خلاف جو چیز ہو اس کے لیے لڑنا ہمارا فرض تھا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں۔ ہمارا اندازہ کتنا غلط تھا۔ اتنا اہم اور مشکل کام اور اسے ہم آسان سمجھ بیٹھے تھے۔ چلنے کا ارادہ کیا تو عجیب عجیب سوال سامنے آئے۔ ان کے مکان تھے جن پر انھوں نے کافی رقم صرف کی ہو گی۔ مگر دیہات میں نہ وہ کرایہ پر دیے جا سکتے تھے نہ بک سکتے تھے۔ ان کی زمین تھی۔ گاؤں سے نکل کر وہ کیسے اس کو اپنے قبضہ میں رکھ سکیں گے۔ جانور تھے جن کے چوتھائی دام اس وقت مل رہے تھے اور ان کو مجبوراً بیچنا پڑ رہا تھا۔

اور سب پر مستزاد وہ ازلی وابدی قرض تھا، ان دنوں جو کسان کے ماتھے پر تقدیر جنم دن سے لے کر موت تک کے لیے لکھ دیتی تھی۔ سب کے سب مقروض تھے اور مہاجن کھاتے کھولے ہوئے بیٹھے تھے کہ یہ ایک تنکا یہاں سے نہ لے جانے پائیں۔ اس کے علاوہ شادی بیاہ کے نیوتے بھی قرض ہی کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی ادائیگی بھی اتنی ہی ضروری ہوتی ہے۔ اس وقت وہ حساب کتاب بھی ہو رہا تھا "کہ تیرے بھیّا کے بیاہ پر میں نے اتنا دیا تھا۔ میرے یہاں تو ابھی کام کاج کی نوبت بھی نہیں آئی ہے۔"

خوش قسمتی سے ہمارے ہمراہیوں میں ایک کانگریسی وکیل صاحب بھی تھے۔ ان کی قانون دانی اس وقت کام آ گئی۔ انھوں نے باقاعدہ سن تاریخ دیکھنا شروع کر دی۔ کتاب کھل گئی اور بے ایمانیاں ظاہر ہونے لگیں۔ بہت سے قرضے جو کالعدم ہو چکے تھے، ظاہر ہو گئے۔ یوں تھوڑی سی گلو خلاصی ان کی ہوئی۔ مکان زمین کی کوئی قیمت ہی اس وقت نہ تھی۔ گائے، بیل، بھینس، سب اس وقت نوچ لینے کی خواہش تھی۔ وہ پوری نہ ہو سکی۔ وکیل صاحب کی سوجھ بوجھ اور پولیس افسر کی ڈانٹ ڈپٹ نے کچھ پیسے ان جلا وطنوں کی جیب میں بچا ہی دیے۔ شادی میں دیا ہوا نیوتہ بھی بیباق ہوا۔

میں سوچ رہی تھی۔ یہ مشکلات اب ان کو مجبور کر دیں گی کہ جانے سے انکار کر دیں مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ بدستور تیار رہے۔ ادھر بنئے اپنی تنگ نظری کا مظاہرہ کر رہے تھے، بس میں نہ تھا کہ بدن سے کھال تک اتروا کر رکھا لیتے؛ ادھر بچے سب کے سب آ کر ٹرک میں بیٹھ گئے تھے۔ ہندو مسلمان بچے پاس پاس بیٹھے ہوئے اس انداز سے ہنس رہے تھے جیسے میلہ دیکھنے جا رہے ہوں اور نہ جانے والوں کو افسوس ہے۔ للچا رہے ہیں کہ

ہم بھی چلتے۔

ایک طرف جوان عورتیں گلے لپٹ کر اپنی سہیلیوں سے رخصت ہو رہی تھیں۔ ہندو مسلمان دو بڑھیاں ایک دوسرے سے مل کر زور زور سے بین کر رہی تھیں۔ ٹرک کے پاس کئی جوان لڑکیاں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے سسکیاں بھر رہی تھیں اور ایک بڈھا کسان سامنے لگے ہوئے چنے کے کھیت کو دیکھ دیکھ کر آنسو پونچھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا یہ جو سامنے کیکر کا پیڑ ہے۔ یہ میں نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ چنا کتنا اونچا ہو چکا ہے۔ تیاری کے قریب ہے۔ کیا پتا اب اسے کون کاٹے گا۔

یہ دردناک سین دیکھ کر میں ضبط نہ کر سکی۔ میں نے پولیس آفیسر سے کہا "یہ بہت ہی سخت کام ہے بس آئندہ آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گی۔ کسی دوسرے کو منتخب کرا دونگی۔ یہ الوداعی منظر دیکھنا میری طاقت سے باہر ہے۔"

کسان درودیوار سے مل کر رخصت ہوئے اور درخت سے ٹوٹے ہوئے پتہ کی طرح شہر کی گلیوں میں سوکھنے کے لیے بکھیر دیے گئے۔ دوبارہ میں ان سے پھر ملی۔ بہت کچھ ڈھارس بندھائی مگر ان کے دلوں کی ہوک نہ مٹا سکی۔ کچھ دن بعد میں نے سنا کہ دھرتی کی محبت انھیں نظام الدین کھینچ لے گئی اور وہاں بھی مایوسی ہوئی۔ یہی لالچ ان کو پاکستان لے گیا۔ پتہ نہیں یہ آرزو وہاں بھی پوری ہو سکی یا مر کھپ گئے۔

اس ایک تجربہ نے ہمیں بہت بڑا سبق دیا۔ ہم ان کو مطمئن نہ کر سکے۔ ان کو پاکستان جانے سے روک نہ سکے۔ ان کو پھر ایک ماہ بعد وطن واپس نہ لوٹا سکے اور ایک بھرے گاؤں کو اجاڑنے کا باعث بھی ہمیں ہوئے۔ اپنی اس بہت بڑی غلطی پر مجھے اب تک افسوس ہے لیکن شاید اس کے سوا اور کوئی حل بھی نہ تھا۔

10

تاریکی اور روشنی

مارچ شروع ہوگیا اور کیمپ اب ناقابل حل مسئلہ بن کر رہ گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، اس کو کیسے ختم کیا جائے۔ عام لوگ نہ اب جھگڑا کرنا چاہتے تھے، نہ مارکاٹ مچانا چاہتے تھے۔ انھوں نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا تھا اور امن و فساد دونوں کے نقصان و فائدے سے واقف ہو چکے تھے۔ سنگھیوں اور آر ایس ایس کے خلاف عام نفرت و ناخوشی پھیلی ہوئی تھی اور وہ سمجھ رہے تھے کہ پے در پے غلطیاں کرتے رہنے سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

لیکن لوکل گورنمنٹ اب تک اس پر تلی ہوئی تھی کہ دلی صوبہ مسلمانوں سے صاف ہو جائے۔ اس کے لیے وہ طرح طرح کی چالیں چلتے رہتے تھے۔ انھوں نے اس معاملہ میں لیگ والوں سے بھی ساز باز کر لیا تھا اور کچھ خود ساختہ لیڈر بھی اپنے ساتھ لگا رکھے تھے۔

انھیں میں ایک دیہات کا ریٹائرڈ لفٹیننٹ بھی تھا، جو حکام کا بڑا منھ لگا تھا... اور تقریباً سب سے اس کا یارانہ تھا۔ بہت سے گاؤں کو خالی کرانے کا ذمہ دار ہم اس کو سمجھتے تھے۔ اپنے گاؤں کا ذی اثر ہونے کے علاوہ اسے پاکستان آفس میں بھی اچھا رسوخ حاصل تھا۔ جسے چاہتا پاس دلوا دیتا، جس کی چاہتا زمین کا تبادلہ کرا دیتا۔ ایک گاؤں کی تیرہ ہزار بیگہ زمین جو ایک بڑے [۱] افسر نے اپنے اعزہ کی پاکستان میں چھوڑی ہوئی ۸۰ ہزار بیگھ زمین سے بدلی تھی وہ ساری بات چیت اسی کی معرفت ہوئی تھی۔

وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ شاید حرص نے اس کی آنکھیں اندھی کر دی تھیں؟ شاید وہ اپنے اعزہ اور ساتھیوں کی جان مال یہاں غیر محفوظ سمجھ رہا تھا یا مستقبل تاریک دیکھ کر

۱۔ مسٹر رندھاوا۔

اس نے فلاح کی یہی راہ سوچی تھی؟ لوگ کہتے تھے کہ اس کو پاکستان گورنمنٹ نے دتی صوبہ کے بہترین کاشت کار پاکستان بھیجنے کے لیے لکھا ہے۔ اور پاکستان گورنمنٹ دنیا پر یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ ہندوستان سے سب مسلمان نکل آئے۔ لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ ہمارے پاس ثبوت ہی کیا تھا۔ صرف قیاس آرائیاں تھیں اور مشاہدات، ہم میں سے کچھ کا خیال تھا صرف حکام پرستی اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے اور اس میں بہت کچھ اصلیت بھی تھی۔ وہ بیک وقت دونوں حکومتوں اور عوام سب کا ہمدرد اور مشکل کشا بن بیٹھا تھا اور اس کی پیٹھ پر رکھا ہوا ایک بڑا سا ہاتھ ہمیں ہر وقت نظر آیا کرتا تھا۔

میرے نزدیک وہ خود کچھ بھی نہ تھا۔ نہ اس جیسے بہتیرے لوگ کچھ تھے۔ وہ تو صرف ہم کو زک دینے ہماری راہ میں رکاوٹ ڈالنے اور ہمیں ناکام بنانے کے لیے کٹھپتلیاں دیکر سامنے لائے جاتے تھے۔ بذات خود ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ پس پردہ جو عقل کام کر رہی تھی اصل لڑائی تو ہماری اس سے تھی۔

ایک دن وہ کیمپ کے دروازے پر مجھے مل گیا۔ میں نے کہا۔ دیکھو تم روز روز آگران کو نہ بھڑکاؤ۔ جب بھی یہ سب واپس جانے پر تیار ہوتے ہیں، تم کسی نہ کسی کا پیغام، وعدہ، یا حکم لے کر آجاتے ہو۔ ان کی تباہی کے ذمہ دار تم ہو۔ تمھیں نے ان کو گاؤں سے اجڑوایا اور اب سوچنے بھی نہیں دیتے ہو۔

اس نے کہا۔ میں ان کے لانے سے انکار نہیں کرتا لیکن میں نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا بھلا اسی میں دیکھا اور اب تو گاؤں واپس جانے کا کوئی سوال ہی باقی نہیں ہے۔ زمینوں کا تبادلہ ہو چکا۔ جب چیز ہی ہماری نہ رہی تو کہاں جائیں۔

میں نے پوچھا اور یہ سب ہوا کس کے حکم سے۔ میں تو دریافت کر چکی۔ گورنمنٹ کو کچھ خبر نہیں ہے پرائم منسٹر تک اس سے لاعلم ہیں۔

اس نے جواب دیا سب کو پتہ ہے۔ مقامی گورنمنٹ[1] نے خود کرایا ہے۔

میں نے چاہا کہ وہ لکھا پڑھی کسی طرح ہاتھ آجائے اور ایک ثبوت مہیا کرکے میں کوشش کروں لیکن کسی طرح پیش نہ گئی۔ خبر تو بہت دنوں سے سن رہی تھی۔ دوسرے زمینداروں

عا۔ دراصل گورنمنٹ کا لفظ غلط تھا۔ صرف دتی صوبہ کا افسر اعلیٰ ذمہ دار تھا۔

کا مجھے اعتبار نہ تھا مگر آج تصدیق ہو گئی۔

چار مرتبہ ناکام ہونے کے بعد ہم سب جھلا اٹھے۔ کوئی حد ہے۔ جب بھی معاملات اس مرحلہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ طے ہو جائیں تب ہی یہ کبھی پاکستان آفس کی طرف سے کبھی اپنے ہمدرد حکام کی طرف سے کوئی نہ کوئی نئی ہدایت یا خوش خبری لے کر آجاتا ہے۔

اور اس جھلاہٹ میں ہم نے اسسٹنٹ کمانڈر اور کیمپ کمانڈر سے کہا کہ اب اس کو کیمپ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دو۔

ایک دن بعد گئی تو معلوم ہوا کہ وہ مع فیملی کے کیمپ میں مقیم ہو گیا ہے۔ ہمیں مجسٹریٹ کا خط دکھایا گیا کہ اس کو اندر قیام کی اجازت دی جائے۔

دوسرے دن میں کیمپ کے باہر کھڑی اس قافلہ کو دیکھ رہی تھی جو شہر سے آ آکر عیسیٰ خاں کے مقبرہ میں جمع ہو رہا تھا، اتنے میں مجسٹریٹ صاحب بھی آگئے۔

میں نے پوچھا۔ کیا پاکستان گورنمنٹ نے دلی والوں کو بھیجنے کی اجازت دیدی ہے۔ اس سے پہلے تو آپ کہتے تھے کہ وہ لوگ ان کو لینا نہیں چاہتے۔

کہنے لگے نہیں صاحب دلی والوں کی اجازت نہیں ہے مگر یہ دیکھئے پنجاب کے گاؤں والوں کے لیے اجازت نامہ آیا ہے۔ لکھا ہے کہ ان کے لیے ٹرین کا بندوبست کر دیا جائے۔

دوسرے دن گاڑی جانے والی تھی اس لیے اب تک بہت سے لوگ آچکے تھے مجھے ان سے باتیں کرتے دیکھ کر کافی آدمی کھڑے ہو کر باتیں سننے لگے۔ ان میں سے ایک نے چیخ کر کہا۔

"کیا دلی والوں کو اجازت نہیں ہے۔"

مجسٹریٹ نے جواب دیا۔ ہاں اور وہ کہتے ہیں کہ معاہدہ تو مشرقی... اور مغربی پنجاب کے تبادلہ کا تھا۔ ہر صوبہ سے اتنا آدمی پہنچ گیا ہے کہ اب گنجائش نہیں ہے۔ اتنا چھوٹا سا تو پاکستان ہے۔ آخر کہاں تک لوگ اس میں سمائیں گے۔

دلی والا بھنا کر بولا: "تو پھر اس کمبخت نے اتنا چھوٹا پاکستان بنایا کیوں تھا جو اس میں ہماری جگہ نہیں ہے۔" مجسٹریٹ قریب آکر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے "اس بدمعاش لفٹیننٹ کو بتائیے سب کیا دھرا اسی کا ہے۔ چہرہ پر طنز اور مضحکہ کی... کیفیت تھی۔ طبیعت جل ہی تو گئی۔ مکاری کی حد ہو گئی۔" چور سے کہو چوری کر اور شاہ سے کہو

ہوشیار رہنا۔" میں نے کہا اسے اندر داخلہ کے لیے پاس دینے کو میں منع کر چکی تھی مگر آپ نے اس کو مستقل قیام کی اجازت دلوادی ہے اور پھر اسے بدمعاش بھی کہتے ہیں!

کھسیانے ہو کر بولے۔ میں نے۔ میں نے!!؟

"جی ہاں آپ نے، آپ کی تحریر موجود ہے" میں نے کہہ ہی دیا اور وہ دوسری طرف مڑکر اوروں سے بات کرنے لگے۔ اس طرح اپنی شرمندگی مٹائی۔

فروری اور مارچ کیمپ کے پناہ گزینوں پر بہت سخت گزرے۔ پولیس والے اب لوٹنے کی کم ہی ہمت کرتے تھے۔ ان کی خالی جیبوں کو ٹٹولنے والے اب خود ان کے بھائی بند تھے۔ کیمپ میں اب ظفر خاں کا راج تھا۔ انھوں نے اور ان کے بھائی نے مختلف کام کرا دینے کے وعدہ پر لوگوں سے خوب روپیہ وصول کیا۔ دونوں نے اپنی بدمعاشیوں کی تکمیل کے لیے کیمپ پولیس کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ان کے ذریعہ وہ جوا کھیلنے کا الزام لگا کر لوگوں کو گرفتار کراتے، بالاخانے پر انھیں قید کیا جاتا اور ان کے ساری پونجی چھین کر انھیں رہائی دی جاتی۔

ایک دن میں گئی تو دیکھا کہ تانبے کے دو نقشیں گلاسوں میں پھول لگائے ہوئے صاف میز پوش پڑا ہوا ظفر خاں دربار لگائے بیٹھے ہیں۔ میز پر طرح طرح کے زیورات کی ڈھیری لگی ہوئی ہے۔ کچھ بکس بھی کھلے پڑے ہیں۔ مجھے اچانک دیکھ کر ایک لمحہ ٹھٹکے پھر کہنے لگے دیکھئے آپا جان۔ بہت سے لوگ ریل پر چڑھتے وقت اپنا سامان بھول گئے ہیں۔ یہ سونے چاندی کے زیورات ہیں۔ برتن کپڑے سب ہی چیزیں ہیں۔ بتائیے ان کا کیا بنایا جائے۔

میں نے ناگواری سے کہا یہ سب کچھ گودام میں محفوظ تھا تو تم نے نکلوایا کیوں۔ پرائی چیز کا تم کیا بنا سکتے ہو۔ بولے دیکھ رہا ہوں کیا کیا چیزیں ہیں۔ آپ ان لوگوں میں تقسیم کر دیجیے۔ کچھ لوگوں کو میں نے دیا ہے باقیوں کو آپ بانٹ دیجیے۔ آخر اسے رکھ کر کیا ہوگا۔

میں نے سختی سے کہا ظفر خاں تمھیں ان چیزوں کی تقسیم کا کوئی حق نہیں ہے۔ ممکن ہے جن کا سامان چھوٹ گیا ہے وہ ہمیں خط بھیجیں۔ گاڑیاں جاتی ہی رہتی ہیں۔ ان کا سامان دوسروں کے ساتھ بھیجا جا سکتا ہے۔ مجھے بتاؤ۔ کس کو دیا ہے۔ میں ان سب سے واپس لوں گی۔

نام پوچھتی ہوں تو اسپتال کے ڈاکٹر، داروغہ گودام، مہتمم راشن نہ معلوم کتنے پیٹ

بھرے مستحقین چیزیں چھانٹ کرلے جا چکے تھے۔ میرے برا بھلا کہنے اور شرمندہ کرنے پر دو ایک نے واپس کیا اور کچھ نے واپس دینے کا وعدہ کیا۔ پتہ نہیں انھوں نے خود کیا لیا تھا، یہ بھلا کیسے معلوم ہوتا۔ البتہ شرمندہ ہوئے تو کہنے لگے۔ میں خود ہی چاہتا ہوں مگر کیا کروں یہ لوگ اتنے حریص ہیں خوشامد کر کے لے گئے۔

سامان بکسوں میں بھروا کر تالا ڈلوا دیا اور والنیٹر سے کہا کہ اسے میرے ساتھ کر دو۔ جہاں دوسرے پناہ گزینوں کا سامان رکھا ہے وہاں رکھوا دوں گی۔ اتفاق دیکھئے اس دن چھوٹی کار تھی، بکس اس میں نہ رکھے جا سکے اور مجبوراً دوسرے دن پر ملتوی کرنا پڑا۔ مگر پھر تو وہ ہفتوں ٹالتے رہے اور کسی طرح بکس نہ دیے۔ اللہ ہی جانے کس غریب کا مال تھا اور اس نے کتنی مصیبت اٹھائی ہوگی کسی ایک کا تھا بھی نہیں۔ بہت سے آدمیوں کا سامان تھا۔ اور نام و پتہ معلوم نہ ہو سکا۔

ایک روز خبر آئی کہ کیمپ میں گولی چل گئی اور ایک آدمی مر گیا گھبرائی ہوئی پہنچی تو معلوم ہوا کہ بہت سے دیہاتی میدان میں جمع ہو کر صلاح مشورہ کر رہے تھے اور وہی سب کا گرو لیفٹیننٹ اس میں تقریر کر رہا تھا۔ بس پولیس نے گھیر لیا۔ کسی نے نکل بھاگنے کی کوشش کی اور اتفاقیہ گولی چل گئی[1]۔

ظفر خان نے بیان کیا کہ میں سب کو آپ کے کہنے کے مطابق سمجھا بجھا کر راہ راست پر لا رہا تھا مگر لیفٹیننٹ نے سارے دیہاتیوں کا جلسہ بلا لیا اور میں نے پولیس والوں سے کہہ دیا کہ جا کر گھیر لو۔ جلسہ یہاں نہ ہونا چاہیے۔ لوگ کچھ نہیں بھاگنے لگے بس گولی چل گئی۔

لیکن جب میں نے تحقیقات کی تو یہ سب کچھ غلط ثابت ہوا۔ واقعہ یہ تھا کہ اکبارگی کیمپ میں خبر اڑ گئی تھی کہ اب کوئی گاڑی پاکستان نہ جائے گی۔ یہ تو یقینی تھا کہ حکام کی مدد اور ان کے لیڈر کی کوشش سے تہاڑ والوں کو تو پاکستان سے اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے لوکل گورنمنٹ نے لیفٹیننٹ کو کراچی جانے کی آسانیاں مہیا کیں اور وہ وہاں سے حق تسلیم کرا لایا۔ مگر یہ ان کی خوش فہمی تھی یا لیفٹیننٹ کی ڈینگ۔ بہر حال سب دیہاتیوں کو تو جانے کی اجازت ملی نہ تھی اس لیے وہ پریشان تھے۔ انھوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور کچھ ایسی صورت پیدا ہوئی کہ برادری کی سمبندھ سے مجبور ہو کر بہت سے تہاڑ

---

[1] پولیس کے بیان کے مطابق۔

والے بھی اس پر مجبور ہو گئے کہ جب تم سب نہیں جاتے ہو تو ہم جا کر کیا کریں گے۔ دوسری طرف کرتا دھرتا زمین کے تبادلہ کی وجہ سے پریشان تھے۔

لیفٹیننٹ پریشان ہو گیا۔ آج اس نے جلسہ اسی لیے کیا تھا اور یہی تقریر کر رہا تھا کہ تم کو اپنی بات سے پھرنا نہ چاہئے۔ اچھی طرح سوچ لو۔

ظفر خاں کو اس مشورہ میں شریک نہیں کیا گیا۔ شاید یہی بات ان کو بری لگی ہو یا کوئی اور وجہ ہو۔ انھوں نے ملٹری والوں کو اکسا دیا اور یہ الزام لگایا کہ لیفٹیننٹ بغاوت پھیلا رہا ہے۔ گورنمنٹ کے خلاف تقریر کر رہا ہے۔ یہ بالکل جھوٹ اور فراڈ تھا مگر اس کی تردید کرنے والا اب یہاں کون بیٹھا تھا۔ فوجیوں کو ساتھ لے کر خود پہنچے اور نالی بجائی کہ گھیر لو مجمع گھر گیا۔ اور لوگ گھبرا کر بھاگنے لگے۔ ایک آدمی سرکل سے نکلا تھا کہ اس کو گولی لگ گئی۔ یہ سخت قدم فوج کو اس لیے اٹھانا پڑا کہ مجمع باغیانہ تھا۔ لوگ بری طرح پریشان اور سہمے ہوئے تھے۔ عورتیں بیٹھی ہوئی سرکار کو کوس رہی تھیں۔ پھر تو دو دن تک آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ جسنے سنا وہی آیا مگر مقتول کے ورثار کی کوئی امداد نہ ہو سکی۔

میں نے دیکھا کہ لیفٹیننٹ بالاخانہ پر منقید تھا۔ دائیں بائیں فوج کے نوجوان تھے۔ اس نے اوپر سے مجھے پکارا۔ سلام کیا۔ ایک شخص اس کا کھانا لیے اوپر جا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ غرایا۔ کوئی ضرورت نہیں۔ میں کھانا نہ کھاؤں گا۔ لوگوں نے بتایا اس نے رات کو بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔ مجھے ذرا یہ عجیب سی بات معلوم ہوئی کہ کیمپ کا ایک ورکر لوگوں کو قید بھی کرا سکتا ہے۔ پوچھا کہ تم نے اسے قید کیسے کر دیا۔ جواب دیا کہ بغاوت کے الزام میں اور داد طلب نظروں سے مجھے دیکھا لیکن میں نے الٹے انھیں کو ڈانٹا۔

میں سب سمجھ اور جان گئی تھی۔ اس لیے ارادہ ہوا کہ اب سارا معاملہ حکام کے گوش گزار کر دوں۔ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ ان دو بدمعاشوں کی بدولت سینکڑوں مصیبت زدہ تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ صورت حال خطرناک تھی۔ سارے پناہ گزینوں میں برہمی پھیلی ہوئی تھی اندیشہ تھا کہ کسی وقت بھی تشدد کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

علماء۔ لیڈر۔ ورکر۔ حکام اور معززین سب ہی آئے۔

دوسرے دن علی الصبح خبر ملی۔ لیفٹیننٹ پاکستان روانہ ہوگیا اور ایک ذمہ دار مقامی آفیسر کے حکم سے وہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ لے کر سدھار گیا۔

ظفر خاں سمجھ رہے تھے کہ "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی"۔ بہت جلد ہم لوگ ان کی حرکتوں کا بھانڈا پھوڑ دینے والے ہیں۔ الزامات کی فہرست قریب قریب تیار تھی کہ ایک روز خبر ملی وہ غائب ہو گئے۔

واقعہ یہ تھا کہ ادھر جلد جلد گاڑیاں جا رہی تھیں۔ کیمپ کو ختم کرنا تھا۔ پناہ گزینوں کو سوار کرانے وہ حسب معمول اسٹیشن گئے اور دو والنٹیر اپنے خیمہ پر تعینات کر گئے کہ شاید عورتوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو یا وہ گھبرائیں ذرا خیال رکھنا۔ اس چالاکی کی ضرورت ان کو اس لیے پیش آئی کیونکہ وہ مشتبہ ہو چکے تھے کہ ہم لوگ آسانی سے ان کو جانے نہ دیں گے، وہ دیکھ رہے تھے کہ سب اس پر تلے ہوئے ہیں کہ کچھ دن ان کو یہاں جیل کی ہوا کھلائیں۔ والنٹیر غریب چار گھنٹے خیمہ پر پہرہ دیتے رہے۔ صبح سے دوپہر ہوئی اور وہ بھی ڈھلنے لگی۔ تب وہ گھبرائے کہ اندر سے تو کوئی آواز تک نہیں آرہی ہے۔ ماجرا کیا ہے؟ جھانک کر دیکھا تو آدمی نہ آدم زاد۔ وہ اب تک خالی خیمے کی حفاظت کرتے رہے تھے۔ دوڑ کر ساتھیوں سے کہا۔ تلاش کی تو پتہ چلا۔ وہ تو ریل پر سوار ہو گئے اور سب کو بے وقوف بنا گئے اور ہماری تحقیقات مکمل ہو کر بھی نامکمل رہ گئی۔ سبھدرا کو اس ہار کا بہت رنج تھا۔ وہ بڑے وثوق کے ساتھ کہتی تھی "یہ مریں گے" دیکھ لینا ضرور مریں گے، لیفٹیننٹ ان سب کو مروا دے گا۔

میں شاید یہ ذکر کرنا بھول گئی ہوں کہ ایک روز کیمپ میں منسٹری کے ایک مسلم رکن بھی آئے تھے۔ اور انھوں نے کہا میں تم سے صلاح مشورہ کرنے نہیں آیا ہوں گورنمنٹ کا حکم سنانے آیا ہوں کہ اپنے اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ حکومت تمھاری حفاظت کا پورا بندوبست کرے گی اس پر دو چار سرغنہ لوگ ان سے بحث و مباحثہ کرنے لگے تھے۔ ان کا شاعرانہ دماغ بھلا یہ حجت کہاں برداشت کر سکتا تھا۔ بہت ہی غصے میں یہ کہہ کر چلے گئے۔ نہ جاؤ تو جہنم میں جاؤ۔

جلدی جلدی دو تین گاڑیاں پاکستان روانہ ہوئیں اور میدان خالی ہو گیا۔ کیمپ ختم ہوا اور ہمیں یکسوئی نصیب ہوئی۔

میں اس سے پہلے ذکر کر چکی ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے مصیبت زدوں سے جو حالات معلوم ہوئے وہ ایک دوسرے سے اتنے ملتے جلتے تھے کہ بعض وقت ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ کیا اسکیم کا مصنف کوئی دوسرا تھا جس نے دو کاپیاں تیار کر کے ایک ایک

دونوں ملکوں کے حوالہ کردی اور دونوں جگہ اسی پروگرام پر عمل ہوا۔ کلکتہ اور بہار وغیرہ میں حالات یہاں سے قدرے مختلف تھے۔ اور دوسرے طریقوں سے وہاں غنڈہ گردی ہوئی۔ مگر دہلی اور پنجاب کے دونوں حصوں میں ہنگامہ کی نوعیت اور مقاصد بالکل ایک جیسے تھے۔ دونوں جگہ پہلے ہندو راج اور مسلم حکومت کا پرچار کیا گیا۔ پولیس اور مقامی حکام نے پروپیگنڈے اور کارروائی میں پورا حصہ لیا۔ اور جو کچھ کیا گیا حکومت کے نام سے کیا گیا لوگوں کو یقین دلایا گیا کہ انڈین گورنمنٹ اور پاکستان گورنمنٹ دونوں کی مرضی یہی ہے کہ اقلیت کی جان و مال کو غیر محفوظ قرار دے دیا جائے۔ حکام علی الاعلان اس کا اظہار کرتے تھے۔ عدالتوں میں اب بھی یہی جواب دیا جاتا تھا۔

اور پھر اقلیت کو خوفزدہ کر کے مجبور کیا گیا کہ گاؤں اور محلے خالی کر کے کسی ایک ٹھکانے کیمپ میں جمع ہو جائیں۔ گاؤں کے باشندوں کو ایک بڑے گاؤں سے بھی یہ کہہ کر نکالا جاتا کہ کبھی اب تمھارا بچانا حکام کے بس کی بات نہیں ہے اس لیے جہاں سینگ سمائے بھاگ جاؤ یا چلو ہم تمھیں حفاظت کے ساتھ شہر کے کیمپ میں پہنچا دیں۔ وہاں سے دوسرے ملک سرحد پار چلے جانا۔ یا بتایا جاتا کہ گاڑی لگ گئی ہے۔ اسٹیشن چلو۔ بے یار و مددگار انسان مایوسی کے عالم میں پیدل۔ گھوڑے ریڑی اور بیل گاڑیوں پر چل پڑتے۔ بچی کھچی جمع پونجی ساتھ لے لیتے اور ان کو کوئی ساتھ لینے سے اس وقت منع بھی نہ کرتا تھا لیکن بمشکل دو تین فرلانگ آگے جاتے ہی ان پر حملہ ہو جاتا۔ ہزاروں درندے لاٹھی، بلم، بندوق اور کرپانوں سے مسلح ہو کر ان پر پل پڑتے۔

اس سلسلے میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب یہ قافلہ روانہ ہوتا اس وقت پولیس ساتھ ہوتی تھی مگر وہ تھوڑی ہی دیر بعد ایسے موقع پر ضرور پیچھے رہ جاتی۔۔۔ تھانیدار صاحب یا ڈی ایس پی صاحب کا پہنچنے کا وعدہ ہوتا تھا مگر کسی ضروری کام کی وجہ سے وہ اس وقت نہ آپاتے اور یہاں سب کچھ ہو جاتا۔

سامان لٹتا، بدن کے کپڑے تک اتار لیے جاتے۔ خاص طور پر عورتوں کا لباس اتارنا ضروری تھا۔ بوڑھے بچے سب بے دریغ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو جاتے۔ اور بھاگنے والے پولیس یا فوج کی گولیوں کا نشانہ بنتے تھے۔ اور پھر گھوڑے دوڑاتی ہوئی فوج آجاتی۔ چند ایک کو بچا کر افسران سے نیک نامی کا پروانہ حاصل کر لیا جاتا۔ زخمی اسپتال اٹھ جاتے۔ لاشیں ٹھیلوں میں بھر کر کھڈوں یا دریاؤں میں پھینک دی جائیں۔ یا پٹرول ڈال کر پھونک دی جائیں اور جوان

عورتیں، کنواری لڑکیاں بطور مال غنیمت کے حملہ آوروں اور پولیس وفوج کے جوانوں میں تقسیم ہو جاتی تھیں۔ حکام کا بھی حصہ لگتا تھا۔ نگران کی قیمتی امانت کسی ذیل دار نمبردار یا پٹواری کے پاس بحفاظت رکھا دی جاتی اور جب تک افسر صاحب کا جی نہ بھرتا۔ لطف اندوز ہوتے اس کے بعد امین کو حق تھا کہ اس کو بیچ کر پیسہ کما لے۔

یہ تھے وہ ہتھکنڈے جن پر ہندوستان پاکستان دونوں جگہ عمل کیا گیا۔ خود دہلی کا یہ حال تھا کہ وہی مشینری جو آج کل پھونک پھونک کر قدم دھر رہی ہے، ہنگامہ کے دنوں میں تیزی کیساتھ متحرک تھی۔ حکام برابر صوبہ کا دورہ کرتے تھے اور لوگوں کو یقین دلاتے تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں حکومت کی مرضی یہی ہے۔ نفاق کی آگ بھڑکانے میں انھوں نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی، لوگوں کو آنے والے خطرہ سے ڈراتے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی بے بسی کا اظہار بھی کرتے تھے کہ بھائیو! ہم تمھاری جان بچانا چاہتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے۔ یہاں تو اب صرف ہندو رہ سکتے ہیں۔ کیا کیا جائے۔ راج ہی دونوں الگ الگ ہو گئے اس لیے مجبوری ہے بہتر یہی ہے کہ گاؤں خالی کر دو۔ دوسرے فریق سے کہا جاتا۔ یہاں اب صرف ہندو راج ہوگا۔ یہ لوگ اگر مذہب تبدیل کر لیں تو اپنے میں ملا لو۔ مہاتما جی کتنے دنوں سے کہہ رہے ہیں کہ چھوت چھات مٹ جانا چاہیے۔ انھیں شدھی کر کے کھان پان ایک کر لو۔

علاقہ نجف گڑھ میں ایک گورنمنٹ آفیسر نے روشن پور[1] دین پورہ پوٹ خورد وغیرہ کئی دیہاتوں کے لوگوں کو اپنے سامنے شدھی کرایا۔ یہ آفیسر جاٹ تحریک کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔ میں نے جب ان سب سے بات چیت کی تو انھوں نے بتایا کہ بڑے بڑے افسران اس دن موجود تھے۔ چالیس گاؤں کے جاٹ اکٹھے ہوئے تھے اور باقاعدہ ہم سے عہد و پیمان لیے گئے تھے۔ اب اگر ہم معاہدہ کی خلاف ورزی کریں گے تو وہ سب اکٹھے ہو کر ہم کو مار دیں گے۔

انتہا یہ ہے دسمبر میں دہلی میں راشٹریہ سنگھ کی ریلی ہوئی۔ اتنے خون خرابے کے بعد بھی حکام کو ہوش نہیں آیا تھا۔ کسے نہیں معلوم تھا کہ دہلی صوبہ یو۔ پی کا شمال مشرقی حصہ اور اجمیر پنجاب سب جگہ سنگھی نوجوانوں نے خون کی ندیاں بہائی ہیں۔ زندہ تو خیر زندہ، قبروں کے مردے تک ان کے جوش انتقام سے نہ بچ سکے۔ دہلی پنجاب اور اجمیر کے قبرستان ان کی درندگی کو رو رہے تھے۔ مگر خاص دارالسلطنت میں کانگریس گورنمنٹ کے زیر سایہ ان کی ریلی ہوئی اور

---

[1] روشن پور۔ دین پورہ۔ پوٹ خورد۔

ایک مہینہ بھی نہ بیتا تھا کہ باپو ان کی گولی کا نشانہ بن گئے۔

ایک مشہور انقلابی[1] نے مجھے بتایا کہ ستمبر میں ان کے پاس خبر آئی کہ شاہدرہ میں اس وقت بڑا قتل و خون ہوا ہے۔ انھوں نے پولیس افسر کو فون کر کے پوچھا تو افسر نے کہا۔ یہاں تو کوئی اطلاع نہیں ہے۔ آپ غلط خبر ملی ہوگی۔ انھوں نے پھر خبر کی تصدیق کی اور دوبارہ فون کیا کہ نہیں خبر صحیح ہے۔ آپ پتہ لگا کر کے بتائیے جواب ملا۔ ہاں دو ایک آدمی مارے گئے ہیں۔ ان کو اعتبار نہ آیا اور خود چل پڑے دہلی سے ان کو کوئی مدد نہ مل سکی۔ پل کے اس طرف ایک پولیس ٹرک مل گیا۔ ٹرک خون سے لتھڑا ہوا دیکھ کر اپنے ساتھیوں سمیت انھوں نے اس کو روک لیا۔ کافی دیر بعد ایس پی وغیرہ پہنچے اور ان لوگوں نے ان کو خون کے نشانات کے ذریعے ثبوت دیا کہ ٹرک لاشیں دریا میں پھینک کر واپس آرہا ہے۔ ملازمین سہمے ہوئے تھے انھوں نے بھی اقرار کیا مگر پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ کوئی سزا نہ ہوئی، کوئی کاروائی نہ کی گئی۔

سب کچھ ہو گیا مگر آج بھی دونوں فریق یہی کہتے ہیں کہ جھگڑہ پہلے پاکستان نے شروع کیا تھا۔ ہم نے تو بدلہ لیا اور آج بھی بہت سے ایسے مسلمان ہیں جو کہتے ہیں۔ سب جھوٹ ہے۔ ہندو لوگوں کو تو رتی برابر نقصان نہیں پہنچا۔ اپنا مال دولت سمیٹ کر ہندوستان آئے ہیں۔ ایک بہن نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ آپ یقین مانئے جوان کو وہاں کوئی خطرہ ہو۔ مزے میں لاہور کے اندر چلتے پھرتے ہیں۔ کاروبار کرتے ہیں۔ اور جب وہاں سے چلنے لگے تو گورنمنٹ نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کوئی معترض نہ ہو۔ جو کچھ لیجانا چاہیں۔ لیجائیں۔ یہ تو اپنا کل سامان حتی کہ فرنیچر تک لیکر آئے ہیں۔ مسلمان تو ظلم کر ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے مشرقی پنجاب اور ریاستوں میں جو کچھ کیا ہے، وہ دیکھیے۔

دوسری طرف مجھ سے بہت سی ہندو بہنوں اور بھائیوں نے کہا کہ مسلمانوں کا کیا بگڑا ان کو تو وہاں بھی راج ملا۔ یہاں بھی قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ ان پر تو مصیبت پڑی نہیں۔ نہ ان کا کوئی مارا گیا۔ اور دہلی آتے ہی ہمارے سیکڑوں آدمی مارے گئے۔ مسلمانوں کے پاس تو ہتھیار بھی بہت تھے۔ پوسار وڈ اور سبزی منڈی پر انھوں نے توپ بھی چلا کر مقابلہ کیا تھا۔

اپریل میں الٰہ آباد سے آتے ہوئے مجھے امرتسر کے ایک ہندو بیوپاری ملے۔ کچھ اور لوگوں نے بھی ان سے سوالات کیے اور اس سلسلہ میں انھوں نے بہت برافروختہ ہو کر

---

[1] ۔ سبھاش چندر بوس کے ساتھی اور انڈین نیشنل آرمی کے آفیسر رہ چکے تھے۔

ایک موٹی سی گالی دے کر کہا۔ . . . . سکھوں نے ہم کو مروایا ورنہ ہم کاروباری لوگ مزے سے دونوں حکومتوں میں تجارت کرتے اور پاکستان میں رہتے۔ ہمارا تو کوئی جھگڑا ہی نہ تھا۔ نہ تارا سنگھ تلوار چمکاتے۔ نہ جھگڑا ہوتا۔ میرے اس سوال پر کہ پہلے کہاں ہوا۔ انھوں نے جواب دیا۔ مارچ میں راولپنڈی میں سکھوں کا قتل عام ہو چکا تھا لیکن پھر بھی سکون رہا۔ مگر امرت سر میں لاہور سے پہلے ہوا۔ مسلمانوں نے لاہور میں ۵ برہنہ لڑکیوں کا جلوس نکالا اور پھر اس کا جواب امرتسر نے ۲۵ لڑکیوں کا جلوس نکال کر دیا۔ میں نے جو یہ حالت دیکھی تو گھبرایا ہوا پولیس اسٹیشن دوڑا گیا۔ ایس۔ پی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ جاؤ جاؤ اپنا راستہ لو۔ نہیں دیکھا جاتا تو آنکھیں بند کر لو۔

بہر حال دونوں طرف ایسے ہی خیالات تھے۔ ایک کی مصیبت کا دوسرے کو یقین آتا ہی نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھنے، جاننے یا سمجھنے کی زحمت بھی نہ اٹھانا چاہتے تھے۔

11

مسائل

افواہیں

اپریل شروع ہوتے ہی یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ پھر دلّی میں بلوہ ہوگا اور اب کی بار نہ صرف چُن چُن کر مسلمان ہی مارے جائیں گے بلکہ دلّی کے ہندوؤں کو بھی اپنے اس نامعقول رویہ اور عدم تعاون کی سزا بھگتنا پڑے گی جو انھوں نے رفیوجیز کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے۔

مسلمانوں نے سنا تو کہا۔ اسی طرح ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء مقرر ہوئی تھی اور پوری ہو کر رہی اب کے بھی یہی ہوگا۔ شہر میں جدھر دیکھو یہی چرچے۔ ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ خبریں کانگرس آفس بھی پہنچیں اور گورنمنٹ ہاؤس بھی۔ دیہاتوں کے کارکن آئے اور بیان کیا کہ ہتھیار جمع ہو رہے ہیں۔ والنٹیر بولے۔ راشٹریہ سنگھ کی شاکھا جگہ جگہ لگ رہی ہیں کسی نے کہا کہ فلاں میدان میں رات بڑھے شاکھا لگتی ہے۔ پریڈ ہوتی ہے۔ بھالے اور بلم کا کھیل شروع ہو گیا ہے۔ کسی نے خبر دی گوردوارہ اور مندروں میں آج کل روز میٹنگیں ہو رہی ہیں۔ ایک صاحب جو ٹیلیگراف آفس میں ملازم تھے، بیان کرنے لگے۔ کہ کل میں سائیکل پر دفتر سے واپس آ رہا تھا، پیچھے پیچھے کچھ اور لوگ بھی آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا:

"یہ سالے ابھی تک پاکستان نہیں گئے یہیں ٹہل رہے ہیں۔"

دوسرا بولا: "رہنے دو یار، ۱۵ جون کو ان کی قربانی کریں گے۔"

جب بھی وہ لوگ اکٹھے ہوتے جنھوں نے امن قائم کرنے کے لیے جان توڑ کوششیں کی تھیں تو اسی پر بحث مباحثہ ہوتا رہتا کہ اگر اب فساد ہوا تو کیا ہوگا؟ کیسے اس بلا کو ٹالا جائے؟ کیونکہ سچ پوچھیے تو حکومت اس وقت بھی کیل کانٹے سے لیس نہ تھی۔ باپو کی شہادت نے سب بہادروں کی ہمت چوگنی کر دی تھی، مگر ہاتھ پیر تو کٹے ہوئے تھے۔ دلّی کا ایڈمنسٹریشن بدستور چوں چوں کا مربّہ تھا اور پرانے پاپی آج بھی برسرِ اقتدار تھے انھیں سے اب تک لڑائی نہ ختم ہو پائی

تھی۔ کسی دوسرے سے مقابلہ کس بر تنے پر کیا جاتا۔

میں شاید کسی جگہ ذکر کر چکی ہوں کہ دہلی میں ایک سنٹرل پیس کمیٹی قائم تھی، جس کے صدر راجندر بابو تھے، اور اس میں شہر کی سرکردہ ہستیاں اور صوبہ کے ممتاز لوگ شامل تھے۔ مجھے علم نہیں اس کمیٹی نے کتنا کام کیا تھا اور کس حد تک امن قائم ہونے میں اس کی کوششوں کا دخل تھا۔ جہاں تک عوام اور شہر کے گنجان فساد زدہ محلوں کا سوال ہے لوگ اس کے نام اور کام دونوں سے ناواقف تھے۔ مگر شاید نئی دہلی اور سیکریٹریٹ میں شانتی پھیلانا اسی کا کام تھا۔

بہرحال جب بھی کارکن کسی نئی کمیٹی بنانے کی بات سوچتے تو ذمہ دار لوگ پیس کمیٹی کا نام لے لیتے کہ وہ تو موجود ہی ہے۔ اس کے ہوتے، کسی دوسری کی کیا ضرورت۔ مگر ہم جانتے تھے، اس میں عوام کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ مختلف الخیال لوگ اس میں ایک مرکز پر اکٹھے نہیں ہو سکتے اور سارا قوم پرست طبقہ اگر اس میں گھسنے کی کوشش کرے تو پہلی منزل پر حکومت سے ٹکراؤ ہو جانا یقینی ہے۔

ایک علاقہ جس سے میرا خود تعلق رہ چکا تھا، اس میں شانتی دَل کے نام سے کام کرنے والوں کی ایک جماعت تھی، اور ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ انھوں نے محلہ خالی نہ ہونے دیا، کاروبار بند نہ ہوا اور مسلمان ایک دن بھی گھروں میں قید ہو کر نہ بیٹھے۔ رفیوجیز سے ان کا جھگڑا کبھی نہ ہوا۔ جو جھگڑا فساد ہوتا، وہ شانتی دل کے والنٹیرا اپنے سر اوڑھ لیتے اور پبلک کو بچا لیتے۔

میں نے اب تک قصداً ایک بات کا ذکر نہیں کیا ہے، اور وہ عمارات اور مسجدوں کا مسئلہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ زندوں سے انتقام کی آگ جب نہ بجھ سکی تو غنڈوں نے مُردوں پر ہاتھ صاف کیا، مگر ہر چیز کی طرح یہ بھی ایک منظم سازش تھی کوئی انفرادی یا اضطراری فعل نہ تھا۔

مہاتماجی جب دہلی آئے ہیں، تو یہاں کی جامع مسجد کے علاوہ تقریباً ساری مسجدیں رفیوجیز کی جائے رہائش بن چکی تھیں، چند ایک کو مندر بھی بنا لیا گیا تھا اور یہی حال مشرقی پنجاب اور ریاستوں کا بھی ہوا تھا۔ دسمبر میں جب اجمیر کی خبر آئی، تو وہاں بھی اسی پروگرام پر عمل کیا گیا۔

جن دنوں میں مقبرہ ہمایوں میں کام کرتی تھی، تو احرار پارٹی کے چند بزرگ مجھ سے ملنے آئے اور انھوں نے کہا۔ کہ بڑا اچھا ہو اگر آپ مزارات و مساجد کے سلسلے میں ہمارے ساتھ کام

کریں۔ ہم مسجدوں کی واگذاری کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ چلیے آپ کو دکھائیں کہ کس بری طرح قبرستان، مزارات اور مسجدیں مسمار کی گئی ہیں۔

لیکن میرا جواب صاف تھا۔ میں نے کہا۔ پہلے نماز پڑھنے والوں کو باقی رکھنے کی فکر کیجیے جب وہی نہ رہے، تو مسجدیں کیا ہوں گی، اور ان کو تالا یا سیل لگا کر آپ کیا بنائیں گے؟ میں ابھی تو کیمپ سے باہر نہیں جا سکتی، پھر دیکھا جائے گا۔

اس کے بعد وہ لوگ اکثر مجھے ملے، لیکن میرا دل ہی نہ چاہتا تھا بلکہ جی تو یہی کہتا تھا کہ یہ مسجدوں کی بربادی اسی لیے ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ دکھانا چاہتا ہے خدا کو اینٹ چونے اور پتھر کی ضرورت نہیں ہے، نہ ان کی پرواہ ہے، وہ تو تمھارے دلوں کا ذوق و شوق، پیشانی میں تڑپتے ہوئے سجدے، نیت اور عمل دیکھتا ہے، جب یہ سب نہیں، تو تمھارے ہاتھوں کی تعمیر اور فخر و برتری کا نشان، تمھاری آنکھوں کے سامنے مٹ جائے گا۔ یہی مشیّت الٰہی ہے۔ یہ مسجدیں جسدِ بے روح تھیں، مٹی کی تھیں، مٹی میں ملا دی گئیں۔

میواتی

اسی طرح جب میں ایک میواتی چھوٹے خاں کے اصرار پر بنگلہ والی مسجد گئی تو تبلیغی جماعت کے ممبران نے مجھے گھیر لیا۔ اس جماعت کا ذکر میں لکھنؤ میں سن چکی تھی، اور اس کے ایک پرجوش ممبر کی دو کتابیں بھی میں نے پڑھی تھیں۔ کلمہ و نماز کی تبلیغ کرنے والی یہ جماعت جو اپنی میوات کی سرگرمیوں کی وجہ سے کافی مشہور ہو چکی تھی بنگلہ والی مسجد میں قیام پذیر تھی۔ اس کے سرگرم کارکن سب دیہاتی تھے، جو اپنی روزی خود محنت مزدوری کر کے کماتے تھے، اور اپنے خیال میں علمِ دین کی اشاعت کرتے تھے، لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان میں پڑھا لکھا صاحب دماغ آدمی کوئی نہ تھا۔ البتہ اہلِ دل تھے، سیدھے، سادھے دیہاتی، پرخلوص دل، خدا اور رسول کے سچے فدائی۔ میں ان کی عزت کرنے پر مجبور ہو گئی مگر ان کا ساتھ نہ دے سکی۔ انھوں نے کہا — اگر آپ جیسی بیٹیاں ہماری شریک کار ہو جائیں، تو ہماری جماعت کو بہت فائدہ ہو۔

لیکن میرے پاس ان کے لیے بھی یہی جواب تھا۔ پہلے پرانے مسلمانوں کو بچا لو۔ اس سرزمین پر اسلام کا نام باقی رکھ لو پھر نئے بنانے کی فکر کرنا۔ ہزاروں بھوکے مر رہے ہیں، ہزاروں شدھی ہو چکے ہیں، پہلے ان کی خبر لینے کی ضرورت ہے۔

انھوں نے کہا۔ ہم تو مسلمانوں کو ہی دین پر مضبوط کرتے ہیں، دوسروں میں مناظرہ و مباحثہ

نہیں کرتے، لیکن میں ان کی کیا مدد کر سکتی تھی۔ میں اتنی راسخ العقیدہ مسلمان تھی ہی کب کہ دوسروں کو متاثر کر سکوں۔ جب تک خود یقین کی منزل پر نہ پہنچ جاؤں، دوسروں کو یقین کیسے دلاؤں گی۔ اور پھر میرے سامنے تو بہت سے کام پڑے تھے، جو اس وقت مجھے اس سے زیادہ ضروری نظر آرہے تھے۔

تڑبڑ بولنے والا میواتی چھوٹے خاں اکثر میرے پاس آتا تھا، اور چپکے سے کہتا میواتی اور آئے ہیں۔ بس جی میوات تو ساری ہی بس رہی ہے، ان کو بھی بسا دو نا۔" اور پھر کہتا۔ چلیے ان سے پاکستان کا احوال تو سن لیجیے۔

وہ مجھے میواتیوں سے ملاتا۔ غریب دل شکستہ کسان مجھے اپنی کہانی سناتے کہ پاکستان والوں نے ہم کو لے جا کر سرحد پر بسا دیا۔ وہاں روز ہی ہم سب کی سکھوں سے مڈبھیڑ رہتی تھی اس لیے ہم نے آپس میں صلاح کی کہ انھیں کے ڈر سے تو ہم نے اپنا دیس چھوڑا تھا، اور انھیں سے یہاں واسطہ پڑ گیا۔ تو جب لڑنا مرنا ہی ہے، تو اپنے وطن میں اپنی چیز کے لیے لڑیں مریں گے، یہاں کیوں مصیبت اٹھائیں۔ اور یہ سوچ کر ہم پلٹ آئے، اور بھی آرہے ہیں۔

جنوری، فروری میں تو خیر ان کی واپسی اتنی نہیں کھلتی تھی۔ اس وقت تک پرمٹ سسٹم نہ تھا، چپکے سے نوح تحصیل پہنچا دو۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ مگر اب تو بڑی مشکل تھی میں کوئی غیر قانونی کام کرنے کو تیار نہ تھی مگر ان کی حالت دیکھ ترس آجاتا۔ ادھر چونکہ باپو نے خود جا کر میواتیوں کو تسلّی دی تھی، اور مشرقی پنجاب کی گورنمنٹ کو مجبور کیا تھا کہ جو لوگ نہیں جانا چاہتے، ان کو مجبور نہ کیا جائے۔ اس لیے ساٹھ ہزار میو اب تک ایک تحصیل میں جمے ہوئے تھے اور انڈین گورنمنٹ دوسروں کے مقابلے میں میواتیوں کو ذرا ڈھیل بھی دیتی تھی۔ اس نے کچھ ذمہ دار کانگریسیوں کی ایک پارٹی بھی نوح تحصیل بھیجدی تھی کہ جو لوگ واپس آئے ہیں، اور جو موجود ہیں، ان کی امداد اور بحالی میں مدد کریں۔

ایک معزز آدمی [ع۱] بھی ان دنوں اس کام میں مدد کر رہے تھے، اور کئی ٹرک میواتیوں سے بھر کر ان کی نگرانی میں گڑگانوہ گئے تھے۔ چھوٹے خاں کہتا تھا۔ ہم سب تو پرجامنڈل کے لوگ تھے۔

ع۱ ۔ اس وقت وہ منسٹری کے ملازم نہ تھے، ایک کارکن کی حیثیت سے ہمارے کارپرداز تھے۔

ع۲ ۔ یہ میری غلط فہمی تھی۔ وہ نئے مسلمان نہیں بناتے تھے۔ صرف مسلمانوں میں نماز کلمہ اور عمل صالح کی تلقین کرتے تھے۔ حقیقت حال بعد کو مجھے معلوم ہوئی۔ (بقیہ آئندہ)

اور ریاست ہماری مخالف تھی ۔ ریاستی گورنمنٹ سے ہمارا جھگڑا رہتا تھا وہ تو اس علاقہ میں کانگرس اور پرجامنڈل سب کو ختم کر دینا چاہتے تھے اسی لیے ہم کو مروا دیا ۔ اور آخری جملہ یہ ہوتا " اب آجاؤ ہماری تبلیغی جماعت میں ۔"

اگر اسے کبھی کچھ روپیہ دینا چاہو تو نہ لے ۔ دن رات پیدل دوڑتا تھا اور سارے منتشر اجزا ، کو میوات پہنچا دینا چاہتا تھا ۔ اس کے اندر غضب کی تڑپ تھی کہ کسی طرح جلد سے جلد اپنی قوم کے گھر بسا دے ۔ اگرچہ اس گروہ کا علم نماز ، کلمہ ، اور دینیات تک محدود تھا ۔ محنت مزدوری کے بغیر روٹی کھانا حرام سمجھتے تھے ، بلا کے جفاکش ، اور دیندار لوگ تھے ، سیکڑوں آدمی آ آ کر یہاں اتر پڑتے تھے اس لیے میں نے پوچھا :

" چھوٹے خاں ، اتنے بہت سے آدمیوں کو کھانا کیسے کھلاتے ہو ؟ "

کہنے لگا " اللہ دیتا ہے ، وہی رزق پہنچانے والا ہے ۔"

میں نے کہا ، " یہ تو ٹھیک ہے ، مگر روپیہ کی ضرورت تو پڑتی ہی ہو گی ؟ "

کہنے لگا ، " نہیں ، ہم لوگ محنت سے کماتے ہیں ، کسی سے لیتے نہیں ۔"

میں نے محسوس کیا ، کہ یہ بہادر جفاکش قوم اس قابل ہے کہ علماء اور گورنمنٹ دونوں اس کی طرف توجہ کریں ۔ اگر ان کو ترقی و تعلیم کے مواقع میسر ہو جائیں تو پھر یہ بہادر نسل ہندوستان کے لیے لوہے کی دیوار بن سکتی ہے ، اور اسلام کا ناقابلِ تسخیر قلعہ ۔

اقبالؔ نے کہا ہے ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اور اس گروہ کے پاس صرف سچا ، پرجوش ، پختہ اور شجاع دل تھا ، اور علم و عقل کی پاسبانی اس پر نہ تھی ۔ سیدھے سادے لفظوں میں وہ دیہات کے سادہ لوح کسانوں کو نماز و کلمہ کی تلقین تو کر سکتے تھے مگر پڑھے لکھے شیطانوں کے لیے ان کے پاس کوئی لاحول نہیں تھی ۔ بیچارے اتنے سیدھے ہیں کہ شہر میں اپنی جماعت بنا کر تبلیغ کے لیے چلتے ہیں ۔ اور جب میں سنتی ہوں کہ وہ کسی محلے میں پہنچے ، تو مرحوم بزرگ عبدالوالی صاحب ایڈیٹر معلومات کا بیان کیا ہوا قصہ یاد آجاتا ہے کہ :

---

۳ ۔ (بقیہ گذشتہ کا) بعد کو ونو باجی نے شمیم بھائی ، مرزا مسعود اور بہن آمنۃ السلام وغیرہ کو بھیجا ۔

کہتے ہیں کہ ایک چودھری بارہ بنکی کے قصبے کے۔ ایک محلے کے، ایک مولانا فرنگی محل کے اور ایک کہیں اور کے۔ چاروں مل کر کلکتہ گھومنے پہنچے۔ جہاں جائیں چاروں اکٹھے۔ جس سڑک پر نکلیں چاروں ساتھ ساتھ۔ یہ مجھے یاد نہیں، وہ مولانا آزاد کے پاس ٹھہرے تھے، یا ملنے ہی گئے ہوں۔ بہر حال وہ ان سے واقف تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے جو انھیں دیکھا تو دوڑے ہوئے مولانا آزاد کے پاس گئے اور کہا۔

"مولانا آپ کو معلوم ہے یہ قبیلہ بنی لحیان[1] نے کیوں کلکتہ پر چڑھائی کر دی ہے۔" مولانا چونکہ ان سے واقف تھے اس لیے بنی لحیان کی تشبیہہ سے بہت لطف اندوز ہوئے۔

شہر میں ابھی مسلم زون قائم تھے، اس لیے خالی مکانوں کو ہم دیہات کے بد دل پریشاں لوگوں سے بھر دینا چاہتے تھے۔ آخر وہ لوگ پھر کہاں جاتے۔ پاکستان جانا نہ چاہتے تھے، گاؤں میں شدھی ہو کر رہتے رہتے عاجز آ گئے تھے۔ ان کا اصرار تھا، ہمیں نکالو۔ ہم کو امید تھی، دو چار ماہ کے اندر حالات ایسے ہو جائیں گے کہ وہ دوبارہ اپنی زمینوں پر واپس جا سکیں۔ جنوری سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا مگر اس واقعہ کے بعد میں نے بھر جانے کی ہمت نہ کی۔

ہمارے ایک ساتھی پولیس کے ہمراہ جایا کرتے تھے۔ ایک بار ان کو ایک مغویہ لڑکی برآمد کرانے کے لیے بھیجا، اور وہاں ان کو کچھ بہادرانہ کارنامہ بھی انجام دینا پڑے جس پر نہ مجھے یقین آیا، نہ دوسرے ساتھیوں کو۔ مگر یہ واقعہ تھا کہ جس کو لینے گئے تھے، وہ نہیں ملی۔ البتہ وہ ایک دوسری لے آئے۔ اور انھیں اس پر فخر تھا کہ وہ بھی تو ایک آدمی کی بیوی ہے۔ اگرچہ اس بافت کا سہرا ایس۔ پی کے سر بندھا، اور ان کو صرف خالی الذہن ہو کر مسکرانا پڑا۔ جن دنوں اہالیان کیمپ کے رویے سے ہم سب دل برداشتہ تھے، اور ہمارا دل نہ چاہتا تھا کہ ان سے بات کریں جب بھی وہ اسی طرح کھوکھلی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں نصیحت کیا کرتے تھے کہ

"ان کی طرف سے اتنا دل سخت نہ کیجیے۔ کچھ تو ہمدردی آپ کو کرنا چاہیے۔"

اور اس نصیحت پر خون کھول جاتا۔ خود تو چادر کندھوں پر ڈالے ہر وقت ٹہلتے رہتے ہیں، اور فرائض ہم سب کو یاد دلاتے ہیں، مگر ہمارے غصہ کا جواب بھی ان کے پاس صرف مسکراہٹ تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے قدرت نے ترس کھا کر ان کو تلافی مافات کے طور پر زیر لب مسکراہٹ عطا کر دی ہے۔ یہ بھی نہ ہوتی تو وہ کیا کرتے؟

---

[1]۔ قبیلہ بنی لحیان اپنی داڑھیوں کے لیے سارے عرب میں مشہور تھا۔

مارچ ختم ہوتے ہی دیہاتوں سے نکاسی کا یہ سلسلہ بھی بند کر دیا گیا۔ سب سے زیادہ مخالف میں خود ہی ہو گئی۔ اور جمعیتہ سے جو فہرست میرے پاس آتی۔ اس کو رکھ لیتی۔ میں اس دن کا انتظار کر رہی تھی جب کہ دیہات کا دورہ کر کے میں ان میں پھر پہلی سی رواداری اور بھائی چارہ قائم کر سکوں۔

اور اب ۱۵ جون کے متعلق افواہیں سن کر ہمیں شدت کے ساتھ ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنی سرگرمیوں کا دائرہ دیہاتوں تک وسیع کر دیں۔

ادھر وہ لوگ جو یو پی وغیرہ کے حصوں میں منتشر ہو گئے تھے، امن و امان کی خبریں سن کر دہلی آرہے تھے، اور دہلی میں پڑے ہوئے دیہاتی، اب گاؤں میں پہنچنے کے لیے بیتاب ہو اٹھے تھے۔ لیکن ان کی مدد کرنا، اس وقت ہمارے امکان سے باہر تھا۔ نہ کوئی سواری تھی نہ فنڈ۔ اس کے بغیر، ہم ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتے تھے۔ کام کرنے والوں کی اب کمی نہ تھی اگرچہ سوشلسٹ کانگرس سے الگ ہو چکے تھے، مگر ایسے کاموں میں شانتی دل کو اب بھی ان کا تعاون حاصل تھا، اور "شانتی دل" تھا بھی معجون مرکب۔ بظاہر وہ کانگرس کی ماتحتی میں تھا، لیکن دراصل اس کا کسی پارٹی سے نہیں، صرف انسان اور انسانیت کی مدد کرنے والوں سے تعلق تھا۔

سوال یہ تھا کہ اگر کانگرس تیاری شروع کرتی ہے تو ستمبر کا بلوہ وہ کب روک پائی تھی، جو جون کی مصیبت روک لے گی۔ اس کے پاس آدمی ہی کتنے ہیں۔ چند صحیح الخیال کانگریسی ہیں جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے ورنہ عام طور پر اس میں اب ایسے لوگ بھر گئے ہیں جنھوں نے موقع پر جن سنگھ کے جلسوں کی صدارت بھی کی، اور اب وہ امن پسند بن گئے۔ لوکل گورنمنٹ کا دست و بازو بننے کے بعد وہ عوام کی بھلائی کے لیے کیا کر سکیں گے اور زندگی میں باپو کے اصولوں کا مضحکہ اڑانے والے، اب کیسے گاندھی ازم کا پرچار کریں گے؟

سوشلسٹ قطعی اس جماعت میں شامل نہ ہوں گے جس کے کرتا دھرتا کانگریسی ہوں گے اور نوجوان گروپ کانوں پر ہاتھ دھر کر بھاگ کھڑا ہوگا۔

سوشلسٹ اگر کوئی کمیٹی بناتے ہیں تو ان پر نہ گورنمنٹ کو بھروسہ ہے نہ کانگرس کو۔ اور نہ عوام ابھی ان کے نام سے واقف ہیں۔ سچ پوچھیے۔ ابھی تو وہ پورے طور سے منظم بھی نہ ہوئے تھے اور ان کے ورکر بالکل نوسیکھے، اور بے اصول تھے، کیونکہ کسی میدان میں اب تک انھیں جمنے کی نوبت نہ آئی تھی، نہ کسی معرکہ سے انھیں واسطہ پڑا تھا، ابھی تو صرف تیاری کر رہے تھے۔

یہ سب سوچ کر "شانتی دل" والے اپنی جماعت کا دائرہ وسیع کرنے کی فکر میں تھے

وہ کہتے تھے، امن قائم کرنا اب کانگرس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ نئی آبادی تو بالکل ہی کانگرس کے اثر اور قابو سے باہر ہے۔ کانگرس اپنا وقار اور اثر اس وقت عوام میں کھو چکی ہے۔ ایک حلقہ سوشلسٹ کے زیر اثر ہو گیا ہے۔ مسلمانوں میں جمعیۃ کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے کیونکہ یہی ایک جماعت تھی جو آڑے وقت ان کے کام آئی اور عام طور پر مسلمان کانگرس سے بالکل ہی بددل ہو چکے ہیں کیونکہ جس شہر میں کانگریسی مسلمان اس بری طرح مارے اور تباہ کیے گئے ہوں۔ اور ان کے ساتھیوں نے ان کی کوئی مدد نہ کی ہو، وہاں ان پر بھروسہ کون کرتا۔ انفرادی طور پر کچھ لوگوں کی وہ تعریف بھی کرتے تھے۔ اور ان کے احسان مند تھے، مگر جماعتی حیثیت سے ان کو کانگرس سے سخت شکایت اور مایوسی تھی۔

بدنامی کا یہ بڑا داغ کانگرس کے ماتھے پر ہے کہ اس تمام ہنگامہ اور فساد کے درمیان وہ اپنے اونچے آدرش، مضبوط نظام، اور سب سے بڑی پارٹی ہونے کے باوجود مصیبت زدوں کی کوئی مدد نہ کر سکی، عوام کو قابو میں نہ کر سکی اور بجائے اس کے کہ گرتے ہوؤں کو اٹھاتی خود نیچے کی طرف پھسل پڑی۔ اس کے ممبران یا تو پڑوسی کو مرتے لٹتے دیکھ کر اپنے گھروں میں چھپ جاتے اور دروازہ بند کر لیتے، یا کانوں میں انگلیاں دے کر گورنمنٹ کی طرف بھاگتے۔ یا پھر خود بھی ان میں شامل ہو جاتے۔ یہ صرف دہلی ہی میں نہیں ہوا، ہر جگہ ہوا، اور دو چار کے سوا، کوئی علی الاعلان میدان میں اس غنڈہ گردی کو روکنے والا نہ آسکا۔

لیکن کانگرس کا جنم داتا اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ مع اپنے مخلص گروہ کے یہ حال دیکھ کر خود جلتی آگ میں کود پڑا، اور تب سب کی آنکھیں کھلیں۔ البتہ سیوا دل کے نوجوان ستمبر سے اب تک مصیبت زدوں کو بچانے آگ بجھانے اور لوٹ مار روکنے میں مصروف رہے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں ان میں سے بہتوں کے دل پنجاب کے زخم خوردہ تھے۔ ان میں بہتوں کے سینے عزیزوں اور دوستوں کی دردبھری یاد سے بھرے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے لاشوں سے بھری ہوئی وہ گاڑیاں جو پاکستانی پنجاب سے دہلی جواہر لال جی کو تحفتاً بھیجی جاتی تھیں، دیکھی تھیں۔ انھوں نے ان زخمی انسانوں کو تڑپتے بھی دیکھا تھا جو صرف ہندو ہونے کی وجہ سے تیغ ستم کا نشانہ بنے تھے اور وہ خوفناک ماضی بھوت بن کر ان کے دماغوں پر مسلط ہو چکا تھا۔ اتنے چند دنوں میں اتنی آسانی سے وہ کیسے اس کو بھلا سکتے تھے۔

مگر پھر بھی تعجب ہوتا ہے، انھوں نے ہندوستان سے بھیجی ہوئی مسلمان زخمیوں اور لاشوں سے پٹی ہوئی گاڑیاں کیوں نہ دیکھیں؟ دلّی اور دوسری جگہوں پر خاک و خون میں لوٹتے ہوئے انسان، کیا ان کی نظر سے نہیں گذرے ؟

سچ تو ہے انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے۔ وہ اپنی تکلیف پر چیخ اٹھتا ہے۔ دوسروں کے دکھ پر ہنس دیتا ہے۔ سالہا سال سے نفرت اور دوری کا جو بیج بویا جا رہا تھا، اس میں اب کونپلیں پھوٹ آئی تھیں اور اگر چند دن اسی طرح اور خون سے سینچائی ہوتی رہتی تو اندیشہ تھا کسی دن تناور درخت بن جائے گا۔ تنہا درخت بنجر زمین پر جس کے سایہ تلے بیٹھنے والا کوئی بھی زندہ نہ ہوگا!

ہم سب تو خطرہ کی بو سونگھ کر نکل پڑے تھے۔ ہم میں کے بہت سے نوجوان بے چین تھے کہ یہ تو نہ انقلاب ہے نہ انقلاب کی آمد۔ یہ ہنگامہ تو کسی دوسرے ہی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ جو انقلاب کے دیوتا کو بھی بھینٹ چڑھا لے گا۔ اور یہی سب سوچ کر جب انھوں نے دیکھا کہ باپو کی شہادت کا اثر ہلکا کرنے اور عوام کو دل و دماغ سے سوچنے کی طاقت سلب کرنے کے لیے پھر تخریبی طاقتیں اکٹھی ہونے لگی ہیں تو گھبرا گئے۔ سارے کے سارے کانسٹی ٹیوشن ہاؤس میں اکٹھے ہوکر سوچ وچار کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے ؟

مردولا سارا بھائی نے ان سب کو بلایا تھا۔ مردولا اچھی کس کو لگتی تھیں۔ کانگریسی ان سے چوکنا رہتے، سوشلسٹ ان سے ڈرتے اور کمیونسٹ ان کو دیکھ کر دور ہٹ جاتے۔ لوگ پاس جاتے ہوئے ڈرتے۔ کہیں جھنجھوڑ کر نہ رکھ دیں۔ لیکن اس کے سب قائل تھے کہ عورتوں میں تنہا وہی ایک عورت ہے جو بلا وجہ مشہور نہیں ہے، اپنے کام، عزم، اور استقلال میں نظیر نہیں رکھتی۔ ذہین آدمی تھوڑا اسنکی تو ہوتے ہی ہیں۔ وہی سنک ان سے بڑے بڑے کام کراتی ہے، اور دوامی زندگی اور قابلِ رشک موت سب اسی سنک کی بدولت وہ حاصل کرتے ہیں۔

مردولا میں بھی سنک تھی۔ بظاہر پتھر کی طرح بے حس لیکن کسی خوش قسمت کو قریب سے دیکھنے کو مل جاتیں تو اندر سے موم کی طرح نرم پگھل جانے والی۔ البتہ یہ موم کوئی معمولی موم نہ تھا جو ذرا سی آنچ میں پگھل پڑے۔ اس کو پگھلانے کے لیے بعض وقت تو بھٹی درکار ہوتی تھی اور بعض وقت خالی دھوپ میں پگھل جاتا تھا۔

میں نے تو اب تک دور سے دیکھا تھا لیکن نہ معلوم کیوں، مجھے اچھی لگتی تھیں۔ ایک غیر معمولی عورت دلیر، جنگ جو۔ گاندھی جی کی سچی بھگت اور وطن کی عاشق۔

یہ اجتماع بہت بڑا نہ تھا۔ گنتی کے چند لوگ تھے لیکن ایک خیال، گوکہ مختلف پارٹیوں کے نمائندے تھے۔ پراونشل کانگرس کے ذمہ دار دو آدمی۔ سوشلسٹ پارٹی۔ جمعیۃ۔ شانتی دل، اور سیوادل کے سکریٹری انچارج۔ سب نے یک زبان ہوکر کہا کہ ۱۵ جون کو خطرہ ہے۔ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں، اور عوام میں خوف وہراس بڑھ رہا ہے۔ اب سوال یہی ہے کہ کیا کرنا چاہیے؟

کانگرس کمیٹی کی ایک ذمہ دار ہستی اسے کوئی اہمیت نہ دے رہی تھی مگر جنرل سکریٹری[ع۱] کی پتہ، پتہ کی باتیں سن کر ان کو بھی خاموش ہوتے ہی بن پڑی۔ وہ سنٹرل پیس کمیٹی کے سوا اور کوئی ذریعہ اختیار کرنے کو گناہ سمجھتے تھے، اور کارکن کہہ رہے تھے کہ ہمیں اپنے کاموں میں اب تک تو اس سے کوئی مدد ملی نہیں ہے اس میں تو لوکل گورنمنٹ نے اپنے دوست بھر دیے ہیں۔ جو قدم قدم پر روڑہ اٹکاتے ہیں۔

بہر حال طویل بحث و مباحثہ کے بعد سب اس نتیجہ پر پہنچے کہ خاموش بیٹھنے کا وقت نہیں ہے، کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے اور سرکاری اثر سے آزاد ہو کر کرنا چاہیے۔

دوسری اور تیسری بار پھر سب مشورہ کے لیے اکٹھے ہوئے، اور یہ طے ہوا کہ پہلے حکام سے تصادم کا جو ہر وقت خطرہ لگا ہوا ہے، اس کا سد باب کر لیا جائے ورنہ کیا دھرا سب اکارت ہوگا۔ ہم تو جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، اور کر رہے ہیں، عوام کی بھلائی اور اپنی گورنمنٹ کی بھلائی اور مضبوطی اور خاتمہ کے لیے کر رہے ہیں، لیکن حکام ہر چیز میں روک ٹوک لگا کر ہمیں باغی، جاسوس، نہ جانے کیا کیا کچھ ثابت کر دیں گے اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ پہلے اس کا تدارک کر لیا جائے۔

حکام کا سوال اٹھا، تو یہ معاملہ ہوم ڈپارٹمنٹ سے متعلق تھا، مگر سوال یہ تھا کہ "بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے" ہم میں سے کسی میں بھی سردار پٹیل کے پاس جانے کی ہمت نہ تھی۔ اور پھر آج کل تو وہ بیمار بھی تھے۔ اس سارے صلاح مشورہ کی خبر ان تک پہنچا دی گئی اور صورت حال کی نزاکت سے بھی مردولا نے حکومت کو باخبر کر دیا۔

انھیں دنوں ایک مخلص کانگریسی جنھیں ہم لوگ ماسٹر جی[ع۲] کہا کرتے تھے، ملے

ع۱ ۔ برہم پرکاش ان دنوں جنرل سکریٹری تھے۔

ع۲ ۔ ماسٹر شانتی سروپ۔

اور بہت اصرار کیا کہ مجھے کل کسی منسٹر تک پہنچا دیجیے۔ ایک ضروری راز کی بات کہنی ہے۔ ہم نے کچھ ٹال مٹول کی تو انھوں نے چپکے سے کہا۔ پس و پیش نہ کیجیے۔ ہمارے ایک محبوب لیڈر کی جان کا معاملہ ہے۔ اب تو میں بھی گھبرا گئی' اور دوسرے ہی دن ایک منسٹر[1] کے پاس صبح سویرے پہنچا دیا گیا۔

پتہ نہیں کیا بات چیت ہوئی' مگر دو ہی تین دن بعد اخبار میں چھپا کہ گاندھی گراؤنڈ کے کسی جلسہ میں پرائم منسٹر گئے تو بہت سے لوگوں نے شور مچا کر ایک ساتھ ان کے قریب آنے کی کوشش کی۔ کچھ ہنگامہ بھی ہوا اور ایک آدمی گرفتار بھی کیا گیا۔ اور پھر ایک پولیس مین کی گرفتاری سنی جو وزیر اعظم کے حفاظتی گارڈ میں شامل تھا۔

ماسٹر جی نے کہا۔ دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ اسی جلسہ میں وہ کچھ کرنے والے ہیں۔ میں تو حفاظتی گارڈ والے آدمی کا نام تک جانتا ہوں' وہ سنگھ کا بڑا ممبر ہے اسی لیے وہاں بھیجا گیا تھا۔

ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ کانگریسی ہر موقع اور ہر جگہ اپنے محبوب لیڈر کی طرف سے چوکنا رہتے تھے۔ وہ بہت بڑا نقصان اٹھا چکے تھے اور اپنی آستینوں میں چھپے ہوئے سانپوں سے بھی واقف تھے اس لیے سیوادل کے والنٹیر ہر جلسہ میں جان توڑ کوشش کرتے کہ کسی طرح لیڈروں کو اپنے حلقہ میں لیں۔ اس سے پہلے باپو کے لیے بھی وہ ہمیشہ ہی کیا کرتے تھے مگر آخری بار برلا ہاؤس میں ٹھہرنے کی وجہ سے ان کو اس کا موقع نہ دیا گیا۔ پولیس محافظ قرار دی گئی اور سیوادل والے اتنی دور روزانہ آنے جانے اور حفاظت کرنے کا کوئی بندوبست نہ دیکھ کر خاموش ہو رہے۔ حکومت کا خیال تھا پولیس مسلح ہے۔ ٹرینڈ ہے۔ قانونی ہے۔ اور یہ تجربہ کار نہیں۔ بنتے ہیں' زمانہ خراب ہے۔ باپو کے دشمن بہتیرے ہیں۔ یہ بھلا کیا کام دے سکیں گے مگر شاید وہ عشق و فرض کی طاقت اور فرق کو نہیں محسوس کر سکتے تھے۔

ہے ابھی خام اگر مصلحت اندیش ہے عشق

1۔ ماسٹر جی صبح ۷ بجے مسٹر رفیع احمد قدوائی سے ملے۔

2۔ ماسٹر جی نے رفیع صاحب سے کہا تھا کہ آج گاندھی گراؤنڈ کی میٹنگ میں پنڈت نہرو پر حملہ ہوگا اور انھیں قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ جس شخص کو اس کام پر مقرر کیا گیا ہے وہ نہرو کے حفاظتی اسٹاف شامل ہے۔ نام بھی بتا دیا تھا۔ رفیع صاحب نے کیا کیا؟ اتنا معلوم ہے کہ وہ شخص گاندھی گراؤنڈ ساتھ میں گیا اور اسکیم ہنگامہ ہونے کے باوجود فیل ہو گئی۔

پگڑی

اب محلّوں میں ایک بہت بڑا جھگڑا مکانات کا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایک نئی وبا "پگڑی" سندھ سے آکر ہندوستان میں پھیل گئی تھی۔ میں نے تو کبھی اپنے ہوش میں "پگڑی" کا نام سنا نہ تھا۔ کچھ دن تو سمجھ ہی نہ سکی کہ یہ ہے کیا بلا؟ پھر ساتھیوں نے مجھے پگڑی کی اہمیت اور کاروباری حیثیت سمجھائی۔ جن دنوں کیمپ میں ہزاروں آدمی روزانہ آرہے تھے، تو ہم سب نے صورت حال سے پریشان ہوکر، اور اس افراتفری کو روکنے کے لیے گورنمنٹ سے درخواست کی تھی کہ جب تک امن قائم نہ ہو جائے مسلم محلوں میں کوئی شرنارتھی نہ بسایا جائے ایک مکان بستے ہی دس گھر اجڑ کر کیمپ میں آجاتے ہیں۔ کچھ ان کے اپنے دلوں میں دہشت بیٹھ گئی تھی اس کے خیالی اثر سے بھاگتے تھے۔ اور کچھ شرنارتھی بھی عجیب وغریب حرکتیں کرتے تھے۔ پہلے دن سے وہ اس کوشش میں لگ جاتے تھے کہ محلہ بھر میں اپنی برادری اور بھائیوں کا قبضہ کرادیں۔ اور مقامی باشندوں کو اتنا مجبور کریں[1] کہ وہ سر پہ پیر رکھ کر بھاگ نکلیں۔

بہرحال گورنمنٹ نے مسلم زون قائم ... کردیے تھے اور ان کے خالی مکانات صرف مسلم رفیوجیز سے بھرے جارہے تھے، اگرچہ اب بھی بہت سے خالی تھے۔

بڑا سخت امتحان تھا۔ کام کرنے والوں اور پنجابیوں دونوں کا۔ ایک طرف تو دھوپ لُو سے سوکھتے ہوئے جسم تھے، جو بے قرار ہوکر ان علاقوں کی طرف لپکتے تھے، جہاں ان کو سایہ اور چھت ملنے کی امید تھی۔ ادھر کارکن تھے جن میں سے بہتوں کے خاندان خود اس مصیبت کا شکار تھے۔ مگر پارٹی کا حکم تھا، جماعت کے اصولوں کی پابندی تھی، اور امن وانصاف کی خواہش تھی جو ان کو مجبور کرتی تھی کہ کھڑے کھڑے ان مصیبت زدوں کو محلّہ سے نکال باہر کریں۔

تین بڑے بڑے علاقے "مسلم زون" تھے۔ ادھر جامع مسجد کا علاقہ۔ ادھر بلیماران وغیرہ اور پھر باڑہ ہندوراؤ۔ چوتھا چھوٹا سا زون نظام الدین تھا۔ اس میں دوسروں کے لیے جگہ بھی نہ تھی۔ پہلے ہی مسلم پناہ گزینوں نے اس پر قبضہ کرلیا تھا۔

ان کی ناقابل برداشت مصیبتیں دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھتا تھا۔ وہ آکر مجھ سے فریاد

---

[1] یہ بدرجۂ مجبوری تھا یا انتقاماً یا غالباً دونوں۔

کرتے اور کہتے کہ تم کہہ دو تو مسلمان تمھاری بات سُن لیں گے۔ میں ان کو لے کر جاتی مگر ناکام واپس آتی۔ مجھے آج تک افسوس ہے کہ ایک شریف انسان مسٹر تلوار اور بھولے پنجابی لڑکے کی میں مدد نہ کر سکی۔ ان دونوں کو ساتھ لے کر میں مسلم علاقوں کے انچارج سے ملی۔ سوشلسٹ پارٹی سے سفارش کی، امداد بحالی کے کمشنر کے پاس گئی۔ جمعیتہ کے آفس بھیجا کہ کسی طرح ان غریبوں کو ایک ایسی جائے رہائش مل جائے، جہاں ان کے خاندان کے بارہ اور سولہ افراد رات کو سو سکیں۔ مگر کچھ بھی نہ ہو سکا۔ حاجتمند کی مدد کسی نے نہیں کی، اور "پگڑی" دینے والے مسلم زون میں مکان حاصل کرتے رہے، دیوار پھاند کر مکانوں میں گھس جانے والے مکانوں پر قبضہ کرتے رہے۔

ہوتا یہ تھا کہ امرا جا چکے تھے اور جاتے وقت اپنی جائداد محفوظ رکھنے اور وقت آنے پر بیچ دینے کے خیال سے اپنے کسی غریب دوست پڑوسی یا ملازم کو اپنے مکان میں ٹھہرا گئے تھے۔ وہ دوست پڑوسی یا رشتے دار، اگر شریف ہوتا تو آخر تک مکان کو اپنے قبضہ میں رکھتا تھا اور اگر وہ چاہتا تھا تو پانچ ہزار دس ہزار "پگڑی" کے لے کر اسے کسی شرنارتھی بھائی کے حوالہ کر دیتا تھا۔

کچھ ایسے مسلم تاجر تھے، جو فساد میں تو بچے رہے، مگر اب انھیں ہندوستان میں ٹھہرنا نہ تھا، اپنی جائدادوں کو بیچ کر جانا چاہتے تھے۔ فروخت کرنا آسان نہ تھا اس لیے مال اسباب بیچ کر، دکان اور مکان کی پگڑی کے ہزاروں لے کر، وہ فی الحال پاکستان جا رہے تھے، تاکہ جب حالات بدلیں تو آ کر اپنی جائداد فروخت کر جائیں۔

وہ بے در، بے گھر لوگ اتنے مصائب کے شکار ہرگز نہ ہوتے، اگر ان کے خود غرض لیڈروں نے ان کو یہ نہ سکھایا ہوتا کہ جاؤ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو مار کر وہاں سے نکال دو۔ ان کی زمین اور جائداد پر قبضہ کر لو۔ میرا خیال ہے، یو۔پی اور دہلی کے مسلمان اتنے بے درد نہ تھے کہ مصیبت زدوں کی مدد سے پہلو تہی کرتے اور پھر ان میں تو ہزاروں گورنمنٹ ملازم بھی تھے، تجارت پیشہ بھی تھے، جو کرایہ دے سکتے تھے۔ کیا اس سے پہلے کسی مسلمان نے اپنا مکان کسی غیر مسلم کو کرایہ پر دیا نہیں تھا۔ میں نے ایک مکان میں مسلم، عیسائی ہندو اور سکھ خاندانوں کو مکان کے چار حصوں میں رہتے دیکھا تھا۔ لیکن ان غلط لیڈروں کی رہنمائی نے ان کو اور بھی تباہ کیا۔ بجائے اس کے کہ ان کو یہ سکھاتے کہ لڑو۔ اپنے حق کے لیے جم کر لڑو۔ اور جن سے نقصان پہنچا ہے، انھیں کو مارو — یہ بتایا کہ چل کر ہندوستان

کے مسلمانوں کو مارو۔

بے اختیاری میں وہ سب لوگ نہیں بھاگے تھے۔ وہاں بھی یہی پروپیگنڈا کیا گیا تھا کہ ایک بھی ہندو سکھ پاکستان میں اب نہ رہے گا۔ سب بھاگ چلو۔ ادھر ناتجربہ کار اور الھڑ کانگرس گورنمنٹ تھی۔ اس نے گاڑیاں اور ہوائی جہاز بھیج بھیج کر ان کو منگوانا شروع کر دیا۔ یہ نہ کیا کہ اپنی فوجیں بھڑا دیتی۔ بجائے اپنی ہی آبادی اور رعایا کو قتل کرانے کے یہ ہیجان اگر ہندوستان، پاکستان کی سرحد پر دو پاگل حکومتوں کو ٹکرا دیتا، تو اس سے ہزار درجہ بہتر ہوتا۔ یہ انتقامی جوش، گلیوں اور سڑکوں پر خون کا چھڑکاؤ نہ کرتا۔ میدان جنگ اس خون سے لالہ زار بنا ہوتا، جو مظلوموں کی حمایت اور ظلم و جبر کو مٹانے کے لیے بہایا جاتا تو اچھا ہوتا۔

مجرم تھا، پڑھا لکھا طبقہ۔ نوکر شاہی۔ لیڈر اور مذہب کے ٹھیکیدار۔ ان سب کو آپس میں بھڑا کر خون خرابہ سے تسکین حاصل کرنا تھی لیکن جس طرح مسلمانوں کا پڑھا لکھا گروہ مسلم لیگ کا علمبردار بن کر عوام کو پاگل بنانے کا ذمہ دار تھا، اسی طرح ہندوؤں کا پڑھا لکھا گروہ راشٹریہ سنگھ کی تخلیق اور اس کی تخریبی سرگرمیوں کا ذمہ دار تھا۔ حالات نے کچھ ایسی پیچیدگی اختیار کر لی تھی کہ کسی ایک فریق کو ملزم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مسلمانوں کی کانگرس سے بدظنی اور بے اعتقادی کچھ ان کے اپنے ہی دماغ کی خرابی نہ تھی۔ اس میں بہت کچھ دخل ان مہاشہ جی کا بھی تھا، جو کبھی آریہ سماج کے مندر میں بھاشن دیتے نظر آتے تھے، کبھی ہندی ساہتیہ سمیلن کے جلسہ میں، کبھی راشٹریہ سنگھ کی پریڈ اپنے سامنے کراتے تھے، اور کبھی ایک قوم، ایک کلچر کا نعرہ لگاتے تھے اور کانگرس کے ذمہ دار لیڈر بھی تھے۔

مسلم لیگ کی کامیابی کچھ "لیکے رہیں گے پاکستان" کے نعرہ کا نتیجہ نہ تھی، اگر مذہبیت قرآن بدست ساتھ نہ ہو لیتی، اور پردہ کے پیچھے سے کوئی تار نہ کھینچتا رہتا تو سارا پڑھا لکھا طبقہ کیسے گھسٹ جاتا؟ کچھ اپنے اغراض تھے۔ کچھ فطری تفوق و برتری کی خواہش تھی۔ کچھ غلط مذہبی جوش تھا، اور کچھ ڈیڑھ سو سالہ تعلیم و تربیت کے اثر سے اخلاقی گراوٹ تھی جس نے ذلت کے اس غار میں گرایا۔

بڈھوں کو تو جلدی تھی کہ اپنی آنکھ کے سامنے آزاد ہندوستان و پاکستان دیکھ لیں۔ کیا ہوتا، اگر یہ دن دیکھنا نوجوان آنکھوں کے لیے چھوڑ دیا جاتا اور خود صرف کوشش میں قبر کا راستہ لیتے!

اب جب کہ وقت گزر چکا ہے، ایسے بہتیرے خیالات آتے ہیں "جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا"! لیکن سب بے کار ہے، آئندہ نسلیں اس کو سوچیں گی۔ مستقبل کا مورخ اس کو لکھے گا۔ مگر بات تو جب ہے کوئی عبرت بھی حاصل کرے۔

نتیجہ بھگتنا پڑا صرف عوام کو، غریبوں کو، متوسط طبقہ کو، اور سب سے زیادہ عورتوں کو اور ان سے بھی زیادہ بڈھوں کو جنہیں موت بھی نہ آئی۔

یہ صرف دونوں طرف لیڈروں کی سیاست ہی نہ تھی۔ نوکر شاہی، سرمایہ داروں اور مہاراجوں کی ملی جلی زبردست سازش تھی۔ گورنمنٹ کے دفاتر مسلم نیشنل گارڈ اور راشٹریہ سنگھ کا اڈہ بنے ہوئے تھے ساری کارروائیاں وہیں سے ہوتی تھیں۔ شروع وہیں سے ہوا اور اب وہی لوگ تھے جو حکومتوں کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ فوج۔ پولیس اور براڈ کاسٹنگ تینوں ڈپارٹمنٹ نے مل کر ملک کا ستیاناس کر ڈالا۔

ایک ایسی منظم سازش، جس نے ہندوستان کی اتنی زندہ، تندرست، دولت مند اور بہادر قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ ہندوستان کے مسلمان اپنے کو اقلیت کہہ سکتے ہیں، مگر وہ ہندو[1] اقلیت کہاں سے تھے۔ ان کی تعداد تو مسلمانوں سے کچھ ہی کم تھی۔ ہر چیز میں ہر بات میں وہ ہم پلہ کیا اور اونچے ہی تھے۔ اگر ان مظالم کے خلاف جو پاکستان میں ان پر توڑے جا رہے تھے، پر امن جنگ چھیڑ دیتے، اور پھر اپنے ہندوستان کے ہندو بھائیوں سے مدد مانگتے تو مجھے یقین ہے ہندو کیسے خود مسلمان بھائی اس ظلم کے خلاف ان کی مدد کرتے یا شاید ایسا نہ ہوتا۔ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی مگر اب سوچتی ہوں، تو یہی خیال آتا ہے کہ ہم سب ضرور مدد کرتے۔ ان میں سے جو یہاں آتا اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے، کیا پتہ کیا ہوتا؟ لیکن میں کوئی سیاستدان تو ہوں نہیں اس لیے میری رائے کی وقعت بھی کیا ہو سکتی ہے۔ میں تو صرف ایک عورت ہوں، اور میرا نقطۂ نظر قانونی آنکھوں میں کیسے سما سکتا ہے۔

جنوری میں عارضی اسکول کے ایک جلسہ میں، میں قرول باغ گئی تھی۔ اور صاف ستھرے

---

[1] ۔ یعنی پنجاب و بنگال کے ہندو سکھ۔

پنجابی و سندھی بچوں کے شاداب چہرے اور محنتی نوجوانوں کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی تھی۔

لیکن میں وہاں بھی سوچنے لگی کہ دلّی کی گرم و خشک آب و ہوا کب تک پانچ دریاؤں سے شاداب ہونے والی اس کھیتی کو ہری رکھ سکے گی؟ یہ پھول جیسے چہرے کمھلا کر نیلے پڑ جائیں گے یہ گرانڈیل جوان کمریں جھکا دیں گے۔ ہڈیاں ابھر آئیں گی اور پنجاب کا حسن دلّی کی پتھریلی زمین جذب کر لے گی۔ چند ہی دن گزرے ہیں مگر دیکھ لو۔ نہ ان ہونٹوں پر اب ماہیا ہے، نہ ہیر، ان پر تو اب صرف گالیاں اور کوسنے .... باقی رہ گئے ہیں۔

"آں قدح بشکست وآں ساقی نماند"

12

نیکی کا بدلہ بدی

ہمارے تعلیمی مرکز کے اوپر والے دونوں کمرے لڑکوں نے ایک شرنارتھی خاندان کو رہائش کے لیے دیدیئے تھے۔ میں ڈری کہ دوسروں کی طرح کہیں یہ بھی انگلی دیتے ہی پہنچا نہ پکڑلیں مگر لڑکوں نے کہا، نہیں، وہ بہت شریف آدمی ہیں۔ آپ اطمینان رکھیے۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے لڑکی کی شادی رچائی اور اس سلسلہ میں کافی مہمان آتے جاتے رہے شادی میں شرکت کے لیے ان کے ایک عزیز بھی آئے تھے جو ماسٹر تھے اور انھوں نے جب اس اسکول کو دیکھا تو بے حد خوش ہوئے کہنے لگے:

"بھئی ہمارا بھی ایک پرائیویٹ اسکول راولپنڈی میں تھا وہ تباہ ہوگیا۔ دل چاہتا ہے، میں بھی یہاں رہ جاؤں، اور پڑھانا شروع کردوں"

اسکول میں ماسٹر ہی کون بہت تھے۔ ہم تو ایسے سرفروشوں کی تلاش میں رہا کرتے تھے، جو کھانے پینے کچھ نہ ہوں۔ کسی وقت آرام نہ کرتے ہوں، اور کام ۲۴ گھنٹے کرتے ہوں۔ سب ہی یہ سن کر خوش ہوئے اور اپنی پارٹی میں ان کو شامل کرلیا۔

شادی ختم ہوتے ہی بچارے بےپناہ گزیں بیمار ہوگئے اور ان کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ادھر ماسٹر صاحب اپنے بیوی بچوں کو لے کر مستقل قیام کے ارادے سے آگئے اور نیچے کے دو کمرے ان کو رہائش کے لیے دیدیئے گئے۔ اسپتال میں کئی دن رہنے کے بعد ایک دن مریض چل بسا اور عین اس وقت کہ ان کی لاش ایمبولنس سے اتاری جارہی تھی۔ میں پہنچی۔ پیچھے پیچھے میں بھی اوپر گئی، اور وہ خوفناک سین میں نے دیکھا ہے کہ دہل گئی۔ بہت سے مرد، اور عورتیں اپنے سینے پر دوہتھڑ مار رہے تھے۔ سب بلند آواز سے بین کرکر کے رو رہے تھے اور بیوہ نے تو پیٹتے پیٹتے اپنا برا حال کرڈالا تھا۔ پھر اس نے ایک جوتی اٹھائی اور اسے اپنے چہرہ پر پوری طاقت سے مارنے لگی۔ گھونسوں سے کوٹتے کوٹتے اس نے

سینہ بالکل سرخ کر ڈالا تھا۔ میں نے لپک کر اسے تھام لیا اور ماسٹر سے کہا، کہ بھئی انھیں سنبھالو۔ یہ کہیں جان نہ دیدے، مگر انھوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ خود رونے چلانے میں مصروف رہے۔ دو ایک سے اور بھی میں نے کہا، مگر کسی نے نہ بیوہ کو روکا نہ سنبھالا۔ وہ سب خود ہی کر رہے تھے، اور میں گھبرائی جا رہی تھی کہ او خدا یہ کیا آفت ہے۔ یہ بین، یہ گھما گھم، یہ چیخیں سنتے سنتے مجھے ایسا لگا کہ خود ہی بے ہوش ہو رہی ہوں۔ موت کس نے نہیں دیکھی۔ خود میرے اوپر جو پڑ گئی وہ ایسا ناگہانی حادثہ تھا کہ تعجب ہے دل کی حرکت کیوں نہ بند ہو گئی لیکن مرنے والے کو اس طرح رویا بھی جاتا ہے، یہ نہ معلوم تھا !!

زمانہ جاہلیت کے حالات کتابوں میں پڑھے تھے، یہ خیال بھی نہ تھا کہ بیسویں صدی میں بھی ہندوستان کے ایک حصہ میں یہ رسم اپنی پوری شدّت کے ساتھ موجود ہے۔ اور تعلیم یافتہ مرد تک اس میں شریک ہوتے ہیں۔ کئی دن مسلسل یونہی ہوتا رہا لیکن پھر میری ہمت نہ پڑی کہ یہ سماں دیکھوں!

اس واقعہ کے بعد لڑکوں نے کوئی دقیقہ اس خاندان کی مدد کا باقی نہ چھوڑا۔ ماسٹر بھی مع اپنے بال بچوں کے آ گئے تھے۔ جون۔ جولائی کی گرمیوں میں راولپنڈی کے رہنے والے بیچارے گرمی کی شدّت سے پریشان ہو رہے تھے۔ اس ساری عمارت میں صرف ایک کمرہ تھا جہاں پنکھا لگا ہوا تھا۔ دوپہر میں سارے لڑکے پچھلے کمرہ میں گرمی سے بھن کر گذار دیتے اور پنکھے والا کمرہ ماسٹر کی فیملی کو دیدیتے کہ یہ لوگ اتنی گرمی کے عادی نہیں ہیں۔ انھیں کو ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا گیا، اور انھیں ان ایثار پیشہ لڑکوں کے مقابلے میں دگنی تنخواہ دی گئی تاکہ کسی طرح اپنا گزارہ کر سکیں۔

لیکن ماسٹر صاحب نے اس کا کیا بدلہ دیا۔ ذرا وہ بھی سن لیجیے۔

اپریل میں انھوں نے امتحان شروع ہونے سے کچھ پہلے بچوں میں پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ میں اپنا اسکول کھولنے والا ہوں۔ پھر لڑکوں سے کہا کہ اس مکان کے چند کمرے ہمیں دے دو۔ لڑکوں نے کہا، اسکول جامعہ کا ہے اور ایک عمارت میں دو اسکول جاری ہونے کی کوئی بھی امید نہیں ہے۔ ماسٹر نے اعلان کیا کہ وہ اتنی قلیل تنخواہ پر بسر نہیں کر سکتے۔ کم از کم چار سو ان کی فیملی کے لیے چاہئیں۔ ہر چند ان کو سمجھایا کہ ادارہ میں تو کوئی سو روپیہ بھی تنخواہ نہیں لیتا۔ آپ کو اتنی رقم کہاں سے دی جا سکتی ہے۔ آپ نے خود ہی ہمارے ساتھ شرکت کی۔ یہ تو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ مالی فائدہ کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں ہے، لیکن وہ

نہ سمجھے، اور لڑکوں کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ تم بیکار یہاں پڑھ رہے ہو، یہ تو ٹمپریری اسکول ہے کوئی اسکول اس کی سند کو تسلیم نہ کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکوں میں عام بے اطمینانی پھیل گئی۔

دو لڑکیاں بھی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ ہم نے ٹیلیفون اور پولیس گائڈ کے لیے درخواستیں دے رکھی ہیں، اس لیے اگر جامعہ سے ہم کو سوشل سروس کا سرٹیفکیٹ مل جائے تو ہماری درخواست پر یقیناً زیادہ توجہ دی جائے گی۔ میں نے شفیق[1] صاحب سے کہا، اور انھوں نے سرٹیفکٹ دیدیا۔ اسے لے کر وہ ماسٹر صاحب کے پاس گئیں، اور خدا جانے کیا بات چیت ہوئی کہ کمرہ سے باہر نکلتے ہی انھوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، اور ناظم مدرسہ کے ہاتھوں میں پکڑا دیا کہ ہمیں ایسے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔

لڑکوں نے بچوں کے میلہ کا پروگرام بنایا، اور اس کی تیاریاں شروع ہو گئیں نقشے، بورڈ، اور تصویریں وغیرہ تیار ہو چکی تھیں اور امتحان اس تیاری کی وجہ سے چند دن کے لیے ملتوی کر دیے گئے تھے کہ ایک دن ماسٹر صاحب نے چھٹی جماعت کے بچوں سے جو نسبتاً اسکول میں سب سے عمر میں زائد تھے، اور اسی نسبت سے عقل میں بھی کچھ کہا سنا۔ تو ان میں شورش پھیل گئی۔ لڑکے کہتے تھے۔ امتحان کیوں نہیں ہوتے۔ ہم کو دوسرے اسکول میں داخلہ کی درخواست دینا ہے۔ اس لیے ایک ہفتہ بعد نہیں ابھی امتحان ہونا چاہیے۔

شورش بڑھتی گئی۔ انھوں نے گھسیٹ کر دوسرے کلاسوں کے بچوں کو بھی باہر نکالا اور شور مچایا کہ ہمیں اسکول نہیں چاہیے۔ ہم اس کو آگ لگا دیں گے۔ اس افراتفری میں ہندو بچے باہر نکل آئے۔ مسلم بچے اندر بیٹھے رہے، اور آپس میں حجت بحث ہونے لگی۔ خاصا ہندو مسلم فساد شروع ہونے کی نوبت آگئی تھی مگر اسکول کے کرتا دھرتا نوجوانوں کو اس وقت سمجھ آگئی۔ انھوں نے فوراً آپس میں صلاح کی اور چھٹی کا اعلان کر دیا۔ مگر اس وقت تک نقشے پھاڑے جا چکے تھے، تصویریں چاک کی جا چکی تھیں، کمرے الٹ پلٹ ہو گئے تھے، اور آگ لگانے کے لیے دیا سلائی ڈھونڈی جا رہی تھی۔ جھٹ پٹ ہندو مسلمان سب بچوں کو اسکول سے باہر نکال کر کمرے بند کر دیے گئے، اور مجھے فون سے تمام حالات کی اطلاع دی گئی۔

---

[1] ۔ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادھر بچے گھر پہنچے تو بہت سے والدین پریشان ہو گئے۔ ان میں سے کسی کو اسکول سے شکایت نہ تھی۔ پنجاب کے سوشلسٹ لیڈر رشیداؔ[1] فوراً دوڑے ہوئے آئے۔ ارے بھائی یہ کیا ہوا؟ جامعہ کے اسکول میں گڑبڑ کیسی؟ وہ حیران ہو ہو کر پوچھتے تھے، اور لڑکوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا اپنے ساتھی کی شکایت کیسے کریں۔ بہر حال انھوں نے سچی کیفیت کہہ سنائی۔ ہوشیار سوشلسٹ جو خود بھی پناہ گزیں تھا معاملہ کی تہہ تک پہنچ گیا، اور اپنے پرانے کلاس فیلو ماسٹر صاحب سے بھڑ پڑا۔ خاصی تلخ گفتگو ہوئی، اور رشیداؔ صاحب یہ کہہ کر چلے گئے۔ کچھ ہو میرے بچے تو یہیں پڑھیں گے۔

مقامی سوشلسٹ پارٹی کے سکریٹری، ایک مشہور اخبار کے ایڈیٹر، ایک پناہ گزیں پروفیسر ایک سردار جی جسے دیکھو دوڑا چلا آرہا ہے۔ غرض تانتا بندھ گیا۔ اسی وقت سے جو والدین آنے شروع ہوئے ہیں، تو دوپہر تک سلسلہ جاری رہا۔ قریب قریب سب کو افسوس تھا، ندامت تھی، صرف چند تھے، جو اپنے بچوں کی طرف سے ہم سے لڑنے آئے ورنہ عام طور پر سب یہی کہہ رہے تھے، کہ اس افراتفری میں صرف جامعہ کا اسکول تھا جس کی بدولت بچوں کے مستقبل کی طرف سے ہم کو تھوڑی بے فکری نصیب ہوئی۔ اب ہم اس کو ہرگز بند نہ ہونے دیں گے، نہ یہاں کوئی جھگڑا ہونے دیں گے۔ غرض معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ دوسرے دن سے امتحان بھی شروع ہو گئے اور دو ہفتہ بعد خاصا شاندار میلہ بھی ہوا۔ اسکول میں ایک مہینے کی چھٹی ہو گئی۔

مگر ماسٹر صاحب اب بہت خطرناک لگنے لگے۔ پناہ گزیں کو بے گھر کرنا اپنا ضمیر گوارہ نہ کرتا تھا، اور رکھنے میں یہ خطرہ تھا کہ اب کی بار سچ مچ ہی آگ لگوا دیں گے لڑکے اپنی خلقی مروّت کی بنا پر صاف کہنے سے معذور تھے۔ یہ کام بھی مجھی کو انجام دینا پڑا۔ یوں تو ان کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ جامعہ چونکہ آپ کی مالی مشکلات دور نہیں کر سکتا اس لیے آپ دوسری ملازمت تلاش کر لیجیے۔ اب یہ بھی ان سے کہدیا کہ چونکہ اب جامعہ نے اسکول کی منظوری دیدی ہے، اس لیے جولائی میں یقیناً داخلے زائد ہوں گے اور جگہ کی دقت ہو جائے گی، اس لیے مہربانی سے آپ دوسرا مکان تلاش کر لیجیے۔

انھوں نے کہا میں خود دوسرا ڈھونڈھ رہا ہوں۔ پندرہ دن بعد پھر یاد دلایا تو جواب دیا۔ دوسری درخواست بھیج چکا ہوں۔ ایک مہینہ بعد جب اسکول دوبارہ کھل گیا، اور بچوں کی تعداد تین سو سے اوپر ہو گئی، ادھر ماسٹر صاحب کے ملنے والے اور رشتے دار بھی دوگنے ہو گئے۔

---

[1] ۔ پروفیسر راجندر رشیدا

تو کھنچاؤ، ناگواری، اور تعلقات میں خرابی شروع ہو گئی۔ ماسٹر صاحب اپنے ایک اور عزیز کو بھی لے آئے اور دو کمرے ان کے قبضے میں دے دیے۔ یعنی اب نیچے کے چار اور اوپر کے دو ان کے خاندان کے کل چھ کمرے ہو گئے۔ بدقسمتی سے راستہ صرف ایک تھا۔ اسی سے لڑکوں کا عظیم الشان غول گزرتا۔ اسی سے محلہ کے لوگ اخبار کے شوقین آتے جاتے اور اسی سے ماسٹر کے رشتے دار سائیکل سمیت گزر جانا چاہتے تھے۔ اسی پر ایک دن تکرار ہو گئی۔ چپراسی نے سائیکل روک لی۔ ماسٹر نے دھمکیاں دیں، اور چیلنج بھی۔

آخر کار کوشش کر کے محلہ کے دوسرے سرے پر دو کمرے بیوہ[1] عورت کو دلوا دیے اور وہ بیچاری تو پہلے بھی کہتی تھی۔ "بھیا تم ہمیں جہاں بٹھا دو گے چلے جائیں گے۔" وہ اپنے بچوں سمیت دوسرے مکان میں چلی گئی۔ اوپر کا حصہ خالی ہو گیا یعنی اصل باشندے منتقل ہو گئے۔ شانتی دل، کانگرس کمیٹی، سوشلسٹ پارٹی سب کو درخواستیں لڑکوں نے دیں کہ اسکول کو اس غاصبانہ قبضہ سے نجات دلائی جائے۔

میں نے ایک دن کسٹوڈین کے نام درخواست لکھوائی اور ماسٹر صاحب سے کہا۔ اس پر دستخط کر دیجیے تاکہ میں خود جا کر آپ کے مکان کے لیے کوشش کروں۔ مگر ان کا منشا ہی دوسرا تھا، کسی طرح دستخط نہ کیے۔ سچی بات یہ ہے کہ ماسٹر صاحب کا رشتے دار یا دوست ایک پولیس والا بھی تھا، اور اس کی شہ پر وہ اور بھی حیران کر رہے تھے۔ پھر یہ بھی واقف ہو چکے تھے کہ یہ لوگ ہم پر زبردستی نہ کریں گے۔ شرافت کا دامن پکڑے بدھو بنے رہیں گے۔

خدا خدا کر کے اگست میں جا کر یہ معاملہ طے ہوا۔ جب ڈپٹی کمشنر، اور چیف کمشنر تک کے پاس اسے پہنچایا گیا اور اس روز روز کی جھک جھک سے نجات ملی۔

بظاہر بالکل معمولی سا واقعہ ہے۔ لیکن میں نے صرف اس لیے لکھنا ضروری سمجھا کہ قارئین اندازہ کر لیں کہ کس حد تک بربادی اور تخریب کی طرف دماغ مائل ہو چکے تھے اور انتقام کی آگ نے تعلیم یافتہ انسانوں کی عقل اور سوجھ بوجھ کو بھی جلا ڈالا تھا۔ یہ ماسٹر، یہ حکام، یہ دفاتر کے بابو لوگ یہی سب لوگ تو اس شرمناک حالت کے جنم داتا تھے۔

---

[1] ۔ پہلے کرایہ دار کی بیوہ۔

13

مئی اور جون

مئی میں محلوں کے اندر کام کرنے والوں کی مشکلات اور بڑھ گئیں، ایک تو افواہیں، جو پتہ نہیں کہاں سے اڑاڑ کے آتی تھیں، اور کون انھیں پھیلاتا تھا، مگر ایک کان بھی محفوظ نہ رہتا جوان کو نہ سنے، اور پھر مسلم زون تھے، جو مستقل باعثِ نزاع بنے ہوئے تھے۔ مکانوں کی قلت لوگوں کو مجبور کر رہی تھی کہ مسلمانوں کو خوشامد یا دھونس، جیسے بھی ہو، مکان دینے پر راضی کرلیں۔ حکام اپنے مخصوص آدمیوں کو شہر کے ذمہ دار افراد کی مدد سے مسلم زون میں مکان دلوا دیتے تھے۔ افسرانِ پولیس ڈنڈے کے زور سے متعصب مسلمانوں کو بھی مجبور کر دیتے تھے کہ ان کے دوست یار رشتے دار کو مکان دیں۔ اور جب ایک کو مل جاتا تو دس للچاتے۔ بہت سارے اکٹھے ہو کر دھاوا بول دیتے۔ اب انھوں نے ایک طریقہ اور اختیار کیا تھا کہ مرد خود نہیں جاتے، عورتوں اور بچوں کے غول روانہ کرتے عورتیں بچوں سمیت گلی میں گھس جاتیں اور مکانوں پر قبضہ کر لیتیں۔

اصل میں ایک محلے کے تمام مکانوں کو بچانے[1] کا ذمہ دار شانتی دل تھا اس لیے لوگ عام طور پر ہمارے والنٹیروں سے بدظن تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ہنگامی دور میں ہمارے کارکنوں سے بہت سی غلطیاں ہوئیں مگر ان غلطیوں کی تنہا ذمہ داری والنٹیروں پر لاد دینا زیادتی ہے۔ ایک دور میں جب ہندوستان کی سرزمین سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دینے کا جذبہ عروج پر تھا اور عوام سے لے کر حکام تک سب ہی آپے سے باہر ہو رہے تھے، ان دنوں جب خود

---

[1] چونکہ پچھلے اعلان کے مطابق ابھی مسلم زون قائم تھے اور ہماری کوششیں کسی طرح دونوں فرقوں کو ساتھ رہنے پر رضامند نہ کرسکی تھیں، اس لیے فی الحال یہی اصول تھا کہ جب تک گورنمنٹ زون توڑنے کا اعلان نہ کر دے مسلم محلوں میں صرف مسلم آبادی یا پرانی ہندو آبادی رہے مگر نئے لوگ نہ بسائے جائیں، یہ بھی قیام امن کے لیے ایک عارضی کوشش تھی۔

قانون کے محافظ، قانون کی خلاف ورزیاں کیا کرتے تھے۔ باپو موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھے اور کام کرنے والے باقی ہی نہ رہ گئے تھے تو چند مخلص نوجوانوں کو، جو سچے دل سے اس اندھیر گردی کو ختم کرنا چاہتے تھے، اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ نوآموز اور ناتجربہ کار نوجوانوں کو لے کر آگے بڑھیں، اور نئی پود کا سہارا ڈھونڈھیں حالانکہ جب پرانے درخت اپنی جڑوں پر ڈگمگا رہے تھے تو پودوں کا سہارا کوئی سہارا نہ تھا۔ لیکن یہ امید ضرور تھی کہ شاید یہ سنبھالا لے کر کسی دن اس اجڑے باغ میں پھر سے بہار لے آئیں، شاید یہی اس طوفان کو بہالے جائیں۔ یہ پڑھے لکھے نوجوان جن میں کچھ سوجھ بوجھ بھی تھی اس خونی کھیل سے اور اس صورت حال سے متنفر تھے، لیکن ان میں ضبط و تحمل کا فقدان تھا، اور جو کچھ خرابیاں پیدا ہوئیں شاید وہ اسی کی بدولت!

ادھر مسلم زون کی ساری کاروائی صرف زبانی تھی، مگر اس کی قانونی حیثیت کوئی نہ تھی۔ اب یہ لوکل حکام کا فرض تھا کہ سارے اسٹاف اور محکموں کو اس اعلان کی حقیقت سے مطلع کر دیں یا ان کو حکم بھیجدیں، مگر لوکل گورنمنٹ تو اس پر تلی ہوئی تھی کہ جھگڑا ختم نہ ہو۔ اس نے نہ عوام کی مصیبت دیکھی، نہ ہماری چیخ پکار سنی۔ بدستور اپنے پرانے ڈھرے پر قائم رہی اور شروع میں نہ جانے کتنی جگہ ہمیں یہی جواب ملا کہ ہم کو تو کوئی اطلاع نہیں ہے، ہمارے پاس کوئی آرڈر نہیں آیا ہے۔

ادھر مرکزی حکومت بغیر اسمبلی کے کوئی قانون نہ بنا سکتی تھی، اور آرڈیننس جاری کر کے ہنگامی حالات کو مستقل بنا دینا بھی مناسب نہ تھا۔ اس کے پاس بھی اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اصول تسلیم کر لے اور اس کا نفاذ مقامی حکومت کے سپرد کر دے۔

کچھ دن کے بعد بڑی مشکل اور دوڑ دھوپ سے حکام کو اس سمجھوتہ کا یقین دلایا گیا۔ مگر ان کو چار ماہ بیت گئے تو بھی سچ مچ یقین نہ آیا۔ ہم سب کی تقریریں جھوٹا بنتا تھا بنتے تھے، ہم کہتے مسلم زون ہے۔ پولیس آفیسر چپکے سے کہتے یہ کوئی قانونی حکم نہیں ہے۔ تم گھس جاؤ تم پر مقدمہ نہیں چل سکتا۔ حکام لوگوں سے کان میں اس اعلان کے کھوکھلے پن کا حال بیان کر دیتے، اور وہ لوگ ہنس ہنس کر ہمارا مضحکہ اڑاتے اور اپنی اپنی من مانی کرتے۔ محلوں پر حملے ہوتے تھے کبھی کبھی مار پیٹ اور پتھراؤ بھی ہو جاتا تھا، اور گالی گلوچ تو ہر روز ہی ہوتی رہتی۔ دکانیں بند ہو جاتیں۔ راہ چلتے بھاگ کر کانگرس آفس میں گھس جاتے۔ گھروں پر اینٹیں برسائی جاتیں اور ڈاکہ چوری کی وارداتیں تو اب اتنی عام تھیں جس کی انتہا نہیں۔

ایک روز ہم لوگ اپنے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انڈیا گیٹ کی طرف سے خوفناک چیخ کی آواز آئی .... ہم سب گھبرا کر اٹھ پڑے۔ پولیس مین دوڑا اور پھر بھاگتے ہوئے آدمیوں کا تعاقب کرتے کچھ لوگ دکھائی دیے۔

معلوم ہوا کسی دفتر کے کوئی بابو مع اپنی بیوی کے چہل قدمی کر رہے تھے۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے۔ انڈیا گیٹ کے اردگرد وسیع میدان اور کتنی ستھری سڑکیں لیکن اس تیز روشنی میں بھی دو سکھ نکل پڑے اور ان کی بیوی کو اٹھالیا۔ بابو نے مقابلے کی کوشش کی تو ایک نے انگلی ڈال کر ان کے گلپھڑے چیر دیے۔ اور یہ خوفناک چیخ ان کی تھی۔ بیوی بچ گئی۔ وہ خود بھی بچ گئے۔ زخم بھی ایک ہفتے میں ٹھیک ہو گئے ہوں گے، مگر اس واقعہ نے مہینوں کے لیے عورتوں کا شام کے بعد ادھر آنا بند کر دیا۔

بہر حال والنٹیر نا تجربہ کار تھے، مفلس تھے، بیکار تھے، اور ان میں سے اکثر پناہ گزیں تھے، وہ سبھدرا کو دل و جان سے چاہتے تھے، مگر تین وقت کھانا نہ کھانے کے بعد چوتھے وقت وہ بھوک سے جان نہیں دینا چاہتے تھے، اس لیے کسی نہ کسی ضرورت مند سے وعدہ وعید کر کے پیسہ اینٹھ لیتے تھے، تاکہ پیٹ کی آگ بجھا سکیں۔

ان میں کچھ ایسے تھے جو یہ بھی نہ جانتے تھے کہ عدم تشدد کس کو کہتے ہیں، وہ حملہ آوروں کو بھگاتے وقت جب بہت مشتعل ہو جاتے تو دو ایک ڈنڈے بھی رسید کر دیتے۔

آٹھ گھنٹہ مسلسل پھاٹک پر پہرہ دینے کے بعد جب وہ بہت تھک جاتے تو بعض وقت انھیں ان مسلمانوں کی صورت سے نفرت ہو جاتی جنھوں نے ان کو چائے تک کو نہیں پوچھا تھا حالانکہ وہ صرف انھیں کے جان بچانے کے لیے مر رہے تھے اور اس وقت وہ انتقامی جذبے کے ماتحت چور دروازہ سے کسی رفیوجی خاندان کو اندر گھسا دیتے۔

اور پھر جب مسلم زدن ٹوٹ گئے اور مکان الاٹ ہونے لگے تو ان میں ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ چونکہ انھوں نے بہت کام کیا ہے لہذا پہلا حق ان کا ہے۔ ادھر ان کے ساتھی بھی یہی سوچ رہے تھے کہ بجائے شریر لوگوں کے اگر یہ محلہ میں بس جائیں، تو بدامنی کی نوبت نہ آئے گی۔

اور اس موقع پر ہم سب نے غلطیاں کیں۔ پہاڑ کے برابر غلطیاں۔ سوشلسٹ نے سوشلسٹ۔ کانگریسیوں نے اپنے ساتھیوں کو، اور شانتی دل نے اپنے والنٹیروں کو مکانات دلوائے اور مستحق و مصیبت زدہ محروم رہ گئے!

یہ سب اس لیے نہیں ہوا کہ ہم ایسا کرنا چاہتے تھے، بلکہ نادانی میں سب کچھ ہوتا رہا اور سمجھ میں نہ آیا۔ بہت سے والنٹیر ایسے بھی تھے، جو ریلیف کمیٹی سے مالی امداد حاصل کرنے یا گورنمنٹ سے قرض لینے یا مکان کی طمع یا شہرت کی خاطر اس گروہ میں شامل ہو گئے تھے اور یہ سب ان کی اعانت اور ان کے مشورہ سے ہوا۔ لیکن اس الزام سے ہم اپنا دامن بچا نہ سکے کہ ہم نے بھی تھوڑی جانب داری کی۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے کہ جب ان کی اوپر بیان کی گئی خواہشات پوری نہ ہو سکیں تو انھوں نے پگڑیاں لے کر دوسروں کے مکانات کسی تیسرے کے نام الاٹ کروا دیے۔

سبھدرا بہت سمجھدار تھی۔ ہمارے ساتھی سب مخلص تھے اور ہم میں اکثر بڑے اونچ نیچ دیکھ کر کام کرنے والے لوگ بھی تھے، لیکن غیب داں کوئی بھی نہ تھا۔ اور ہمیں اپنے ساتھیوں پر بھروسہ بھی شاید ضرورت سے زیادہ ہو جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سبھدرا کو سب نے ستایا اور مقامی حکام نے والنٹیروں پر مقدمے تک چلا دیے۔ لیکن ان تمام دشواریوں کے ہوتے ہوئے بھی کام تو کرنا ہی تھا، اور بدنامی کی پرواہ کیے بغیر قدم بڑھانا ہی تھا۔ آج جب وقت گذر چکا ہے تو واقعات کا تجزیہ کرنا کتنا آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اس وقت ہمارے پاس اس پر غور کرنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔

اب ہمارے سامنے دو بڑے اہم مسائل تھے۔ رفیوجیز کو حتی الامکان مطمئن کر کے ان میں اور مسلمانوں میں تعلقات پیدا کرانا، اور ۱۵ جون کے فساد کو روکنا جس کی دھمکیاں ہر روز دی جا رہی تھیں۔

اس ایک نقطہ پر جمعیتہ، کانگرس، سوشلسٹ اور فارورڈ بلاک سب ہی متحد تھے، اور ہمارا گروہ ان سب کا معجون مرکب تھا۔ اس لیے یہ چھوٹی سی جماعت اپنی پچھلی سرگرمیاں اور کامیاب تجربے لے کر آگے بڑھی، اور طویل بحث و مباحثہ کے بعد سب نے اس پر اتفاق کیا کہ ہر پارٹی ان دنوں اپنا پارٹی پروپیگنڈہ بند کر دے۔ ایک مرکز پر متحد ہو کر ہم سب کام کریں۔ صرف امن اور اتحاد ہمارا مطمح نظر ہو، اور ہر قیمت پر ہم اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں، چاہے اس کے لیے ہمیں حکام سے جھگڑنا پڑے چاہے عوام سے لڑنا پڑے۔ خواہ حکومت سے ٹکرانا پڑے۔

یہ طے ہو جانے کے بعد تو ہم سب ایک مضبوط دیوار بن کر شورش پسندوں کے راستہ میں حائل ہو گئے۔ پناہ گزینوں میں سے نوجوان صحیح الخیال لڑکے، لڑکیاں جو پہلے ہی تعمیری کام کر رہے تھے، ہمارے ساتھ ہو گئے۔ کچھ سکھ بھائی تھے جو ہماری مدد کرنا چاہتے تھے، اور انھوں نے مختلف کاموں کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ ایک نے پبلسٹی میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔

مردولا[1] نے کہا۔ جو خطرہ درپیش ہے، وہ کسی ایک کے لیے نہیں ہے۔ پچھلے واقعات سے سب نے نقصان اٹھایا ہے۔ دیس کی شانتی، اس کی عزت، اس کی ترقی، یہی ہم سب کی منزل مقصود ہے۔ اس وقت اگر ہم نے مل جل کر کچھ کر لیا تو بنیاد مضبوط کریں گے ورنہ یہ آزادی خواب بن کر رہ جائے گی، اور بدلہ نفرت پھوٹ کے بیج اگر تہہ میں بیٹھ گئے تو پھر ہم ان کو کبھی نکال نہ سکیں گے۔

شانتی دل کا نیا روپ

سب نے اس سے اتفاق کیا کہ اپنی جماعت کی ساری طاقت اس وقت امن قائم کرنے میں خرچ کریں گے اور شانتی دل کو از سرِ نو آرگنائز کیا جائے لیکن آرگنائزیشن سنٹرل پیس کمیٹی کی ماتحتی میں ہو تاکہ مالی مشکلات کے وقت ہم اس سے مدد لے سکیں، اور راجندر بابو[2] کی امداد و اعانت بلکہ سرپرستی ہمیں حاصل رہے۔

راجندر بابو کے پاس کچھ ذمہ دار لوگ گئے۔ ان سے حالات بیان کیے اور ان کی منظوری بھی حاصل ہو گئی۔ بنیاد استوار کرنے کے بعد ڈھانچہ تیار ہوا۔ ہر پارٹی کی ایک ایک، دو دو، ذمہ دار ہستیاں شامل کر کے ایک مشاورتی بورڈ بنایا گیا۔ اس کی ماتحتی میں شہر دیہات، پروپیگنڈا اور کارکنوں کا انتخاب کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ کمیٹیاں ترتیب دی گئیں۔

اور ساری لڑائی، بھڑائی، دوڑ دھوپ اور روپیہ کی فراہمی مردولا کے سر چھوڑ دی گئی، یہ بھی کہ ہم سب کی بلائیں بھی وہ اپنے سر اوڑھیں گی۔

ہماری شہر کی گشتی کمیٹی بڑی زور دار تھی۔ اس کا کام سارے دن گھومنا تھا اور ہر علاقہ کے شانتی دل آفس کی رپورٹ مرکزی دفتر کو دینا تھی۔ شہر کے ۱۲ علاقوں میں شانتی دل کے دفتر قائم ہوئے جہاں الگ جگہ مل گئی وہاں الگ ورنہ کانگرس یا سوشلسٹ پارٹی کے آفس میں ساجھا کر لیا۔ ایک جگہ خیمہ لگا کر دفتر بنا لیا۔ ان ۱۲ مقامات کے حالات، ان کی نوعیت اور مسائل سب اکثر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے اور گشتی کمیٹی صبح سے شام تک ان جھگڑوں کو سلجھانے، اور ان حالات پر سوچ بچار کرنے میں وقت صرف کرتی تھی۔ شہر کے یہ دفتر محکمۂ اطلاعات کا کام بھی کرتے تھے اور اپنے علاقہ کے امن کے ذمہ دار بھی قرار دیئے گئے۔

---

[1] ۔ مردولا سارا بھائی۔

[2] ۔ پریسیڈنٹ آف انڈیا۔

پروپیگنڈہ میں پوسٹر۔ پمفلٹ۔ جلسہ۔ مشاعرہ۔ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ چلتی پھرتی تقریریں، اور جاسوسی، سب ہی کچھ شامل تھا۔ آخر میں ڈراما بھی رکھا مگر اس کا کوئی بندوبست نہ ہو گا۔

دیہاتی کمیٹی کا کام پورے دلی صوبہ کا دورہ، مقامی اور نئی آبادی میں بھائی چارہ قائم کرانا، مسلمانوں کی آبادکاری، ہر فیوجیز کی مشکلات کا حل سوچنا، اور ہر روز کی رپورٹ دفتر میں دینا سب شامل تھا۔

مرکزی دفتر اپنے انتخابی بورڈ کی مدد سے شہر کے تمام علاقوں کے لیے انچارج اور کارکن منتخب کرتا۔ اور وہی اس علاقہ کے امن اور تمام نزاعی مسائل کا نگراں اور ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔

ابھی یہ سب معاملات طے ہو ہی رہے تھے کہ ہم نے اپنے کام کو پھیلانا شروع کر دیا اور شہر و دیہات میں چھوٹے چھوٹے جلسے کرنے لگے۔

مہرولی کے پاس ایک گاؤں کے سقے قطب صاحب کی درگاہ میں پانی بھرا کرتے تھے۔ فساد کے دنوں میں وہ مرتد ہو گئے۔ لیکن جب گاندھی جی وہاں گئے تو انھوں نے گاؤں والوں سے کہا، کہ جو کچھ ہوا ہے زبردستی ہوا ہے، اسے مٹانا ضروری ہے، وہی سقے مسلمان کی حیثیت سے اب بھی قطب صاحب کی درگاہ میں پانی بھریں۔ ان کی شہادت کے بعد جب ونوبا بھاوے جی گئے تو وہ بھی یہی کہہ آئے۔

انھیں دنوں ہمیں خبر ملی۔ ایک میل پرے دوسرے گاؤں میں میواتیوں کی بڑی جماعت واپس آگئی[1] ہے اور انھوں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہائش اختیار کر کے محنت مزدوری شروع کر دی ہے۔ ان میں سے کچھ ہمارے پاس آتے بھی اور مفصل حالات سناتے رہے۔

اور چونکہ بلا کسی امداد کے آکر ٹھہر گئے اس لیے بڑی مصیبت کی زندگی گزار رہے تھے، ہم سب کی رائے ہوئی کہ ایک جلسہ اس گاؤں میں کرنا چاہیے جہاں کے سقوں کا معاملہ ہے اور اس میں ان میواتیوں کو بھی مدعو کر کے سب سے میل ملاپ کرایا جائے۔

جلسہ کے لیے ہم نے مہرولی کانگرس کمیٹی کو مطلع کیا۔ پھر دوبارہ اس گاؤں کے ذمہ دار لوگوں سے کہلایا اور مقررہ روز ہم سب جا پہنچے مگر وہاں اس وقت تک کوئی نہ تھا۔ مقامی کمیٹی کے صدر کی خواہش تھی، جلسہ آج بھی ملتوی کر دیا جائے، چونکہ دوبارہ کوشش ہو چکی تھی، اس لیے سبھدرا کو چڑ سی ہو گئی۔ اس نے کہا میں بیٹھی ہوں، آپ سب کو بلا لیجیے۔ آج تو میں بغیر کام ختم کیے نہ جاؤنگی۔

کافی دیر میں لوگ اکٹھے ہوئے۔ میواتی بھی آئے۔ انھوں نے پڑوسیوں کا شکریہ ادا کیا کہ

---

[1] افراتفری کے دنوں بکثرت لوگ علی گڑھ، بلند شہر، سہارنپور وغیرہ کی طرف بھاگ گئے تھے۔

ایک مہینہ یہیں آئے ہوئے ہوچکا ہے، مگر کسی نے ہم کو سنایا نہیں۔ ساتھ ہی اپنی تکلیفیں بیان کیں۔ چونکہ وہ پاکستان ایک لمحہ[1] کے لیے بھی نہ گئے تھے، ادھر ادھر بھاگ نکلے تھے، اس لیے ان کو یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، مگر پھر بھی انھوں نے انڈین گورنمنٹ سے اپنی وفاداری کا صاف لفظوں میں یقین دلایا۔

مطالبۂ وفاداری

اور آج کل بہت عام چیز تھی۔ ہر ہندو کو حق حاصل تھا کہ وہ مسلمانوں سے وفاداری کا مطالبہ کرے۔ اس موقع پر ہمارے ساتھ سیلو اگرام کے جاجو جی بھی تھے۔ انھوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ جس کے گھر میں لوٹ کا مال ہو، وہ اپنی خوشی سے ان کو واپس کردے۔ جو بچے اپنے گھروں میں باپ چچا کو دوسروں کا مال لوٹ کر لاتے دیکھیں گے وہ آگے چل کر کتنے پاپی ہوں گے، اس پر آپ لوگ وچار کر لیجیے۔ اپنے بچوں کی بہتری کے لیے، اپنے خاندان کی بھلائی کے لیے اپنا چال چلن ٹھیک کرو۔ ایکتا۔ بھائی چارہ۔ نیکی۔ سچائی۔ سب کچھ انھوں نے سادے لفظوں میں ان کو سمجھایا۔

ہمارے ساتھیوں میں، ایک صاحب نے ذرا عجلت کی اور عین اسی مرحلہ پر تجویز پیش کردی کہ سب مل کر ان کی مالی مدد کرو۔ ہم نے روکا۔ یہ بہت بے موقع ہے۔ خاص طور پر مجھے اس اپیل سے بڑی ذلت محسوس ہو رہی تھی، مگر وہاں تو الفاظ زبان سے نکل چکے تھے، دو چار نے بڑھ کر دس پانچ روپیہ کا اعلان بھی کردیا اور جلد ہی سوال پیدا ہوگیا خزانچی کون بنے۔ اس پر جھگڑا شروع ہوا۔ مجمع میں دو آدمی پستول لگا کر بھی آئے تھے، مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں دوسرا ہی کھیل شروع نہ ہوجائے۔ یہ تو یقینی تھا کہ زبردستی ہم یہاں جلسہ کر رہے تھے، ہمارا مقصد چندہ جمع کرنا نہ تھا، لیکن ذرا سی حماقت نے رنگ ہی بدل دیا۔

لوگ چیخ چیخ کر صدر پر الزام لگا رہے تھے کہ جب وہ گاؤں خالی ہوا ہے تو ہم میں سے کسی نے نہیں لوٹا۔ غنڈوں نے اکٹھا ہو کر لوٹنا شروع کیا تو صدر صاحب نے سب سے مال چھنوا لیا اور اپنی حفاظت میں رکھا کہ گورنمنٹ کو بھیج دیا جائے۔ آخر وہ سب کہاں گیا؟ اتنا مال ہضم کر کے بھی یہ اس لائق ہیں کہ کمیٹی میں شامل ہوں۔ یا خزانچی بنیں۔

---

[1] ۔ دہلی سے بھاگ کر بکثرت لوگ یوپی کے قریبی اضلاع اور دیہاتوں میں چلے گئے تھے۔

[2] ۔ باجو جی وردھا سے آکر ہمارے شریک کار بنے تھے۔ گاندھی جی کے بھگت تھے۔

بات بڑھتی جارہی تھی، اور کہنے والے صاحب خوش تھے کہ ہونے دو۔ بڑھنے دو اسی طرح توبات کھلے گی۔ وہ نئے تھے، اور نہیں جانتے تھے کہ ایک مرتبہ آگ لگا کر پھر بجھانے میں کتنی دیر لگے گی لیکن میں نے نہ مانا۔ ان شور کرنے والوں کے بیچ میں گھس کر صاف اعلان کر دیا کہ ہم لوگ اس لیے نہیں آئے ہیں، نہ ہم چندہ چاہتے ہیں نہ جھگڑا، روپیہ پیسہ کا سوال بالکل غلط درمیان میں آگیا ہے۔ ہمارا مقصد صرف میل ملاپ اور شانتی دل کا پرچار کرنا ہے۔ ہم دونوں نے چیخ چیخ کر، اور جاجو جی نے سمجھا کر معاملہ رفع دفع کرایا ورنہ اس دن نہ جانے کیا ہوتا۔ شاید "بیتی" اس دن ہنگامہ کرا دیتی۔

جلسہ میں ہم سے وفاداری کے سوالات ہوئے۔ حیدرآباد اور کشمیر کی بابت پوچھا گیا۔ انھیں دنوں پونچھ میں بڑی فتح انڈین گورنمنٹ کو ہوئی تھی، ماسٹر جی[1] نے اپنی تقریر میں اس فتح اور بریگیڈیر عثمان کا ذکر چھیڑ دیا اور صرف ایک نام لے کر ان سے پوچھا کہ کیا اس مسلمان سے زیادہ دیس سے محبت کرنے والا کوئی ہندو ہے تمھارے پاس۔ وہ بہت سے بہادر جو اس سے پہلے جنگ آزادی میں لڑے، مرے، اور اب کشمیر میں جان دے رہے ہیں، اگر وفادار نہیں کہے جا سکتے ہیں تو کیا ہم تم ہیں؟

ایک مقامی زمیندار نے اٹھ کر کہا:

> "اگر حکومت کی مرضی یہی ہے تو ہم ان کو بسانے اور رکھنے پر تیار ہیں، اور ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے دیں گے۔ لیکن مسلمانوں کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اب وہ پرانی بات نہ چلے گی۔ پہلے تو وہ گایا کرتے تھے "میرے مولا بلالے مدینہ مجھے"۔ اب اگر وہ یہاں رہنا چاہتے ہیں تو وفادار بن کر رہیں، یہاں رہ کر مدینہ کی طرف تاکتے رہنا غلط بات ہے، ہم اب یہ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کو اپنا دماغ ٹھیک رکھنا ہوگا۔"

یہ سن کر تو خودداری اور قومی غیرت کے احساس سے میرے کان جلنے لگے۔ ایک بار جی چاہا کہ وہ کھری کھری سناؤں، طبیعت ٹھکانے ہو جائے لیکن حالات نے مجھے اب کافی مصلحت اندیش بنا دیا تھا بمشکل قابو حاصل کیا اور سنبھل کر ان سے کہا۔

کیا تم کسی تیرتھ کو جاتے ہوئے، یاترا کے مقصد سے چلتے ہوئے جس سرزمین اور جس دریا کا رُخ کرتے ہو، اس کی طرف دھیان دینے اور اسی کو پکارنے کا خیال دل میں نہیں لاتے ہو؟ مدینہ والے کو پکارنے کے یہ معنی تم نے کیوں لیے کہ مسلمان ہند کو اپنا وطن نہیں سمجھتے، یا ترک وطن کرنا

---

[1] - ماسٹر شانتی سروپ۔

چاہتے ہیں۔ اگر جمنا جی کی جے لکھنا، اور مہادیو جگن ناتھ پوری اور متھرا جانے کا خیال اور کوشش تمھارے لیے زیبا ہے اور جائز ہے۔ تو ان کو بھی مکہ مدینہ کی طرف متوجہ دیکھنے یا مذہب اور بانی مذہب کے تصور سے اپنی روح کو ستھرا کرنے کا اتنا ہی حق پہنچتا ہے۔

نہ وہ یہ بات مان سکتے ہیں اور نہ تمھیں یہ کہنا چاہیے۔ دوسرے وہ اپنے گھر واپس آئے ہیں، تمھارے بسنے دینے یا نہ دینے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ تم اپنے گھر رہو، وہ اپنے گھر رہیں گے۔ البتہ ہم تم سے انسانیت اور شرافت کی اپیل کرنے آئے ہیں، کہ بھلے آدمیوں کی طرح، اچھے پڑوسی بن کر رہو، ہر مذہب نے یہی سکھایا ہے، اور انہی باتوں سے آدمی جانور سے اونچا ہے۔

بہر حال معاملہ ٹھنڈا ہوا۔ ہمارا مقصد حاصل ہو گیا۔ دو گاؤں کے درمیان ہم نے صلح کرادی اور سقّے قطب صاحب جانے لگے۔ میواتیوں کو ہم نے روپے، پیسے کی امداد خود پہنچائی مگر اپنی ضروریات زندگی وہ خود اپنے دست بازو سے حاصل کرتے رہے۔ بلا کی جفاکش قوم ہے۔[1]

دلّی کا امن و امان غارت ہونے سے پہلے مقامی حکّام نے یہاں دیہاتوں میں امن کمیٹیاں بنائی تھیں اور ہمیں معلوم تھا کہ جب کسی نئی کمیٹی کے بنانے کا سوال اٹھتا ہے، پرانی امن کمیٹی نمودار ہو جاتی ہے۔ اس لیے مقامی حکّام سے ہم نے درخواست کی کہ اپنی امن کمیٹیوں میں "شانتی دل" کا ایک آدمی شامل کرلیں۔ شانتی دل کا مرکزی آفس کانسٹی ٹیوشن ہاؤس میں تھا، اور اس کی شاخیں ہم سارے صوبہ میں پھیلانا چاہتے تھے۔ بہت سے کاموں کے علاوہ مشکلات کا ایک اور حل بھی ممبران نے سوچا تھا کہ گورنمنٹ کی امداد کے لیے غیر سرکاری مخلص کارکن مہیا کیے جائیں۔ اسی زمانہ میں کئی ایسے آدمیوں کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں چھپی جو مشتبہ حالات میں منسٹروں کی کوٹھیوں کے پاس یا اندر گھسنے کی کوشش کرتے دیکھے گئے اور ان خبروں نے جتا دیا کہ دشمنوں کی کوشش اب کسی نئی شہادت کے لیے ہو رہی ہے۔

یہ تو ہم کو بالکل امید نہ تھی کہ حکّام ہم سے تعاون کریں گے۔ ہر قدم پر اندیشہ تھا کہ ان کی طرف سے رکاوٹ ڈالی جائے گی، ایک بات اور بھی تھی۔ تقریباً ہر محکمہ پر نئے آنے والوں کا قبضہ تھا۔ وہ ہمارے قابو سے باہر تھے۔ مقامی کانگرس کا بھی ان پر کوئی اثر نہ تھا۔ ان کے دل دکھے ہوئے تھے اور دماغ غصّے سے بھنائے ہوئے تھے۔ تبادلۂ آبادی اگر آہستہ آہستہ ایک مقررہ مدت کے اندر ہوا ہوتا تو یہ اتنی ناگوار صورت حال نہ ہوتی۔ لیکن اب تو بھیڑ بکریوں کی طرح آدمیوں کے

---

[1] جلد ہی ان کے غول کے غول پتھر توڑنے اور عمارتی کام کرنے دہلی آنے لگے۔

ریوڑ ہنکائے گئے تھے۔ بے ٹھکانا ہونے کی وجہ سے نہ کوئی نظم و ضبط ان میں باقی رہ گیا تھا، نہ اخلاقی و سماجی روک۔ اس وقت تو "تنگ آمد بجنگ آمد" والا نقشہ تھا۔

کتنی بڑی غلطی تھی کہ ذمہ دار حکام جو ایک ضلع کے انتظام اور قانون پر حاوی ہوں، ایک دم اسے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ کر چل دیں جن کے دل انتقام کی آگ میں جل رہے ہوں۔ ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ یہی ہوا اور زیادہ افراتفری اسی لیے پھیلی کہ گورنمنٹ افسران کو بھی تبادلہ میں شامل کر لیا گیا بلکہ میرا تو خیال ہے، گورنمنٹ ملازم ہی تھے، جنھوں نے یہ سب کچھ کرایا اور پھر سرمایہ دار جنھوں نے روپیہ دے دے کر دونوں طرف غنڈوں کو قتل عام پر تیار کیا۔

اب سے پہلے جب کلکتہ میں فساد ہوا ہے تو مسلم لیگی خاندان جس کے کچھ اعزہ دہرہ دون میں تھے بھاگ کر دہرہ دون اپنے عزیزوں کے پاس آگیا۔ مہاجر بیمار تھے اور ان کی بیوی کہتی تھیں کہ کلکتہ کی حالت دیکھ کر ان کی یہ گت ہوئی ہے۔ مکان چونکہ پاس ہی تھا اس لیے میرا اکثر ان سے ملنا جلنا ہوتا۔ ان کی اور میری لڑکیاں بھی آپس میں گہری دوست بن گئیں۔

کچھ عرصہ بعد ایک روز کلکتہ کا ذکر چھڑا اور میرے استفسار کرنے پر انھوں نے حالات بیان کرنے شروع کئے۔ دوران گفتگو میں بڑی سادگی، فخر اور مسرت کے ساتھ انھوں نے کہا کہ بہن ان دنوں کاروبار تو بالکل ہی بند تھا۔ بس دن بھر چاقو بٹتے تھے۔ رات بھر چاقو بٹتے تھے۔ میں نے پوچھا وہ کس لیے؟ کہنے لگیں یہ ہندوؤں کو مارنے کے لیے۔ پٹھانوں نے اتنا مارا ہے کہ ہندوؤں کا کچومر نکال دیا۔ بڑی بڑی پیٹیاں پارسل آتی تھیں اور بس دکان کے دروازہ بند رہتے تھے۔ پیچھے کی طرف سے لوگ آکر چاقو لے جاتے تھے۔ زیادہ تر پٹھانوں[1] سے یہ کام لیا جاتا تھا۔ پٹھان مختلف دکانوں پر ملازم تھے۔

جب وہ سات آٹھ قتل کر لیتے تو ان کے اوپر جنون سا طاری ہو جاتا اس لیے لاریاں اور موٹریں پیچھے پیچھے لگی رہتی تھیں کہ جہاں یہ حال دیکھا، وہیں اٹھا کر موٹر میں ڈالا اور لے گئے۔ خوب ان کو نہلاتے، برف میں دباتے تب وہ ٹھیک ہوتے تھے، ورنہ خودکشی کر لیتے تھے۔

میں نے پوچھا۔ یہ صرف آپ کے یہاں ہوتا تھا یا اور لوگ بھی کرتے تھے؟ کہنے لگیں، سب بڑے بڑے کارخانہ دار اور سیٹھوں کے یہاں یہی ہوتا تھا۔ ادھر ہندو مہاجن، مل مالک اور سیٹھ ساہوکار وہی کرتے تھے اسی لیے تو ہم کو بھی بندوبست کرنا پڑا اور تب مجھے خیال آیا کہ یہ بیماری صاحب

ع۱۔ تقسیم سے پہلے فیکٹری، کارخانے اور دکانوں پر عام طور سے پٹھان ملازم رکھے جاتے تھے۔ کلکتہ اور بمبئی دونوں جگہ۔

خانہ کی بلا سبب نہیں ہے۔ ضمیر کی مار بھی ہو گی۔

آج بھی یہ واقعہ میرے دماغ میں تازہ ہے۔ بیان کرنے والی کی نظر میں اس کی کوا ہمیت نہ تھی۔ یہ تو جہاد تھا۔ جائز دفاع کی کوشش تھی جس پر دونوں فریق عمل کر رہے تھے۔

اسی طرح لکھنؤ میں ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ لاٹھیاں جن کے سروں پر دھار دار ہتھیار لگے ہیں، ایک موٹر کمپنی کے مالک کے مکان کے پچھلے حصے میں جمع کرائے جا رہے ہیں اور ایک گورودوارہ یا مندر اسلحہ خانہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔

بہر حال یہ پرانی منحوس یادیں تھیں جس کا نتیجہ اس وقت آنکھوں کے سامنے تھا۔ اور پچھلے تجربے نے اب ہمیں بہت کچھ چونکا دیا تھا اس لیے باقاعدہ کام شروع کر دیا گیا۔ آفس کے انچارج فی الحال ایک پرانے کانگریسی ماسٹر جی ہو گئے، اور انھوں نے میز سنبھال لی۔ پنجاب کے ایک نوجوان پناہ گزین نے انفارمیشن اپنے ذمہ لیا، سبھدرا پارٹی کی کنوینر مقرر ہوئیں۔ بیج تیار ہوئے اور جگہ جگہ جلسے، مشاعرے، کوی سمیلن، سب ہونے لگے۔ دو جیپیں بھی حاصل کر لی گئیں۔ متفرق اخراجات کے لیے روپیہ کی فراہمی مردولا نے اپنے ذمہ لی اور جلد ہی سنٹرل پیس کمیٹی سے بھی ہمیں مدد مل گئی۔ پٹرول مجبوراً مقامی گورنمنٹ کو دینا پڑا۔ دیہاتی کمیٹی میں پنڈت شرما[1]۔ ایک لالہ جی اور میں تین فرد تھے۔

---

[1] ۔ پنڈت جے دیو شرما۔ مدن لال۔

14

دِلّی کے دیہات

۲۴ جون ۱۹۴۸ء سے دیہاتی کمیٹی نے بھی اپنا کام شروع کر دیا۔ مجھے چونکہ دیہاتوں سے زیادہ دلچسپی تھی دوسری اپنی کاروباری ناواقفیت اور کم علمی کو چھپانے کا اس کے علاوہ کوئی ٹھکانا بھی نہ تھا اس لیے اس میں شامل ہو گئی۔ میں شاید اس سے پہلے ذکر بھی کر چکی ہوں، کہ شدھی ہو جانے والے مسلمانوں کا مسئلہ بھی پریشان کن ہو گیا تھا، اس لیے اور بھی ضروری معلوم ہوا کہ میں یہی کام اپنے ذمّے لوں۔

دلّی کے دیہات جو کبھی آباد، خوشحال ہونگے، اب اجڑے پڑے تھے۔ مکانات جلے ہوئے، کھیت ویران اور گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ جب ہم کسی گاؤں میں پہنچتے، تو گاؤں کے کسی کونے سے چند آدمی نکل پڑتے اور ہمیں لے جاکر چوپال میں بٹھلاتے۔ جب ہم گاؤں کے ویران حصّے کی بت سوال کرتے تو لاپروائی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہمیں یقین دلاتے کہ مسلمانوں کو تو ہم روک رہے تھے، اور فلاں نمبردار سے ہمارا بڑا یارانہ تھا۔ ہم نے اس کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ چلے گئے۔ یہاں سے تو اپنا سب لے لوا کر باہر نکلے، مگر گاؤں سے باہر ان پر حملہ ہوا۔

لیکن جب مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی زمین۔ کھیت اور مکانوں کے بارہ میں ہم سوال کرتے تو وہ بغلیں جھانکنے لگتے، اور ایسا ظاہر کرتے جیسے یہ مسئلہ آج ہی ان کے سامنے آیا ہے۔ انھوں نے اس سے پہلے سوچا ہی نہ تھا۔

بیشتر دیہات ابھی ایسے تھے جہاں ہندو پنجابی پناہ گزینوں نے قدم بھی نہ رکھا تھا۔ ان میں سے اکا دکا جگہ زمین کی تلاش میں آئے تھے تو ان دیہاتوں کے زمیندار، ذیلدار ان کو شربت لسی پلا کر رخصت کر دیتے تھے، اور یقین دلا دیتے تھے کہ مسلمانوں کے پاس تھا ہی کیا؟ وہ تو بالکل مفلس اور قلاش تھے۔ اب جو کچھ ہے۔ ہمارا ہندوؤں کا ہے۔ ان کی کوئی چیز نہیں جس پر تم قبضہ

کر سکو۔

واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی نہیں چاہتا تھا کہ شرنارتھی یہاں آباد ہوں۔ حالانکہ دیہات خالی اسی لیے کرائے گئے تھے کہ نئے آنے والوں کے لیے جگہ نکل سکے۔ کھانے کا ٹھکانہ ہو سکے۔ لیکن بے خود غرضیوں نے یہ مقصد فنا کر دیا۔ حکام کے بس میں نہ تھا کہ زبردستی رفیوجیز کو وہاں آباد کریں۔ اگر ہندوؤں میں شورش پھیلتی اور دیہاتی جاکر حکام کا دروازہ کھٹکھٹاتے تو حالات سے ناواقف حکومت فیصلہ یقیناً ان کے حق میں کرتی۔

اس کے علاوہ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ان پر پشیمانی بھی غالب تھی۔ وہ افسوسناک انداز میں ان دنوں کی یاد کرتے تھے۔ دس بیس گاؤں میں، ان کے گاؤں کی دھاک تھی، اور راج دربار میں اپنے گاؤں کی وسعت اور آبادی کی وجہ سے ان کی اہمیت و عزت تھی۔ مسلمان پڑوسی اس وقت تو کانٹا معلوم ہوئے مگر اب یاد آرہے تھے۔ گاؤں خالی ہو جانے کے بعد اپنی کمی کا احساس ان کو بے چین کر رہا تھا، اور وہ ہر طرح سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے، کہ نہ ہم نے ان سے برائی کی، نہ انھوں نے ہمارے ساتھ کچھ کیا، یہ تو سب حکومت نے کرایا۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اور اس زود پشیمانی کا مظاہرہ ہر جگہ ہو رہا تھا۔ ایک دلّی والے جن کی چاندنی چوک میں دکان تھی، ایک روز کہنے لگے کہ:

صاحب ہماری دلّی کا تو ان پنجابیوں نے ایسا ستیاناس کیا ہے کہ دیکھ دیکھ کر کوفت ہوتی ہے نہ کوئی تمیز رہ گئی ہے، نہ تہذیب، چاندنی چوک میں آج تک کباب نہ بکے تھے۔ اب دیکھیے جگہ جگہ کباب کی دکانیں لگ رہی ہیں۔ فتحپوری اور فوارہ پر سرِ میدان پٹریوں پر شراب تک بک رہی ہے۔ لوگ اسی جگہ کھڑے کھڑے شراب پیتے ہیں اور چاٹ کباب کھاتے ہیں، ہمیں ناک بند کر کے گزرنا پڑتا ہے۔ ہماری عورتیں بالکل ہی پردہ میں بیٹھ گئی ہیں۔ آنا جانا بند ہے۔ شریف عورتوں پر سرِ بازار آوازے کسے جاتے ہیں اس لیے کیا کریں۔ اتنے غیر مہذب لوگ تو ہم نے دیکھے ہی نہیں۔ ہمیں تو یہ فکر ہے، کہ بچوں کے اوپر ان حالات کا کتنا خراب اثر پڑیگا۔ ابھی کل میں نے دیکھا۔ ایک خوبصورت عورت بدن پر ڈیڑھ دو سو کا ریشمی سوٹ، خوب لپ اسٹک اور پاؤڈر

لگائے ہوئے چاندنی چوک کی سڑک پر دوگز کا گنا چوستی ہوئی چلی جارہی تھی۔

بدمذاقی کی انتہا ہے!

یہ شکایت عام تھی۔ شام کے پانچ بجے سے جیوہتھیا کے ڈر سے منھ پر کپڑا لپیٹ لینے والے جینی بنئے اس صورت حال سے روز بہ روز بیزار ہورہے تھے۔

دیہاتی حتیٰ الامکان کوشش کرتے تھے، پنجابی پناہ گزیں یہاں نہ آئیں۔ جب ہماری پارٹی بہت سے دوسرے گاؤں میں ہوتی ہوئی، قصبہ بجف گڑھ پہنچی تو...... جون کے مہینے کی آگ پر جلتی ہوئی دوپہر تھی۔ گرمی کے مارے برا حال تھا۔ ہمارے ساتھ ایک پرانے کانگریسی بھی تھے۔ انھوں نے اپنے رشتے دار کا مکان ڈھونڈھا اور ان کی بیٹھک میں جو دوکان کی چھت پر تھی، قیام کیا۔ مقامی کانگرس کمیٹی کے صدر اور سکریٹری چونکہ دور رہتے تھے اس لیے ان کے بلانے کو آدمی بھیجدیا گیا۔ ان کے آنے تک ہمیں یہاں وقت گزارنا تھا۔ میزبان نے دو ایک اور پڑوسیوں کو بلالیا اور خود اپنے سمدھی کی خاطر مدارات میں لگ گیا۔ پڑوسیوں میں ایک لالہ جی بھی تھے۔ انھوں نے تقریباً سارا وقت ہمارے ساتھ گزارا۔ ہمارے تیسرے ساتھی نے حسب معمول "ٹیکٹ" سے کام لینا شروع کردیا اور اپنے آنے کا مقصد بتاتے ہوئے لالہ جی سے پوچھا:

"کہو بھئی خوش ہو، مسلمان تو چلے گئے، مگر یہ جو کہ نئے آئے ہیں، ان سے کیسی پٹ رہی ہے؟" دکاندار نے جواب دیا:

"بس جی اچھی ہی پٹتی ہے۔ اور یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ میاں لوگ چلے گئے۔"

انھوں نے پوچھا:

"کیا چاہتے ہو، پھر آجائیں، کہ اب نہ آئیں؟"

لالہ جی نے جلدی سے جواب دیا:

"نا صاحب، میاں لوگوں کی تو اب یہاں گزر نہیں۔"

میں نے پوچھا:

"کیا تمھاری ان سے بہت لڑائی رہتی تھی؟"

لالہ نے کہا:

وہ لڑائی تو خیر کیا، مگر ان کو بڑا گھمنڈ تھا۔ سارے دیس کو وہ "اہلِ اسلام" بنالینا چاہتے تھے، اس سے چھٹی ملی۔ پھر ان کی وجہ سے گئو بھی ہمارے شہر میں کٹتی تھی۔ وہ لوگ بہت کھاتے تھے، اور امیر بھی تھے، سچی بات تو یہ ہے اپنے ہندو بھائی آگئے۔ یہ اچھا ہوا۔"

ہم نے پوچھا:

"تمھاری ان کی اچھی نبھتی ہے۔ میل جول رہتا ہے؟"

ہنس کر بولے:

"نبھتی تو خیر کیا ہے۔ یہ بھی ماس کھاتے ہیں، اور سکھ کرپان بھی باندھتے ہیں۔ ہم ہنستے ہیں۔ شرابیں پی پلا کر روز ہی دنگا فساد مچاتے ہیں مگر ان کی ہماری اچھی چوٹ چلتی ہے۔ جب جھگڑا ہوا، ایک دوسرے کے سر توڑ لیے اور ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔ بس جی اسی طرح کٹ جائے گی۔ کئی بار کھٹ پٹ ہو چکی ہے۔ ابھی اس دن بھی ہو چکا ہے اور ہم نے جان لیا ہے کہ یہ اسی طرح راضی ہوں گے۔"

گاؤں کا حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہاں لوگ مارے دو ہی چار گئے البتہ بھگا سب دیے گئے۔ لالہ جی نے کہا:

وہ تھانا، ہمارا تحصیلدار۔ بس اس نے سب کو زندہ نکلوا دیا۔ لیکن جاٹ بھائیوں سے ہم نے کہہ دیا، کہ ہم تم ایک ہیں، اور کئی گاؤں کے مسلمان شدھی ہوئے، ان کو ہم نے اپنے میں ملالیا۔

ہم نے اس سے کانگرس کی بابت پوچھا، تو مسکرا کر عجیب انداز سے جواب دیا۔

"یہاں تو کانگرس ہے ہی نہیں، ہاں بس پردھان جی ہیں۔ یہاں تو سنگھ پارٹی اور ہندو سبھا کا زور ہے، اور جاٹستان کی مانگ ہے۔ کانگرس کے ہیں تو دو تین آدمی، مگر ان کو کوئی پوچھتا نہیں، نہ ان کی کوئی سنتا ہے۔

مسکرا مسکرا کر لالہ جی نے سب کچھ کہہ سنایا۔ میں خاموش بیٹھی رہی، کیونکہ میرے ساتھیوں کی ہدایت تھی جب تک سارا حال دوست بن کر پوچھ لیں، نہ بولوں، مبادا انھیں شبہ ہو جائے اور وہ جی کی بات چھپا ڈالیں۔

صدر صاحب تو ملے نہیں، سکریٹری آئے، اور انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم کوشش کریں گے کہ آپ جلسہ کرلیں۔ مگر ہمارے مہربان لالہ جی کہتے تھے، یہاں جلسہ کیا کرنا، یہاں تو بس ٹھیک ٹھاک ہے۔

سکریٹری نے کہا کہ اگر میں لوگوں کو اکٹھا کرنے میں ناکام رہوں تو یہ سمجھ لیجیے گا کہ یہاں ہم صرف دو کانگریسی ہیں۔

تیسرے دن ہم پنڈت شندر لال کو لے وہاں پہنچے۔ لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا صرف صدر اور سکریٹری تھے۔ مایوس اور رنجیدہ۔ وہ بھلے آدمی اپنے کو اس قدر بے بس محسوس کر رہے تھے۔ نہ ان کی کوئی طاقت تھی نہ آواز۔ ایک بالاخانہ پر بیٹھ کر ہم نے دو گھنٹے انتظار کیا بمشکل چند آدمی جمع

ہوئے۔ کمیٹی کے صدر نے تقریر شروع کی، اور ایک سال کے سارے واقعات پر تبصرہ کر ڈالا۔ تقریر سلجھی ہوئی اور مخلصانہ تھی۔ دل کا درد الفاظ میں جھلک رہا تھا۔ مجمع آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہوا، لیکن صدر صاحب کی بے بسی اور مایوسی دیکھ کر ہم سب بہت متاثر ہوئے۔ یہ مخلص انسان جس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہو رہی تھی اس سارے علاقہ میں تنہا کانگرس کا نمائندہ تھا اور اس کا اٹھنا بیٹھنا لوگوں نے دشوار کر رکھا تھا۔ اسے صوبہ سے اب تک کوئی مدد بھی نہیں ملی تھی، لیکن وہ آج بھی اپنی جگہ قائم تھا۔

اور پھر پنڈت سندر لال نے تقریر شروع کی۔ لوگ دکانوں اور مکانوں سے نکل نکل کر اکٹھے ہونے لگے۔ پاس پڑوس کے کسان بھی آگئے۔ تقریر ڈھائی گھنٹہ جاری رہی۔ نہ کوئی اکتایا نہ کسی نے مخالفانہ نعرے لگائے۔ نہ کوئی برہم ہوا۔ اور پنڈت جی پینترے بدل بدل کر، راشٹریہ سنگھ، ہندو سبھا، مسلم لیگ اور دھرم و ایمان کے ٹھیکداروں کو چیلنج کرتے رہے۔ درمیان میں تھوڑا تھوڑا کر کے دودھ پیا۔ مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ آخر تک تو حاضرین کی تعداد ہزاروں ہو گئی تھی۔

ہم کامیاب واپس آئے۔ اب جس گاؤں میں جاتے بے کھٹکے اپنا پروپیگنڈا کرتے۔ پنڈت جی نے نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اس علاقہ کے لوگ سوچ میں پڑ گئے تھے، کہ یہ جو کچھ ہوا کیا ہوا، اور کیسے ہوا، کئی گاؤں میں ہم کو دو دو تین تین بار جانا پڑا۔ اور ۱۶ جون سے لے کر ۳۰ جون تک ہم نے ۷۲ گاووں کا دورہ کیا۔

ایک طرف ہم نے علاقہ مہرولی کے سارے دیہات و قصبات دیکھے دوسری طرف علاقہ نجف گڑھ کے بہت سے دیہاتوں میں گئے۔ کہیں بڑے جلسے کئے کہیں چھوٹی میٹنگیں۔ کسی جگہ ہم نے پنڈت سندر لال جی کو تکلیف دی اور کہیں حاجو جی کو۔ اس میں کوئی شک نہیں، پندرہ جون کی افواہیں سب جگہ پھیلی ہوئی تھیں کچھ لوگ اقرار کر لیتے تھے کہ "ہاں یہاں بھی خبر آئی ہے"۔ اور کچھ لوگ چھپاتے تھے۔ نئے بلوے کے ڈر سے لوگوں میں خوف و ہراس بھی تھا، اور عام بے اطمینانی بھی۔ اپنے پروگرام کے مطابق ہم نے بہت سی جگہوں پر شانتی دل کمیٹیاں قائم کیں، اور مقامی لوگوں کو شرنارتھیوں کو، اور جہاں جہاں مسلمان واپس آگئے تھے، ان کو سمجھا بجھا کر اس پر راضی کیا کہ "گذشتہ راصلوٰۃ"[1] جو ہو چکا اسے بھول جائیں، گئی ہوئی کسی چیز کا مطالبہ نہ کریں، صرف زمین مکان کے

---

[1] ۔ گذشتہ راصلوٰۃ آئندہ را احتیاط فارسی کا مشہور مقولہ ہے یعنی جو ہو چکا اسے بھول جاؤ اور آگے احتیاط کرو۔

واپسی کے لیے جھگڑیں۔ اگران کا مکان کسی مقامی ہندو بھائی کے قبضہ میں ہے تو ہم ضرور خالی کرادیں گے۔ اور اگر شرنارتھی بھائی کے پاس ہے تو گاؤں کا کوئی بھی ٹوٹا ہوا مکان وہ اپنے لیے منتخب کرلیں۔ اس کی مرمت اور درستی کے لیے ہم پیسہ مہیّا کردیں گے۔ مگر شرنارتھی سے مکان واپس لینے کی وہ بالکل کوشش نہ کریں۔ حتی الامکان ہر قیمت پر امن اور میل ملاپ قائم ہونا چاہیے۔

ہماری اس پالیسی نے بہت سے فتنے روک دیے اور مخالفین کے پاس شکایت کرنے کے لیے ایک واقعہ بھی مہیّا نہ ہو سکا۔ ہمارا اصل کام تھا، مقامی ہندو، مسلمان اور شرنارتھیوں میں بھائی چارہ قائم کرانا۔ اس کا موقع ہمیں کم ہی دیہاتوں میں ملا کیونکہ شرنارتھی کسی طرح دیہات کی طرف رخ نہ کرتے تھے، اور مقامی ہندو ان کا آنا پسند نہ کرتے تھے، اس کے بجائے وہ مسلمانوں کو پھر بسا لیتے تھے۔

ایک گاؤں میں جب ہم پہنچے اور لوگوں کو اکٹھا کیا، تو پہلے مقامی لوگ اپنے جھرمٹ میں ایک مسلمان نمبردار کو لیے ہوئے آئے، پھر شرنارتھیوں کا گروہ آیا۔ وہ دونوں دو ٹکڑیوں میں الگ الگ بیٹھے، شرنارتھیوں نے شکایت کی کہ صرف ہمیں زک دینے کے لیے انھوں نے اس مسلمان نمبردار کو بلا کر گاؤں میں بٹھا لیا ہے، تاکہ مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی زمین ہمیں الاٹ نہ ہونے پائیں اور ہندوؤں نے کہا:

> ”زک دینا کیسا آخر انصاف بھی تو کوئی چیز ہے، اس کا حق ہے تو ہم کیسے اسس کو جھٹلائیں؟ اور جو زمین کی بات کہتے ہو، تو سب چیز پر تو تمھارا قبضہ ہی ہے، خالی نمبردار کی، اور اس کے رشتہ داروں کی زمین چھوڑ دو۔ گاؤں بھر کا تو تم لوگوں نے برا احوال کر ڈالا ہے، مکانوں کے چھپر تک پھونک لیے اب اور کیا کرو گے؟“

غرض کافی دیر سمجھانے اور لعنت ملامت کرنے کے بعد ہم نے ان سب کو اس پر راضی کرلیا کہ کمیٹی قائم کرلیں، اور اپنی مشکلوں اور شکایتوں کی رپورٹ ہمارے آفس کو بھیجدیں کمیٹی میں اس تنہا مسلمان کا نام ہندوؤں نے خود شامل کرانا چاہا۔ شرنارتھی بگڑے کہ یہ کس پارٹی کا نمائندہ ہے۔ اس کے پیچھے طاقت ہی کیا ہے اور ایک آدمی کی آواز کوئی آواز ہوئی۔ مگر مقامی زمیندار اس پر مصر رہے کہ ہم سب کو اس پر بھروسہ ہے اور بھی مسلمان واپس آرہے ہیں۔ مسلم نمائندہ کمیٹی میں ضرور رکھا جائے۔

کچھ ہی دن بعد مجھے معلوم ہوا۔ نمبردار کی وہ زمین جو شرنارتھیوں کے قبضے میں تھی، مقامی ہندو دوستوں نے زبردستی اس پر ہل چلوا دیے اور نمبردار کا قبضہ کرا دیا۔ اس پر جھگڑا چلا اور آخر

کارجیت نمبرداری[1] کی ہوئی۔

اکثر گاؤں ایسے تھے جہاں مسلمان نہیں واپس . . . آئے تھے ، نہ ان کی درخواست آبادکاری ہمارے پاس اب تک[2] . . . آئی تھی ، لیکن مقامی آبادی اور شرنارتھیوں میں جھگڑا چل رہا تھا ۔ مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی جائداد جسے ان کے جاتے ہی پڑوسیوں نے ہتھیا لیا تھا ۔ اب رفیوجیز کو دی جا رہی تھی ۔ اور جن کے قبضہ سے وہ کھیت اور مکان نکل رہے تھے ، وہ ہاتھ دھو کر شرنارتھیوں کے پیچھے پڑ گئے تھے ۔ شرنارتھی بھی کچھ کمزور نہ تھے ۔ پھر اس وقت ان کی پشت پناہی حکومت بھی کر رہی تھی اور کرنا ہی چاہیے تھا ۔

بہرحال ایسے مسائل کا پُرامن حل بھی ہمارے پاس یہی تھا کہ یہاں دو چار بااثر آدمیوں کو ذمہ دار بنائیں ۔ ان سے عہد لیں کہ اپنے گاؤں میں بلوہ نہ ہونے دیں گے ۔ اتنا نقصان اٹھانے کے بعد کچھ تو سمجھ آنا چاہیے ۔ دوسروں کے بھڑکانے میں آ کر انھیں اپنے پیروں پر کلہاڑی نہ مارنا چاہیے ۔ میل ملاپ بڑھانے کے لیے جلسے کیے ۔ ملی جلی کمیٹیاں بنائیں ، اور ان کو سمجھایا کہ خود نہ لڑو ۔ شکایتیں ہمارے پاس لاؤ ۔ ہم تم دونوں کی طرف سے سب سے لڑیں گے ۔

مسلم پناہ گزینوں کی مالی امداد ایک مشکل مسئلہ تھی ۔ مقامی گورنمنٹ نہ اس کی ضرورت سمجھتی تھی ، نہ ہماری بات سنتی تھی ۔ دلی کے تباہ حال لوگوں میں اب بڑے پیمانہ پر چندہ دینے کی طاقت نہ تھی ، اور سچی بات یہ ہے کہ ہندو بھائیوں کے پاس ہم جانا نہیں چاہتے تھے ۔ ہمارے دماغ اتنے صاف کب تھے کہ مصیبت زدہ کی مدد کرتے وقت یہ بھول جائیں کون ہندو ہے کون مسلمان ! ؟

ناچار " ملا کی دوڑ مسجد تک " ہم نے جواہر لال جی کا دروازہ کھٹکھٹایا ، اور ایک بار نہیں ، تین بار ان کی جیب خاص اور ان کے فنڈ سے کثیر رقمیں حاصل کیں ، اور اس روپیہ سے مسلم پناہ گزینوں کے لیے لکڑی ، بانس ، پھوس ، دروازے اور چوکھٹوں کا انتظام کیا ۔ میرے لیے قدرت نے اتنی آسانی

---

[1] ۔ مگر پانچ چھ سال بعد وہی نمبردار ایک روز مجھے کالو سرائے میں ملا ۔ وہ کسی کے گھر جانوروں کی دیکھ بھال پر ملازم تھا اور بہت بری حالت میں تھا ۔ پوچھنے پر پتہ چلا ، وہ سب ڈھونگ تھا ۔ صرف اس کی زمین ہتھیانے کے لیے یہ ڈراما کھیلا گیا تھا ۔ زمین شرنارتھیوں کو نہیں مل سکی ۔ مقامی بنیوں نے ہڑپ کر لی ۔

[2] ۔ ہمارے پاس آبادکاری کے لیے صرف وہ مسلمان درخواست دیتے تھے جو ہندوستان ہی میں مقیم اور منتشر تھے ۔ پاکستان جانے والوں کی نہ واپسی کا سوال تھا ۔ نہ آبادکاری کا ان کی پراپرٹی کسٹوڈین کی تحویل میں تھی ۔

مہیا کر دی تھی کہ بھائی صاحب کے ذریعہ سے ذرا جلدی آواز اوپر تک پہنچ سکتی تھی، اور یہ ذریعہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔

ایک دن جس گاؤں میں ہم گئے وہ بختاور پور تھا۔ یہاں کی مسلم آبادی ایک مسلمان نائب تحصیلدار کی سرکردگی میں ہندو بن گئی تھی، اور اب ان سب سے نائب تحصیلدار کی کسی بات پر ناچاقی ہو گئی تھی۔ اسی غصہ میں انھوں نے اعلان کر دیا۔ ہم تو مسلمان ہیں۔ صرف جان کے ڈر سے ظاہر میں ہندو بن گئے تھے۔ جمعیۃ اور شانتی دل کو انھوں نے درخواست دی کہ ہم سب کو یہاں سے نکال کر پاکستان پہنچا دیا جائے یا ہمارا فیصلہ کیا جائے۔

ہم نے دیکھا کہ گاؤں والے نائب تحصیلدار کو اپنے حلقہ میں لیے بیٹھے تھے، اس وقت وہ سب اس کے پشت پناہ اور ہمدرد بن بیٹھے تھے، اور سارے مسلمان گاؤں سے باہر اپنے کھیتوں کے قریب جھونپڑیوں میں پڑے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم سب اس لیے اکٹھے ہو کر رہ رہے ہیں، کیونکہ ہمیں اپنی جان اور اپنے کھیتوں کی طرف سے خطرہ ہے۔ مسلمانوں کی درخواست پر ان کی حفاظت کے لیے پولیس گارد ٹھہرا ہوا تھا مگر حسبِ دستور ان کی موجودگی میں بھی راتوں کو سامان اٹھ جاتا تھا۔ کھیت کٹ جاتے تھے اور بیل کھل جاتے تھے۔

میں اس سے پہلے "کھرڑکی"[1] والوں کا حال دیکھ چکی تھی اس لیے کسی طرح دل نہ چاہا۔ ان کی مشکلات سن کر بھی مجھے بہتر صورت یہی معلوم ہوئی کہ جس طرح ہو سکے ان کو اسی گاؤں میں مستقل کیا جائے۔ یہاں سے نکلنا اس سے بڑی تباہی ہوگی، جو اس وقت ہو رہی ہے۔

ہمارے ساتھیوں کی بھی یہی رائے ہوئی۔ نائب تحصیلدار سے ہم نے بات چیت کی تو اس نے کہا: اس وقت مجھے یہی ٹھیک معلوم ہوا کہ ان سب کی جان بچا دوں۔ مگر اب تو یہ میرے کہنے میں نہیں ہیں۔ ان کا جو جی چاہے کریں۔ چاہے ٹھہریں چاہے جائیں۔ میرا راستہ الگ ان کا الگ۔ میں تو کہیں نہ جاؤنگا۔

لوگوں نے چلا کر کہا۔ ہم تم سے کوئی مطلب نہیں رکھنا چاہتے۔

اس نے جواب دیا۔ میں تو کہہ چکا، کہ تم اپنی مرضی کے مختار ہو جو چاہے کرو۔ میں تو ہندو ہو چکا گاؤں والے اس سے ہمدردی کر رہے تھے۔ اور یہ سب سن کر ہم نے آپس میں صلاح کی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئے۔

تیسرے دن ہم جا جوجی کو لے کر پہنچے۔ وہ ان دنوں ہم سب کی خوش قسمتی سے دہلی میں ہی تھے

---

[1] ۔ وہ گاؤں جہاں کے بہت سے شدھی آدمیوں کو نکال کر دہلی لایا گیا تھا۔

اوران کو اس بڑھاپے میں ہم اکثر تیس چالیس میل لے جاکر تکلیف دیا کرتے تھے۔
ہماری مدد انھوں نے کی، اور یہ معرکہ بھی ہم نے انہی کی مدد سے سر کیا۔
انھوں نے اپنے سلجھے ہوئے انداز میں جب ٹھنڈے ٹھنڈے سوالات کر کے ان کو جی کی بات اگل دینے پر مجبور کر دیا تو پھر میٹھے لفظوں میں سمجھانا شروع کیا۔ گاندھی جی کے ایسے سیدھے سادے بولوں میں انھوں نے اخلاقی اور سماجی اصول سمجھائے۔ اخلاق، دھرم اور انسانیت کے نام پر ان سے اپیل کی کہ اس غنڈہ گردی کو ختم کر دیں اور اپنے وحکومت کے دشمنوں کو دکھادیں کہ ہم اب چوکنا ہو چکے ہیں، ان کی چالبازیوں میں نہ آئیں گے۔ ۱۵ جون کو دنگے، فساد کی جگہ آپس میں پیار محبت اور ایسی شانتی ہو کہ دشمن ہاتھ مل کر رہ جائیں۔ انھوں نے گورنمنٹ کی پالیسی، کانگریس کے اصول، اور باپو کی تعلیم سب کا ذکر کر کے محبت کا بھولا سبق ان کو پھر یاد کرایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں صلح ہوگئی۔ تین بار جانے کے بعد ہمیں اس موضوع کی طرف سے اطمینان کلی ہوگیا۔
دیہاتوں میں صفائی، تعلیم اور طبی امداد کا بندوبست پہلے ہی کیا ہوتا تھا اور اب تو بالکل ہی صفایا تھا۔ بھلے دنوں میں حکیم جی، ویدجی، دائیاں اور جرّاح۔ یہ ضرور ہوا کرتے تھے، اب وہ بھی سب مرکھپ گئے، یا دتی چلے گئے تھے، بہت ہی بری حالت تھی۔ میلوں، کوسوں تک مریض کا پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔ اسکول کی عمارتیں جہاں جہاں تھیں۔ خالی پڑی تھیں۔ مگر ایک گاؤں میں مسجد توڑ کر بہت ہی پھرتی و مستعدی سے اسکول قائم کرلیا گیا تھا۔ اس دن ہمارے ساتھ ایس۔ پی تھے۔ میں نے کہا کہ مسجد کی عمارت آپ سیل کرا دیجیے۔ اس کو تو دوسرے کام میں نہ استعمال ہونا چاہیے۔ ایس۔ پی نے دیکھا، اظہار افسوس بھی کیا۔ پھر مجھے نہیں معلوم اسکول چلتا رہا یا مسجد کی مرمت ہوئی۔ بہر حال کسی گاؤں میں اسکول باقی نہ رہ گیا تھا۔
ہم جب دیہات میں پہنچتے، وہاں کے بچے ہمیں گلیوں۔ درختوں اور تالابوں پر اُچکتے، پھاندتے ہوئے ملتے تھے، جوان کھیتوں میں کام کرتے ہوئے نظر آتے، اور عورتیں کنوئیں پر یا گھروں میں سست رفتاری سے ٹہلتی ملتیں، لیکن سارے گاؤں کے بڈھے زیادہ تر چوپال میں جوا کھیلتے ہوتے اور ہمارے پہنچتے ہی نمبردار کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر بہت جلد ساری آبادی چوپال میں بھر جاتی، جوئے کی بازی گرد بڑ ہو جاتی۔ بڈھے افیمچیوں کی طرح اپنی چندھی آنکھیں کھول کر ہمیں دیکھنے کی کوشش کرتے۔ ان میں سے کوئی ہمارے سوال کا جواب نہ دیتا۔ سب ذیلدار یا نمبردار کا منھ دیکھنے لگتے۔ کوئی اس وقت تک ہمیں بیٹھنے کے لیے بھی نہ کہتا، جب تک کہ گاؤں کا چودھری نہ آجائے۔
یہ تھا ہندوستان، جس کا صحیح نقشہ ہم اس وقت دیکھ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر میری توجیے

ہمت ٹوٹ جاتی اسے ٹھیک ہوتے شاید نصف صدی سے کم نہ لگے گا۔ اور یہ کسی حکومت کے بس کا روگ تو ہے نہیں انھیں انسان بنانے کے لیے تو آدمی بنانے کی فیکٹری قائم کرنی پڑے گی فیکٹری بھی ایسی جس کے سب پرزے غیر سرکاری ہوں۔ نوجوان اور صرف مخلص نوجوان ہی اس دنیا میں انقلاب لا سکتے ہیں۔ اگر سال کے دو مہینے، یعنی اپنی چھٹیاں ان دیہاتوں پر صرف کر دیں تو شاید کالج و یونیورسٹی کے ہزاروں لڑکوں کا غول، ان دیہاتوں میں پھیل کر ان کا معیارِ زندگی بہتر بنا سکتا ہے، مگر ؂

او خویشتن گم است کرا رہبری کند[1]

---

[1] جو آپ ہی کھو گئے ہوں وہ دوسروں کو کیا راستہ دکھائیں گے۔

15

بحالی کا مسئلہ

ہمارے ساتھیوں میں دلّی کے ایک معزز زمیندار برہمن[1] بھی تھے، اور وہ خالص دلّی والے تھے۔ زبان اردوے معلّیٰ اور کرخنداری ملی جلی بولتے تھے، اور دفتری فارسی آمیز اردو لکھتے تھے۔ انھوں نے بےحد کام کیا۔ مسلمانوں کو بسانے، ان کی زمینیں واپس دلانے اور ان کا حق ملکیت تسلیم کرانے کے لیے تمام عدالتی و قانونی دشواریاں انھوں نے ہی حل کیں۔ وہ پرانے کانگریسی نہ تھے اس لیے کہیں خوشامد، کہیں حکمت عملی، اور کہیں دھونس، جیسا موقع ہو، اس لحاظ سے اپنا کام نکالتے تھے اور جب میں کسی چیز کو خلاف اصول کہتی تو بڑے لطف کے ساتھ مجھے "نیتی" اور ٹیکٹ کے اصول سمجھاتے تھے۔ انتھک کام کرنے والے اور بڑے اچھے مددگار تھے، سرکار دربار کا بھی تجربہ ان کو بہت تھا۔ لیکن اندرونی طور پر کٹھیٹ برہمن تھے اکثر کہا کرتے۔ دنیا تو ساری پاپ سے بھر گئی ہے اس کا کارن یہی ہے کہ استریوں نے پتی ورتا کا پالن کرنا چھوڑ دیا ہے اور پھر منوسمرتی سے عورت کے فرائض سناتے اپنی بیوی کی مثالی پرستش کا ذکر کرتے۔ ڈرائیور ہاں میں ہاں ملاتا رہتا، اور میں جل کر بحث شروع کر دیتی، مگر وہ برا نہ مانتے۔

جمعیۃ العلماء نے ہمیں ایک درخواست بھجوائی، جو موضع آلی کے مسلمانوں نے دی تھی۔ اب وہ اس منافقانہ زندگی سے تنگ آچکے تھے اور گاؤں سے نکلنا چاہتے تھے، لیکن ہم پکا ارادہ کر چکے تھے کہ اب کسی کو گاؤں سے نکلنے نہ دیں گے۔ اگر اسی جگہ ٹھہر کر ہم نے معاملات کو ٹھیک نہ کیا تو کچھ کرنا بیکار ہے۔

ہماری پارٹی سرِ شام وہاں پہنچی۔ ہمارے ساتھی نے حسب معمول "گوڑ برہمن" کا حقہ طلب کیا اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ ایک اچھا تعارف ہوتا تھا، اور کامیابی کا راستہ کھل جاتا تھا۔ لوگ

---

[1] پنڈت جے دیو۔

بھلا پنڈت کی بات کیسے نہ دھیان سے سنتے۔ فوراً آؤ بھگت شروع ہو جاتی تھی۔
میں جب کبھی مذاق اڑاتی تو وہ یہی ثبوت پیش کرتے کہ اپنا مطلب، کام نکالنے سے ہے، دیہاتوں میں تو لوگ اسی طرح متوجہ ہوتے ہیں، لیکن پھر جلد ہی صفائی پیش کر دیتے:
"آپا جی، کھانے پینے میں کیا رکھا ہے، اصلی چیز تو آپس کا پریم ہے، کھان پان کبھی ایک نہیں رہا مگر ہندو مسلمانوں میں بھلا کوئی بیر کبھی تھا؟"
اور مجھے لاجواب ہو جانا پڑتا۔ واقعی اس سے پہلے ہندو مسلمان گہرے دوست ہوتے تھے، مگر چھوت چھات بدستور قائم رہتی تھی۔ اور دونوں دوست ایک دوسرے کے مذہبی شعائر کا احترام کر کے برا بھی نہ مناتے تھے۔ اب جبکہ ہم مہذب ہو گئے۔ چھوت چھات مٹ گئی۔ کھان پان ایک ہو گیا تو ایک دوسرے کی بے عزتی اور بربادی پر تل گئے۔
"گوڑ برہمن" کا حقہ آیا، اور مزے مزے کی باتیں شروع ہوئیں۔ چوپال کے صحن میں نیم کا درخت تھا۔ اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے ہم گہری نظروں سے ان بڈھے پریشان چہروں کو، ان حیرت زدہ آنکھوں کو دیکھ رہے تھے، اور ان نوجوانوں کو دیکھ رہے تھے جنھوں نے ہماری آمد کی خبر سنتے ہی بھانپ لیا تھا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔
ہم نے ان مسلمانوں سے کہا کہ اچھا اب آ کر صاف صاف بتاؤ، تم چاہتے کیا ہو۔ جبراً تبدیل مذہب کیا ہے یا راضی خوشی سے۔ اور اب گاؤں سے بھاگنے کے لیے کس لیے تیار ہو؟
کچھ لوگ تاویلیں کرنے لگے، ایک جوان آدمی نے کہا۔ کچھ نہیں جو ہماری تقدیر میں تھا پورا ہوا۔ میں تو اب گاؤں نہیں چھوڑ سکتا چاہے کچھ ہو جائے۔
لیکن ایک بڈھا آگے بڑھا۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میرے قدم تھام لیے، اور کہا یہ لوگ جو چاہیں کریں، لیکن میرا آخری وقت ہے، قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوں۔ مجھ سے تو یہ بے ایمانی نہیں ہوتی، میں تو اب اس حال میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے لے چلو۔
یہ سننا تھا کہ ساری محفل چونک پڑی۔ زمینداروں اور بنبرداروں کی تیوریاں کھنچ گئیں، اور انھوں نے کہا، جب ہر طرف دنگا فساد مچا ہوا تھا، تب تو ہم نے ان کی جان بچائی اور ہماری بات کا یقین نہ کیجیے ان ہی سے پوچھ لیجیے کہ ان کو رتی برابر تکلیف ہم نے دی ہے۔ ہم سب ان کے آڑے آئے اور ان کی حفاظت کی۔ اور اب یہ ہمارے ساتھ یہ کر رہے ہیں۔
بڈھے نے جل کر کہا، تم نے بچائی کہ سور نے بچائی۔ بڈھا رو دیا۔ شور کھلایا کر تب ہم کو یہاں رہنے دیا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے، اور اندرونی تکلیف کو ضبط کرنے کی کوشش میں وہ سارے

جسم سے کانپ رہا تھا۔ اس نے کہا اب مجھ سے نہیں رہا جاتا۔ اس ڈھنگ سے زندگی نہیں کٹ سکتی۔

نمبر دار بگڑا۔ تم نے ہمارے ساتھ کھایا پیا۔ حقہ پانی کیا۔ تمھارے خیال سے ہم نے چھوت چھات مٹائی، تم نے ہمارا دھرم بھرشٹ کیا، اور اب یہ کہتے ہو۔ جان بچانے کا یہ بدلہ؟ کیسا انیائے ہے! ؟ سب کے سب آپس میں بولنے لگے۔ ہندو نوجوان خاص طور پر زیادہ برہم تھے۔ بڈھے سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہے تھے اور مسلمان ہماری موجودگی سے کچھ دلیر ہو گئے تھے۔

آخر کار سب کچھ سن کر میں نے ان سب سے کہا کہ:

بھئی معاف کرنا۔ ذرا مجھ کو صفائی سے کہنا پڑتا ہے کہ جو کچھ میں نے ابھی دیکھا اور سنا، اس کا مطلب ہے، تم دونوں پاپی ہو۔ ابھی ذرا دیر پہلے نمبر دار کی باتیں سن کر میں سمجھی تھی کہ اس گاؤں والے بڑے بھلے لوگ ہیں۔ یہاں جھگڑا نہیں ہوا۔ مل جل کر رہے اور ایک دوسرے کی حفاظت کی۔ مگر اب تو خیال بدلنا ہی پڑا۔ سن لو۔

تم دونوں نے ایک دوسرے کو دھوکہ دیا۔ جھوٹ بولا۔ ایک دوسرے کا دین دھرم بگاڑا۔ کتنے شرم و افسوس کی بات ہے کہ بہادر راجپوت اپنے پڑوسی کو پناہ دیتا ہے اور پھر اس کو مجبور پا کر یہ ظلم بھی کرتا ہے کہ گندی چیز، جسے کھانا اور کھلانا دونوں اس کے دھرم کی رو سے بھی جائز نہیں ہے، زبردستی اس کو کھلا کر خود بھی پاپ کرتا ہے اور اس کو بھی گنہگار بناتا ہے۔

اور تم پٹھان، بات کے دھنی، قول کے سچے، آن کے لیے جان پر کھیل جانے والے، تم جان کے ڈر سے اپنا ایمان خراب کرتے ہو، دل میں کچھ زبان پر کچھ۔ جب تم دل سے ہندو نہیں بنے تھے، تو تم نے جھوٹ بول کر ان کے ساتھ کیوں کھایا پیا۔ ان کے مذہبی رواجوں کو توڑ کر تم نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے، ذرا سوچو، یہ سب کرنے سے تو مر جانا اچھا تھا۔ تم میں سے کسی کا منہ اس قابل نہیں کہ خدا کو دکھا سکو۔ اب ایک ہی راستہ ہے کہ اپنے گناہوں پر پچھتاؤ۔ پہلے ایک دوسرے سے اور پھر بھگوان سے معافی مانگو اور پہلے کی طرح مل جل کر رہو۔

اور جو یہ نہیں ہو سکتا۔ تو پھر مجھے بتاؤ۔ میں ٹرک بھیج کر ان کو نکلوا لوں۔ گورنمنٹ دونوں کی ہے۔ وہ سب کو رکھنا چاہتی ہے۔ اس کے نزدیک سب برابر ہیں چاہے ان کا مذہب کوئی ہو۔ اتنے دن تم نے آزادی کا انتظار کیا۔ دعائیں مانگیں، اور جب مل گئی تو اس طرح اس کو مٹانے کے در پے ہو!

پتہ نہیں کیا تھا۔ کچھ وقت ہی شاید ایسا آگیا تھا کہ دونوں شرمندہ ہو گئے، اور تین دن کی مہلت مانگی کہ ہم پنچایت کر کے فیصلہ کر لیں۔

ہم واپس آئے دوسرے دن ونوبا بھاوے جی سے ملی، اور سارا حال سنا کر ان سے درخواست کی، کہ اپنے آدمی بھیجکر دیہاتوں میں باپو کے اصول اور تعلیم کا پرچار کریں، تو جلدی حالات سدھر جائیں گے۔ لوگوں میں اب سننے اور سمجھنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔

تیسرے دن ہماری پارٹی پھر گئی تو نمبر دار نے کہا۔ آپ ذرا یہاں ٹھہریے۔ ہم اس وقت پھر اکٹھے ہو کر بات کر لیں تو بتائیں۔ بڈھے کی چوپال میں جس میں اس کی لکڑی، لکڑی کاٹنے کے اوزار اور بھوسہ بھی ڈھیر تھا۔ ہم نے بیٹھ کر انتظار کرنا مناسب سمجھا۔

اس کا بیٹا مجھ سے کہنے لگا، کہ ذرا آپ میرے ساتھ چلی آیئے۔ میں آپ کو اپنا گھر دکھا دوں، اسے چھوڑ کر بھلا میں کیسے جا سکتا ہوں۔ اندر اس نے ایک کمرہ مجھے دکھایا جو اناج کی بوریوں سے بھرا ہوا تھا۔ گھر میں سامان بھی نسبتاً دوسرے کسانوں سے زیادہ تھا۔ اس نے کہا، میں جس طرح ہندو بنا ہوا رہا ہوں، اسی طرح رہوں گا، مگر بڈھا نہیں مانتا ہے۔ میں اکیلا ہی تو اس کا بیٹا ہوں۔ مجھے وہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اور پھر اس گاؤں میں دوسرا بڑھئی کاریگر بھی تو نہیں ہے، اسی لیے تو ان کو میری قدر ہے، یہاں مجھے کام بھی بہت ملتا ہے۔

اور یہ سچ تھا۔ اگر یہ بڑھئی۔ لوہار مزدور چلے جاتے تو پاس پڑوس کے ہل بیل گاڑیاں درست کرنے والا کون تھا۔ دوسرے پناہ گزیں بھی آ گھستے، جن کو انھوں نے اپنے بیان کے مطابق کالکا سے آگے بڑھنے نہ دیا تھا۔ حتیٰ کہ جیت پور یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر خالی پڑا تھا، احسان نمبردار اور اس کے ساتھیوں کے جانے کے بعد اس گاؤں میں ابھی تک پناہ گزین نہیں آ سکے تھے۔ جوانی دنیا، اس کا فائدہ اور اپنا مستقبل دیکھ رہی تھی، اور بڑھاپا آخرت کی فکر میں پریشان تھا۔ دونوں کے جذبات میری نظر میں تو قابل احترام ٹھہرے۔ میں ان مولوی صاحب کی طرح جو ایک بار ہمارے ساتھ دیہاتیوں کو لینے گئے تھے، ان سے یہ نہ کہہ سکی: کہ " دین و دنیا دونوں میں سے ایک کو چن لو" کیا پتہ جب وہ بھوک سے بیتاب ہوں تو بالکل ہی ملحد ہو جائیں۔ ابھی تو وہ کہتے ہیں ہم دل سے خدا کو یاد کرتے ہیں، چھپ کر نماز پڑھتے ہیں "

یہ سب سوچ کر میں پھر نمبر دار وغیرہ کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن دیر ہوتی ہی چلی گئی، اور ہمیں یہ محسوس ہوا کہ وہ لوگ ٹال رہے ہیں۔ آخر کار تھک کر ہم نے چلنے کی ٹھان لی اور یہی سوچ لیا کہ دوسرے دن سواری اور حفاظت کا انتظام کرا دیں گے۔ جونہی ہم کار میں بیٹھے، نمبر دار آگیا، اس کے ساتھ اور بھی کئی لوگ تھے۔ اس نے بڈھے کا ہاتھ پکڑا اور اسے گلے لگا کر کہنے لگا:

" بہن جی، ہم بڈھے ہمیشہ کے ساتھی پڑوسی۔ ایک دوسرے کو چھوڑ نہیں سکتے، میں کہے دیتا ہوں،

ان کا جیسے جی چاہے رہیں، مگر یہاں سے نہ جائیں۔ ہم ان کو جانے نہ دیں گے۔"

میں نے کہا" مگر یہ تو مسلمان ہو کر رہنا چاہتے ہیں اور تم اس کو پسند نہ کرو گے۔ حالانکہ صدیوں سے یہ یہاں اسی طرح رہتے آئے ہیں، اور تب تمھارا کچھ نہ بگڑا۔ اب ان کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی اجازت نہیں ملتی، اس لئے بھاگ رہے ہیں۔"

نمبر دار نے وعدہ کیا کہ ..... اب کچھ نہ ہوگا۔ کوئی ان کو نہ روکے گا۔ لیکن گوڑ گانوہ کے جو لوگ بھگدڑ میں یہاں آکر بس گئے تھے وہ اگر جانا چاہیں، تو جائیں، نہ وہ ہمارے ہیں اور نہ ہم ان کو رکھنا چاہتے ہیں، یہ گڑبڑ بھی انھیں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ ان کو آپ ضرور یہاں سے بلا لیجیے۔

مصالحت ہو گئی اور ہماری پارٹی کامیاب واپس آئی۔ ہم نے ونوباجی کو جاکر خوش خبری سنائی کہ اب دوسرے دن آپ کے جانے کی ضرورت نہیں ہے، وہاں سب گلے مل گئے۔ وہ بھی بہت خوش تھے۔

دوسرے روز ہم آدمی وہاں سے نکال کر نظام الدین میں لبا دیے گئے۔ وہ سب گوڑ گانوہ کے تھے، اور وہیں واپس جانے کے خواہش مند تھے، مگر فی الحال ہم ان کو بھیج نہیں سکتے تھے۔ کچھ روز بعد ایک دن بڈھا پھر آیا۔ وہ کچھ بہت خوش نہ تھا، مگر اتنا اطمینان تھا کہ اپنے گھر میں نماز پڑھتا ہے۔ اس نے پوچھا۔ بہن جی روزے آرہے ہیں، رکھوں؟ ہمارے ساتھیوں نے کہا۔ ضرور رکھو کوئی تم کو روکے تو ہم سے بتانا۔ وہ اب بھی ڈر رہا تھا لیکن اس کی ڈھارس بندھ گئی۔

اس تجربہ نے ہمت بڑھا دی۔ نجف گڑھ علاقہ کے بہت سے دیہات شدھی لوگوں سے آباد تھے۔ ان میں بہت سے بھاگنے پر تلے ہوئے تھے، اور ہم نے سوچا کہ پنچایت اور گاندھی جی کی دعا پر مجلس کے ذریعہ اگر ہم اس کو سدھار سکیں تو بہت ہی اچھا ہوگا۔ ونوباجی سے میں نے اس پر بات چیت بھی کی اور وہ تیار تھے کہ جب کہو، ہم وہاں پرارتھنا سبھا منعقد کرلیں۔ لیکن کچھ ایسے حالات پیش آتے رہے کہ ہم اپنی اس خواہش اور ارادہ کو پورا نہ کر سکے۔

جلے ہوئے مکانات اور ملبہ کے ڈھیر تو خیر ہر جگہ ہیں ملتے تھے، مگر شاہدرہ پل کے اس پار ہم نے ایک گاؤں ایسا دیکھا جہاں بہت سے پختہ مکانوں کی دیواریں تک کھود دی گئی تھیں۔ یہاں شرنارتھی بڑی تعداد میں مقیم تھے اور ان کی ٹوٹی ہوئی دیواروں کو درست کر رہے تھے۔ گاؤں کے تمام درخت کاٹ کر دروازے، کھڑکیاں اور چھت تیار ہو رہی تھی۔ مقامی آبادی دوسرے سرے پر تھی۔

ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ" کیا یہ مکان بموں سے اڑائے گئے ہیں۔

معلوم ہوا نہیں، اس قصبہ میں تو کوئی لڑائی ہوئی ہی نہیں۔ یہاں تو مسلم کیمپ تھا اور کیمپ

کے تمام افراد یہاں سے صحیح وسلامت نکل گئے۔ البتہ دو تین فرلانگ پرے، گاندھی نگر کے سامنے والے میدان میں ان پر حملہ ہوا اور ۷۵ فی صد آدمی ختم ہو کر جو ایک حصہ بچا وہ دہلی پہنچا دیا گیا۔

ہم نے پھر سوال کیا:

"مگر یہ مکان کس نے کھودے؟"

مقامی ہندوؤں نے جواب دیا۔ "شرنارتھیوں نے!"

حالانکہ یہ غلط تھا، اور ہمیں اصل حقیقت بعد کو معلوم ہوئی، اس قصبہ کی بربادی کے ذمہ دار شرنارتھی ہرگز نہ تھے، علاقہ شاہدرہ کی تباہی و بربادی کے ذمہ دار مقامی لوگ تھے، جن میں راشٹریہ سنگھ کے ممبران اور سرگرم لوگ بہت تھے، یا پھر پولیس، جن میں ہندو راج اور جاٹستان کا پروپیگنڈا اس حد تک ہوا تھا کہ وہ اپنی انسانیت بھی کھو بیٹھے تھے۔ یہ تو ان دنوں عام بات تھی کہ کرد خود، اور الزام تھوپ دو شرنارتھیوں کے سر۔ "کمزور کی جورو سب کی بھاوج"۔ شرنارتھی جہاں تھے بھی نہیں، وہاں بھی ہر کام کے ذمہ دار وہی قرار دیے گئے۔ اور ان کے پردہ میں امن کے دشمنوں نے اپنے ہاتھ رنگے۔ لیکن شرنارتھی بھی کتنے بدھو تھے، ان کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ اپنی صفائی پیش کرتے۔

بہر حال حالات کی تحقیق کرنے کے بعد، اور پاس پڑوس کے دیہاتیوں سے پوچھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچے، کہ پڑوسی ان مسلمانوں کے ساتھ ہر وقت اٹھنے بیٹھنے والے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان اپنا سونا چاندی دیواروں اور زمینوں میں دفن کرتے ہیں۔ اس قصبے کے مکین بڑے مالدار لوگ تھے۔ ۵ ہزار تو صرف مویشی ان کے پاس تھے۔ بھیڑ بکریاں تھیں۔ بہترین نسل کی بھینس اور گائیں جن کا سارا دودھ روزانہ دہلی آتا تھا۔ مسلمان گوجروں کا یہ قصبہ اپنے تمول کے لیے مشہور تھا۔ ممکن ہے زمین اور دیواریں کھودتے وقت شرنارتھیوں نے بھی کچھ شرکت کرلی ہو لیکن میرا خیال ہے یہ سب کچھ ان کے آنے سے پہلے ہو چکا تھا۔ اور جب وہ آئے تو مکانات کے دروازے اور کھڑکیاں تک غائب تھیں چھت کی کڑیاں بھی اتر کر ہندو بھائیوں کے مکانوں میں پہنچ چکی تھیں۔ ردی سامان باقی تھا۔ وہ رفیوجیز نے کھانا پکانے کے لیے ایندھن کے طور پر استعمال کرلیا۔ ان کو بھی تو اپنے انتقام کی آگ بجھانا تھی۔ بلا کچھ سوچے سمجھے دو چار جھونپڑیوں میں انھوں نے بھی آگ لگا دی۔

اور اب اس دھوپ لُو سے بچنے کے لیے پاس پڑوس کے گاؤں تک کے درخت کاٹ کر لاتے ہیں اور ان ٹوٹے ہوئے گھروں کی مرمت کر رہے ہیں۔ انھیں مکانوں کی درستی کے لیے وہ گورنمنٹ سے روپیہ بھی مانگ رہے تھے۔

ارد گرد امپروومنٹ ٹرسٹ کے پلاٹ پڑے ہوئے تھے۔ شرنارتھی کہتے تھے، ہمیں الاٹ

کر دیے جائیں تو ہم خود مکان بنوالیں، اور ہم نے مرکزی دفتر کو رپورٹ کی کہ جس قدر جلد پلاٹ دلوا دیے جائیں بہتر ہوگا۔

مہرولی کے قریب ایک بہت بڑا گاؤں[1] تھا جس کی آبادی پچھلے دنوں آٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس کے باشندے دولت مند، تندرست اور بہترین کاشتکار بھی تھے۔ یہاں البتہ پختہ مکانات پر پناہ گزینوں کا قبضہ تھا، اور مکانات صحیح وسالم تھے۔ لیکن کچے مکانوں کے سیکڑوں چھپر اور چھتیں چولھے میں جلا ڈالی گئی تھیں اور اب پریشان تھے کہ آخر اتنے بہت سے آدمی کہاں رہیں، کیسے رہیں۔ دو عالی شان مسجدیں بھی تھیں، اور ان میں بھی کئی خاندان بس رہے تھے۔

مسجدوں اور مزارات کے متعلق ساری رپورٹ ہم "انخلا مساجد کمیٹی" کو جس کے صدر لالہ مہر چند کھنہ تھے، بھیجا کرتے تھے۔ یہ کمیٹی باپو اپنی زندگی ہی میں بنا گئے تھے اور اسی کمیٹی کی کوشش سے دہلی کی بہت سی مسجدیں مسلمانوں کو پھر واپس ملیں۔ ان کی مرمت ہوئی۔ مزارات کی درستی ہوئی۔ محکمہ آثار قدیمہ کے سکریٹری اور احرار پارٹی کے ایک رکن بھی اس میں شامل تھے۔ جب کوئی امر مشتبہ ہوتا تو قدیمی نقشہ جات کی مدد سے ثبوت حاصل کیے جاتے تھے۔ میں چونکہ اب تک ان کی شریکِ کار نہ تھی، اس لیے تفصیل سے ناواقف ہوں۔ لیکن کمیٹی کی سرگرمیاں اور اس کے گرانبار احسانات کی معترف ضرور ہوں، وہ خطرہ میں پڑکر بھی اپنے فرائض ادا کرتے تھے۔

دلّی میں جمعیۃ العلماء کے ہوتے ہوئے (جو سارے ہندوستان میں مسلمانوں کی خالص سربرآوردہ جماعت ہے)، اور اس کے زیر سایہ دیہاتوں میں نہ مذہبی تعلیم تھی، نہ اسلامیت یا اسلامی کلچر تھا۔ برہمن یا راجپوت۔ جاٹ۔ گوجر وغیرہ قوموں کے لوگ اپنے رہن سہن اور رسم ورواج کے اعتبار سے کسی طرح بھی دیکھنے میں مسلمان نہ معلوم ہوتے تھے۔ مسلم جاٹ اپنی ہٹ دھرمی اور جہالت میں کسی طرح بھی ہندو جاٹوں سے مختلف نہ تھے۔ ارتداد کا فتنہ اٹھا تو پورے پورے گاؤں شدھی ہو گئے۔ اس طوفان کے لیے ان کے پاس کوئی روک نہ تھی، کوئی سہارا نہ تھا۔ ان میں بیشتر ایسے تھے جو کلمہ تک سے ناواقف تھے۔ اور کلمہ جانتے ہوتے جب بھی کیا تھا جب اس کے معنی سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔

اچھے بھلے چنگے، کھاتے پیتے لوگ اور ان میں مڈل پاس تک ایک فی صد بھی نہ تھے۔ کئی کئی سو بیگہ زمین کے اور دو منزلہ مکانوں کے مالک انگوٹھا لگاتے تھے۔ دستخط نہ کر سکتے تھے۔

---

[1] - چھترپور

جب مردوں کا یہ حال تھا، تو عورتوں کا کیا ذکر۔ راجدھانی کے ارد گرد جب یہ حال تھا تو ملک کے دوسرے حصّوں میں جو نہ ہوتا، تھوڑا تھا۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا[1]

ہماری پارٹی علاقہ نزیلہ کے بھی ایک ایسے گاؤں میں بھی گئی جو کانگریس کے مخلص کارکنوں کی کوشش سے ستمبر میں اُجڑ کر نومبر ۱۹۴۷ء میں پورے دو ماہ بعد باپو کے سامنے ہی آباد ہو گیا تھا۔ لیکن اس وقت تک ان بچاروں کو کسی طرف سے کوئی امداد نہ ملی تھی سوامی کا آشرم[2] جو مصیبت زدوں کی پناہ گاہ رہ چکا تھا، آج بھی بے سہارا لوگوں کی امیدوں کا مرکز تھا۔ سوامی جی کے خلوص، اور ان کے ساتھیوں کی مدد نے نہ صرف ان کی جانیں بچائیں، بلکہ عزّت اور جان بھی بچائی اور ایمان بھی بچایا۔ ان کی زمینیں بھی واپس دلائیں، اور ۵۰-۵۰ سال کے موروثی کاشتکار جو مالکوں کے تعصب کا شکار ہو کر بے دخل کر دیے گئے تھے، ان کی قانونی امداد بھی سوامی جی نے کی۔ ظلم، زبردستی اور دھوکہ کے کئی واقعات جو سوامی جی کے پاس تحریری موجود تھے۔ انھوں نے ہمارے سپرد کیے۔ انھوں نے کہا۔ ہم تھانہ میں بھی رپورٹ کر چکے اور سب جگہ ان معاملات کو لے گئے مگر سنوائی نہ ہوئی۔ وہ بھی لاقانونی سے بہت پریشان تھے۔

سوامی جی نے علاقہ نزیلہ میں ایک چھوٹا سا آشرم کھول رکھا تھا۔ اس میں مستقل تو صرف تین چار آدمی رہتے تھے۔ لیکن مسافروں اور دکھیاروں کا تنہا ٹھکانہ یہی تھا۔ ان کے دوسرے ساتھی تعلیم یافتہ تھے، مگر سوامی جی ان پڑھ تھے۔ بلا کے جفاکش، مخلص، گاندھی جی کے سچے بھگت، اور بحیثیت انسان کے بے نظیر آدمی تھے۔

ان دنوں جب فساد اپنے عروج پر تھا۔ پڑوس کا گاؤں خالی ہو کر سارے کا سارا آشرم میں اٹھ آیا۔ ان سب کو کافی دن یہاں رکھنے کے بعد انھوں نے ندی پار پہنچا دیا کہ اپنی رشتہ داریوں میں یو۔ پی چلے جاؤ۔ جونہی اکتوبر گزرا اور نومبر آیا۔ سوامی جی اور ان کے دوسرے ساتھی ایفائے وعدہ کے لیے بے چین ہو گئے باپو سے صلاح لے کر وہ سارے پناہ گزینوں کو بلا لائے۔ پانچ مہینے تک کسی طرف سے ان کو بالکل مدد نہ ملی۔ سب کا بوجھ اپنے ضعیف کاندھوں پر انھوں نے خود اٹھایا۔ ہم لوگ بھی ان کی کچھ زیادہ مدد نہ کر سکے۔ بس حقیر سی مالی امداد اور کسی قدر دوسری اعانت۔

---

[1] ۔ اس باغ کی حالت سے ہماری بہار کا اندازہ کر لو۔

[2] ۔ ایک پرانے کانگریسی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر۔

باقی سب مسائل انھوں نے خود حل کیے۔ اسی آشرم میں دو ماہ تک چھپا کر ایک مسلم لڑکی نائر جی[1] میرے پاس پہنچا گئے تھے ۔ ایسے واقعات معلوم نہیں کتنے پیش آئے ہوں گے۔ مگر وہ اپنی تعریف کب کرانا چاہتے تھے ۔ وہ تو خاموش کام کرنے والے تھے ۔ جو ہر کام اپنا فرض سمجھ کر انجام دیتے تھے۔

لڑکیوں کو آشرم میں چھپانا پھر ان کو بحفاظت رشتہ داروں تک پہنچانا صرف سوامی جی کی ہمت تھی۔ مخالفین کے نرغہ میں بھی ان کی ہمت کم نہ ہوتی تھی۔ میرے ساتھ بھی کئی مقامات کا دورہ انھوں نے کیا اور اپنا تو تقریبا سارا علاقہ ہمیں انھوں نے دکھایا۔ میں جلسوں میں ان کی تقریریں سن کر دنگ رہ گئی۔ اپنی دیہاتی زبان میں وہ قانون، سیاست، بین الاقوامی حالات اور دھرم سب پر اپنی خداداد قابلیت کی بدولت روشنی ڈالتے تھے۔ ستھرے خیالات، بلند معیار اور صائب رائے رکھتے ہوئے بھی وہ بڑی سادگی سے اپنے کو ان پڑھ مورکھ کہا کرتے تھے۔ ان سے مل کر اور پھر کچھ اور خلص کانگریسیوں کو میں دیکھ کر پکار اٹھی کہ پھر انسان نکلے تو یہیں سے۔ باپو کا کیا دھرا اکارت نہیں ہوا۔ انھوں نے بنجر زمین نہیں چھوڑی ہے۔ اکا دکا سایہ دار درخت بھی اگا گئے ہیں، جن کے تلے زندگی کے تھکے ہارے لوگ آج بھی آرام حاصل کر سکتے ہیں۔ جب بچا کھچا دیکھنے کا وقت آیا تو باپو ہی کی گدڑی سے جواہر چمکتے ہوئے دکھائی دیے۔

ہمیں وہ دیہات بھی دکھائے گئے جہاں ایسے لوگ زمین و مکان کے مالک تھے جن کے پاس مشرقی پنجاب میں بھی زمینیں اور مکان تھے، اور مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی زمینوں میں سے ان کو اس گاؤں میں بھی حصہ دیا گیا تھا۔ وہ مشرقی پنجاب کے رہنے والے تھے، مگر ان کے کچھ مربعے پاکستان میں بھی تھے، اور وہ اب ان سے محروم ہو گئے تھے اس لیے دہلی صوبہ کی مسلم جائداد سے ان کو نقصان کا معاوضہ دیا گیا تھا۔

یہ لوگ فصل پر آتے تھے، کٹائی، جوتائی کرنے کے بعد سب اناج بیچ باچ کے روپیہ لیتے اور مشرقی پنجاب واپس چلے جاتے۔ اس گاؤں کی سولہ سو بیگہ آراضی کی زیادہ تر تقسیم ایسے ہی پناہ گزیں مصیبت زدوں کو ہوئی تھی۔ پاس کے ایک دوسرے گاؤں میں ایگریکلچر ڈپارٹمنٹ[2] کے ایک ممبر کو ۸ ہزار بیگہ زمین الاٹ کی گئی تھی۔ ہماری تو اس سے ملاقات نہ ہو سکی لیکن لوگوں

---

[1] ۔ سوامی جی کے دوسرے ساتھی مسٹر کرشن نائر — دہلی کے ایک سماجی اور سیاسی عہدہ دار بعد کو دہلی سے پارلیمنٹ کے ممبر بھی چنے گئے۔

[2] ۔ مرکزی گورنمنٹ کے۔

لے بتایا کہ جنگل کی ہزاروں روپیہ کی لکڑی بیچ کر کثیر رقم اس نے حاصل کی ہے اور ان دنوں کہیں گیا ہوا ہے۔

مشکل یہ تھی کہ مقامی آبادی اور پناہ گزین دونوں اپنے اپنے معاملات الگ ہی الگ طے کرانا چاہتے تھے، اور کچھ صورت بھی ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ ایک محکمہ دوسرے کی دقتوں کا بالکل لحاظ نہ کرتا تھا۔ اس لیے وہ بھی سمجھتے تھے کہ ہمارا محکمہ ہمارا حاکم اور ہمارا معاملہ سب جدا ہے، ہم ایک دوسرے سے مل کر کیوں فیصلہ کرائیں، اور کس لیے ایک دوسرے کا لحاظ کریں۔

بہر حال سب کچھ دیکھتے بھالتے ۱۵ جون بھی گزر گیا۔ حکومت کیل کانٹے سے لیس تھی اور کارکن صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھے دشمنوں کی کچھ پیش نہ گئی۔ سب کچھ خیریت سے گزر گیا۔ ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر جون بھی اسی ہماہمی اور دوا دوش میں ختم ہو گیا۔

لیکن وہ شر پسند عنصر جو ۱۵ جون کو اپنا مقصد حاصل نہ کر سکا تھا ایسی برہمی اور بے چینی پیدا کر دینا چاہتا تھا کہ لوگ از خود بھاگنے لگیں۔ اس لیے اب پھر دوبارہ مسجدوں، مزاروں کی کھدائی شروع ہو گئی، اور شہر میں مکانات حاصل کرنے کے بہانہ شورش پھیلائی جانے لگی۔ "شانتی دل" کی میٹنگیں جلد جلد ہوتی تھیں، اور ہم سب مل کر بیٹھ کر یہی سوچتے تھے کہ وہ کونسی سازش ہے، جسے ہمیں بے نقاب کرنا ہے۔ یہ برابر ہو رہا تھا کہ کسی گاؤں میں جا کر خالی پڑی ہوئی زمین، یا ایسے کھیت پر جن پر مقامی باشندوں نے قبضہ کر لیا ہو، ہم اس کے اصلی مالک کو واپس دلانے کی کوشش کرتے اور فوراً مخالفین کو پتہ لگ جاتا۔ جب تک ہم مالک کو لے کر پہنچیں وہاں ٹرک بھر کر شرنارتھی روانہ کر دیے جاتے اور پھر مالک کے لیے ایک کونہ بھی خالی نہ رہ جاتا۔

دیہاتوں میں اسکول بند تھے۔ بیکاری عام تھی اور کھیت بنجر پڑے تھے۔ یہ تو گورنمنٹ ہی جانتی ہو گی کہ اس افراتفری میں کتنا مالی نقصان اس کا ہوا، اور کتنی زمین تھی، جس کی دو فصلوں کا لگان افسران مال نہ حاصل کر سکے۔ لیکن ہمارا اندازہ تھا کہ اس سال نصف سے بھی کم آمدنی ہوئی ہو گی۔ اور اسی لیے ہماری اور بھی خواہش تھی کہ کسی طرح جلد نئی فصل بونے والے گاؤں میں پہنچا دیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ہر آدمی کسی دوسرے کی چیز اور زمین پر قابض تھا، وہ سارا پرانا نظام ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اور غاصب[1] نہ حکومت کو کچھ دینا چاہتے تھے، نہ شرنارتھی کو

---

[1] ۔ حکام کے سامنے وہ اقرار ہی نہ کرتے کہ کوئی چیز ان کے قبضہ میں ہے۔ اور ہم لوگوں پر یہ دھونس جماتے کہ یہ سب ہمارا ہے۔ ان میں سب مقامی ہندو زمیندار تھے۔

اور نہ مالک کو!

گورنمنٹ اگر چاہتی تو بڑی آسانی سے دلی صوبہ میں مشترکہ کاشت کا طریقہ رائج کر سکتی تھی۔ سارے گاؤں کو ملا کر ایک اجتماعی یا پنچایتی ادارہ قائم کر لیا جاتا، اور اس میں مسلم پناہ گزیں، پنجابی رفیوجیز اور اگر مان جاتے تو مقامی زمیندار، سب شامل کر لیے جاتے۔ میرا خیال ہے، نہ ماننے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ جب گورنمنٹ زمینداری چھینے گی، تب وہ آخر مانیں گے، اس وقت کیوں نہ راضی ہو جاتے۔ مگر منتظمین اس پر راضی نہ تھے۔

مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی زمینیں بجائے اس کے کسی کو ایک ہزار بیگہ الاٹ ہو، کسی کو دس بیگہ یا دو بیگہ عنایت کی جائے۔ اور کسی کو یونہی دھتکار دیا جائے اگر اسی ساری زمین پر قبضہ کر کے جماعتی فارم بن جاتا تو ایک نیا تجربہ بھی ہو جاتا اور یہ آسانی بھی رہتی کہ اگر مالک واپس آئے، تو اس کو بھی جماعت میں شامل کر کے اس کُل کا ایک جزو بنا لیں۔ مالک بھی سمجھتا "بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھلی، چلو جو کچھ مل جائے غنیمت ہے، بھوکوں تو نہ مریں گے!

میں بار بار کہتی تھی، کہ ہمارا مطالبہ یہی ہونا چاہیے۔ لیکن ایک طرف تو کسٹوڈین کا محکمہ اور امداد و بحالی والے اس پر تلے ہوئے تھے کہ اسی نفاست سے زمینیں الاٹ ہوتی رہیں گی اور دوسری طرف خود ہمارے ساتھی جو اس ڈر سے کہ کہیں یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو ان سب کے حق ملکیت پر بھی چوٹ پڑے گی، اس پر بضد تھے کہ زمین کا فرداً فرداً رفیوجیز کو الاٹمنٹ بھی ہو۔ اور جب مالک آجائیں تو اسی طرح ان کو واپس بھی دی جائے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ جس کا حق ہو اسے ملنا چاہیے۔ اسٹیٹ کے اس حق کو کہ زمین جس طرح چاہے تقسیم کرے، ان کے زمیندارانہ دماغ تسلیم ہی نہ کرتے تھے، اور اگر وہ مان جاتے تو بھی یہ کب امید تھی، کہ ہماری تجویز پر عمل ہو جائے گا اور حکومت بھی مان لے گی۔

مجھ میں خود نہ اتنی صلاحیت تھی، نہ اتنا علم کہ جس کی طاقت سے اقتصادیات میں پڑتی، اس لیے اپنی نااہلیت دیکھ کر یہی بہتر معلوم ہوا کہ ان آزمودہ کار لوگوں پر معاملہ چھوڑ دوں، وہ جس طرح کرا سکتے ہوں معاملات طے کرائیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اپنے نظریہ اور قدامت پسندانہ اصولوں پر چل کر انھوں نے بہت کچھ کرا لیا، میں جدت کو لیے بیٹھی ہی رہ جاتی۔

مہرولی میں ایک گاؤں ”شیخ سرائے“ بھی تھا، یہاں کے سب مسلمان ستمبر میں مارے گئے یا بھاگ گئے تھے، کچھ اب تک دہلی میں مقیم تھے۔ ان کی درخواست جب ہمارے پاس آئی تو ہم نے جا کر اسے دیکھا، اس وقت وہاں ایک ہزار اور دو ہزار کے درمیان شرنارتھی بس رہے

تھے۔ اور سنٹرل ریلیف کمیٹی کی طرف سے کوآپریٹو اسکیم کے مطابق وہاں امداد و بحالی کا کام ہو رہا تھا۔ پراونشل کانگرس کمیٹی کے ایک ممبر کی زیر نگرانی یہاں جماعتی کھیت، بنائی، کتائی، اور تعمیر اور عمارتی سامان کی تیاری سب کچھ ہو رہی تھی۔

گاؤں میں کچے مکانات اب بھی خالی تھے اگرچہ حسب معمول چھپر وغیرہ ان پر یہاں بھی باقی نہیں رہ گئے تھے مگر کوئی توڑ پھوڑ نہیں ہوئی تھی، نہ آگ لگائی گئی تھی ہم نے ممبر صاحب سے کہا کہ بہتر یہی ہوگا، آپ مسلم پناہ گزینوں کو بھی سوسائٹی میں شامل کر لیجیے۔ اگر مقامی ہندو بھی مل جاتے تو کیا کہنا تھا۔ لیکن وہ شاید ہی اپنی ملکیت سے محروم ہونا پسند کریں اس لیے آپ مسلم اور ہندو پناہ گزینوں کو ملا کر اپنی اسکیم چلائیے۔ میں مسلمانوں کو اس پر راضی کر لوں گی۔ وہ تیار ہو گئے اور اس تجویز کو پسند کیا۔

لیکن مجھے اور انھیں دونوں کو اپنے ساتھیوں کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم کہتے تھے، موقع ہے۔ ایک تجربہ ضرور کر لیا جائے۔ سوال سخت تھا۔ لیکن میں نے دل مضبوط کر کے یہاں تک کہہ دیا کہ مسلمانوں کو اگر اس میں نقصان بھی ہو جائے، تو مجھے افسوس نہ ہوگا۔ حالانکہ نقصان ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ کام اگر محنت اور دیانتداری سے کیا جاتا، صوبائی اور مذہبی تعصب کا دخل نہ ہوتا تو یقیناً یہ تجربہ دونوں کے لیے مفید ثابت ہوتا۔

ایک پناہ گزیں اس پروگرام کے کرتا دھرتا اور مہتمم تھے۔ ان سے بھی ہم نے اس موضوع پر بات کی۔ انھوں نے لاپروائی، حقارت اور ناگواری کے ساتھ اس تجویز کو سنا۔ ہمارے ساتھیوں کی پیش کردہ وجوہ اور اندیشے بھی غلط نہ تھے نہ رفیوجیز مسلم کو ساتھ لینے پر تیار ہوتے، نہ کارکن اتنے فراخ دل تھے کہ دونوں کو ایک نظر سے دیکھنے پر تیار ہوتے۔ میری کچھ پیش نہ چلی اور مسلمان آج تک شہر میں پڑے ہیں۔ ان کی زمینوں اور مکانوں میں لوگ رہتے ہیں، ہل چلتے ہیں۔ فصل تیار ہوتی ہے اور وہ حسرت کے ساتھ کبھی کبھی جا کر دیکھ آتے ہیں اور اب تو وہ جانا بھی نہیں چاہتے۔ انھوں نے ملازمت اور کاروبار وغیرہ کر کے اپنی گذر بسر کا سامان بھی کر لیا ہے۔ وہاں ان کا ہے بھی کیا۔ ایک کھدا ہوا قبرستان اور ایک بزرگ کے مقبرہ کے کھنڈرات اب تک ان کی ملکیت ہیں۔ بزرگ کی یہ آرام گاہ توڑ پھوڑ کر گدھوں کا مسکن بنائی گئی تھی، ہماری پارٹی جب وہاں گئی ہے تو بھی وہاں گدھے موجود تھے۔ مجھ سے تو رنج کے مارے کچھ کہا نہیں گیا۔ لیکن میرے ساتھیوں نے گاؤں والوں کو ڈانٹا۔ لعنت ملامت کی اور گدھے وہاں سے نکلواتے۔ اور آئندہ کے لیے سختی کے ساتھ تنبیہ کی۔ پھر لالہ مہرچند کھنہ گئے اور انھوں نے دیکھ بھال کر شاید اس کی مرمت بھی کروائی۔ میں نے تو پھر ادھر کا رخ ہی

نہ کیا۔

چراغ دہلی اس سے بالکل متصل تھا اور وہاں بھی یہی حال ہو چکا تھا۔ صرف حضرت روشن چراغ دہلی رحمتہ اللہ علیہ کا مزار سلامت تھا۔ گاؤں کے بڈھے ہمیں دیکھ آ گئے۔ وہ رنجیدہ تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا:

صاحب یہ وہ درگاہ ہے جس سے ہمیشہ ہمارے باپ دادا کو، اور پھر ہمیں عقیدت رہی نئی فصل نئی شادی اور نیا بچہ لے کر ہم اس درگاہ کو نذرِ عقیدت پیش کرنے آیا کرتے تھے۔ یہ سارا گاؤں اس درگاہ کے لیے وقف تھا۔ اس شہر پناہ کے اندر صرف مسجد تھی، درگاہ تھی، اور دوسرے مزارات وغیرہ تھے، خدام اور مجاوروں کے سوا یہاں کی ساری آبادی احاطہ سے باہر تھی۔

ایک مرتبہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ایک ہندو چیلے کو ان کی گدی پر بیٹھایا گیا تھا۔ پھر شاید **۱۸۵۷** میں یا اس سے پہلے نادر شاہ کے قتل عام کے دنوں میں باہر کی آبادی بھاگ کر شہر پناہ کے اندر چلی آئی اور تب سے ہندو مسلمان یہاں بس رہے تھے۔ اب کی جو فساد ہوا اس میں یہاں سنگھ کا زور بہت بڑھ گیا تو جوانوں نے ہماری ایک نہ سنی۔ مسلمان تو سب بھاگ گئے اور انھوں نے درگاہ اور اس سے متصل ہر عمارت کو توڑا پھوڑا۔ تباہ کیا۔ غنڈوں نے مزار کے اس وزنی پتھر اٹھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ کسی طرح اس کو کھسکا نہ سکے[1]۔

مزار کے اوپر دو جسیم سنگِ مرمر کی سلیں ایک دوسرے سے پیوست تھیں۔ ان کو بمشکل ایک بالشت ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکا اور پھر تھک کر انھوں نے مقبرہ کے فرش پر غصہ اتارا۔ اس کا ٹائل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ منقش چھت گیری کا شیشہ اور خوبصورت پینٹنگ برباد کی۔ دوسری قبروں کو ہتھوڑوں سے چکنا چور کیا۔ پھاوڑوں سے اکھیڑ کر ملبہ کی ڈھیر لگا دیے۔ مسجدوں میں اس وقت شرنارتھی ٹھہرے ہیں۔ درگاہ سے ملحق دوسری عمارتوں پر گاؤں والوں کا قبضہ ہے۔

ایک بڈھے نے کان میں جھک کر کہا۔ یہاں گنڈہ پارٹی بہت ہے۔ اس کا تو کچھ بندوبست کرو۔ اور یہ سب کچھ سنا کر انھوں نے ہمیں بتایا کہ بمشکل اس درگاہ کا فرش، فانوس، چادریں اور جھاڑ وغیرہ ہم نے بچالی ہیں جو امانت رکھی ہیں۔ جس وقت کہو ہم تمھارے حوالہ کر دیں۔ کیا کریں صاحب

---

[1] ۔ مزار بالکل محفوظ رہا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔ شرپسندوں میں زیادہ تر مقامی نوجوان تھے۔ اکا دکا شرنارتھی۔ البتہ گنبد کی اور ارگرد کی ساری آئینہ بندی اور مینا کاری کو توڑ کر ختم کر دیا گیا۔

کچھ نوجوان ہمارے یہاں ایسے ہیں جن پر ہمارا بس نہیں چلتا۔

ہمارے برہمن ساتھی کہا کرتے تھے " میں آپ کو بتادوں آپاجی، ہندو کا بچہ کبھی قبر پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا"، لیکن یہ حقیقت دیکھ کر وہ بالکل سناٹے میں رہ گئے۔ یہاں تو بہت ہی کم رفیوجی تھے۔ اور وہ بھی چند دن ہوئے آئے تھے۔ اس وقت تو وہ بچارے میلوں دور تھے، سکھ تو خال خال ہی تھے۔

درگاہ کا قدیم ۵ سو برس کا پرانا برنجی دروازہ، سنہرا کلس اور قیمتی سامان لٹ چکا تھا۔ لیکن ان بڈھوں نے ہی ہمیں بتایا کہ کوئی چیز علاقہ سے باہر نہیں گئی۔ آپ کوشش کریں تو سب چوروں کے گھر سے برآمد ہو سکتا ہے۔

تقریباً آٹھ ماہ کی کوشش کے بعد پولیس نے پاس پڑوس کے گاؤں سے وہ چیزیں برآمد کرائیں اور کچھ زمانہ کا رنگ اور حکومت کے ڈر سے لوگوں نے از خود لاکر درگاہ میں چپکے سے رکھ دیں۔

ہمارے ساتھ پنڈت سندر لال تھے۔ اس علاقہ میں بھی ان کے بھروسہ پر ہم نے بڑے جلسہ کا اعلان کر دیا۔ اور انھوں نے پورے تین گھنٹہ تک سیاست، مذہب، رواج، تاریخ اور ہندوستان و پاکستان کے چشم دید واقعات پر تقریر کی۔ خوب کھری کھری سنائیں لوگ بھنا اٹھے۔ مگر جلد ہی انھوں نے نشست بدل لی۔ خود بھی روئے دوسروں کو بھی رلایا اور جس وقت لوگوں کی آنکھ سے آنسو گرنے لگے تو انھوں نے کوئی چٹکلہ چھوڑ دیا کہ رونے والے بے اختیار ہنس پڑے۔

مخالفانہ سوالات ہوتے۔ ہلکی ہلکی اضطرابی آوازیں آئیں۔ اور ابتدا میں تھوڑی سی ہنگامی کیفیت محسوس ہوئی لیکن پھر سکون طاری ہو گیا اور آخر تک قائم رہا۔

اس جلسے میں جاجوجی بھی تھے۔ انھوں نے بڑی صلاحیت کے ساتھ کچھ اینڈے بینڈے سوالات کیے۔ اور جب دل میں چھپا ہوا چور نکال لیا تو سادے لفظوں میں ٹھوس حقیقت سمجھائی۔ بلا کا سکون ان کی شخصیت میں تھا۔ نہ گھبراہٹ، نہ تیزی، نہ جوش شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی کیفیت ان پر طاری رہتی تھی۔ بظاہر دیکھنے میں بالکل خالی الذہن بیٹھے ہیں مگر کان اور آنکھیں

لہ ۔ ہمارے ساتھ چھا غ دہلی جانے والوں میں اس دن خوشحال چند خورسند ایڈیٹر ملاپ بھی تھے جو بعد کو سنیاس لے کر مہاتما آنند سوامی بنے۔

ایسی کھلی رکھتے تھے کہ مجمع کی کوئی حرکت حتیٰ کہ چہرہ کا اتار چڑھاؤ تک بھانپ لیتے تھے۔

دیہاتوں اور قصبوں کے بڑے جلسوں میں ہمیں ان دونوں سے جو قیمتی امداد ملی ہم اسے بھول نہیں سکتے۔ بحیثیت مجموعی ان دونوں بزرگوں نے صوبہ کے دیہاتوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور قومیت کے تصوّر کو اجاگر کرنے میں ان کی امداد اگر شاملِ حال نہ ہوتی تو شاید ہم اس کی نصف بھی کامیابی نہ حاصل کر سکتے۔

آخر کار ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ بڈھا خادم نیاز علی تنہا درگاہ میں رہنے لگا۔ اور پھر عرس کے دن دلّی سے لاریاں بھر بھر کر لوگ آئے مگر کسی کو نہ اعتراض ہوا نہ برا لگا۔ ہماری درخواست پر کچھ مقامی لوگوں نے مکان خالی کر دیے اور ہم یو۔پی اور دلّی سے چراغ دلّی کے رہنے والوں کو اکٹھا کر کے درگاہ کے قریب بسا دینے کا انتظام کر ہی رہے تھے کہ ایک دن معلوم ہوا کہ شرنارتھی وہاں جا رہے ہیں۔ اور دو تین دن کے اندر مسجد سے لیکر ان مکانات تک ایک آدمی کی بھی جگہ خالی نہ چھوڑی گئی جو خادم کے علاوہ دو چار آدمی بھی ہم بھیج سکتے۔

مجھے بالکل افسوس نہ ہوتا اگر شہر کے دروازوں، فٹ پاتھ، یا ٹوٹی قبروں میں زندگی کے دن کاٹنے والے شرنارتھیوں کو بھی سر چھپانے کا ٹھکانہ مل گیا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا وہ بچارے تو پڑے ہیں اور پتہ نہیں کب تک یونہی پڑے رہیں گے۔ صوبائی تعصب جانبداری اور رشتہ داری یا دوستی کا لحاظ کیے بغیر تو ہمارے ملک میں کوئی ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔

اگر حکام اس معاملہ میں ہمیں تھوڑا سا موقع دیدیتے اور ہماری نیک نیتی پر بھروسہ کرتے تو مقامی ہندوؤں سے سارے مکانات واپس لینے کے بعد وہ چار پانچ خاندان جو دہلی میں موجود تھے ہم ضرور بسا دیتے لیکن ان چند مسلم خاندانوں کے پڑوسی سب شرنارتھی ہی ہوتے کیونکہ مسلمان اتنے باقی ہی کہاں تھے جو سب مکانوں پر قبضہ کرتے۔ باقی جتنے مکان تھے وہ مقامی لوگوں کے قبضہ سے نکال کر ہم خود رفیوجیز کو دینا چاہتے تھے۔ اور اس طرح کچے مکانات بھی آباد ہو جاتے۔ لیکن انھیں ہم پر بھروسہ کب تھا۔ اور نہ ہمیں ان پر تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کسی اور ملک اور کسی دوسری حکومت کے لیے کام کر رہے ہیں اور وہ کسی دوسری کے لیے۔ ہمارا مقصد بھی اس کے سوا اور کیا تھا

کہ دیس میں امن وامان قائم کر کے اپنی نئی حکومت کو مضبوط بنائیں۔ وہ چیزیں اور وہ باتیں جن سے حکومت کی بدنامی اور بے عزتی ہوتی ہے، اسے نقصان پہنچتا ہے۔ ان کو مٹانے کی کوشش کریں۔ اور ملک کی افراتفری کا کسی ڈھنگ سے علاج سوچیں۔ دکھیاروں کی مدد کریں۔

اور جہاں تک میرا خیال ہے۔ حکام بھی یہی سب سوچتے ہوں گے۔ ان کے فرائض میں بھی یہی سب شامل ہوگا اور وہ بھی مصیبت زدوں کی مدد کرنا چاہتے ہوں گے۔ لیکن وہ ہمیں اپنا حریف و دشمن تصور کرتے تھے اور ہم انھیں۔ نہ ہم اپنی بات کا پتہ ان کو لگنے دیتے نہ وہ کبھی ہم سے صلاح لیتے۔ خود کانگریسیوں کو شکایت تھی کہ ان کی اپنی پارٹی کی حکومت ہے اور ان سے ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے جیسے وہ ففتھ کالمسٹ ہیں۔

ہم چاہتے تھے کہ محکمۂ امداد و بحالی کے ساتھ مل کر امن کا پرچار کریں اور ان کے مفید کاموں میں مدد دیں یا ڈسٹرکٹ بورڈ تعلیمی پروپگنڈا ہم سے کرائے تو یہ اسکول اور مکتب پھر سے جاری ہو جائیں یا محکمہ حفظان صحت کو دیہاتوں کی صحیح رپورٹ دیں اور وہ ان پر توجہ کرے تاکہ سوشل اصلاح بھی ساتھ ساتھ جاری رہے لیکن نہ ان کو توجہ کرنے کی فرصت تھی نہ ہمیں اتنا موقع تھا کہ اس پروگرام پر عمل کر سکیں اور یہ سب تصور اور تجویز ہی رہی۔

رمضان قریب آرہا تھا۔ ہمارے مسلمان کارکن فکر میں تھے کہ وہ اتنی دوادوش اس مہینہ میں بھی جاری رکھ سکیں گے یا نہیں جو اجتماع کانسٹی ٹیوشن ہاؤس میں ہوتے تھے۔ ان میں کبھی کبھی مرد و لا آفیسروں کو بھی مدعو کر لیا کرتی تھیں۔ انھوں نے صورت حال کو دیکھ کر اور ہمارے کارکنوں کی رپورٹ سنکر یہ طے کیا تھا کہ حکام سے مل کر معاملات کا تصفیہ کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم عوام کو صحیح راستہ پر لانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے لازمی ہے کہ پہلے نوکر شاہی کو اپنے خلوص کا یقین دلا کر ان کا بھی تعاون حاصل کر لیں۔ یہ ملاقاتیں سب ہی دوستانہ فضا میں ہوتی تھیں۔ کھلے دل سے شکائتیں ان کے سامنے رکھی جاتیں ان کے خراب اثرات و نتائج بتائے جاتے اور یہ امید پڑتی کہ اب ان کا تدارک ہو جائے گا۔ لیکن ابھی ہمیں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی تھی البتہ تقریباً ہر محکمہ میں سے ہم نے بھلے لوگ اور دیانت دار آفسران کی اخلاقی امداد حاصل کر لی تھی۔

ان کی نیکیاں اور انسانی صفات بھی ہمارے بار بار اکسانے پر ابھر آئی تھیں لیکن ان کی تعداد اتنی قلیل تھی اور انتظامی معاملات میں ان کو اتنا کم دخل تھا کہ ہمیں کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔

ہمیں اندیشہ ہو رہا تھا کہ ہنگامہ فرد ہونے اور امن قائم ہو جانے کے بعد اب جو یہ مزارات و مساجد کو مسمار کرنے کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا ہے تو اس کی تہہ میں وہی سازشش کام کر رہی ہے۔ جو ہماری سرگرمیوں اور حکومت کی تیاریوں کی وجہ سے ۱۵ جون کو ناکام ہو چکی ہے۔ اور یہ شبہ صحیح ثابت ہوا۔

ہم محسوس کر رہے تھے کہ مرکزی حکومت اور مقامی گورنمنٹ میں ذرا تال میل واجبی ہی واجبی ہے۔ اور اس لیے ہماری پارٹی نے یہ طے کر لیا کہ ہم کو عوام اور حکومت دونوں کے لیے کام کرنا ہے۔ عوام اور حکام دونوں کی لاقانونی کارروائیوں کا ریکارڈ ہمیں رکھنا چاہیے۔ تاکہ اپنی گورنمنٹ کو صحیح حالات سے باخبر کر سکیں اور اسے مضبوط آزاد اور جمہوری بنانے میں ہم بھی قوم پرستوں کا ہاتھ بٹائیں۔

میں بھلا ان کاموں میں کیا حصہ لے سکتی تھی۔ نہ اتنی لیاقت نہ تجربہ۔ ہلکا پھلکا کام میں نے بھی اپنے سر لیا۔ یوں سمجھیے دم پکڑ کر " پانچوں سواروں" میں شامل ہو گئی۔ اور دیہاتوں کی دوڑ دھوپ میں جو کچھ دیکھا وہ آپ سب کو سنا رہی ہوں۔ بہت سے راز تھے۔ بہت سی کوششیں تھیں اور بہت سی خفیہ کارروائیاں تھیں جن کا علم مجھے تھا کیونکہ ہر کارروائی میں تقریباً شریک رہتی تھی۔ لیکن ان کی تفصیلات نہ اس وقت مجھے یاد ہیں نہ میرے پاس سارے کاغذات موجود ہیں۔ یہ تو جب کبھی مؤرخ تلاش کرے گا تو " شانتی دل " کا ریکارڈ بتائے گا کہ اس چھوٹی سی بے دست و پا جماعت نے دہلی کی اندرونی درستی اور حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے اپنی بساط بھر کیا کچھ کر ڈالا۔ کس طرح آہستہ آہستہ حکومت کے ہر شعبہ میں گھس کر کوڑے کباڑ میں سے اس نے موتی چنے اور کس طرح تخریبی طاقتوں کو ہار ماننے پر مجبور کر دیا۔

کوئی شک نہیں کہ اس میں مردولا کی دیوانگی اور سرفروشی کو بڑا دخل تھا بلکہ وہی ایک دماغ تھا جو اس وقت پارٹی پر چھایا ہوا تھا۔ اس کا ایک پیر ہندوستان میں تھا ایک پاکستان میں۔ بیک وقت معلوم نہیں کتنے جھگڑوں میں اپنے آپ کو مردولا

نے پھنسا رکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے بھی میں نے تعصب، صوبہ پرستی، جانبداری یا عورت و مرد کے امتیاز کا گذر مردولا کے پاس نہ دیکھا۔ اور کبھی کبھار جب عورتوں کو تسکین دینے کے لیے وہ کہتیں میں بھی تو عورت ہوں۔ ہم کو تو عورتوں میں کام کرنا ہی چاہیے تو ہم ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگتے۔۔ ایسا لگتا جیسے یہ اجنبی آواز ہے۔

16

مزارات اور مسجدیں

جولائی کو ہمارے پاس بستی نظام الدین کے ایک کارکن آئے[1] اور بیان کیا کہ تین چار دن سے بستی کی فصیل سے باہر میدان میں کھدائی ہو رہی ہے، جو شہر پناہ سے ملا ہوا ہے۔ قبرستان بھی ہے، اور دو تین قبریں توڑی جا چکی ہیں۔ سنا ہے اس جگہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بن رہا ہے اس لیے زمین برابر کی جا رہی ہے۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جس وقت حکومت کے ایک رکن موقع پر آئے تو مقامی شانتی دل کمیٹی کے انچارج نے اس پر توجہ دلائی۔ اور انھوں نے اسی وقت سرخ جھنڈیاں قبروں کے نشانات پر لگوا دی ہیں، لیکن آثار ایسے نظر آ رہے ہیں کہ یہ شرارت بند نہ ہو گی۔ پی۔ ڈبلو۔ ڈی کے مزدور اور والنٹیر پھاوڑہ چلا رہے ہیں۔

دوسرے دن میں دیکھنے گئی تو دیکھا واقعی اکثر مقامات پر سرخ جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں کئی ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔ ایک بڑا گروہ زمین برابر کر رہا تھا۔ کوئی پھاوڑہ چلا رہا تھا، کوئی مٹی اٹھا رہا تھا، کچھ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ محکمہ امداد بحالی اور پی۔ ڈبلو۔ ڈی کے آفیسر اور اسٹاف وہاں موجود تھے اور صوبے کی گورنمنٹ کا ایک ذمہ دار[2] رکن بھی بہ نفس نفیس اس کام میں حصہ لے رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، وہ میرے آنے کی خبر سن کر خیمہ میں چلے گئے۔ میں نے ان کو دیکھا بھی نہیں لیکن میرے ساتھی نے بتایا شاید وہ ملنا نہیں چاہتے۔ اس وقت کھدائی ایک قبر کے اونچے ڈھیر کی بھی ہو رہی تھی۔ نظام الدین کے ایک ذمہ دار صاحب[3] میرے ساتھ تھے۔ انھوں نے دکھایا اور کہا کہ ہمارے

---

1. حکیم سید حسین
2. ڈپٹی کمشنر
3. سید محمد میاں نظامی۔

احتجاج پر حکام نے اس جگہ کام بند کرا دیا تھا۔ انجینئر صاحب کو بلا کر انھوں نے مجھے وہ نقشہ بھی دکھایا جس میں ۱۷ مقامات پر منسٹر صاحب جھنڈیاں لگوا گئے تھے لیکن جھنڈی جب شمار کی گئیں تو اس وقت کل ۱۳ نکلیں۔ خیر ہمارے کہنے سے اس وقت پھر انھوں نے دوبارہ چار اور لگوا دیں، اور میں کہہ سن کر واپس چلی آئی۔

بستی کے لوگوں کو ہم نے اطمینان دلایا کہ کوئی حرج نہیں، اگر ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بن رہا ہے، اس سے تمھارا نقصان نہیں، فائدہ ہوگا۔ ایک صاحب بولے کہ عرب سرائے خالی پڑی ہے۔ اس میں تو کوٹھریاں بھی ہیں۔ اگر یہ لوگ چاہیں تو اس کو ٹھیک کر کے رہائش کے لائق بنا سکتے ہیں، ان قبروں میں کیا رکھا ہے جو اس طرف اتنی توجہ کر رہے ہیں۔ قبرستان کی حد چھوڑ کر، جو چاہیں، سو کریں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

باہر یہ قصہ ہو رہا تھا، اندر بستی کے مسلمانوں نے بوریا بستر لپیٹنا شروع کر دیا کیونکہ کسٹوڈین کو بھی سروے کرنے کی اسی وقت سوجھی۔ درگاہ کے سب سے بڑے ذمہ دار بزرگ نے تھیلے میں کپڑے ڈالے، اور دوسرے دن میرے پاس دوڑے آئے کہ مجھے ہوائی جہاز کا ٹکٹ دلوا دیجیے۔ یا پھر اس صورتِ حال کو ختم کرائیے، جب درگاہ کے سارے احاطہ پر قبضہ ہو جائے گا تو ہم رہ کر کیا کریں گے۔

میں نے چیف کسٹوڈین صاحب سے پوچھا۔ یہ صاحب ابھی نئے آئے تھے اور پچھلے زمانے کی بدعنوانیوں کے بعد ان کے آنے سے کچھ امید بندھی تھی کہ شاید حالات سدھریں۔ بہرحال میں نے ان کو بتانا چاہا کہ دیہاتوں کے بھاگے ہوئے مسلم پناہ گزیں درگاہ سے متصل خالی مکانات میں آباد ہیں، باقی میں مجاور رہ رہے ہیں، کچھ حصہ مہمانوں اور فقراء کے لیے وقف ہے۔ تمام عمارات درگاہ میں وقف ہیں، اور وقف کی جائداد آپ کی دسترس سے باہر ہے۔ بزرگ[1] خود ہجرت نہیں کر سکتے اور اس لیے یہ مہاجرین کی جائداد نہیں ہو سکتی۔ سروے غلط ہو رہا ہے۔

انھوں نے بالکل لاعلمی ظاہر کی، اور کہا کہ مجھے کچھ خبر نہیں، میں نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ اس سلسلہ میں نامناسب نہ ہوگا، اگر میں ایک صاحبزادہ کا ذکر کروں، جو پاکستان جانیوالے گڈول مشن میں شرکت کے لیے دہلی تشریف لائے اور بدقسمتی سے یہاں آتے ہی بیمار پڑگئے۔ گڈول مشن

لہ۔ شنکر سرن جی جو اتر پردیش سے بلائے گئے تھے

[1]۔ یعنی حضرت نظام الدین اولیاءؒ

توشاید پھر نہیں جاسکا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے کچھ طالب علم یہ خیر سگالی مشن لے کر پاکستان جارہے تھے، وہ کیوں رک گئے، یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اس کے ایک، بیمار ممبر تقریباً ایک ماہ ہمارے یہاں رہے اور جب صحت یاب ہو گئے تو ان کو بار بار فون کرتے دیکھ کر میں نے سوال کیا کہ کبھی تم یہاں بیٹھ کر کوئی نیا پروگرام بنا رہے ہو کیا؟ کہنے لگے۔ بزنس کی سوچ رہا ہوں۔[1]

چند دن بعد وہ ہمارے یہاں سے چلے گئے، اور کانسٹی ٹیوشن ہاؤس میں کمرہ لے کر مقیم ہو گئے۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں، ان کے پاس اکھٹے تھے اور ان میں کے چند آدمی کبھی کبھی شناختی دفتر کے آفس بھی آجایا کرتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ان سے سخت الجھن تھی، میں نے آفس والوں پر اعتراض کیا، کہ عجیب عجیب سی چیزیں تمھارے دفتر میں آتی ہیں، اور تم مشتبہ لوگوں کو دیر تک یہاں ٹھہرنے کی اجازت بھی دید یتے ہو۔ میں اس گروہ سے مطمئن نہیں ہوں اس لیے بہتر ہوگا، اگر عام اصول بنالو، کہ غیر متعلق لوگوں کو یہاں نہ بیٹھنے دو۔

ایک روز بہت کثیر مجمع دیکھ کر مجھے اشتیاق پیدا ہوا، اور اس طرف چلی گئی۔ بمبئی کی ایک نوجوان عیسائی لڑکی جس سے صاحبزادے نے راہ چلتے میرا تعارف کرایا تھا، اس وقت موجود تھی۔ جوتوں کا بہت بڑا ڈھیر کمرے کے دروازے پر دیکھ کر ماتھا ٹھنکا کہ ضرور آج کوئی بات ہے۔ لڑکی نے بتایا کہ:

”آج ہمارے یہاں انٹرویو ہو رہا ہے۔ اور سارا پارٹی کا لوگ جمع ہے، لڑکا لوگ چُنا جائے گا، والنٹیر کا کام کرنے کے لیے۔“

میں سوچ میں پڑ گئی کہ یہ کس قسم کا لڑکا ہوگا جس کو چننے کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی کا سب سے شورش پسند لیگی لڑکا بلایا گیا ہے اور اس کی تنظیم کون کر رہا ہے؟

صاحبزادے سے ملاقات ہوئی تو وہ اکڑ رہے تھے کہ گورنمنٹ کو کام کرنے کے لیے نوجوان نہیں مل رہے تھے۔ میں نے تار دے کر تو بلایا ہے، اور یہاں رفیوجیز میں سے ایک ہزار لڑکا تیار کر دیا ہے، جو گورنمنٹ کی مدد کرے گا۔

میں خاموش ہو رہی، لیکن دل میں کھٹک باقی رہی کہ دیکھو "یہ لڑکا لوگ کا پارٹی" کس گھر میں آگ لگاتا ہے۔ ہم اور ہ کے مندرجہ بالا واقعہ کے بعد مجھے وہ صاحبزادے پھر مل گئے۔ میں نے کہا۔ تم کون سی جماعت تیار کر رہے ہو، یہاں تو سارے قبرستان صاف ہوتے جارہے ہیں اور تمھارے نوجوان مجھے کہیں دکھائی نہ دیے۔ وہ کس کی مدد کریں گے۔

---

[1] ۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا، وہ مسلم نیشنل گارڈ کے ممبر تھے۔ نام یاد نہیں عثمانی کہے جاتے تھے۔

صاحبزادے نے کہا، جی نہیں، آپ کو بالکل غلط خبر ملی۔ وہ ہمارے ہی لوگ تو ہیں جو بستی میں کھدائی کرنے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ کا کتنا روپیہ صرف ہوتا۔ ہمارے والنٹیر سو، ڈیڑھ سو جاتے ہیں، اور دو ڈھائی گھنٹہ میں اتنا کام کر دیتے ہیں جو مزدور آدھا دن میں کرتے۔ قبریں نہیں توڑی جا رہی ہیں۔ میں تو خود وہاں موجود تھا، صرف زمین برابر کی جا رہی ہے۔

میں چونک پڑی۔ اچھا، تو یہ کہیے، یہ سب آپ لوگوں کی کارستانیاں ہیں۔ وہ دوست جو بمبئی اور گونڈے وغیرہ سے تار دے کر بلائے گئے وہ صرف آپ کی مدد کے لیے آئے تاکہ ہمارے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے اور شانتی دل کا توڑ کرنے کے لیے سوشل سروس لیگ آرگنائز ہو، شکریہ! تم سے اس کے علاوہ توقع بھی کیا ہو سکتی تھی۔

دوسرے دن جا کر میں نے تحقیق کی۔ صاحبزادے اور ان کے دوسرے دوستوں کی معیت میں رفیوجی نوجوانوں کی پارٹیاں آ کر یہ سارے کام کر رہی تھیں، اور ہماری چیخ پکار کی کوئی سنوائی نہ تھی۔

بہرحال تین دن میں کوشش کرتی رہی۔ جھنڈیاں لگوائی جاتیں، اور میرے پیٹھ موڑتے ہی پھر اکھاڑ دی جاتیں۔ لطف یہ ہے کہ جب کبھی ایک دم سے پہنچ جاتی تھی تو کچھ نہ کچھ اپنی آنکھ سے دیکھ لیتی تھی، لیکن فوراً ہی سارے کے سارے منکر ہو جاتے ہمیں معلوم نہیں ایسا کیوں ہوا کس نے کیا، یہ تو کل کی بات ہے، پرسوں کی بات ہے۔

اندر کی گڑبڑ اور باہر کا ہنگامہ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس اب یہ علاقہ بھی چند روزہ ہے سارے پاپڑ بیل کر جس بستی کو بچایا گیا تھا، اب وہ ضرور اجڑ جائے گی۔ جامع مسجد کے بعد یہی ایک ایسا خطہ تھا جہاں محبت تھی، امن تھا، سکون تھا۔ نظام الدین اولیاء کے دامن سے لپٹے رہنے والے لوگ اب رو رہے تھے کہ کہاں جائیں، کیا کریں۔ پناہ گزین اس امن و عافیت کی جگہ چھوڑ کر کہیں ہٹنے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتے تھے، اور شرنارتھیوں نے اپنی دیکھ بھال میں اضافہ کر دیا تھا۔ جب دیکھو غول کے غول دیکھنے چلے آ رہے ہیں، کہ یہاں کوئی مکان ہے۔

ادھر عرب سرائے کی تجویز پیش کرنے والے صاحب[1] شرمندہ ہو کر رہ گئے۔ وہ ہاتھ مل رہے تھے کہ انھوں نے ایسا کیوں کہہ دیا۔ تین دن کے بعد ان کے مورثِ اعلیٰ کا مقبرہ توڑ کر اس میں سے پانی کا نل گزار دیا گیا۔ اور معلوم ہوا گنبد کے قریب ہی پائخانہ بنانے کی بھی اسکیم ہے۔

شاید ۶ کو انھوں نے اس واقعہ کی اطلاع دی۔ اس وقت اتفاق سے ایک منسٹر صاحب بھی

---

[1] ۔ حکیم سید حسین۔

آ گئے تھے۔ میں نے سارا حال جا کر ان کے گوش گذار کیا اور درخواست کی کہ ذرا چل کر آپ سب چیزیں ایک نظر دیکھ لیں، انھوں نے کہا، آپ چلیے، میں ابھی آتا ہوں۔ ادھر کئی دن سے ہم نے دو لڑکوں[1] کی ڈیوٹی بھی بستی میں لگادی تھی کہ ہمیں صحیح حالات کی رپورٹ کرتے رہیں۔

ذرا خیال کیجیے کہ آفیسر کی موجودگی میں منسٹر کے حکم کے خلاف یہ ساری کارروائی ہورہی تھی۔ آخر کہاں تک۔ ہر لمحہ اندیشہ تھا کہ کسی نہ کسی وقت ہندو مسلمانوں میں تصادم ہو جائے گا۔ مسلمان اس وقت ایسے بے دم پڑے تھے کہ وہ تین دن ٹالتے رہے۔ دوسرے انھیں میرے اور میرے دوستوں پر بھروسہ تھا کہ ہم کوئی نہ کوئی تصفیہ کرادیں گے۔ ہم نے سختی کے ساتھ ان کو روکا تھا کہ تم بالکل دخل نہ دینا۔ خیر، شکر ہے ؎

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"[2]

معاملے نے بہت طول کھینچا۔ مجھے اس سلسلے میں جواہر لال جی سے بھی مل کر سارے حالات ان کے گوش گزار کرنے پڑے۔ اور میں نے تفصیل کے ساتھ، واقعات، موجودہ حالت اور اس سلسلہ میں قوم پرستوں کی کوششیں، سب کا حوالہ دیا۔ پنڈت جی نے پوچھا، اور یہ سب کون رہا ہے؟ میں نے جواب دیا۔ مردولا کسی قدر حیرت سے بولے، اچھا۔ تو مردولا بہت کام کر رہی ہے اور جب میں نے جتایا کہ ہم سب کی لیڈر اس وقت وہی ہیں تو وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ مجھے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی کہ دیکھو اس طرح کام کرنے والے پیچھے رہا کرتے ہیں۔ نہ کوئی نمود، نہ نمائش۔ روز کا آنا جانا، مگر اشارے کنائے سے بھی مردولا نے اپنی کارگزاری کا ذکر نہ کیا تھا۔

تمام حکام سے کافی جھگڑا رہا۔ شانتی دل کے آفس کی طرف سے بھی سخت احتجاج کیا گیا لیکن اب یہ سلسلہ اتنے بڑے پیمانہ پر شروع کر دیا گیا تھا کہ ہمارے لیے ہر جگہ پہنچنا، اور سب کی خبر لینا مشکل تھا۔ نظام الدین سے پلٹی تو احرار پارٹی کے ایک رکن[3] مجھے "شاہ مرداں" جسے پرانی کربلا بھی کہتے ہیں۔ وہاں لے گئے۔ پھاٹک میں شرنارتھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ قدیم زمانے کے اس عالیشان پھاٹک کے اردگرد کوٹھریاں بنی تھیں۔ ان میں بھی یہی لوگ بس رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے عمارت کا تھوڑا تھوڑا حصہ لے کر اپنے رہنے کے لیے الگ الگ مکان بھی بنا لیے تھے، مکانوں کے صحن میں بیٹھنے اور نہانے

---

[1] ۔ لڑکوں میں ایک ہندو تھا ایک مسلمان تاکہ کوئی مبالغہ نہ کرسکے۔

[2] ۔ ایک مصیبت آئی تھی جو خیریت کے ساتھ گذر گئی۔

[3] ۔ چودھری عبدالستار صاحب۔

کے لیے قبروں کے مرمریں تعویذ استعمال ہوتے تھے۔ کسی کسی جگہ سنگ مرمر کے ٹکڑے فرش میں بھی لگا لیے تھے۔

قبرستان صدیوں کا پرانا سفید پتھر کی منقش سلوں سے بھرا پڑا تھا اور وہ سب اکھیڑ کر الگ کر دی گئی تھیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قدم مبارک[1] بھی یہیں سنگ مرمر کی حسین ترین عمارت کے صحن میں نصب تھا۔ عمارت پرانے وقتوں کی نقاشی اور پچی کاری کا اعلیٰ نمونہ تھی اور در و دیوار سب توڑ کر سفید چورہ بکھیر دیا گیا تھا۔ لاکھوں روپیہ کا قیمتی پتھر[2] ریزوں کی شکل میں ڈھیر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہفتوں کی محنت اور سیکڑوں آدمیوں کی مدد سے اس کو تباہ کیا گیا ہے۔ ایک دو آدمی تو اتنا کر نہیں سکتے تھے۔

لوگوں نے بتایا کہ عمارت شیعہ فرقہ کا مقدس ترین مقام ہے۔ ہر سال محرم اور دوسرے موقعوں پر ایران و عراق وغیرہ تک سے لوگ اس کی زیارت کے لیے آیا کرتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر سیاہ پتھر کی لکھائی دیکھ کر میں نے اسے اٹھا لیا۔ یہ کسی سلطان کی قبر کا تعویذ تھا۔ نام اور سن سب آگے ہوگا۔ یہ پتھر کا ذرا سا ٹکڑا، اور اس طرح کے بہت سے ٹکڑے، امام، عالم، شہزادوں اور فقیروں کی داستانیں سنا رہے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ کبھی اس دنیا میں اسی طرح کے جیتے جاگتے انسان چلتے پھرتے تھے۔ اسی دلی میں ان کی وجاہت و شہرت کا ڈنکا بجتا تھا۔ یہیں انھوں نے علم و اخلاق کی بنیادیں استوار کی تھیں۔ اسی شہر میں انھوں نے جوانی کی سرمستیوں میں داد عشرت دی تھی اور یہی گوشے کبھی ذکر و فکر کے بھی مسکن رہے تھے۔ کبھی ان کے سامنے بھی لوگ دین و دنیا کی دولتیں مانگنے آیا کرتے تھے اور اپنے مخالفین کو وہ بھی زر و طاقت کے زعم میں مظالم کا تختۂ مشق بنایا کرتے تھے۔ اور اسی سرزمین بھی کبھی اللہ اور اللہ کی مخلوق سے محبت کرنے والے نیکی و سچائی کی طرف بھٹکے ہوئے لوگوں کو بلایا کرتے تھے۔ آج ان سب کی ہڈیوں سے پھاوڑے اور ہتھوڑے ٹکرا رہے ہیں اور علی گنج میں اس پر ٹریکٹر چل رہے ہیں۔ یہ خوبصورت نقشیں تعویذ کیا کسی عیش پسند نوجوان شہزادہ کی یادگار ہے؟ یا کسی عالم دین کی؟ یا تارک الدنیا فقیر کی؟ آج ان میں سے کوئی اگر واپس آجائے تو اسے یقین نہ آئے کہ اس کی قبر کھودنے والے جانور نہیں، اچھے پڑھے لکھے بیسویں صدی کے مہذب انسان بھی ہو سکتے ہیں!

---

[1] ۔ قدم مبارک کا نقش سنگ مرمر کی ایک سل پر تھا۔
[2] ۔ سنگ مرمر۔

اس دنیا میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے۔ کبھی زندوں کو مار کر قبریں بنائی جاتی ہیں، اور کبھی قبروں کو کھود کر زندوں کے لیے عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں۔ کائنات کے اس عظیم الشان چکر میں ایسے واقعات ایک لمحہ کی اہمیت رکھتے ہیں لیکن انسان یہ سب کہاں سوچتا ہے ۔ بقول صفی لکھنوی:

آج دیوانہ اڑاتا ہے جو ویرانہ کی خاک
کل اڑائے گا یونہیں ویرانہ دیوانے کی خاک

چلت چاکی دیکھ دیا کبیرا روئے   دو پاٹن بیچ آئے ثابت رہا نہ کوئے

پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ہم پریشانی میں پڑ گئے۔ ایک حادثہ پیش آگیا۔ گاڑی دو رویہ کھڑی ہوئی چارپائیوں سے ٹکرا گئی اور ایک چارپائی ٹائر میں الجھ کر ساتھ ساتھ چل دی۔ خود گھسٹتے ہوئے اس نے دو تین اور کو بھی ڈھیر کر لیا۔ ایک تو خیر بالکل ہی ختم ہو گئی۔ دوسری اور تیسری کو ہلکا سا نقصان پہنچا۔ لیکن یہ واقعہ بھلے دن ہوتے تو صرف افسوس کے قابل تھا، اور غریبوں کو معاوضہ دے کر ختم ہو جاتا۔ اب تو ہم پاگل پن کے دورے سے گزر رہے تھے، اس لیے چیختے چلاتے، گالیاں دیتے ہوئے لوگوں نے گاڑی گھیر لی۔ ڈرائیور کو ڈانٹ کر میں نے گاڑی رکوائی، ورنہ شاید اور کوئی حادثہ ہو رہتا، وہ گھبراہٹ میں آگے بڑھا لے جانا چاہتا تھا۔

غصہ میں بپھرے ہوئے عورت مرد ہمیں، پنڈت نہرو کو، اور کانگرس راج کو کوس رہے تھے۔ وہ کیوں نہ کوستے جو ہم میں سے کون ان کی مصیبت میں کام آیا تھا۔ اور اس بربادی کے آنے میں کس کا ہاتھ نہیں تھا، انھیں دیکھ کر مجھے خود ہی اپنے ہاتھ خون میں لتھڑے دکھائی دینے لگتے تھے۔

اس وقت ان کی تنہا واحد چارپائی جس پر وہ رات میں چند لمحہ غافل سو کر دنیا و مافیہا کو بھول جایا کرتے تھے، آنکھوں کے سامنے ٹوٹی پڑی تھی۔ ان سے منھ چھپا کر چلے جانا میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ میں نے معذرت کی۔ اظہار افسوس کیا اور مرمت کے لیے کچھ رقم پیش کی جس کو کم محسوس کر کے انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اتنی کثیر رقم کا مطالبہ کیا جو اس وقت میرے امکان سے باہر تھی۔ میں پہلی رقم پر اصرار کرتی رہی۔ معاملہ تو طے نہ ہوا لیکن بات چیت سے وہ ذرا ٹھنڈے پڑے۔

جب تمام عمارت دیکھ کر ہم واپس لوٹے تو پھر صحن میں برافروختہ ہجوم نے ہمیں گھیرا۔

عورتوں نے آگے بڑھ کر بچے میرے قدموں میں ڈال دیے، کہ یہ مر رہے ہیں، اور تم ان کی کوئی پرواہ نہیں کرتے ہو۔ ہم کو مکان دلوا دو۔ ہم کئی ماہ سے یہاں پر پڑے ہیں۔ کچھ عورتوں نے چلا کر کہا "یہ مسلمان ہم کو بہت ستاتے ہیں۔" میں نے کہا، بی بیو، یہاں مسلمان تو میلوں، کوسوں تک اردگرد میں بھی باقی نہیں ہیں، تم کو ستانے کہاں سے آتے ہیں؟

کہنے لگیں۔ ہاتھ ہاتھ بھر کے لانبے سانپ نکل نکل کر ڈس رہے ہیں، کتنا بڈھا، بچہ ہمارا مر چکا ہے۔

میں نے متحیر ہو کر پوچھا، تو کیا مسلمان سانپ ہیں؟ اور پھر میں نے کافی دیر تک ان کو سمجھایا۔ ان کی غلطی بتائی کہ اس سیکڑوں سال کی پرانی عمارت اور قبروں کو چھیڑ کر تم نے خود سانپوں کو دعوت دی ہے۔ انھیں میں سانپوں کے گھر ہوں گے۔ ان کے مکان کھدے، وہ تم سے بدلہ لے رہے ہیں۔ میں نے ان کو آفس کا پتہ دیا اور کہا کہ "شانتی دل کو درخواست دو وہ تمھاری مشکلوں میں مدد کرے گا، مکان بھی ان کی مدد سے مل سکیں گے لیکن کسی وقت پھر سوچنا کہ تم سب نے کتنا برا کام کیا۔ عمارت نہ برباد کرتے، اسی میں رہتے، قبریں تمھارا کیا بگاڑ لیتیں، اتنا حصہ الگ رہتا۔ باقی ٹھکانے تم ٹھہر سکتے تھے۔

سب ایک ساتھ بولے۔ یہ سب ہم نے نہیں کیا۔ اس کو کھودنے کے لیے تو ٹرک میں بھر کر لوگ شہر سے اور علی گنج کے کوارٹروں سے آتے تھے۔ ہم لوگ تو بعد کو یہاں آئے ہیں، تب یہ سب لوٹ چکا تھا۔ میرے احراری ساتھی نے بتایا کہ اپریل تک یہ تمام عمارت اور مقبرہ صحیح سلامت تھے۔ سب کچھ مئی ۴۸ء سے جون ۴۸ء تک ہوا ہے۔

میں نے دوبارہ چارپائی کے مالک کو وہی رقم پیش کی۔ اب کی بار اس کا غصہ کم ہو چکا تھا اور اس نے لے لی۔ واپسی میں راستہ ہی میں ایک قبرستان اور مسجد کے آثار بھی تھے، وہاں زمین ہموار کرنے کے لیے ٹریکٹر استعمال ہو رہا تھا۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی قبریں ابھی باقی تھیں، اور مسجد کی محراب اور بنیادوں کے آثار موجود تھے۔

یہ تمام حالات دیکھ کر میں نے کھنہ جی[1] سے خود ملنا ضروری سمجھا اور دوسرے دن کھنہ جی اور محکمہ آثار قدیمہ کا منشی ایک بڑے نقشہ سمیت ہمارے ساتھ وہاں گئے۔ پرانے نقشہ میں جو میں نے سکریٹریٹ سے حاصل کیا تھا ایک مسجد کا نشان صاف تھا، مگر آج یو بھی صاف

---

[1] لالہ مہر چند کھنہ سابق منسٹر سرحد جو بعد کو ریہبلی ٹیشن منسٹر حکومت ہند بھی رہے۔

ہو چکی تھی۔ صرف پختہ فرش کے آثار باقی تھے۔ قبریں ختم ہو چکی تھیں۔

پی۔ ڈبلو۔ ڈی والوں سے دیر تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ کھنہ جی کو ثبوت مل چکا تھا آثار قدیمہ والا مصر تھا کہ ہمارے یہاں شہادت موجود ہے لیکن وہ لوگ بلا وجہ تاویلیں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب کچھ مٹ چکا تھا۔ اب کیا چیز بچائی تھی جو ہم لڑتے۔ احراری صاحب اسی طرف سے بہ اصرار ہمیں خونی دروازے کے پاس جیل کے صحن والی مسجد دکھانے لے چلے۔ میری طبیعت مکدّر ہو چکی تھی اسی لیے میں شروع سے اس معاملے میں دخل دینے یا دلچسپی لینے سے کتراتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں، کسی غیبی ہاتھ نے گھیر گھار کر مجھے یہاں پہنچا دیا۔ میں تو کبھی اپنے خاندانی قبرستان میں بھی جانا پسند نہ کرتی تھی۔ ہمیشہ یہی کہتی تھی۔ بس اب ایک ہی بار جاؤں گی۔ روز روز جا کر کیا کروں اور اب کئی دن سے قبروں ہی کے بیچ چکّر لگاتے گزر رہی تھی۔ میں نے لوگوں سے کہا۔ سب کھود ڈالو برباد کر ڈالو۔ یہ تو پرانی ہو چکی تھیں۔ ہم اب نئی نئی بنوائیں گے۔ ایسی کہ جن کے آگے تم سب بھی اپنی اکڑی ہوئی گردنیں جھکا دو۔ اور جن کا تم بھی ادب و احترام کرو[1]

کیا خبر تھی کہ یہ بول دو ہی چار دن میں حقیقت بن جائیں گے اور شہید عثمان دشمنوں سے بھی خراج عقیدت حاصل کرے گا۔ وہ شاہانہ جلوس جب شہر سے او کھلے پہنچا ہے تو پا پیادہ ایک جم غفیر ساتھ تھا اور سب کے دل عزت و احترام کے جذبات سے معمور تھے۔[1]

اس مسجد کو چند دن پہلے دیکھ چکی تھی۔ اس وقت دیواریں صرف دو دو بالشت باقی تھیں، اور مسجد کا اندرونی سرخ پتھر کا جانمازوں والا فرش بھی محفوظ باقی رہ گیا تھا۔ سفید پتھر کے تحریر سے نازک نازک جانمازیں بتا رہی تھیں کہ ہم پر کتنے پر خلوص سجدوں کی مہریں لگ چکی ہیں۔ لیکن نہیں، اگر سجدے پُرخلوص ہوتے تو وہ مٹتے کیسے ؎

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

بہرحال آج وہ سب مٹ چکا تھا اور معمولی پتھر کا چبوترہ باقی تھا، جو سپاہیوں کے بیٹھنے کے کام آ رہا تھا۔ جیل کے صحن میں چار دیواری کے اندر مسجد، پھاٹک ہی سے پولیس کا سخت پہرہ۔ ہر وقت بیسیوں آدمی اس جگہ رہتے تھے اور بیچاروں نے دیکھا ہی نہیں کہ اچھی بھلی بنائی مسجد کون بد معاش کھود کر چلا گیا۔ ہائے! ان آنکھوں والوں کا اندھا پن۔

---

[1] اور پھر رفیع بھائی اور مولانا آزاد کے لیے لوگوں کی گردنیں خم ہوتے دیکھیں۔

کھنہ جی نے نقشہ میں قدیمی مسجد کے نشان دیکھے۔ محراب جائے نماز ستون سب کے آثار گھوم پھر کر تلاش کئے اور فاتحہ پڑھ کر ہم لوگ پلٹ آئے۔

ان حالات سے ناظرین کو اندازہ ہوگا کہ فسادی جو حکومت کے ڈر سے اب زندوں پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے تھے، بڑی تیزی کے ساتھ پرانے آثار منہدم کرکے ایسی فضا پیدا کرنی چاہتے تھے جس سے پھر افراتفری پھیلے، وہ اب مردوں سے بدلہ لینے میں بیحد منہمک تھے، اور یہ سب جون جولائی میں ہو رہا تھا۔

محکمہ آثار قدیمہ کے سکریٹری وغیرہ ہم سے ملے اور کہا، کہ ہم اب چیزوں کو بچا نہیں سکتے۔ پی۔ ڈبلو۔ ڈی کے لوگ بربادی کرتے ہیں اور کراتے ہیں۔ لیکن مجھے شبہہ ہے کہ یہ بات جو انھوں نے ہم سے کی، حکومت کے کانوں تک بھی پہنچائی یا نہیں۔ میرا خیال ہے خود ان کا دامن بھی الزام سے داغدار تھا کہ انھوں نے حفاظت کرنے کی پوری کوشش نہیں کی۔

کسی مسجد یا مزار کی بربادی کی خبر ہمیں ملتی ہم انخلار مساجد کمیٹی کے صدر کھنہ جی کو اطلاع کرتے، وہ چیف کمشنر کو لکھتے، اور چیف کمشنر پی۔ ڈبلو۔ ڈی۔ کو مرمت کے لیے لکھ دیتا۔ یہ چکر برابر چل رہا تھا۔ اسی رفتار سے توڑ پھوڑ انخلا اور مرمت ہو رہی تھی۔

یہ محکمہ جس طرح تعمیر اور مرمت کا ذمہ دار تھا، اسی طرح تباہی و بربادی کا بھی ٹھیکیدار تھا۔ اس وقت اس میں بہت سے وہ لوگ شامل تھے، جو تخریبی جماعتوں کے ممبر تھے، پرانی کربلا، شاہِ مرداں، عرب سرائے اور بہت سے دوسرے آثار، مساجد اور مقبرے اپنی ویرانی کے لیے زیادہ تر پی۔ ڈبلو۔ ڈی کے مرہون منت ہیں۔

افسروں کی موجودگی میں مسجدیں مسمار ہوئیں حتیٰ کہ ستمبر میں ضلع کے سب سے بڑے[1] آفیسر کے مکان کے سامنے ایک چبوترہ پر، جو قبرستان تھا اس کی سطح برابر کی گئی اور جب رپورٹ کی جاتی تو پولیس سننا بھی پسند نہ کرتی۔ سیوک دل۔ سوشل سروس لیگ۔ بہتیرے ناموں سے بگڑے دل نوجوانوں کی جماعتیں ان کی شریکِ کار تھیں۔ بڑے بڑے ہاتھ ان کی مدد پر تھے۔ ہمارے کہنے سننے کی وہ کیوں پرواہ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب بات ہم اوپر تک پہنچاتے تو گورنمنٹ مرمت کا حکم دیتی۔ یہ آرڈر ہمیشہ چوٹی پر سے اترتے تھے۔ کتنی بہترین پالیسی تھی۔ کسی کا جی میلا نہ ہونے پائے۔ کھودنے والوں کو بھی نہ روکو، کیوں ان کے جی کی

---

[1] ۔ ڈپٹی کمشنر۔

امنگ باقی رہ جائے۔ اور جب تعمیر کا حکم آئے تو اتنی مستعدی سے تعمیل ہو کہ ان سے زیادہ کسی کو لگن لگی ہی نہیں ہے۔

گورنمنٹ اپنی ہوشیار نوکر شاہی کے شکنجہ میں کسی ہوئی، کھدائی اور رہنوائی، دوہرے اخراجات کی متحمل ہو رہی تھی۔ اور لطف یہ ہے کہ اس حماقت کا اس وقت تک اسے احساس نہ ہوا۔ وہ سمجھتی ہے اخراجات میں اضافہ کا باعث ہیں یہ غنڈے۔ لفظ غنڈہ سن کر ذہن فوراً ایک ایسے نوجوان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو بالوں میں خوب تیل ڈالے سلیقہ سے کنگھی کیے بےفکری کے ساتھ، پان چباتا ہوا اسٹرک پر ٹہل رہا ہو۔ پارک میں عورتوں پر آوازے کس رہا ہو۔ سینما کے دروازے پر کھڑا لڑکیوں کو گھور رہا ہو۔

لیکن زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ اب غنڈہ گھروں میں رہتا ہے، دفتروں میں کام کرتا ہے، عدالت کی کرسی پر بیٹھتا ہے۔ یونیورسٹی یونین کا صدر ہو سکتا ہے پبلک کا لیڈر بنتا ہے، اور جلسوں میں دھواں دھار تقریریں کرتا ہے۔ بیسویں صدی کا غنڈہ کتنا مہذب انسان ہوتا ہے!

بہرحال کوئی بھی اس تخریب کا ذمہ دار ہو، لیکن میں خود عورتوں کو، ماؤں بہنوں کو بھی اس صورتِ حال کا ذمہ دار قرار دیتی ہوں۔ انھوں نے روکنے اور ختم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مکانات کو جلانے اور برباد کرنے کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہو رہا تھا۔ دیہاتوں کو پہلے ہی کافی اجاڑا جا چکا تھا، لیکن اب بھی شراب بنانے، اور کھانا پکانے کے لیے زیادہ تر گھروں کے چھپر، دروازے، اور گاؤں کے درخت استعمال ہو رہے تھے۔ دیہاتوں میں کہیں چھاؤں باقی نہ رہ گئی تھی۔ سب زمینیں تپ رہی تھیں جس طرح آدمیوں کے دل و دماغ تپ رہے تھے۔

ہم لوگوں کو سب سے بڑی مشکل تو یہ پیش آئی تھی کہ جب کسی معاملہ پر افسروں سے بات چیت کر کے سب کچھ طے کرا لیتے اور خوش خوش نیچے کے اسٹاف تک پہنچتے کہ بھئی اب فلاں کام ہونا چاہیے، تو وہ جواب دیتے کہ:

"ہمارے پاس تو کوئی ایسا آرڈر آیا نہیں کہ آپ کی مدد کی جائے۔"

کتنی بڑی شرمندگی اور ذلت کا سامنا تھا لیکن اسے چھوڑ کر ہم پیچھے کیسے ہٹ سکتے تھے۔

واقعہ یہ تھا کہ انگریز ابھی گیا تھا، اور اس کالی سرکار کو ابھی انھوں نے سرکار سمجھا نہ تھا۔ ادھر افسروں کے سر پر بھی غیر ملکی ڈنڈا باقی نہ تھا۔ وہ آج کل آج کل کرتے کرتے معاملہ کو ٹال کر

ختم کر دینا چاہتے تھے۔ ہندوستان کی روایتی سستی اور کاہلی اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی۔
مزارات و مساجد کے سلسلہ میں جب میں وزیر اعظم سے ملی ہوں اور میری رپورٹ کو شانتی دل نے ایک زوردار نوٹ کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچایا ہے، تب جا کر یہ بدعت ختم ہوئی۔ مقامی حکام نے ہماری کوئی بات نہ سنی اگر پنڈت جی کو صحیح حالات سے باخبر نہ کیا جاتا تو کوئی عجب نہ تھا کہ ۱۵ جون کے بجائے ۱۵ جولائی کو ہم سرپکڑ کر روتے!

17

چراغ تلے اندھیرا

لوکل ایڈمنسٹریشن سے اس مستقل جھگڑے نے ہم سب کو پریشان کر دیا۔ آخر ہمارے ساتھ دشمنوں اور مخالفوں کا سا برتاؤ کیوں ہو رہا ہے؟ ہم صرف امن ہی تو قائم کرنا چاہتے ہیں، اور ایسا امن جو حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کر دے۔ ہم نے تو تمام قوم پرست طبقہ سے اپیل کی ہے کہ ہمارے ساتھ مل کر کام کرے۔ حکّام ہم پر بھروسہ کیوں نہیں کرتے؟ ہم میں سے بہتوں کے دماغ میں ایسے سوالات آتے تھے! اور جب کبھی اکٹھے ہوتے، تو اسی موضوع پر بحث ہوتی۔ سب سے زیادہ رنجیدہ کانگریسی تھے۔ وہ سمجھے تھے، ان کی گورنمنٹ ہے' ان سے زیادہ ہمدرد کون ہو سکتا ہے، اور اس وقت یہ رنگ تھا کہ ان کی بات کبھی نہ پوچھی جاتی تھی۔ دلّی والے کہتے تھے، ہم تو اچھوتوں سے بدتر ہو گئے ہیں۔ کسی دفتر میں جاؤ، شرمندہ ہو کر لوٹ آؤ۔

دیہاتوں سے جو رپورٹ ہماری پارٹی لائی، اس سے ثابت ہو گیا کہ خبریں سچ تھیں۔ واقعی تیاریاں تھیں، پوسٹر، خفیہ جلسے، اور چھوٹے بچوں تک کے ذریعہ پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ پچھلے فسادات میں تین گروہ منظم کئے گئے تھے۔

ایک تو علاقہ نجف گڑھ میں جاٹوں کا ایک گٹھ بنایا گیا تھا۔ ان میں جاٹستان کے مانگ کا پرچار کیا گیا۔ مجھ سے خود جاٹ زمینداروں نے کہا کہ:

> "ان دنوں تو بس جاٹ راج کی بات چل رہی تھی، اس مارے سب بڑے بڑے لوگوں کی صلاح ہوئی کہ ہندو مسلمان جاٹ بھائی ایک ہو جاؤ۔ کوئی پاکستان لے رہا ہے، کوئی ہندوستان۔ سکھ اپنا حصہ الگ مانگ رہے ہیں۔ ہمارا بھی تو آخر راج ہونا چاہیے۔"

دوسری طرف مہرولی میں تگا۔ راجپوت، چوہان منظم ہوئے، اور ان میں خالص

ہندو راج کا پرچار ہوا۔ شاہدرہ کے علاقہ میں، گوجرا اور ہربجن سنگھ[1] کے نام پر اکھٹے ہوئے۔ ان سب کو ہتھیار سپلائی کئے گئے۔

باقاعدہ جتھے بنا بنا کر یہ لوگ، اس پڑوس کے دیہاتوں پر حملے کرتے تھے۔ ان کے ہمدرد تقریباً ہر محکمہ میں تھے، اور ان تینوں گروپوں کو ان سے مدد ملتی تھی۔ نجف گڑھ کے جاٹوں کی امداد، بھرتپور کی فوجوں تک نے کی۔ بلکہ دو ایک جگہ ہمیں بتایا گیا کہ فوج ان بے قاعدہ سپاہیوں کو ساتھ لے کر صوبہ کے سرحدی دیہاتوں پر حملہ کرتی تھی۔

صرف ایک علاقہ نریلہ ہمیں ایسا ملا جہاں کانگرس کا آج بھی اثر تھا، جہاں سب کچھ ہو گیا، مگر انسان ختم نہیں ہوئے۔ جہاں آدمیت کا گڑھ سوامی جی کا آشرم تھا۔ پاس پڑوس کا جتنا حصہ ان کے زیرِ اثر تھا بہت کچھ اس مصیبت سے بچا رہا۔ جو غلطیاں ہوئیں، جو ظلم ہوے اس کی تلافی کی کوشش بھی ہوئی۔ اور یہاں جاٹوں کے سوا، اور مفسدوں کی کوئی جماعت بھی نہ بن سکی۔ دو ماہ کے اندر اندر حالات پر قابو ہونے لگا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے دو ممبران اس علاقہ میں، اپنی مخلصانہ کوششیں جاری رکھے ہوئے تھے!

ہریجنوں کی اخلاقی حالت پہلے ہی کیا تھی، ان دنوں وہ کسی خفیہ تحریک کے اثر سے غیر معمولی طور پر سرکش، ڈاکو اور جرائم پیشہ ہو رہے تھے، بہتوں کو داڑھی بڑھوا کر ایک کرپان تھمادی گئی تھی، اور وہ بزعم خود سکھ بن گئے تھے[2]۔

جب چراغ دہلی کی درگاہ کی مرمت ہونے لگی تو کئی دن بعد ہم اسے دیکھنے گئے۔ فرش کی سیمنٹ ابھی پکی نہ ہوئی تھی، گیلی تھی اور دیواروں کا چونا خشک نہ ہوا تھا۔ پی۔ ڈبلو۔ ڈی۔ کے ایک انسپکٹر نے شکایت کی کہ صاحب، ان چماروں کو منع کیجیے۔ جوتے پہن کر فرش پر چلتے ہیں اور بنا بنایا فرش غارت کر رہے ہیں۔ منع کرو تو لڑنے پر تل جاتے ہیں۔

ایک چودھری نے چپکے سے کہا " ان کی تو جلدی فکر کیجیے۔ بہت ستاتے ہیں۔ بات بات پر اب ہم سے لڑنے ۔ ۔ ۔ ۔ لگتے ہیں!" دوسرے نے کہا " یہاں جوان لوگوں میں سنگھ کا بڑا زور ہے، اس کو تو کچھ کرو۔" مگر جب پکڑ دھکڑ شروع ہوئی، اور خود اس کا بیٹا سنگھ کا ممبر ہونے کے الزام میں پکڑا گیا تو سب کچھ جانتے ہوئے بھی باپ کی محبت نے مجبور کر دیا کہ وہ

---

[1] - آر۔ ایس۔ ایس۔

[2] - امن و امان کے بعد اندازہ ہوا کہ ہریجن آج بھی ہریجن ہے۔

چھڑانے کی کوشش کرے اور جب رہا ہو کر وہ آگیا تو اس نے کہا۔ ویسے ہی شبہ میں پولیس اس کو پکڑ لے گئی تھی۔

میرے سامنے ہی جب ایک شخص برآمدہ سے گزرا، اودو بیرے نے بڑھ کر ٹوکا۔ اس پر وہ بگڑا۔ بات بڑھی۔ معاملہ گالی گلوچ تک جا پہنچا۔ میں حیران کھڑی اس تو تکار کو سن رہی تھی، اور سوچ رہی تھی کہ کیسے یہ ناؤ پار لگے گی۔ ان کو تو ان بچارے رئیسوں اور چودھریوں نے مسلمانوں کے لیے ابھارا تھا، یہاں تو الٹی آنتیں گلے پڑ رہی ہیں۔ چودھری کیسے، اب تو یہ گورنمنٹ ملازمین تک کے منھ آرہے ہیں۔

ایک بار پنڈت سندر لال جی کو لے کر ہماری پارٹی پالم گئی۔ وہاں پہنچ کر سنا کہ تین دن سے ایک بھینس مری پڑی ہے، اور ہریجن اٹھانے سے انکار کر رہے ہیں۔ ہریجنوں کو بلوا کر پوچھا، تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ ہم نہ اٹھائیں گے۔ آپس میں بحث و مباحثہ بڑھتا دیکھ کر پنڈت سندر لال اٹھ پڑے اور کہا:

"بھئی لڑنے کی کیا بات ہے، وہ نہ کریں ہم سب مل کر کر لیں۔ آؤ بھائیو، مدد کرو، میں خود اٹھاتا ہوں۔"

لیکن مردہ بھینس کو ہاتھ لگانا کوئی برہمن کیسے گوارا کر سکتا تھا، خود اپنی جماعت کے برہمن بھی گھبرا اٹھے، ادھر سندر لال جی ہیں کہ خوش خوش بلا رہے ہیں۔ ہاتھ لگائے دے رہے ہیں، اور یہاں سب ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہے ہیں۔

خیر یہاں بھی "نیتی"[1] کام آگئی اور ہریجنوں کو یہ طعنہ دے کر ابھار دیا گیا کہ اتنے بڑے اچاریہ مہا برہمن اور پھر مہمان، ان سے گندی چیز اٹھوا رہے ہو، شرم نہیں آتی پنڈت جی نے بھینس اٹھا کر پھینکی نہیں اور تمھاری ناک کٹی!

ہریجن ایسے تو بے غیرت نہ تھے کہ وہ مہمان کی بے عزتی کرتے، وہ بھی ہاں ہاں کرتے ہوئے دوڑ پڑے، ہٹیے، چھوڑ دیجیے پنڈت جی، ہمارا جھگڑا تو گاؤں والوں سے ہے۔ ہم آپ کو ہاتھ نہ لگانے دیں گے۔ لیکن پنڈت جی مدد سے باز نہ آئے۔ لوٹ مار اور غنڈہ گردی کی ان چند دنوں میں ان کو کچھ عادت سی پڑ گئی تھی اور اب ان سے نچلا بیٹھا

---

[1] ۔ پنڈت جے دیو نیتی، ٹیکٹ، راج نیتی کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے اور بڑے مزے میں اپنی برہمنیت کی دھونس جماتے تھے۔

نہیں جاتا تھا۔ ادھر امداد و بحالی کے کام کی رفتار اتنی سست تھی کہ شرنارتھیوں میں زبردست بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ کوئی کمی نہیں کرتی تھی۔ اس کا ہر رکن چاہتا تھا کہ جلد سے جلد ان کی مشکلات حل کرے! پھر بھی دیر تو لگ ہی رہی تھی۔

حکومت روپیہ بھی بے دریغ صرف کر رہی تھی، لیکن اوپر سے لے کر نیچے تک سارے کارکن اپنے مٹھے پن کا ثبوت دے رہے تھے، اگر سنٹرل ریلیف کمیٹی کی غیر سرکاری امداد شامل نہ ہوتی تو شاید ابھی دو سال تک یہی بے چینی مستقل رہتی، اور جتنا کام ہوا ہے اس کا آدھا بھی نہ ہو پاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں ابھی قوم کا سچا درد، کام کی لگن، اور بگڑی کو بنانے کا سلیقہ پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ نوکر شاہی کہیں باہر سے نہیں آئی تھی۔ وہ ہمیں میں کے سست کاہل اور لاپرواہ افراد تھے۔ جس طرح ہم اپنی پبلک زندگی میں پھوہڑ تھے، نظامِ حکومت میں شامل ہو کر بھی اپنے بے ڈھنگے پن کا ثبوت دے رہے تھے۔ ابھی تو توسارا آوے کا آوا بگڑا ہوا تھا۔ لاپروائی سے قدم اٹھاتے وقت ہم سب یہ بھول جایا کرتے تھے کہ لوگ گرمی سے بھن رہے ہیں، ان کا دماغ بھلا کے دن ٹھیک رہ سکتا ہے اور وہ کب تک ہمارا انتظار کریں گے!

اور بھئی ایمان کی بات تو یہ ہے کہ راج کاج کی صدیوں سے عادت بھی تو چھوٹ گئی تھی۔ کرتے کرتے کہیں تھوڑے دن میں عادت پڑے گی، اور جیسے جیسے تجربہ ہوگا، پھرتی آئے گی، سلیقہ آئے گا۔ ہر چھوٹا قدم بڑے قدم کا پیش خیمہ ہوتا ہے، اور ہمیشہ پہلی اینٹ سے دوسری اینٹ راجگیر اچھی بناتا ہے۔ مصیبت تو یہ ہوئی کہ ذرا سانس لینے کی مہلت بھی نہ ملی۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے[1]۔"

حد ہو گئی۔ خالی ٹکڑے پڑے تھے۔ رفیوجیز نے ہم سے کہا، حکام سے کہا۔ سب سے فریاد کی کہ اگر یہ ہم کو دلا دیے جائیں تو اپنا پیسہ لگا کر ہم مکان بنوا لیں گے، ایسے ایسے نہ جانے کتنے پلاٹ امپروومنٹ ٹرسٹ کے پاس تیار پڑے تھے اور کوئی بڑی بات نہ ہوتی، اگر جلدی سے ان کا الاٹمنٹ کر دیا جاتا۔ مگر سوچ بچار میں پورا سال بیت گیا اور دوسرے

---

[1] - کاہلی۔

جاڑے سر پر آگئے تب کہیں جا کر چند آدمیوں کو وہ قطعے مل سکے۔

ساری خالی زمین، انجنیئر اور عمارتی سامان کی خریداری میں ضروری سہولتیں اگر ان کو مل گئی ہوتیں تو ہزاروں نہ سہی سیکڑوں خاندان تو ضرور بلا حکومت کی مدد کے بس چکے ہوتے۔ لیکن یہ میرا خیال ہے، اور میں حکومت کی مشینری کا ننھا سا پرزہ بھی نہیں تھی اس لیے صرف اندازہ اور قیاس آرائیاں ہی کر سکتی ہوں۔ کیا پتہ اس راستے میں کتنی مشکلیں تھیں کیا دقتیں تھیں، یہ تو مکینک ہی بتا سکتا ہے کہ مشین کے چلنے میں کونسی اڑچن اور کیا مشکلات تھیں، شاید اسی لیے وہ ایسا نہ کر سکے ہوں حالانکہ میری طرح پبلک کا ہر آدمی یہی سوچتا تھا، اور حکومت کی دشواریوں سے بہت کم لوگوں کو ہمدردی تھی۔ غصہ سب کو آتا تھا۔

18

شانتی دَل

۱۳ جولائی کو شانتی دل کی میٹینگ راجندر بابو[1] کے یہاں ہوئی۔ شانتی دل کے ایک ماہ کے کام کی رپورٹ ان کے سامنے پیش کرنے کے بعد مردولا نے ساری دقتوں کا ذکر کیا اور یہ طے ہوا کہ کام کا دائرہ وسیع کر دیا جائے۔ کام کرنے والوں کے لیے بھی ایک معیّن اور واضح پروگرام بنا۔ عورتوں اور بچوں کا سیکشن کھولنے کی تجویز ہوئی اور درگاہوں اور مسجدوں کی واپسی کا سوال بھی سامنے آیا۔ مسلمانوں کے خالی مکانات کو سیل کرنے اور خالی مکانات کو سروے کرانے کا منصوبہ بھی باندھا گیا۔ ساتھ ہی بجٹ کی منظوری بھی لی گئی۔ سنٹرل پیس کمیٹی نے بجٹ کم و بیش منظور کر لیا۔

اور پھر جولائی ہی میں تمام حکّام، پارٹیوں کے نمائندوں اور سوشل ورکرس کا ایک اجتماع سکرٹریٹ میں پرائم منسٹر کے کمرہ[2] میں ہوا۔ حکام کو ہماری بے اعتدالیوں کی شکایت تھی، ہمیں ان کی لاقانونی اور لاپروائی کی۔ بیسیوں معاملات زیر بحث آئے، اور دشواریوں پر سب نے مل کر کھلے دل سے بحث و مباحثہ کیا۔ اس وقت تو ہماری سب سے بڑی دقت مقامی حکومت سے اختلاف تھا۔ پراونشل کانگریس کے جنرل سکریٹری نے تفصیل اور صفائی کے ساتھ واقعات کا حوالہ دیا۔ عدم تعاون کی شکایت کی، اور کچھ الزامات بھی لگائے۔ پولیس افسروں نے تاویل کرنی چاہی، مگر اتنے منہ کہنے والے تھے کہ وہ سب کی تردید بھی نہ کر سکے۔ صوبہ کے سب سے بڑے مرنجان مرنج افسر بھی شروع سے آخر تک موجود رہے۔ وہ نہ کسی کے مخالف تھے نہ مدّاح نہ شاکی، نہ وہ کوئی وعدہ کرتے تھے نہ کسی وعدہ پر عمل

---

[1] پریسیڈنٹ

[2] جواہر لال نہرو

کرنا ان کے امکان میں تھا۔

صوبہ کے ایک ذمہ دار رکن نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ مسجدیں خالی کرانے میں جلدی کی گئی اور اسی لیے شرنارتھیوں میں بے چینی ہے۔ جب تک نئے مکان نہ بن جائیں، وہ جہاں بیٹھے ہیں وہاں سے اُٹھایا نہ جائے۔

سوشلسٹ پارٹی کے سکرٹری بولے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں، اسی لیے مخالفت کرتا رہا ہوں!

میں نے کہا۔ لیکن آپ یہ تو سوچیے، عبادت کی جگہ کے لیے تو آپ کو ایک اصول بنانا ہی پڑے گا وہ رہنے کا ٹھکانا تو نہیں ہے۔ دوسرے شرنارتھیوں کے ٹھہرنے کے بعد تباہی اور بے حُرمتی کے جو واقعات ہوتے رہتے ہیں، اُن کو روکنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ انھیں ایسی جگہ قیام نہ کرنے دیا جائے۔ مسلمانوں میں بھی تو یہ سب حال دیکھ کر بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔

حکام نے کہا۔ وہ تو تب ہوتا ہے جب انھیں روکا جاتا ہے۔

میں نے چشم دید واقعات کا حوالہ دیا کہ کس طرح قیام کے بعد انھوں نے بربادی کی ہے۔

اس پر سوشلسٹ پارٹی کے سرگرم سکریٹری کہنے لگے کہ "میں زندوں میں کام کرتا ہوں، آپ مُردوں میں کرتی ہیں"۔

جملہ اچھا تھا۔ دوسرا وقت ہوتا تو شاید مجھے بھی لطف آتا، لیکن اس وقت بہت بُرا لگا۔ جی چاہا کہ کچھ کہوں، لیکن کچھ کہنا مناسب نہ معلوم ہوا۔ پی گئی۔ اور پھر ان دنوں تو یہ حقیقت بھی تھی، جھٹلاتی کیسے؟ بہت کچھ ہوتا رہا۔ پنڈت جی تو اٹھ کر چلے گئے، مگر ان کے سکریٹری کافی دیر تک صدارت کرتے رہے۔ مردولا نے اپنی فطری صاف گوئی کے ساتھ سب کچھ کہہ ڈالا، اور ہم سب خوش ہوتے رہے ؎

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ ہم سب کی طرف سے کہہ رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں ہم اپنے تجربات بھی سنا رہے تھے۔ آخر کار ہم یہ طے کر کے اُٹھے کہ اب سے یہ شکایت نہ ہونے دی جائے گی۔ سوشل ورکرس کو قانون کے دائرہ میں رہ کر کام کرنا ہوگا۔ اور قانون کے بہانے ہم کو ستانے والے افسران اب ہماری امداد کریں گے۔ لوکل گورنمنٹ ہمیں اپنا مشیر سمجھے گی مخالف نہیں۔

شانتی دَل نے تخریبی طاقتوں کو ناکام بنانے کا پروگرام بھی نہرو جی کے سامنے رکھا، اور ان کی پسندیدگی نے کل حکام کو مجبور کر دیا کہ امن پسندوں سے تعاون کریں۔ شانتی دَل پہلے ہی ہر اس شخص سے ممبر بننے کی درخواست کر چکا تھا، جو شانتی کو پسند کرتا ہو!

میں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں میں نڈر ہو کر بولنے، بے دھڑک اور بے لاگ بات کہنے والے مولانا حفظ الرحمٰن[1] کی طرح اِکّا دُکّا لوگ تھے۔ ایسی تمام محفلوں میں ان کی جرأت دیکھ کر میں تعریف کر اُٹھتی تھی۔ ان دنوں وہی ناظم جمعیۃ العلماء تھے۔ ان کی ایک رائے ہوتی تھی، اور اس پر وہ آخر تک قائم رہنا بھی جانتے تھے۔

اور پھر کانسٹی ٹیوشن ہاؤس میں بھی ایک اجتماع ہوا۔ اور مردولا نے ساتھیوں کو بتایا کہ باہر کے اسلامی ممالک میں ہندوستان کے مزارات و مساجد کے لیے کیسا مخالفانہ پروپیگنڈا ہو رہا ہے، اور مصر و ایران تک سے درگاہ قدم شریف کے بارے میں سوالات ہوئے ہیں۔ اس پارٹی کے ایک ممبر کو انھوں نے قدم شریف کی بحالی اور درستی پر مامور کیا، اور رمضان سے پہلے پہلے مسلمانوں کے نڈر ہو کر آنے جانے کے لائق بنا دینے کا کام ان کو سونپا گیا۔

کانسٹی ٹیوشن ہاؤس کا کمرہ نمبر ۶۱ تمام ترقی پسند جماعتوں کا مرکز بن گیا تھا، اور اکثر بے کار نوجوان وہاں آ کر ایک دو مہینہ ہمارے ساتھ کام کرنے کے بعد اپنے لیے ترقی کا راستہ سوچا کرتے تھے۔

اب مسموم محلّوں میں زبردست پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا تھا۔ ورکرز کو ٹریننگ دینے کے لیے ڈاکٹر ہارڈیکر سے درخواست کی گئی۔ اور دہلی کے خالی مکانات الاٹ کرانے اور سیل کرانے کی مہم میں شانتی دل کی سب کمیٹیوں کے انچارج اور والنٹیر حکام کی مدد کر رہے تھے۔ سیل لگنا اور پھر مکان الاٹ ہونا۔ کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ مشکل کام آخر تک آسان نہ ہو سکا اور بدنامی ہی شانتی دل کے سر رہی۔

---

[1] مولانا حفظ الرحمٰن سے ملاقات پہلے بھی ہوئی تھی مگر پھر ۱۹۴۷ء سے تقریباً روز کا ساتھ رہا۔ فسادات کے دنوں میں مولانا حفظ الرحمٰن مع اپنے تین ساتھی علما کے گلیوں سے لے کر گورنمنٹ ہاؤس اور برلا ہاؤس تک مصروفِ عمل نظر آتے تھے۔ ان کی دلیری، استقلال اور غیرت ایمانی مجھے بہت متاثر کیا۔

ویسے تو پچھلے مشورہ اور وعدہ وعید کے بعد اب ہمیں نسبتاً مخالفت کا سامنا کم ہی کرنا پڑتا تھا کم از کم کسی میں ہمت نہ تھی کہ کھل کر مخالفت کرے۔ در پردہ جو چاہتے کرتے۔ لیکن بعض وقت تو پبلک کا مفاد حکومت کی مصلحت سے ٹکرا جاتا تھا اور ایسے موقع پر ہم لامحالہ پبلک کا ساتھ دیتے تھے، کیا کیا جاتا، حالات ہی کچھ ایسے ہو رہے تھے کہ سوچو کچھ اور ہو کچھ جائے۔

مسلمانوں کی بھی عجیب حالت تھی۔ ان کے اندر بھی ابھی کدورت، نفرت اور انتقام کا جذبہ بھرا ہوا تھا۔ وہ پگڑیاں لے کر بیع نامہ کر کے ہمیں اور بھی مشکل میں ڈال دیا کرتے تھے۔ ایک بہت بڑے مسلم محلہ کے امیر چپکے چپکے غریبوں کے مکانات شرنارتھیوں کو پگڑیاں لے کر دے رہے تھے، اور اپنا بڑا مکان ان کو پیش کر دیتے تھے کہ آؤ، اس میں آ جاؤ۔ بیوقوف افلاس کے مارے ہوئے اپنا مکان چھوڑ کر ان کے عنایت کیے ہوئے کمرہ میں اُٹھ آئے اور پھر جلد ہی وہ اپنے مکان کا بیع نامہ کر کے، غریبوں کو شرنارتھیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پاکستان چل دیے تھے۔ جب سیلیں لگنے لگیں، تو بھی انھوں نے یہی چالاکی کی کہ غربا کے محلہ اور گلی کو کسٹوڈین کے حوالہ کرا دیا۔ میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا اس وقت قول و فعل کوئی چیز بھی قابل اعتماد باقی نہ رہ گئی تھی۔ پہلی بار جب مجھ سے ایک شخص نے آکر کہا کہ عدالت کہتی ہے۔ تمھاری تنہا گواہی کافی نہیں ہے۔ یا تو ایک ہندو لاؤ، یا دو مسلمان۔ تو مجھے بڑا غصہ آیا اور ذلّت محسوس ہوئی کہ خدا کی شان ہے۔ اب دو مسلمانوں کا ایک ہندو کے برابر وزن تولا جائے گا۔ مگر چند ہی دن بعد حقیقتِ حال ظاہر ہو گئی۔ ایک کیا، مسلمان چار مل کر بھی اس وقت اپنے جھوٹ کی بدولت ہندو سے ہلکے تھے کیونکہ پتہ نہ تھا وہ کس وقت ترک وطن کر دیں۔

لیگ کے کچھ سرگرم ممبران کبھی ابھی ہندوستان میں موجود تھے، اور ان میں کے کچھ خوش اخلاق یار باش حضرات جب دہلی آتے تھے، تو ساری کیبنٹ، گورنر جنرل، اور ممبرانِ اسمبلی، حتّٰی کہ کانگرس لیڈر تک سے ملنا ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن کبھی انھوں نے مسلم پناہ گزینوں کو دیکھنے مصیبت زدوں کا دُکھ سننے، اور مشکلوں میں مدد کرنے کی زحمت نہ اٹھائی۔

وہ لوگ اب اس وقت مجبور ہو رہے تھے کہ کانگرس سے تعاون کریں اور اپنے معاملات کو کانگریسی نقطہ نظر سے حل کریں۔ ظاہر ہے وہ کہاں تک اپنے جذبات پر قابو حاصل کرتے۔ اپنے معاملات کو طے کرانے میں روایتی بے حسی اور جانبداری پر آج بھی ان کا عمل تھا۔ ان

میں سے کسی کو ایک دوسرے کی زیادہ پرواہ نہ تھی۔

یہاں محلوں کے اندر ہر پیسہ والا مسلمان یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سب بیچ باچ کر پاکستان نکل جائے۔ ادھر شانتی دل والے اور نیشنلسٹ مسلم ان کو روکتے تھے کہ غریب پڑوسیوں پر رحم کرو۔ تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ مکان نہ بیچو۔ تم نے یا تمھارے ساتھیوں نے ان کے ذاتی مکانات پہلے ہی چھنوا دیے ہیں، یا رفیوجیز زبردستی ان پر قبضہ کر چکے ہیں، اب اگر اپنے بڑے مکان کے کسی کونے میں ان کو پناہ دے چکے ہو، تو اس سے انھیں محروم نہ کرو، جب امن ہو جائے گا، تب آکر فروخت کر ڈالنا۔ ہم تمھارے گھروں میں اور خانما برباددوں کو لاکر لبسا دیں گے، کرایہ نہ مانگنا، ملکیت تمھاری محفوظ رہے گی!

لیکن وہ کیوں سُنتے۔ وہ راتوں رات پگڑی کے ہزاروں روپے لے کر رفو چکر ہو جاتے تھے۔ والنیٹر بھوکے پیاسے پہرہ دیتے رہ جاتے، اور وہ اپنے راستے میں ان کو رکاوٹ سمجھ کر اُلٹے حکام سے ان کی شکایتیں کر دیتے۔ پولیس ویسے ہی خار کھائے بیٹھی تھی۔ اسے ایک بہانہ مل جاتا۔ فوراً شانتی دل کے خلاف ایک کیس بن جاتا۔

جولائی کے مذاکرات کا ایک نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ایسے کیس اور مخالفتیں درپردہ ہونے لگیں، کھلم کھلا نہ ہوتی تھیں۔ ملاقاتیں بات چیت سب بہت ہی دوستانہ رہتی تھی۔ اور پھر کسٹوڈین کا محکمہ، اسے بھی غریبوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ادھر دہی سرکردہ لیگی جمعیۃ میں گھس رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر نیشنلسٹ مسلمان الگ چڑھتے۔ کانگرسی جدا منہ بناتے مکانات کے معاملے میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ اُن سے معاملت کرنے پر ہمارے کارکن کسی طرح تیار نہ تھے، لیکن علمار کے دامن میں پناہ لینے والے لیگی، اب گورنمنٹ میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ ان میں کچھ اپنی تجارت کا فروغ چاہتے تھے۔ کچھ اچھے داموں اپنی جائداد بیچنے کے خواہش مند تھے۔ اور کچھ ہند و پاکستان دونوں کے شہری بننے کے سچے دل سے متمنی تھے۔

ایک صاحب نے تو ایک کانگریسی مسلمان کے ذریعہ مجھے محلہ میں مرکز تعلیم و ترقی اور شانتی دل کا آفس کھولنے کے لیے کئی ہزار کی پیش کش کی بشرطیکہ میں ان کو انڈیا کا ٹریڈ کمشنر بنوا کر پاکستان بھجوانے کی کوشش کروں۔ لطف یہ ہے کہ ہمارے سیدھے سادے نیشنلسٹ بھائی بڑے زوروں میں ان کی وکالت کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا، سرمایہ دار سے روپیہ حاصل کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ مکان اور روپیہ دونوں چیزیں حاصل ہو

رہی ہیں۔ اس محلہ میں ہمارا امن مشن اسی صورت سے کامیاب ہو سکتا ہے جب یہاں کے امراء کو ہم مٹھی میں رکھیں۔ میرے انکار پر انھیں سخت مایوسی ہوئی۔ وہ بچارے اس کو دیانت داری یا اصول کے خلاف سمجھتے ہی نہ تھے۔

ادھر جن دیہاتوں میں لوگ واپس آرہے تھے، ان کی بُری حالت تھی۔ وہ بس تو گئے، مگر افلاس و ناداری کی حد نہ تھی۔ دیہات کا اصلی کام کھیتی باڑی تھا۔ مگر ان کی زمینیں اب تک کسٹوڈین کے پاس تھیں جس کے ثبوت اور فیصلہ میں مہینوں کی دیر تھی۔ وہ لوگ جن کے کھیت مقامی ہندوؤں کے قبضے میں تھے، ہم لوگوں کے سمجھانے بجھانے سے پھر اپنے کھیت واپس لینے میں تو کامیاب ہو گئے، یا فصل کٹتے ہی انھوں نے خود زبردستی قبضہ جما لیا، اور اس طرح اپنی ملکیت حاصل کر لی، وہ بھی تو نئی جوتائی سے معذور تھے۔ نہ ان کے پاس ہل، نہ کدال، نہ پھاوڑہ۔

کچھ لوگوں نے قرض لے کر ہل، بیل خرید لیا۔ لیکن اس خبر نے ہمیں اور زیادہ فکرمند کر دیا کہ جلد کوئی صورت نکالیں۔ اگر گورنمنٹ نے تقاوی نہ دی تو یہ قرض کیسے ادا ہوگا اور ایک دو فصلوں کے بعد اصل و سود ملا کر زمین مہاجن کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔ یہ پھر ویسے کے ویسے ہی رہ جائیں گے۔ مہاجن اس وقت بڑی محبت و فراخ دلی سے قرض دینے پر تیار تھے، خوب لانبی شرح سود پر اپنے پرانے ساتھیوں کی آؤ بھگت کرتے ہوئے وہ رقم پیش کر دیا کرتے تھے۔

19

اگست سے ستمبر تک

شدھی ہونے والے مسلمانوں نے بھی ان دنوں بہت حیران کر رکھا تھا جمعیۃ اور پاکستان آفس کو برابر درخواستیں دے رہے تھے۔ میں نے جمعیۃ والوں سے کہا کہ ایک آدمی اپنا میرے ساتھ کر دیجیے، تو میں جا کر ان لوگوں سے بات چیت کروں۔ اپنے ساتھیوں کو تو اس وقت مسلم جائیداد کی فہرست بنانے، دوبارہ بسانے، اور ان کے کھیتوں میں نئی فصل بونے کے لیے کارروائی کرنے کی جلدی تھی۔ ورنہ پھر تو جو ہم نے کیا تھا، وہ سب بے کار جاتا۔ کچھ آراضی کسٹوڈین کے قبضہ میں تھی۔ مگر ان تمام حالات کی تحقیق کی ضرورت تھی اور یہ کام میرے بس کا تو تھا نہیں، اس کو تو وہی لوگ کر سکتے تھے، جو عدالت اور زمیندارانہ مقدمہ بازی کا تجربہ رکھتے ہوں!

بہر حال ہماری پارٹی دو ٹکڑیوں میں بٹ گئی۔ کسی کسی دن ہمارا کام مشترک ہوتا کسی دن علیحدہ اور سوامی جی ہمارے شریک کار ہو گئے۔ انھوں نے بہت سارے گاؤں ہمیں دکھائے۔ جمعیۃ کے ایک صاحب کو لے کر جب میں ان دو گاؤں میں گئی جہاں کے گیارہ سو مسلمان جن کی شدھی کی گئی تھی پاکستان کو درخواست رہائی بھیج چکے تھے۔ اس سے پہلے بھی میں ایک بار یہاں آ چکی تھی، اور ان سے حالات پوچھنے کے بعد یہ سوال کیا تھا کہ "یہ مسجد کس نے توڑی"، تو انھوں نے لاپرائی سے جواب دیا تھا، یہ تو جب کی بات ہے جب ہم شدھی ہوئے تھے، تو اپنے آپ ہم نے اس کو بھی توڑا تھا۔

میں نے کہا، اس سے کیا فائدہ ہوا؟ تم کو نہیں ضرورت تھی تو یونہی رہنے دیتے، شاید کسی اور کو ضرورت پڑے۔ جواب ملا، اب یہاں کون مسلمان ہے جو نماز پڑھے گا۔ نہ کوئی آئے گا۔

یہ سب سُن کر مجھے بھی ان کا کہنا ٹھیک معلوم ہوا تھا کہ "ہم راضی خوشی ہندو بن

گئے ہیں،" ہم تو جاٹ ہیں، پہلے بھی ہندو تھے، اب پھر ایک ہو گئے۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ وہ دھوکہ دے رہے تھے اور پاکستان کو خفیہ درخواستیں بھی بھیج رہے تھے۔

یہ دو سالم گاؤں تھے، جن کی غالب آبادی مسلم تھی۔ اونچے ٹکڑے۔ اُجڈ اور جاہل قسم کے لوگ اس میں بستے تھے۔ ایک دن جب ہم پہنچے تو یہ خبر سُن کر آئے تھے کہ یہاں سے دس بارہ آدمی پاکستان بھاگ گئے ہیں، اور کچھ علماء کے پاس آئے تھے کہ ہماری مدد کرو۔

ہمیں نجف گڑھ میں کئی کانگریسی میں نظر آئے۔ یہاں کانگریس آفس بھی کھل گیا تھا۔ دو آدمیوں کو ساتھ لے کر سوامی جی کی موجودگی میں ہم نے بات چیت شروع کی۔ پتہ نہیں ڈر گئے یا کیا وجہ ہوئی صاف مکر گئے:

"نا صاحب، ہم میں سے تو کوئی گیا نہیں، ہم تو گاؤں میں سے نہیں نکلنا مانگتے۔ ہم نے تو کوئی درخواست نہیں دی۔ ہم تو اپنی مرضی سے شدھی ہوئے ہیں۔ ہوگا کوئی جس نے ہم میں سے خبر پہنچائی۔"

اتنی صفائی سے وہ سب یہ کہتے رہے کہ مجھے بھی یقین آگیا۔ ضرور کسی نے علماء کو غلط خبر دی ہے۔

واپس آئی تو مولانا حفظ الرحمٰن نے کہا۔ آپ مقامی کانگریسیوں کو لے کر گئی تھیں اس لیے وہ ڈر گئے، اب کی تنہا جائیے، اور آپ کے ساتھ دفتر کے ایک صاحب جائیں گے، وہ ان آدمیوں کو پہچان کر پوچھیں گے جو ہمارے یہاں آئے تھے۔

دوسرے دن جمعیۃ کے ایک صاحب کو لے کر پھر پہنچی۔ یہ تیسرا چکر تھا، اور آج ان کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا۔ انھوں نے اقرار کیا کہ ہاں ہم گئے تھے۔

مولوی صاحب نے پہچان کر پوچھا کہ "کل تم نے کیوں انکار کیا؟"

جواب ملا۔ "ہم ڈر رہے۔ کہیں پتہ لگ جائے اور آفت ہو جائے۔"

لیکن وہ سب آخر وقت تک یہی اصرار کرتے رہے کہ ہمیں پاکستان پہنچا دو۔ یہاں ہم علی الاعلان مسلمان بن کر نہیں رہ سکتے۔ گیارہ سو آدمیوں کو گاؤں سے لے جا کر پاکستان بھجوانا یا کہیں اور رکھنا ناممکن تھا۔ ان کو دوبارہ لبسانا بھی ایک مشکل مسئلہ تھا، اور پھر تھوڑے سے آدمی تھے جو پاکستان جانا چاہتے تھے، باقی تو اس پر بھی نہیں تیار تھے۔ گاؤں سے بھاگنے پر راضی تھے۔

ہم نے سمجھایا کہ تمہارے اطمینان و حفاظت کا سب بندوبست ہم کرا دیں گے۔

دلّو باجی کو یہاں لا کر یہ ارتھنا سبھا کرائیں گے اور بھائی برادری کے سامنے اعلان کرادیں گے۔ پھر کوئی تم سے نہ بول سکے گا۔ بھاگنے کا ارادہ نہ کرو۔ ٹھیک سے رہو جس طرح پہلے رہتے تھے اسی طرح۔

ایک بڑے میاں بولے۔ صاحب وہ تو چالیس گاؤں کی پنچایت کر کے ایک تحصیلدار صاحب کے سامنے ہم ہندو بنے تھے، اور ان سے بھی بڑے افسر سے پوچھ تاچھ کر اجازت لے کر تب یہ سب کیا گیا تھا۔ اب قول دے چکے ہیں۔ بات بدل کر پھر یہاں رہیں تو ان پنچوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟

میرا جی جل گیا۔ میں نے کہا، بڑے میاں، یہ تمھاری عمر، اور یہ باتیں۔ ساٹھ برس تک تم مسلمان رہے، اور اب ایک سال سے ہندو ہوئے ہو، ۶۰ برس کا عہد توڑ کر تو مجھے اور مولوی انیس[1] کو منہ دکھا رہے ہو، اور ایک سال کا قول توڑ کر ان کو نہ دکھا سکو گے؟

ان میں کا ایک آدمی جو پڑھا لکھا نوجوان تھا، اور اس صورتِ حال سے ازحد بیزار معلوم ہو رہا تھا، بول اٹھا کہ "جناب سچی بات یہ ہے کہ میں جانا چاہتا ہوں۔ اور بھی کچھ آدمی ہیں جو جانا چاہتے ہیں۔ کچھ یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ تو جاٹوں کے ساتھ مل کر دھار[2] بھی چڑھتے تھے۔ جب سارے جاٹ اکٹھے ہو کر مسلمانوں کے گاؤں پر دھاوا بولتے تھے، تو یہ بھی جایا کرتے تھے۔"

یہ سُن کر لوگ اس سے لڑنے لگے۔ ہم لڑتے کہاں تھے، ہاں ساتھ ہوتے تھے، وہ تو جانا ہی تھا کیا برادری کا کہا نہ مانتے؟

وہ بولا۔ یہی سہی، بہرحال تم ہندو ہو چکے ہو..... تو رہو، درخواست دینے تو ہم لوگ گئے تھے، جو نہیں رہنا چاہتے ان کو تو نکلوا دیجیے!"

لیکن میں ان کو چھوڑ کر چلی آئی۔ میں نے کہا۔ تم جاٹ ہو، اور تم میں اتنی ہمت بھی نہیں، کہ اپنے مذہبی عقائد کا اعلان دلیری سے کر سکو، تو پھر ایسے مسلمانوں کی اسلام کو ضرورت بھی نہیں ہے، اس منافقانہ زندگی سے میں تم کو نہیں بچا سکتی۔ دو تین گھنٹے کے اندر بھی تم کسی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے۔ تین بار آ کر میں نے حجت پوری کر دی۔ اب تم اپنے لیے خود ہی کوئی

---

[1] مولوی انیس الحسن مولانا حفظ الرحمٰن کے خاص معتمد بہترین عربی داں اور انتھک کام کرنے والے جمعیۃ العلماء کے شاید آفس سکرٹری بھی تھے۔

[2] دھار بمعنی حملہ۔ دھاوا۔

راستہ ڈھونڈھو۔ میں پاکستان بھیجنے کا بند و بست نہ کروں گی، یہاں ٹھہرو تو تمھارے لیے ہر ممکن انتظام کرادوں گی۔ گورنمنٹ کو اس سے کوئی مطلب نہیں، ہندو رہو یا مسلمان، لیکن آدمی بنو۔

پھر مجھے نہیں معلوم ان سب کا کیا حشر ہوا، پوچھنے کو بھی جی نہ چاہا۔

سُنتی ہوں، ایک پاکستانی ٹرک کئی دن تک گشت کرتا رہا اور جتنے جانے والے تھے اس میں چلے گئے۔ یہ ٹرک اپنے آپ تو چلا نہ گیا ہوگا۔ پاکستان گورنمنٹ نے زبردستی تو دلّی صوبہ میں گشت نہ کرایا ہوگا۔ کس کی مرضی سے ایسا ہوا۔ کس نے اجازت دی۔ میں نے یہ بھی جاننے کی زحمت نہ اٹھائی

البتہ انھیں دنوں ایک اور گاؤں میں اس ٹرک کے پہنچنے کی خبر سُن کر اور یہ معلوم کرکے کہ وہاں سے بھی دس بارہ آدمی جا چکے ہیں، ہمارے ساتھی چراغ پا ہوگئے۔ وہاں گئے، ان سب کو ڈانٹا۔ دھمکیاں دیں۔ سمجھایا، اور پھر دوسرے دن مجھے ہمراہ لے کر پہنچے کہ ان کی تشفی کروں کافی دیر تک میں نے ان سب سے بات چیت کی۔ صلاحیت کے ساتھ تقریباً ہر موضوع پر ان کے خیالات پوچھے اور پھر قوم پرستانہ نظریہ اور جمہوری حکومت کی تشریح کرکے ان کو بتایا کہ یہ دو عملی، یہ منافقت نہ تمھارے لیے اچھی ہے، نہ حکومت کو فائدہ ہے۔ لوگ توجہ سے سن رہے تھے، متاثر ہو رہے تھے اور بارش کا طوفان پوری شدت سے آرہا تھا۔ ہمراہیوں کو پریشانی تھی کہ اب چلنا چاہیے۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ کسی طرح ہم رخصت ہوں، لیکن میں بات پوری کرکے اُٹھی اور تب ان میں کے بہت سے یہ کہہ رہے تھے کہ جان کے ڈر سے ہم نے یہ کیا تھا اور جب یہاں مسلمان بن کر ٹھہر سکتے ہیں، تو پھر ہم پاکستان کیوں جانے لگے؟

لیکن مجھے افسوس ہے بہت ہی کم جگہ میں پہنچ سکی۔ بہت کم موقع مجھے مل سکا کہ اس بے چینی کو دور کرسکیں خود اپنے ساتھیوں میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے، جو ایسے کام میں اپنے مذہبی اعتقاد کے باعث میرا ساتھ نہ دے سکے۔ میں ان پر الزام نہیں لگاتی، شاید میں بھی پاکستان میں ہوتی اور مجھ سے کہا جاتا کہ جاؤ۔ ان ہندوؤں کو جو مسلمان بن گئے ہیں، پھر ہندو بن کر رہنے کی اجازت دیدو تو میں نہیں کہہ سکتی ہوں ایسا کرسکتی یا نہیں، مذہبی تخیل کیا مجھے اتنا فراخ ہونے دیتا کہ ہندوؤں کے دلوں کی بے چینی دُور کرسکوں۔ بالکل یہی حال یہاں کے ہندو بھائیوں کا تھا۔ وہ بھلے لوگ سب کام کرلیتے تھے، لیکن جو شُدھی ہو چکے تھے، ان لوگوں کو پھر مسلمان بننے پر مجبور کرنا، ان کے بس میں نہ تھا۔ مذہب دھرم آدمی کو کتنا پیارا ہوتا ہے۔

اسی گاؤں میں تین آدمی ہمیں ملے۔ انھوں نے بہت ہی پُرلطف انداز میں قصہ سنایا کہ ہماری اور گاؤں کے مسلمانوں کی ایک بیاہ کے موقع پر لڑائی ہوگئی تب ہم نے مسلمانوں

سے کہا کہ جب تم ایسا برتاؤ ہم سے کرتے ہو تو ہم بھی ہندو بنے جاتے ہیں اور ہم نے اسی وقت نائی کے آگے اپنا منڈا[1] رکھ دیا کہ لے چوٹیا بنا دے۔ بس اس دن سے آج کی گھڑی تک ہم تو ہندو ہیں۔ بھلا ان سے میں کیا کہہ سکتی تھی۔ کیا پتہ اب پھر کسی دن وہ چوٹیا کے بجائے داڑھی اور کیس بڑھا لیں۔

سرگرمیاں

جولائی سے اگست تک دیہاتوں میں زمینوں کے معاملات طے ہوتے رہے۔ حیدر آباد میں رضا کاروں کا زور تھا اس لیے اکثر گاؤں میں ہم سے سوال ہوتا تھا کہ آخر ہماری سرکار حیدر آباد کو ڈھیل کیوں دے رہی ہے؟

ایک جگہ دو تین نوجوان مجھ سے کہنے لگے کہ ماتا جی ایک بات بتائیے۔ ہم دو بھائی آپس میں زمین اور گھر کا بٹوارہ کرتے ہیں، تو اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہو جاتے ہیں، پھر کوئی ایک دوسرے پر اپنا حق نہیں جتاتا۔ اور یہ ہندو مسلمان کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جب آپ نے اپنا چوتھائی حصہ لے لیا، تو پھر ہندوستان پر آپ کا کیا حق اور مسلمان یہاں کیوں ڈٹے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا۔ جب تک بھائی بھائی ایک گھر میں رہے، سب چیز ایک میں رہی۔ سب کا دعویٰ رہا۔ جب بٹوارہ ..... ہو گیا، تو پھر حق دعویٰ کیسا؟

کتنا سیدھا سادا سوال تھا۔ یہی سوال ہر ہندو کی زبان پر تھا اور گاؤں کے عقل مند لوگ بچے بچے کو بتاتے تھے، کہ یہی سوال کرو اور مسلمان! ان کے پاس جواب ہی کیا تھا۔ لیکن میرے پاس جواب تھا، میں نے دیر تک ان کے سوالات سنے اور جواب دیے اور آخر کار ان میں دو کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ باقی جھگڑتے رہے۔ ہمارے مستعد ہمراہی کسی کو سوال کرنے اور سوچنے کا موقع نہیں دیتے تھے، نہ دینا چاہتے تھے۔ وہ اس کو ہماری ناسمجھی سمجھتے تھے، اور واقعی یہ چیز تھی بھی زمیندارانہ اور حاکمانہ اصول کے خلاف، لیکن ہمارے دماغوں میں تو خود ہی ہلچل تھی۔ ہم دوسروں کی اتھل پتھل کیسے نہ دیکھتے۔ کانگریس کے بنیادی اصولوں سے انحراف اور جمہوری دور میں آمرانہ جابریت کا مظاہرہ بھلا میں کیسے کر سکتی تھی اس لیے مجھے تو کھود کھود کر پوچھنے میں لطف آتا تھا۔ میں تو ان کے دلوں میں

---

[1] سر

جھانکنا چاہتی تھی۔

عام مسلمانوں میں حیدر آباد کے لیے نہ کوئی بے چینی تھی، نہ جوش وخروش مگر پڑھا لکھا طبقہ اور امراء متفکر تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر لڑائی چھڑی تو گھمسان کا رن پڑے گا لیکن جب وقت آیا تو "خود غلط بود آنچہ پنداشتیم" تین دن میں قصہ ختم ہوگیا۔ اس سے پہلے بار بار لوگ سوال کرتے تھے، کہ آخر سرکار ڈرتی کیوں ہے۔ حیدر آباد میں لڑائی کیوں نہیں چھیڑ دیتی۔ قصہ تو ختم ہوگیا مگر اس سلسلہ میں بھی غربا بچارے کے سر جاسوسی کا کاغذی وبال ڈالا گیا۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ گھروں میں فاقے ہوئے۔ نادار عورتیں بلبلا کر روئیں۔ بچے تڑپے، اور سچ مچ کے جاسوس جہاز کے ٹکٹ لے اصل خیر سے پاکستان سدھار گئے۔

ادھر کشمیر بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔ نہ جانے کیوں دیہاتوں میں کشمیر کے اتنے تذکرے تھے۔ اتنی فکر تھی اور اتنا جوش تھا۔ اب ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا۔ زیادہ تر مسلمان کے کاشتکار ہریجن تھے، اور اب مسلمانوں کی متروکہ زمین چونکہ شرنارتھیوں کو الاٹ ہو رہی تھی، جو خود کاشتکار تھے، اس لیے ہریجن تیزی سے حقوق کاشتکاری سے محروم ہو رہے تھے۔ ہر گاؤں میں ان کے تعلقات پناہ گزینوں سے خراب ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کی لوٹ مار کرنے کے بعد ان کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ اخلاقی گراوٹ جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اپنا پرایا کچھ نہیں سوجھتا۔ وہی ہاتھ جو مسلمانوں کو نوچ کھسوٹ چکے تھے، اب شرنارتھیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جاٹ اور ہریجن رفتہ رفتہ جرائم پیشہ قوم بنتے جا رہے تھے۔

ہم نے اپنی رپورٹ میں اس خطرہ کا بھی اظہار کیا کہ اگر فوری درستی اور اخلاق کے سدھار کا بندوبست نہ ہوا تو صوبہ دہلی جرائم پیشہ قوموں کی بستی بن جائے گا۔

ایسے بھی گاؤں ہم نے دیکھے جن میں فساد سے پہلے مسلم آبادی اکثریت میں تھی۔ جب گاؤں اجڑا تو قلتِ تعداد کی وجہ سے ہریجنوں یا دوسری ہندو قوموں نے بھی دوسرا ٹھکانا نہ ڈھونڈا۔ لیکن جب ہم نے پھر نئے سرے سے آباد کرنے کی کوشش کی، تو مسلمانوں کے آتے ہی ہندو بھی واپس آگئے اور چونکہ مسلمان کم تعداد میں واپس آئے تھے اس لیے رفیوجیز

لے اسی سلسلہ میں مجھے ایک بات اور معلوم ہوئی کہ دہلی صوبہ میں ہریجن پٹے پر زمین لے سکتے تھے مگر زمین کے مالک نہیں بن سکتے تھے یعنی زمیندار نہیں بن سکتے تھے۔

لے ہر رنز کی ہماری رپورٹ انگریزی میں ترجمہ ہو کر اوپر بھیجی جاتی تھی۔ زیادہ تر پنڈت جی کو۔

بھی لاکر بسائے گئے۔ گاؤں تو بھر گیا، لیکن تین قسم کے پناہ گزینوں سے، جو سب کے سب مصیبت زدہ تھے، سب محتاج تھے، اور سب مدد کے طالب تھے۔ مسلمانوں کی امداد شانتی دَل کر رہا تھا، رفیوجیز کی محکمہ امداد و بحالی۔ رہ گئے مقامی ہندو۔ آخر وہ کس کے پاس جائیں، ان کے لیے کوئی محکمہ نہ کھولا گیا تھا۔ ہم کو خوشی ہوئی جب اس تین قسم کی آبادی میں میل ملاپ کرانے اور امداد کرنے کے لیے ہم نے اپنی خدمات پیش کیں، اور ان سب کے لیے سستے راشن کی دکانیں کھلوانے میں ہماری کوشش کامیاب ہوئی۔

۱۵ اگست کے لیے بھی تو پہلے سے پیش بندی کرنی تھی۔ شانتی دَل کا محکمہ اطلاعات خاصا زور دار تھا، اس نے بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دیں[1]۔

ہم نے دیکھا کہ مقامی لوگ عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھے، وہ دیکھ رہے تھے کہ جو گروہ نیا آیا ہے، وہ علم، صحت، صورت اور محنت میں ان سے اونچا ہے۔ ان میں کی ایک جماعت ہتھیار بند بھی ہے اس لیے انھیں اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر یہ ہندوستان پر چھا گئے، تو بہت جلد ہر شعبہ پر قبضہ کر لیں گے، اور تجارت تو پہلے ہی ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے۔ اگر روک تھام نہ ہوئی تو بیوپار اور حکومت دونوں پر ان کا راج ہو جائے گا۔ یہ سب سوچ کر انھوں نے صوبائی تعصب بڑھانا شروع کر دیا اور شانتی دَل کو ان سے بھی جھگڑنے کی ضرورت پڑ گئی۔

اتفاقات تو دیکھیے، چونکہ اس وقت گورنمنٹ کے تقریباً ہر محکمہ میں پنجاب سے آئے ہوئے لوگ زیادہ تھے۔ اس لیے جب مسلمانوں کے متروکہ مکان اور نئے بنے ہوئے دکانوں و کوارٹروں کا الاٹمنٹ ہونے لگا تو سب سے پہلے پنجابیوں کا حصہ لگا۔ اس پر فرنٹیر والے بگڑے کہ آخر ہمارے ساتھ سوتیلی اولاد کا برتاؤ کیوں ہو رہا ہے۔ سندھی چلاتے تھے...... ہمارا بھی حق ہے۔ آخر ہمیں کیوں پیچھے ڈھکیلا جا رہا ہے۔

حالات کے تمام پہلو اور واقعات کی ادھادھند رفتار دیکھ کر تو کہنا پڑتا ہے کہ واقعی بڑی سخت جان تھی ہماری سرکار، جو طوفان کے اتنے تھپیڑے کھا کر بھی جیتی بچ گئی۔ کشتی اُلٹی پلٹی بھی نہیں، آہستہ آہستہ رفتار بڑھاتی ہی رہی۔

تقریباً تین ہزار مکانات مسلم زون میں شرنارتھیوں کو دیے گئے۔ یہ وہ مکان تھے جن کو

---

[1] مسٹر کرشن لال بھگت اس محکمہ کے انچارج تھے۔ جو بعد کو صدر کانگریس دہلی بھی بنے۔

بدامنی کے خیال سے والنیٹروں نے لڑ بھڑ کر روک[1] رکھا تھا اور اس طرح مسلم زون ختم ہو گئے۔ آبادی اب چند محلوں کو مستثنےٰ کر کے تقریباً مخلوط ہو گئی۔ میری تو پہلے ہی سے خواہش تھی، کہ حالات اعتدال پر آتے ہی آبادی مخلوط کر دی جائے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ کوئی کسی کو مکان سے نہ نکال سکے۔ چھین نہ سکے۔ خرید نہ سکے۔ تب ہی یہ نفرت اور دوری کم ہوگی۔ رہا میل جول کرانا، تو وہ ہمارا کام ہے۔ ہم کو کوشش کرنا چاہیے کہ مسلم برادری اور ہندو برادری نہیں، انسانی برادری قائم ہو سکے!

لیکن مسلم لیڈر ڈرتے تھے، اور اندیشہ کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ وہ ذرا مشکل سے اس پر راضی ہوئے۔ مگر جب یہ کام ہو گیا تو پتہ چلا کہ حکام کا اندازہ کتنا غلط تھا۔ ۲۴ ہزار کنگز وے کیمپ کے ہزاروں کرکشیتر کیمپ، اور ہزاروں دوسرے کیمپوں کے شرنارتھی بدستور بے گھر رہے۔ پھر گورنمنٹ نے، ریلیف کمیٹی نے اور مکان بنوانے شروع کیے اور ہزاروں مکانات بننے کے بعد بھی ہزار ہا خاندان جاڑے میں ٹھٹھرنے کے لیے بچ رہے!

پرانے آثار، کھنڈرات، عمارتیں، ہمایوں کا مقبرہ، صفدر جنگ کا مقبرہ، عرب سرائے سب میں پناہ گزیں بھرے پڑے تھے اور مجھے یقین ہے اگر ان کو آسانی اور سہولت کے ساتھ وہاں بھجوا کر یہ وعدہ لے لیا جاتا۔ سمجھا بجھا دیا جاتا کہ ان آثار کو ہندوستان کے تاریخی آثار سمجھ کر برباد نہ کریں تو شاید وہ مان جاتے۔ لیکن اتنا موقع ہی کہاں ملا۔ نہ کسی کو خیال آیا۔ نہ محکمہ آثار قدیمہ نے اس طرف توجہ کی کہ حفاظت کا کوئی بندوبست کرائیں۔

ہم سب کچھ کر رہے تھے اور عام حالات درست بھی ہو رہے تھے، اکثر افسروں سے بھی ہم کو امداد مل رہی تھی، لیکن وہ نیک دل افسر جو میرا ہاتھ بٹاتے، ان کی اکثر گوشمالی ہو جایا کرتی تھی جیسے لوکل گورنمنٹ کو شانتی دَل سے خواہ مخواہ کا بیر ہو گیا تھا یا وہ انھیں چاہتی ہی نہیں تھی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں کسی پارٹی حتیٰ کہ کانگریس تک کی پوچھ نہ تھی۔ آخر کار ہم میں کا انتہا پسند طبقہ اس پر تل گیا کہ اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے، کہ گورنمنٹ کو مجبور کیا جائے کہ وہ لوکل ایڈمنسٹریشن میں تبدیلی کرے۔ عوام کی آواز شانتی دَل کے ساتھ تھی۔ سب پارٹیوں کی متفقہ امداد شانتی دَل کو حاصل تھی۔ تمام شکایات، اندیشے اور تجویزیں اوپر تک پہنچائی گئیں، اور اپنے آزمودہ کار جرنیلوں کو جنگ کے ہر پہلو

---

[1] اور اب ان کو روکنے کی ضرورت نہ تھی۔ وقت آگیا تھا کہ آبادی مخلوط ہو جائے۔

سے باخبر کر دیا گیا۔ آپس میں خوب بحث و مباحثہ ہوا۔ ایک کو چھوڑ کر سب کی متفقہ رائے ہوئی کہ جب تک دلی کی حکومت نہ بدلے، سب کرنا دھرنا بے کار ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو دلی کی شانتی سنہرا خواب بن کر رہ جائے گی، اور ہم شورش پسندوں کا کھلونا بن جائیں گے۔ ہم پچھڑے کر کے آتے ہیں۔ یہاں اپنی من مانی ہو چکتی ہے۔ شانتی دل کو زک پہنچانے اور توڑنے کے لیے مختلف ناموں سے والنیٹر کور بنائی جا رہی ہیں۔ اس کا بس ایک ہی علاج ہے۔

خدا خدا کر کے ہم کو کامیابی نصیب ہوئی۔ سب نے مل کر خوشی منائی اور اس واقعہ کو سال کی دوسری اور بڑی جیت قرار دیا۔ ایسا لگا جیسے فتنے کی جڑ اکھڑ گئی۔

اگست میں، میں نے بہت کم دیہاتوں کا دورہ کیا کیوں کہ اب جو کام تھا، وہ زیادہ تر عدالتی اور کاروباری تھا، اور اس میں میری نااہلیت مسلّم تھی۔ کسٹوڈین کے محکمہ سے جھگڑنا تو روز ہی پڑتا تھا۔ کام کرنے والے دوسرے تھے۔ جھگڑنے والی سبھدرا، اور مردولا تھیں اور ہم سب ان کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ ان دونوں کی تو مستقل لڑتے ہی گذرتی تھی۔ ایک دن تو بہت ہی دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

کچھ لوگوں نے جا کر حکومت کے ایک رُکن کو خبر دی کہ فلاں محلہ میں مکانات خالی ہیں۔ مسلمانوں نے بے ایمانی یہ کی ہے کہ بوگس اور فرضی لوگوں کو لا کر اس میں بٹھا دیا ہے، اور سیل نہیں لگانے دیتے ہیں، محکمۂ امداد و بحالی اور محکمۂ کسٹوڈین دونوں نے صلاح کر کے پولیس بھیج دی، کہ ۱۲ بجے رات کو جا کر مکان سر بمہر کر آئیں۔

محلہ کے لوگ بے فکر بیٹھے تھے کہ پولیس پہنچ گئی اور مکانوں سے زبردستی لوگوں کو نکال کر قفل ڈالنے شروع کر دیے۔ مکان کے مالک جو بھی ہوں، لیکن اس میں بسنے والے دیہاتوں اور فساد زدہ محلوں سے بھاگ کر آنے والے غریب مسلمان تھے، بال بچوں سمیت وہ سب گلی میں نکال دیے گئے۔ شانتی دل کے والنیٹر روکتے رہے، کسی نے ان کی نہ سُنی تب انھوں نے مرکزی دفتر کو ٹیلیفون کیا۔ فوراً مردولا جی پہنچیں۔ سبھدرا جی آئیں۔ ادھر سے حکام پہنچے گرم اور جھگڑا شروع ہو گیا۔ تین بجے رات تک ہنگامہ رہا۔ آخر کار حکومت کے ایک رُکن نے موقع واردات کا معائنہ کیا، اور اس غلطی کو اتنی شدت سے محسوس کیا کہ خود قفل کھولے ہاتھ پکڑ پکڑ کر بچوں اور غریبوں کو مکانوں میں پہنچایا اور کھلے دل سے اس صورت پر اظہار افسوس کیا۔

صبح ہوتے لوگ اپنے گھروں میں، پولیس اپنے تھانہ میں، لیڈر اپنے مکانوں میں پہنچے اور معاملہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ غلطی سب چند خود غرضوں کی تھی یا کرپٹ ملازمین سرکار کی۔

دہلی کے حالات اور حکومت کیا بدلی، عوام اور کارکن دونوں کے لیے دنیا بدل گئی۔ سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ دیہاتوں میں تقاوی اور امداد بھی گورنمنٹ سے مل جانے کی امید بندھی۔ پولیس نے چوری کا مال ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنا اور مجرموں کو سزا دینا بھی شروع کر دیا۔ چند دن پہلے نئے افسروں اور پناہ گزینوں میں چاندنی چوک کی پٹریوں سے اسٹال ہٹا دینے پر ذرا ٹکراؤ ہو گیا تھا، اور ستیہ گرہ بھی چل پڑی تھی۔ چاندنی چوک میں پرانی دکانوں کے آگے دو تین قطاریں لکڑی اور ٹاٹ وغیرہ سے بنی ہوئی دکانوں کی ہو گئی تھیں، اور پٹریوں پر اس طرح دوکان لگا کر بیٹھنے والے نسبتاً سستا بیچتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرانے بیوپاری صبح سے شام تک مکھیاں مارتے رہتے۔ گاہک کی شکل بہت ہی کم دکھائی پڑتی۔ جو آتا۔ پہلی قطار والا۔ پھر دوسرا پھر تیسرا روک لیتا، اور مقامی دکاندار حسرت سے دیکھا کرتا۔

دکانوں کی کثرت نے گاہکوں کی تعداد بھی بڑھا دی تھی اور آلو، چھولے بھلّے کھا کھا کر بیسیوں دونے اور کیلا، سنترہ کے چھلکے، سڑک پر بکھرے رہتے تھے، کناٹ سرکس کی گندگی بھی آبادی کی کثرت نے بڑھا دی تھی۔ ایسا کیوں تھا۔ یہ لاہور سے آنے والے، جنھوں نے اس کو دوسرا پیرس بنا رکھا تھا۔ اتنے خوبصورت شہر کے بسنے والے دردمند معزز انسان آخر اتنے کاہل الوجود، غیر مہذب اور پھوہڑ کیسے ہو گئے تھے۔ میں اکثر اس بات کو سوچا کرتی تھی، لیکن جلد ہی اس کی اصل وجہ سمجھ میں آ گئی۔

کیا وہ بے غیرت لڑکیاں تھیں؟

ستمبر میں ایک جھگڑا چکانے کے لیے سبدرا نے مجھے باڑہ ہندو راؤ جانے کے لیے کہا، کہ آپ جا کر ایک پناہ گزیں ماں اور دو جوان بیٹیوں کو سمجھائیے، جو سارے محلہ کے لیے مصیبت بن کر رہ گئی ہیں، لوگ ان سے نالاں ہیں، اور وہ کسی کا کہنا سنتی ہی نہیں ہیں۔

صبح میں نواب گنج پہنچی اور محلہ والوں کی ساری شکایات سننے کے بعد ماں اور بیٹیوں کو بلا بھیجا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ دونوں جواں لڑکیاں، اتنی بے حیا ہیں کہ بلا جھجک نالی پر بیٹھ کر پیشاب کر لیتی ہیں۔ راہ چلتوں کے سامنے لیٹی رہتی ہیں۔ باہر کے نل پر نہاتی ہیں اور لوگوں سے ہنسی مذاق کرتی ہیں۔ ماں اور باپ دونوں موجود ہیں، لیکن وہ ان کو کسی بات سے نہیں روکتے۔

بڈھی عورت اپنی بیٹی کو لے کر آئی، اور میں نے اس سے سوال کیا کہ تعجب ہے آپ

کی موجودگی میں آپ کی لڑکیاں اتنی بے راہ ہیں۔ آخر آپ انھیں منع کیوں نہیں کرتیں۔

میرا اتنا کہنا تھا کہ لڑکی پھوٹ پڑی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ ماں تو تاویلیں کرنے لگیں۔ نہیں، یہ سب جھوٹ ہے۔ سب غلط ہے، ہمیں نکالنے کے لیے بہانہ تراشا گیا ہے، میری لڑکیاں کچھ بھی نہیں کرتیں۔ محلہ والے یونہیں خار کھاتے ہیں!

مگر لڑکی نے روکا: "یہ کچھ نہیں۔ پہلے آپ چل کر ایک نظر ہمارے رہنے کا ٹھکانہ دیکھ لیجیے۔ پھر جو کہیے گا ہمیں منظور ہے"۔

وہ مجھے اپنے گھر لے گئی (اگر اسے گھر کہنا مناسب ہو تو) محلہ کے دوہرے قدیمی پھاٹک کا چھتہ کافی لانبا تھا جس میں دورویہ چار چار کوٹھریوں کے آگے بیٹھنے کے لیے دو بالشت چوڑا لکڑی کا تختہ لگا ہوا تھا، پرانے وقتوں میں یہ کوٹھریاں چوکیداروں کی نشست کے لیے بنائی گئی ہوں گی اور اب ان میں پورے پورے خاندان آباد کیے جا رہے تھے۔

یہ کوٹھری اندر سے دو، سوا دو گز لانبی، اور بمشکل ۴ فٹ چوڑی ہو گی۔ اس ایک کوٹھری کا رقبہ دیکھیے اور اس میں دو جوان لڑکیوں اور دو ماں باپ، چار آدمیوں کے رہن سہن پر غور کیجیے۔ وہ اسی میں سوتے تھے، بیٹھتے تھے، اور دن رات کا بیشتر حصہ اسی میں گزارتے تھے۔ آگے نکلے ہوئے تختہ پر انگیٹھی رکھ کر کھانے کی کوئی چیز پکا لیا کرتے تھے۔ یہ اتنی سی پٹری ان کی رسوئی بھی تھی اور بیٹھنے کی جگہ بھی!

دوسری کوٹھری میں چائے کی دکان تھی۔ سامنے والی کوٹھری میں درزی مشین رکھے ہوئے کپڑے سی رہا تھا۔ غرض سب کوٹھریاں مختلف لوگوں سے آباد تھیں، اور ان سب کے بیچ میں سڑک چل رہی تھی محلہ کے اندر آنے اور باہر جانے والے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا[1]۔

لڑکی نے روتے ہوئے کہا:

آپ نے میرا گھر دیکھ لیا۔ سب حال دیکھ لیا۔ اب بتائیے، اس کوٹھری میں تو ہم چار آدمی لیٹ بھی نہیں سکتے۔ ہم میں سے دو جب پٹری پر بیٹھتے ہیں، تب دو آدمی آرام کرتے ہیں۔ باہر نہ بیٹھیں تو سوئیں کیسے؟ نہانا دھونا سب اس سامنے والے نل پر نہ کریں تو پورا اسال ہونے آتا ہے۔ بدن اب تک سڑ نہ چکا ہوتا۔ آخر نہانے کے لیے ہم کہاں جائیں۔

---

[1] محلہ میں آمدورفت کا صرف یہی ایک راستہ تھا۔

صبح ہونے سے پہلے ضروریات سے فارغ ہو لیتے ہیں، لیکن پھر بھی بندہ بشر ہیں۔ دن میں جب کبھی حاجت ہوتی ہے، تو مجبوراً اسی نالی پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہ دیکھیے، میں اس تختہ پر بیٹھتی ہوں تو کیا دکان پر لوگ میری خاطر سے چائے پینا چھوڑ دیں گے۔ وہ تو ضرور ہی آئیں گے اور میرے ان کے درمیان دو قدم کا بھی فاصلہ نہ ہوگا۔ لوگ کپڑے لینے یا سلوانے درزی کے پاس ضرور ہی آتے ہیں۔ اب اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ میری وجہ سے آتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور!

میں حیران کھڑی ساری کتھا سن رہی تھی، اور سوچ رہی تھی کہ اب کیا کہوں؟ میں نے کہا بیٹی، جب دن میں ضرورت ہوا کرے، کسی کے گھر میں چلی جایا کرو۔ یوں سرِ راہ نالی پر نہ بیٹھا کرو۔ یہ تو شرم کی بات ہے۔ اس پر وہ اور زیادہ بلبلا کر روئی۔

"بھلا کوئی مجھے اپنے گھر میں گھسنے دے گا۔ کہنے کو تو سب برا کہتے ہیں لیکن ایک بار سے دوسری بار کسی کے گھر پانی لینے بھی چلی جاتی ہوں، تو لوگ دھتکار دیتے ہیں"

غریب پناہ گزیں عورت ٹھنڈے سانس بھر کر کہہ رہی تھی:

ہمارا بھی پنجاب میں ایک گھر تھا اور عزت تھی، یہاں آکر ہی ایسے ذلیل بن گئے ہیں۔ کوٹھری میں سارے دن بھلا کون بیٹھ سکتا ہے۔ سب کام اندر ہی اندر کیسے ہو سکتے ہیں۔ لوگوں کا جو دل چاہے کہتے رہیں۔ بات تو جب تھی کہ دکھی سمجھ کر کوئی سہارا کرتا۔ ہمدردی تو خاک الٹے پاؤں ٹکانے کی جگہ بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔

لڑکی نے کہا۔ یہ راستہ دیکھیے۔ اس پر سیکڑوں آدمی گزرتے رہتے ہیں۔ اب وہ چاہے اپنے کام سے آتے ہوں، یا ہمیں دیکھنے، ہم ان کو بلاتے نہیں ہیں، اور ان کو روک بھی نہیں سکتے۔ ہے بھگوان!

بھلا میں ان سے کیا کہہ سکتی تھی۔ ساکت کھڑی ہوئی رام کہانی سنتی رہی محلے کے عزت دار لوگ بھلا اس آہ کو کیوں سنتے۔ انھوں نے اتنا بھی محسوس نہ کیا کہ ماں کی آنکھوں کے سامنے، باپ کی زندگی میں کسی مصیبت زدہ کی ناموس سرِ بازار رسوا ہو رہی ہے۔ کسی کی بھرپور جوانی سرِ راہ لٹ رہی ہے۔ باغ کے دو کھلے ہوئے پھول راہ گیروں کے جوتے تلے مسلے جا رہے ہیں۔ دو خاندانوں کی بنیادیں مسمار ہو رہی ہیں اور صرف ان ماں باپ کی نہیں، عوام کی عزت، قوم کی آبرو اس پھاٹک میں مٹ رہی ہے۔ ہائے افسوس!

دُکھا ہوا دل اور پریشان دماغ لے کر میں واپس آئی، اور سبھدرا سے کہا کہ اگر تم نے ان کو مکان نہ دلوایا تو سمجھ لو گناہ کیا۔

انھوں نے بتایا۔ درخواست جا چکی ہے، میں خود کہہ چکی ہوں مگر کسی طرح کسٹوڈین ان کو مکان نہیں دے رہا ہے۔ اتنے مکانوں کا الاٹمنٹ دوسرے لوگوں کو ہو چکا ہے، اور ان کا نمبر ہی نہیں آتا۔ پندرہ دن آجکل کرتے گزر گئے ہیں ــــ اور یہ سُن کر میرا جی چاہا کہ اِن قانونی ہستیوں کا دل چیر کر اس میں ایک انسان کا دھڑکتا ہوا دل رکھ دوں، تب شاید اِن غریبوں کی آہ اس سے ٹکرا سکے!

کوشش ہوتی رہی اور کہیں ایک مہینہ کے قریب لگ گیا تب جا کر اِن ماں بیٹیوں کو مکان مل سکا!

پھاٹک خالی ہو گیا۔ چائے کی دُکان بدستور چلتی رہی۔ درزی کپڑے سیتا رہا البتہ محلہ والوں کو یہ اطمینان نصیب ہو گیا کہ اب آوارہ[1] لڑکیاں یہاں نہیں ہیں، مگر ایسی لڑکیوں کی تلاش میں آوارہ نوجوان بدستور محلہ اور محلہ سے باہر گشت کرتے رہے۔

البتہ جس بات پر میں اتنے دِنوں سے غور کرتی رہی تھی، وہ ان عورتوں کا، اور پھر کنگزوے کیمپ کا حال دیکھ کر میری سمجھ میں آ گئی۔

کنگزوے کیمپ

ستمبر آخر میں، جب میں سیوادَل[2] کے انچارج کے ساتھ کنگزوے کیمپ گئی، تو شام ہو چکی تھی۔ ہم اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جہاں کپڑا تقسیم ہو رہا تھا، اس جگہ پہنچ گئے۔ لٹھا ململ اور دھاریدار کپڑوں کے تھان پناہ گزینوں میں بانٹے جا رہے تھے۔ کسی کے حصّہ میں ۱۶ گز کسی کو تیس گز، کسی کو ۵ گز بال بچوں سمیت دیا جا رہا تھا۔

میں اس چیز کو چھپانا نہیں چاہتی کہ اس وقت کپڑوں کا اتنا ڈھیر اور تقسیم دیکھ کر مجھے پُرانی تحصیل میں پڑے ہوئے پناہ گزیں مسلم اور محلوں میں بکھرے ہوئے چیتھڑے لگے مسلم مہاجرین یاد آ گئے، اور خیال آیا کہ اتنی کوشش کے باوجود اس ایک سال کے عرصہ میں ایک جوڑہ بھی

---

[1] بے چاری شریف مصیبت زدہ لڑکیاں۔

[2] شادجی

گورنمنٹ سے حاصل نہ کر سکی جوان کے تن ڈھانپ سکوں۔ ان کی درخواستیں ہمارے پاس آئی تھیں لیکن ہم انھیں لے کر کسی افسر کے پاس یا کسی کمیٹی کے پاس نہ جا سکتے تھے۔ خود جتنا بھی چندہ کر سکتے تھے کیا۔ ریلیف کمیٹی سے ہمیں کوئی مدد نہ ملی کیوں کہ وہ صرف ہندو پناہ گزینوں کے لیے تھی۔[1]

جمہوری حکومت مصیبت کے مارے ہوؤں میں یہ فرق کر رہی تھی۔ صرف ایک وزیرِ اعظم کی ذات تھی کہ جب بھی ان کے آگے ہاتھ پھیلایا خالی نہ پلٹے۔ اور انھیں کی بدولت ہم کارکنوں کا منہ اس لائق رہا کہ دوبارہ لوگوں کو دکھا سکیں، اور دنیا کے سامنے دھڑلے سے خم ٹھونک کر اعلان کر سکیں، ہماری سرکار جمہوری ہے غیر متعصب ہے۔ یہاں رحم و انصاف سب کے لیے ہے۔ انھیں کی مدد تھی کہ مسلمان سڑکوں پر مرنے کے بجائے گھروں میں زندہ رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

لیکن یہ خیال تو صرف ایک لمحہ کے لیے آیا۔ ہمیں تو ابھی کیمپ دیکھنا تھا، اور شام ہوئی جا رہی تھی۔ کیمپ کمانڈر نے ہمیں اپنے ساتھ لے کر مختلف حصّہ دکھائے۔ ہم نے سوچا اندھیرا ہو جانے سے ان نئے کوارٹروں کو دیکھ لیں جو بنوائے جا رہے ہیں۔ آٹھ آٹھ سو کی لاگت میں خاصے بھلے مکان جس میں ایک کچن، دو کمرے، ایک برآمدہ تھا، تیار ہو رہے تھے چار سو کی لاگت سے کچے کوارٹر بھی بن رہے تھے، وہ صرف ایک کمرہ، برآمدہ تھا۔ بجلی، پانی لانے کی بھی اسکیم تھی۔

دیکھتے بھالتے ہم خیموں کے پاس بھی گزرے، تیل نہ ملنے کی وجہ سے چراغ نہ جل سکے تھے[2] اور سب طرف اندھیرا گھُپ تھا۔ لوگوں نے راشن، بچّوں کے دودھ اور خیموں کی شکایت کی، اور کہا کہ یہاں مہتمم افسر اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو خیمے دیتے ہیں، اور ہم دو، دو خاندان ایک خیمہ میں گزارہ کر رہے ہیں کیمپ کے ایک کرتا دھرتا نے اپنی فیملی کے لیے دو خیمے چھوڑے ہیں۔ کسی نے دھوپ سے بچنے کے لیے دہرا خیمہ لگا رکھا ہے اور ہم کو بارش میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ چونکہ رات ہو گئی تھی اس لیے دوسرے دن کا وعدہ کر کے ہم کیمپ کمانڈر کے کوارٹر

---

[1] دیہات سے آئے ہوئے دلّی والے اور پنجابی دیہاتی بکثرت شہر کے کونے کھدرے میں سب میں پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ پاکستان گیا تھا، نہ جانے کو سوچتا تھا۔

[2] حالانکہ تیل کی ان دنوں کوئی مشکل نہ تھی۔

میں آگئے اور اس سے ضروری باتیں پوچھیں، حالات معلوم کیے۔ قریب ہی گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہو رہا تھا اور بہت سے لوگ ایک شامیانے نیچے بیٹھے سن رہے تھے۔

چلتے وقت میں پہلے کار میں بیٹھ گئی۔ ساتھیوں کے آنے میں ذرا دیر لگی۔ وہ کیمپ کمانڈر اور دوسرے لوگوں سے کچھ بات کر رہے تھے۔ اتنے میں پشت کی طرف سے کچھ کھسر پھسر کی آواز آئی۔ مڑ کے دیکھتی ہوں تو تین چار سکھ چوروں کی طرح موٹر کے پیچھے کھڑے تھے، مجھے شبہ ہوا کہ کیا بات ہے۔ کچھ نیت بد ہے جو اس طرح چھپے کھڑے ہیں، لیکن کچھ بھی نہ تھا شاید وہ صرف بات کرنا چاہتے تھے، آہستہ آہستہ ان میں سے ایک آگے بڑھا۔ اندر جھانکا اور کہا۔ آپ کی تعریف ؟

لہجہ طنزیہ تھا، مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا "اب میں کیا اپنی تعریف کروں ؟"

اتنے میں دو تین اور آگے بڑھ آئے۔ انھوں نے پھر پوچھا:

"آپ کا شبھ نام ؟"

میں جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ کیمپ کمانڈر اور سیوادَں کے انچارج تیزی سے آکر درمیان میں حائل ہو گئے۔ انھوں نے ناگواری سے کہا:

"آپ کیوں پوچھتے ہیں، ہٹیے راستہ چھوڑ دیجیے" اور جلدی سے دونوں دائیں بائیں ہو کر ان لوگوں کے اِدھر اُدھر ہو گئے۔

میں نے خیال کیا روکنے سے حجت ہو گی اور بات بڑھے گی اس لیے شاہ جی سے کہا۔ کہ نہیں، ان کو آنے دیجیے۔ جو کچھ یہ لوگ پوچھنا چاہتے ہوں، پوچھ لیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس نے پھر نام پوچھا۔ انھوں نے کہا۔ ان کو مسز قدوائی کہتے ہیں۔ کیا کہو گے؟

میں دیکھ رہی تھی کہ وہ لوگ پریشان ہو کر، جلد روانہ ہونا چاہتے تھے لیکن اب کئی سکھ موٹر کے پاس آچکے ہیں، اور کوئی فائدہ نہ ہوگا اگر بات سنے بغیر ہم چلے جائیں گے۔

برہمی کے ساتھ سکھوں نے کہا کہ ہم یہی جاننا چاہتے تھے۔ آپ لوگ آتے ہیں اور کیمپ کے افسران کے پاس بیٹھ کر واپس چلے جاتے ہیں، ہماری بات بھی سننا گوارا نہیں ہوتا۔ ہمارا حال دیکھیے۔ ہم سے پوچھیے تو ہم آپ کو بتائیں کہ کیا دکھ ہے۔

برہمی بڑھ رہی تھی۔ وہ بہت کچھ کہتا رہا۔ جو سب مجھے یاد نہیں، رات کا وقت۔ روشنی ندارد اور بگڑے دل لوگ۔ ہمارے ساتھی ٹھہرنا کیسا، فوراً روانہ ہو جانا چاہتے تھے اور اندر ہی اندر کچھ دہشت تو مجھے بھی ہو رہی تھی لیکن پھر بھی ان کو جواب تو دینا ہی تھا۔

میں نے نرمی کے ساتھ کہا کہ میں آئی تو تھی اسی ارادے سے تھی کہ آپ کا حال دیکھوں گی۔ پریشانی اور دکھ آپ کے منہ سے سنوں گی۔ لیکن شام ہوگئی ہے پرسوں پھر آؤں گی۔ اور پہلے آپ کی طرف آکر آپ کی بات سنوں گی تب دوسری جگہ جاؤں گی۔ میرا تو یہاں آنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ جو کچھ ہو سکے آپ کی مدد کروں۔ خدمت کروں۔

میرے جواب نے ان کو کچھ ٹھنڈا کیا۔ کچھ دیر اور بات چیت کر کے ہم لوگ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں شاہ نے پوچھا:

"آپا جی اس وقت جب یہ لوگ چھپ کر کھڑے ہوئے تھے آپ کے جی میں کیا خیال آیا تھا؟"

میں نے کہا۔ کوئی خاص خیال نہیں آیا مگر ذرا اندیشہ ہوا تھا کہ کوئی جھگڑا نہ ہونے لگے۔

کہنے لگے۔ نہیں اب کسی میں یہ ہمت نہیں ہے۔ خطرہ کی کوئی بات نہ تھی۔ کہنے کو تو انھوں نے یہ کہا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ڈرے وہ بھی تھے اور اسی لیے کیمپ کمانڈر اور خود ان لوگوں کے داہنے بائیں ہو لیے تھے۔ چلتے وقت کیمپ کمانڈر نے کچھ کان میں جھک کر کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید منع کر رہے ہیں۔ پرسوں میں نہ آؤں اس لیے میں نے کہہ دیا پرسوں ضرور آؤں گی اور اس آدمی سے بھی ضرور ملوں گی، جو مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں وعدہ کر چکی ہوں۔

تیسرے دن گئی اور کئی گھنٹہ ٹھیری۔ سارے وقت کہتی رہی کہ ادھر چلو جدھر اس سکھ نے بتایا تھا کہ سکھوں کے خیمے لگے ہوئے ہیں مگر ہمراہیوں میں سے کسی نے نہ مانا ٹالتے ہی رہے اور اِدھر اُدھر پھراتے رہے۔ خود راستہ نہ جانتی تھی جو چلی جاتی۔ اس بیچارے بگڑے دل سے ملاقات نہ ہو سکی، پتہ نہیں وہ کیا کہتا؟ کیا کہنا چاہتا تھا۔

پھٹی ہوئی آنکھیں۔ پریشان بال اور لاغر جسم لیے ہوئے ایک ضعیف جوڑا خیمہ میں لیٹا ہوا تھا۔ عورت کی عمر ۶۵ کی ہوگی، تو مرد کی ۷۰ برس کی دونوں بڈھے، کمزور۔ مریض، زور زور سے کھانس رہے تھے، اپنی حسرت زدہ چندھیائی ہوئی آنکھیں کھول کر انھوں نے ہمیں دیکھا یہ بڈھے میاں بیوی جنھوں نے اپنی جوانی پنجاب کے سرسبز و شاداب کھیتوں میں گزاری ہوگی، بڑھاپا چند چیتھڑے اوڑھ کر ایسے خیمہ میں گزار رہے تھے، جیسے میں نے چھوا، تو نکڑا ہاتھ میں چلا آیا۔ ان کے بچے کیا ہوئے؟ انھیں اب کون پکا کر کھلاتا ہوگا؟ اب کس چیز کو دیکھ کر

ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہوں گی۔ آہ شاید سکون کی موت بھی اب ان کی قسمت میں نہیں ہے۔
میں یہ سب سوچتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

دوسرے خیمے میں بہت سے بچّے تھے اور شاید ان میں دو تین خاندان بھی رہ رہے تھے۔
مائیں ہمیں دیکھ کر کہنے لگیں کہ:

ان بچوں کو دودھ بھی تو نہیں ملتا۔ سرکار سے ٹین آتے ہیں، مگر وہ نہ جانے کس کے پیٹ میں چلے جاتے ہیں۔ انھیں دودھ کے نام سے جو چیز مل رہی ہے وہ ہم ابھی تم کو دکھاتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ میلا سا آٹا اُٹھا لائیں۔ اسے ایک کٹورے میں گھول کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ پاؤڈر کی تہہ نیچے جم گئی تھی اور پانی اوپر تھا۔ کسی ایسی چیز کا پاؤڈر تھا جو پانی میں حل نہ ہو سکی۔ میں نے ایک لفافہ میں تھوڑا سا خشک پاؤڈر نمونتاً لے لیا۔

یہ نمونہ لے کر آگے بڑھی تو دوسرے سرے پر ایک عورت روٹی لے کر دوڑی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ روٹی مٹی کی ہے یا کس چیز کی، شاید ہر قسم کا اناج ملا کر دیا گیا تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ اناج کے ہم وزن مٹی بھی ملی ہوئی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ مارچ میں جب میں گڑگانوہ میں الور کے آٹھ ہزار مسلم پناہ گزینوں کا کیمپ دیکھنے گئی ہوں، جو پاکستان جانے والی گاڑی کے انتظار میں پڑے ہوئے تھے، اور ذرا ذرا سی چھت گیری ان میں سے بہت سوں کو عنایت کر دی گئی تھیں، تو وہاں بھی عورتوں نے مجھے ایسی ہی روٹی دکھائی تھی اور مسلم کارکنوں نے کہا تھا کہ مسلمانوں کو روٹی تک اناج کی نہیں دی جارہی ہے۔ خود میرے دل میں بھی خیال آیا تھا کہ شاید مسلمانوں کے کے ساتھ خاص طور سے یہ دشمنی کی جارہی ہے لیکن وہی روٹی یہاں ہندو رفیوجی بھی کھا رہے تھے۔

لیکن یہ کیمپ تو ہندوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے کارکن ہندو تھے۔ امداد کرنے والے ہندو تھے یہاں کا حال دیکھ کر یقین ہو گیا کہ ہوس اور خود غرضی اپنا پرایا نہیں دیکھتی۔ وہ ذاتی فائدہ کے لئے اپنوں کا بھی گلا گھونٹ سکتی ہے۔

بیواؤں کا ایک غول ہمارے پیچھے لگ گیا کہ آخر گزارہ کی کوئی صورت کراؤ گی۔ ایک مشین ہمیں دلاؤ۔ میں نے کہا، بھئی لکھ کر دیدو۔ لیکن شاہ جی نے ٹوکا۔ نہیں یہ درخواست

لہ دودھ آٹے کی طرح تھا۔

سینٹرل ریلیف کمیٹی کو جا کر دو۔ وہ لوگ مشین دے رہے ہیں، اور بیواؤں کی امداد کر رہے ہیں۔ ہم اس میں کچھ نہیں کر سکتے[1]۔

ایک میدان میں اسکاؤٹ ماسٹر بچوں کو ڈریل کرا رہے تھے، سب نے فوجی سلام کیے، میں نے کہا:

ذرا خیال رکھنا کہیں سنگھ کی ہوا نہ لگ جائے؟

شاہ جی ہنسے، نہیں، اس سے تو اطمینان رکھیے۔ یہ تو اسکول کے بچّے ہیں اور یہاں بال نکیتن کے نام سے بھی ایک بہترین اسکول چل رہا ہے، وہ دیکھنے کے لائق ہے۔

دوسری لائن میں پھر ہمیں دودھ کا ایک نمونہ ملا اور اس پاؤڈر سے پانی میں تو دودھ جیسی سفیدی آئی مگر نیچے مٹّی کی تہہ سی جم گئی۔ آٹے اور دودھ کے نمونے لے کر ہم نے خیموں کی جانچ کی اور واقعی دو خیمہ ایک خاندان کے پاس دیکھے اور بیس آدمی ایک خیمہ میں دیکھنے کو ملے، اور ایسے لوگ بھی دیکھے جن کے پاس کوئی خیمہ نہ تھا۔ اپنی تحقیقات مکمل کرنے کے بعد ہم کو بال نکیتن دیکھنا تھا۔ لیکن آج پھر شام ہو گئی، اور واپس آنا پڑا۔

ساری رپورٹ ہم نے شانتی دل کو دے دی۔ دودھ کے نمونے بھی دیے، کہ کسی کیمسٹ کو دکھا لیے جائیں، تاکہ پتہ چلے کیا کیا چیزیں اس میں ملی ہوئی ہیں۔ بچّے بکثرت بیمار رہو رہے تھے، اور یہ دودھ پی کر تقریباً ہر کو دست آنے شروع ہو جاتے تھے۔ میرا اپنا اندازہ تھا کہ ایک پاؤڈر میں تو سنگھاڑہ کا آٹا اور دودھ کا پاؤڈر تھا۔ دوسرے میں سوڈا آٹا اور کسی دوسری چیز کی آمیزش تھی۔

اس کیمپ کے بے شمار لوگ چاندنی چوک وغیرہ میں فٹ پاتھ پر دوکان لگاتے تھے۔ بہت سے سرکاری ملازم تھے۔ پولیس کے محکمہ میں تھے۔ ٹھیکیداری کرتے تھے، بڑھئی وغیرہ تھے اور اب یہ سب تھوڑا بہت کما لیتے تھے۔ اس کے علاوہ بے شمار بیوہ عورتیں تھیں۔ بڈھے، لاوارث بچّے اور غریب کسان لوگ تھے۔ جن کا واحد سہارا سرکار کے دیے ہوئے راشن پر تھا۔ راشن مفت سب کو ملتا تھا۔ بہت ہی کم لوگ تھے جو راشن نہیں لیتے تھے۔ لیکن یہاں بھی حسب معمول غریب لوگ بھوکے مر رہے تھے اور بڑے یا امیر لوگ مزے اڑاتے تھے، کوئی بیس گز کپڑا پا جاتا اور کسی کی ننگے پھرنے کی نوبت تھی۔

---

[1] درخواستیں بعد کو گذار دی گئیں۔ اور انھیں مشین ملنے لگیں۔

ملک بھر میں دولت کی صحیح تقسیم کرنے اور سرمایہ کو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے صرف کرنے کا خواب دیکھنے والے ایک کیمپ تک میں غلطیاں کر رہے تھے۔

میں نے اپنے اوپر لعنتیں کی کہ ابھی پرسوں میرے دل میں خیال آیا تھا کہ ہندو پناہ گزینوں کی فکر ہے، اور مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امیروں کے لیے سب کچھ ہے، غریبوں کے لیے کچھ نہیں ہے، کیمپ کے غربا راسی سطح پر تھے جس سطح پر گیلوں اور مسلم کیمپ کے پناہ گزیں غربا رہے تھے۔

آج میں نے چند غلیظ بھیانک چہرہ بھی دیکھے تھے جن کی بے خواب آنکھوں کی سرخی خوفناک جرائم مجروح ضمیر اور دماغی ہیجان کی ترجمانی کر رہی تھی۔ ان میں چند مایوس چہرہ بھی تھے، جن کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ماضی کی داستانیں دہرا رہی تھیں۔ کچھ نیم مردہ بچے بھی مجھے ملے تھے جن کی معصومیت بھوک اور انسانی بربریت کا شکار بن رہی تھی۔

آج میں نے مغربی پنجاب کے اسلامی اخلاق و شجاعت، اور پنجابیوں کی بہادر قوم دونوں کا نمونہ دیکھا تھا، وہ بہادر قوم جسے زمانہ کا بے رحم ہاتھ آہستہ آہستہ گڑھے میں گرا رہا تھا۔

ماضی کا شیرازہ بکھر گیا ہے، بُرا ہو تقدیر کی ستم ظریفی کا جس نے مجھے اس کے سمیٹنے کے لیے پیدا کیا۔

(ہملٹ از شکسپیر)

لوگوں نے اپنی گمشدہ لڑکیوں کا ذکر کیا۔ اپنے بچھڑے اعزہ کی کہانی سنائی۔ اپنی دولت اور املاک کا رونا رویا اور سب سے زیادہ کیمپ کی زندگی سے عاجز آنے کا ماجرا بیان کیا۔

یہ خیمے بظاہر تو پاس پاس لگے ہوئے تھے اور دیکھنے میں تو سارا کیمپ صرف شرنارتھیوں کا تھا۔ آنے والے صرف پاکستان کے باشندہ تھے، مگر ذرا غور کیجیے کیا اس کے اندر بسنے والے اتنے ہی ایک تھے؟ ایسا نہ تھا۔ آپ کسی ملتانی کے خیمہ میں کھڑے ہوئے ہیں۔ اس سے ملا ہوا دوسرا خیمہ راولپنڈی والے کا ہے اور وہ سامنے والا خیمہ ملتان بنوں سے لٹ پٹ کر آیا ہے۔ چوتھا خیمہ سندھی کا ہے لیکن سندھی کے پڑوس میں سرگودھا یا بہاول پور کا خاندان آباد ہے۔ پست پر کوئٹہ والا کپڑے دھو رہا ہے۔ ان سب کی شکلیں رہن سہن عادات و اطوار اور اکثر ضروریاتِ زندگی تک میں یکسانیت نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے کے رشتہ دار، پڑوسی دوست کچھ بھی تو نہیں ہیں، ان میں اکثر ایک دوسرے کی بولی بھی نہیں سمجھ پاتے۔ اور پھر کارکن ہیں جو اور بھی پھوٹ بڑھا رہے ہیں۔ پنجابی کام کرنے والے اپنے دیس والے کا پاس کرتے ہیں، سندھی اپنے ہم وطنوں

کا ساتھی ہے۔ فرانٹیئر والا پنجابی کی تحقیر کرتا ہے، اور بلوچستانی سندھی کی!

جب یہ سب اپنے گھروں میں ہوں گے تو بہت سے گناہ، جرم، برائیاں، سماج، برادری یا مذہب کے ڈر سے نہ کرتے ہوں گے۔ ان میں سب اپنے قانون کا پاس و ادب ملحوظ رکھتے ہوں گے۔ لیکن آج وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوا میں اڑ رہے ہیں۔

سندھی کیوں اس پنجابی پڑوسی کی شرم کرے جس کو وہ جانتا پہچانتا تک نہیں، اور پنجابی کس لیے فرانٹیئر والے کا لحاظ کرے۔ کچھ اس کا رشتہ دار تو ہے نہیں۔ راولپنڈی کی لڑکی کے کون سے رشتہ دار یہاں بیٹھے ہیں جن کے طعنوں اور برادری میں نکو بننے کے ڈر سے وہ بلوچستانی نوجوان سے آنکھیں نہ لڑائے۔ آخر چالیس پچاس سال کا سکھ کب تک عورت کا انتظار کرے، وہ ان نوجوان لڑکیوں میں سے کیوں نہ ایک چھانٹ لے جو اپنے اعزہ سے بچھڑ کر، شاخ سے ٹپکے ہوئے پھل کی طرح زمین پر گری پڑی ہیں۔ کچھ اپنا گاؤں تو ہے نہیں جو خالصہ جی پنچایت کر کے اس کا بائیکاٹ کر دیں گے!

ضرورت سے مجبور ہو کر ملتانی نے اگر مالدار سندھی کی جیب کتر لی۔ یا خیمہ کی ڈوری کاٹ کر ایک صندوق اڑا لیا تو پناہ گزینوں پر شبہہ کرنے کون آتے گا۔ اور اس مصیبت میں چند دن آرام سے کٹ جائیں گے۔ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کو اس انتہائی تکلیف کے وقت سوچ بھی نہیں سکتے تھے، اور اسی لیے ان میں مروت شرم اور رواداری باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس وقت تو انھیں صرف اپنی، اور اپنے بال بچوں کی فکر تھی۔

یہ سماج۔ یہ مذہب۔ یہ برادری اور یہ قانون جسے ہم ہمیشہ کو ستے رہتے ہیں جس سے اپنا پیچھا چھڑانے کی جوانی میں بڑی حسرت ہوا کرتی ہے، اور جس کی تحقیر کرنے۔ مذاق اڑانے اور توڑنے میں ہم کو بہت لطف آتا ہے۔ بڑھاپے میں بھی اس کے بندھن سے گھبرا کر ہم اکثر رو دیتے ہیں۔ بظاہر یہ ہمیں کتنا ہی برا کیوں نہ نظر آتا ہو، مگر چند دن اس کے شکنجے سے چھوٹ کر ہم سب حیوانیت کی سطح پر پہنچ گئے تھے۔

تینوں قومیں جب اس بھاری بوجھ کے نیچے دبی ہوئی تھیں، تو وہ تعلیم یافتہ، عزت دار، دولت مند، اور بہادر تھیں آج وہی تینوں معزز قومیں بے حیا، جرائم پیشہ اور وحشی بن گئی ہیں۔ میں پاکستان نہیں گئی لیکن چار ماہ بعد مقبرہ میں مسلم پناہ گزینوں کا اخلاقی زوال ہوتے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے، اور آج ان لوگوں کی یہ گراوٹ دیکھ بھی لرز اٹھی۔ اور پھر یہ لٹی ہوئی عصمتیں، خانماں برباد کنبے، کچھ مسلمان بھائیوں کے اخلاق و شجاعت کا

اعلیٰ نمونہ تو نہ تھے۔ یہاں تو ہر خیمہ میں مسلم پنجابیوں کی بربریت ناچ رہی تھی۔ ہر جگہ انسانیت سسک رہی تھی اور انسان مر رہا تھا۔ ہندوستان پاکستان دونوں میں۔

اور یہ سب دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ انسان اپنی جماعتی زندگی ہی میں انسان رہ سکتا ہے۔ اس کے کاندھے پر اگر یہ جوا نہ ہو، تو در و دیوار سے سینگ ٹکراتا پھرے اور درندگی میں جانوروں کو بھی مات کر دے۔

ابھی تک یہی طے نہ ہو سکا تھا کہ ان کو کس طرح بسایا جائے؟ کچھ لوگوں کا خیال تھا ضلع ضلع کے باشندہ علیحدہ علیحدہ رکھے جائیں۔ کچھ کہتے تھے نہیں صوبہ اور ریاست کا حساب رکھا جائے۔ کسی کا خیال تھا، ایسا کرنے سے صوبائی تعصب بڑھے گا، اور نئی نئی قومیں پیدا ہو جائیں گی اس لیے سب کو منتشر کر دینا ٹھیک ہوگا۔

لوگ ڈرتے تھے کہ سکھوں یا فرانٹیر والوں کی آبادیاں الگ الگ بسیں تو پھر سر پھٹول ہوگی۔ لیکن اگر وہ منتشر کئے جاتے تھے تو یہ حال تھا، جو آپ اوپر دیکھ چکے ہیں اور اکٹھے ہوتے تھے تو اجتماعی طور پر اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرتے تھے اور حقوق جن کا ابھی کوئی تعین بھی نہ ہو سکا تھا۔

میں تو اندرونی طور پر یہ حال دیکھ کر صوبہ اور ضلع کے لوگوں کو اکٹھا رکھنے کی اتنی زیادہ قائل ہو گئی تھی کہ آج اس کے سوا دوسری بات سوچنے کو بھی جی نہیں چاہتا اور جب مجھے معلوم ہوا ہزارہ کے ایک جگہ اور فرانٹیر کے فرید آباد میں اور بھاولپور کے راجپورہ میں بسائے جا رہے ہیں، تو مجھے بہت ہی خوشی ہوئی کہ چلو اس جنگلی زندگی کی عادت تو ان کو نہ پڑے گی۔ اب پھر وہ انسان بن جائیں گے۔ اور مجھے یقین ہے چند سال بعد یہ ہندوستان کے مضبوط بازو بن کر رہیں گے۔ چاہے اس میں جتنے برس لگ جائیں البتہ اخلاقی سدھار ضروری ہے۔ اس کی طرف پہلی توجہ کی ضرورت ہے۔

کیونکہ میرا اپنا خیال ہے۔ پنجاب کی سوسائٹی کا رنگ ہی یہ تھا۔ شاید وہاں کوئی اخلاقی معیار تھا ہی نہیں۔ اگر تھا تو برائے نام ایسا کہ عوام تک وہ پہنچتا نہ تھا، اس چیز میں ہندو مسلمان کو نہ سوچیے۔ سوسائٹی ہر مذہب و ملت کے باشندوں سے مل کر بنتی ہے۔ وہ سب ایک جیسے ہوں گے، اور ایک جیسا برتاؤ ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہوں گے۔ وہ چیزیں جو ہماری سوسائٹی میں بد تہذیبی سمجھی جاتی ہیں، ان کے یہاں معمولی باتیں تھیں، اور یہ جو کچھ ہوا ہے۔ بہت کچھ اسی کا نتیجہ تھا۔ عوام کے کیرکٹر گرتے ہی گئے اور آخر اس

سطح پر پہنچ گئے۔ اس ایک سال میں تو حالت اتنی بدتر نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اور ان کے پڑوسی دونوں اگر سوچیں، تو محسوس ہو گا کہ وہ دوستی جس کا وہ فخریہ ذکر کیا کرتے تھے، وہ تعلیم جسے انھوں نے صوبہ بھر میں عام کر دیا تھا، کیا اس کی بنیادیں ٹھوس تھیں۔ گہری تھیں۔ انسانیت کے معیاروں پر پوری اترتی تھیں۔ آخر کیوں آپس میں ان کے اتنے دن پٹی۔ دوستی ہوئی اور پھر آناً فاناً اس کی یہ درگت بنی کہ نہ مذہب کا پاس باقی رہ گیا، نہ انسانیت کی لاج۔ ضرور کہیں سے اس عمارت میں کوئی اینٹ لگنے سے رہ گئی ہوگی۔ کوئی خامی تو ضرور رہی ہوگی۔ ڈھونڈا جائے تو پتہ چلے۔ ضرورت ہے کہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھ لیا جائے۔

20

وحشت و بربریت

میں نے گوڑگانوں کا مسلم رفیوجی کیمپ دیکھا تھا۔ اس میں الور کے آٹھ ہزار پناہ گزیں پڑے ہوئے تھے اور جامع مسجد کے سامنے پٹیالہ، نابھ وغیرہ کے لوگوں کو بھی دیکھا تھا۔ ان کے پاس صرف خوفناک کہانیاں تھیں۔ ان سب کی اس وقت یہ حالت تھی، جیسے شکاریوں نے جنگل میں ہانکا کرایا ہو، اور سب جانور گھیر کر مار لیے گئے ہوں۔ بہ مشکل یہ چند نکل بھاگے ہوں۔ شکاری مہاراجے۔ ان کے درندے فوجی اور پاگل عوام نے ماؤں کی گود سے بچے چھین کر نیزوں پر اٹھا لیے۔ والدین کے سامنے بیٹیوں کی بے حرمتی کی۔ بیوی کے روبرو اس کے شوہر کو قتل کیا، اور بربریت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ شاہی خاندان کے افراد۔ وزرار۔ افسرانِ پولیس و فوج کی ذمہ دار ہستیاں، ان میں سے بہتوں کے دامن داغدار ہیں، اور نہ جانے کس کس کی پشت پر مہاراجوں کا ہاتھ ہے ؎

رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

لیکن یہ سب داستانیں سنانے والوں کے پاس کوئی ایسی کہانی نہ تھی، ایک بھی ایسا واقعہ نہ تھا جو آدمی نے آدمیت کے لیے کیا ہو۔ صرف ایک بڈھے کے چار بچوں کی چھٹی میں نے دیکھی جو اس کے برہمن دوست کے پاس امانت تھے اور دوست بچوں سے لکھوا رہا تھا کہ:

"آپ کسی طرح آ کر لے جاؤ۔ یہاں سارا گاؤں پیچھے پڑا ہے۔ مار ڈالنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں، اور لڑکیاں سیانی ہو رہی ہیں اس لیے ان کی شادیوں کی زبردستی ہے۔"

ریلیف اینڈ ویلفیر کی کوششوں سے بڈھا سنگرور جا کر اپنے بچوں کو لا سکا اور سکون حاصل کر سکا! ...... اسٹیٹ سے آنے والی ایک لڑکی نے مجھے بتایا کہ:

ہنگامہ سے ایک روز پہلے ہمارے مہاراج نے خود تقریر کی اور کہا کہ

> تم لوگ بالکل نہ گھبراؤ۔ ہم سب کی عزت۔ جان۔ مال کی حفاظت کریں گے بشرطیکہ اپنے ہتھیار چپکے سے حوالے کردو۔ اور لوگوں نے چھریاں تک مارے وفاداری کے آگے رکھ دیں۔

لیکن دوسرے دن جب فوجیوں اور عوام کے گروہ قتلِ عام کرتے گھوم رہے تھے، تو مہاراج راجدھانی سے باہر جاچکے تھے۔ لوگ گھروں میں چھپے بیٹھے تھے، اور ہتھیار بند مجمع اندر گھس کر بے دریغ چن چن کر صفایا کر رہا تھا۔ روکنے والا کوئی سرے سے موجود ہی نہ تھا اس لیے کئی دن قتل وغارت گری کا سلسلہ جاری رہا۔

پاکستان نے انڈین گورنمنٹ پر نسل کشی کی کوشش کا الزام لگایا ہے، لیکن جہاں تک دہلی یا ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا سوال ہے یہ بالکل غلط ہے، یہاں تو خود باپو تھے، اور دلی کی سڑکوں پر تو جواہر لال جی بنفسِ نفیس دکھیاروں کی مدد کو نکل پڑتے تھے، ان کے بہت سے ساتھی، اور قوم پرست گروہ حتیٰ کہ پرائم منسٹر کی اکلوتی لڑکی[1] تک مصیبت زدوں کی امداد، اور ان کو حفاظت کی جگہ پہنچانے یا خطرہ سے نکالنے کا بندوبست کر رہے تھے۔ یہاں روکنے والے تھے۔ بُرا کہنے والے تھے۔ اور باپو! اُن کی پکار تو دُنیا سُن رہی تھی۔

مگر جہاں تک ریاستوں کا سوال ہے، اس میں کوئی شک نہیں، وہاں ضرور نسل کشی کی کوشش ہوئی۔ خاندان کے تمام مردوں کو قتل کرنے کے بعد، اگر چند ماہ کا لڑکا نظر آیا تو حتی الامکان اسے بھی زندہ نہیں چھوڑا۔ البتہ جوان لڑکیاں ضرور زندہ رکھی جاتی تھیں۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ساٹھ ساٹھ برس کے رنڈوے سے بدتر کنوارے آخر بیاہے کیسے جاتے، اور بردہ فروشی کی قدیم رسم پھر کیسے زندہ کی جاتی؟

یہ سب کچھ اپنے آپ ہو رہا تھا، یا پردہ کے پیچھے کوئی ہاتھ تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ایک دوسرے پر بھروسہ اس حد تک اُٹھ چکا تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک رکن[2] نے خود باپو سے کہا:

> "مجھے مسلمانوں پر بالکل وشواس نہیں رہ گیا ہے۔"

---

[1] اندرا گاندھی

[2] سردار پٹیل

اور ایک روز جب دلّی کی ذمہ دار ہستیاں باپوؔ کے سامنے فرقہ وارانہ فساد، اور امن قائم کرنے کی تجویزوں پر غور و خوض کر کے فارغ ہوئیں اور باپو کے اثر و رعب نے ان سے منوا لیا کہ امن قائم کرنے کی ضرورت ہے تو ان میں سے ایک جرنلسٹ اور کانگریسی نے باہر نکل کر کہا کہ:

"تم لوگ بیکار امن قائم کرنے کے لیے جان دے رہے ہو۔ یہ بھی تو دیکھو کہ پاکستان میں ہندوؤں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ وہاں کا حال نہیں دیکھ رہے ہو۔ ان کے لیے بھی تو کچھ کرو۔ یہاں کی بڑی فکر ہے۔"

اور پاکستان میں اس وقت جو ہو رہا تھا، اس کا کسی کو صاف پتہ چلتا ہی نہ تھا۔ پاکستان سے آنے والے مسلمان کہتے تھے۔ وہاں سب امن و امان ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ ہندو رہ رہے ہیں، کاروبار کر رہے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقت ایک روز ظاہر ہو گئی جب ایک مشہور انقلابی لیڈر کے خسر اپنے کچھ ضروری کاغذات اور ضروری چیزیں لینے گھر والوں کی شدید مخالفت کے باوجود پاکستان چلے گئے۔ لاہور میں ان کا مکان ابھی خالی تھا۔ ٹوٹے پھوٹے مکان سے انھوں نے اپنی چند ضروری چیزیں تلاش کر کے نکالیں لیکن مجمع نے مکان گھیر لیا اور ان کو گولی مار دی گئی!

اسی حالت میں دو ایک دن بعد ہوائی جہاز سے ہندوستان لائے گئے اور یہاں آپریشن کر کے گولی نکالی گئی۔ سخت جان تھے بچ گئے۔

شاید جون میں ایک روز میں باڑہ کے اسکول گئی، تو لڑکوں سے ملنے ان کے دو مسلمان دوست آئے ہوئے تھے۔ دوستوں نے بتایا کہ وہ ابھی پرسوں پاکستان سے واپس آگئے ہیں۔ گئے تو اسی ارادہ سے تھے کہ مستقل سکونت اختیار کر لیں گے لیکن وہاں کا حال دیکھ کر اب ان سے نہیں رہا جاتا۔

انھوں نے ایک صاحب کا نام لیا جو دلّی کے رہنے والے تھے، اور کراچی میں دوسرے مہاجرین کی طرح ایک مکان پر قابض ہو گئے تھے۔ اکثر لوگ انھیں کہتے مکان میں ہم کو بھی حصے دار بنا لو، لیکن وہ بھلا کاہے کو راضی ہوتے، وہ پہلے آئے تھے، اس لیے ان کا حق زیادہ تھا۔

ایک روز دو جنٹلمین کار پر چڑھ کر ان کے ہاں آئے اور بتایا کہ وہ حکومت پاکستان کے افسر ہیں ان کو بھیجا گیا ہے کہ آپ کو دوسرا مکان دیدیں اور یہ خالی کرا لیں۔ مہاجر نے

کہا، کہ اگر دوسرا ل جائے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ یہ طے ہوا کہ اسی وقت مکان دیکھ لیا جائے اور مہاجر اپنی دو بیٹیوں، اور بیوی کو چھوڑ کر مکان دیکھنے ان کے ساتھ چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر کار واپس آئی کہ مکان مہاجر نے دیکھ لیا ہے اور تم تینوں کو بھی بلایا ہے کہ اگر پسند کر لو۔ عورتیں سوار ہو کر چلی گئیں۔ مہاجر مکان دیکھ بھال کر پلٹے، تو یہاں سب غائب۔ بیوی تو واپس مل گئیں، لیکن بیٹیاں نہ مل سکیں۔

مہاجر بے چارہ اپنی تقدیر کو رو رہا ہے کہ وہ کیوں ہندوستان سے آیا۔ وہیں مر جاتا تو اچھا تھا۔ اخلاقی گراوٹ نے دونوں طرف شہری زندگی کو امن وسکون سے محروم کر دیا تھا۔ یہاں رفیوجی روتے تھے، وہاں مہاجر۔ اتنا موقع نہیں ہے کہ میں سارے واقعات دُہراؤں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عوام کی اخلاقی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ وہ اپنوں کے ساتھ بھی وہی کر رہے تھے جو غیروں کے ساتھ کر چکے تھے۔ اور دوستوں کے ساتھ بھی ان کا وہی برتاؤ تھا جو دُشمنوں سے۔

اس میں کوئی شک نہیں، ان کے اندر یہ بربریت اور بے حیائی اور عدم رواداری صرف اس لیے پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اپنے دوست اور پڑوسیوں کے زخم خوردہ تھے ؎

من از بیگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن ہرچہ کرد آں آشناں کرد

یہاں کے شرنارتھیوں کا بھی یہی حال تھا اور وہاں کے مہاجرین کا بھی یہی۔

سوشل سروس کرنے والے لڑکوں میں سے ایک لڑکا کئی ماہ سے ہمارے ساتھ کام کر رہا تھا۔ مجھے دوسرے لڑکوں نے بتایا تھا کہ اس کا باپ ہنگامہ میں کام آچکا ہے اور پاکستان میں اپنی بڑی جائداد چھوڑ کر صرف دو بہنوں کو کاندھے پر بٹھا کر یہ غریب بھاگ سکا ہے۔ بدقت ندی پار کی اور ہندوستان پہنچ کر بے سروسامانی کی زندگی گزار رہا ہے۔ اب اس کا کوئی نہیں ہے جو مددگار ہو!

یہ اٹھارہ سال کا لڑکا بظاہر بے حد محنتی اور سلجھے ہوئے خیالات کا تھا۔ ایک مہینہ دیہات میں بھی بحیثیت والنٹیر سبھدرا کے ساتھ مقیم رہا۔ دو ایک ہفتہ اسکول میں بھی امداد دی۔ ایک مسلمان لڑکے سے اس کی گہری دوستی تھی۔ دونوں ساتھ مختلف کاموں میں شریک رہتے۔

اس نے مجھے بتایا کہ اب کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے، اور جن رشتہ دار کے گھر

تھا انھوں نے بھی نکال دیا ہے۔ یہ سُن کر ہم نے اُس کی مالی امداد کا بھی بندوبست کرا دیا۔ جب نظام الدین میں شانتی دل کا آفس کھولا تو تین ہفتے تک انھیں دونوں لڑکوں کے سپُرد رہا اور دو جگہ ٹیوشن کا انتظام بھی ہو گیا۔ رہنے کے لیے اس کے پاس مکان بھی نہیں تھا۔ کھانے اور رہنے کا انتظام بھی کر دیا گیا۔

لیکن ایک روز میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب ایک عورت نے آکر کہا کہ میں اس کی ماں ہوں۔ کئی ہفتہ سے اس سے کہہ رہی تھی کہ مجھے اپنی آپا جی کے پاس لے چل، تو میں تیرے لیے کہوں کہ مستقل کام دلا دیں مگر ٹال مٹول کر رہا تھا۔ ناچار پوچھتی پاچھتی میں خود چلی آئی۔

میں نے تعجب سے سوال کیا۔ "آپ ماں ہیں؟ آخر اس لڑکے نے مجھ سے ذکر کیوں نہ کیا۔ آپ کس کے گھر رہتی ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "اپنے بھائی کے ساتھ ہیں، میرے شوہر اور دوسرے چھوٹے بچّے سب وہیں رہتے ہیں۔ کیا کریں بہن گزارہ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ بھائی نوکر ہے، اُسی کے پاس رہ رہی ہوں۔ لائل پور میں ہمارے مربعے ہیں۔ اس کا بھی کچھ نہیں ملتا۔ بس بہن جی آپ لڑکے کو تو کسی کام سے لگا ہی دیجیے۔ میں روز کہتی تھی کہ آپا جی سے کہہ، وہ نوکری دلا دیں گی، مگر وہ سنتا ہی نہیں۔ اب اس کا پڑھانا میرے بس کی بات نہیں۔ دسویں کے بعد پڑھانے کے لیے تو بڑے پیسہ کی ضرورت ہے۔ آپ اس کو نوکری دلوا دو۔ میرا بھائی بھی یہی کہتا ہے لیکن وہ غصہ ہو جاتا ہے۔"

وہ کہتی رہی اور میں سُنتی رہی اور سوچتی رہی اٹھارہ سال کا لڑکا اور اتنا بڑا دھوکا۔ باپ فساد میں مارا گیا۔ دو چھوٹی بہنوں کی جان بچا کر بھاگا۔ تیر کر ندی پار کی، اور اب دوست کے گھر پڑا ہے۔ رشتہ کے ایک ماموں تھے انھوں نے بھی گھر سے نکال دیا کہ اب ہم بوجھ نہیں اٹھا سکتے!؟

اس نے مجھ سے یہ بھی تو کہا تھا کہ اگر اجازت دو تو میں اپنی بہنوں کو یہیں کوارٹر میں لے آؤں۔ اور میری بہن (جن کے بچوں کو وہ ان دنوں پڑھاتا تھا) اس پر تیار ہو گئی تھیں کہ ایک کوارٹر اس کو دے دیں لیکن مالک مکان راضی نہ ہوا کہ کوئی پنجابی وہاں رکھا جائے حالانکہ وہ خود ہندو تھے۔ کتنی فکر رہی تھی اس کی بہنوں کی۔ اور کتنی کوشش سے ہم انھیں بامعاوضہ کام دلوایا کرتے تھے۔ ماں تو خیر تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت ہوئیں، لیکن بیٹے نے پھر اس دن سے آج تک مجھے صورت نہیں دکھائی۔ اپنے جھوٹ پر شاید شرمندگی

ہو یا جو وجہ ہو۔

اسی طرح آتما سنگھ کی بیوہ کو جب میں مسز رامیشوری نہرو کے پاس لے گئی کہ اس کو کوئی کام دلوادو تو انھوں نے تعلیم کی بابت پوچھا اور یہ سُن کر کہ صرف تھوڑی ہندی پڑھنا جانتی ہے، مسز نہرو نے کہا۔ تب میں آپ کو کیا کام دے سکتی ہوں؟ میرا خیال ہے تم نوکری کر لو!

اِس نے پوچھا۔ کیسی نوکری؟

مسز نہرو نے نرمی کے ساتھ سمجھایا کہ یہی گھروں میں کام کرنے کی۔ برتن باسن۔ صفائی سُتھرائی۔ بچوں کا کام۔ اور کیا۔ اتنا سُننا تھا کہ بگڑ گئی۔ "واہ ہم ایسے گئے گزرے ہیں کہ گھروں میں پانڈے مانجھیں گے"۔

انھوں نے کہا۔ "تو پھر محلوں میں ہمارے سِلائی کے سنٹر کھلے ہوئے ہیں۔ روشن آرا روڈ تم سے قریب پڑے گا، وہاں جاکر کام لے لو۔ اس سے بارہ آنہ یا ایک روپیہ روزانہ کما لوگی"۔ عورت کو یہ بھی بُرا لگا۔ اس نے کہا:

"اتنے میں کیا ہوگا۔ سو روپیہ مہینہ کا تو ہمارا خرچہ ہے"۔

مسز نہرو جھلّا کر بولیں۔ پھر بی بی میں کیا کر سکتی ہوں۔ گورنمنٹ سے بچّوں کی پڑھائی کا انتظام ہو جائے، اور تم محنت مزدوری کر کے کھانا پینا چلالو۔ یہی گزر بسر کی صورت ہو سکتی ہے!

لیکن اسے کوئی بات پسند نہ آئی۔ غصہ میں بھری کھڑی رہی۔ اور جونہی کمرہ سے باہر نکلی اس نے گالیاں دینی شروع کر دیں:

"ہم سے کہتی ہیں پانڈے مانجھو۔ ہم خاندانی لوگ اتنا گر نہیں گئے ہیں کہ کسی کے گھر بھانڈا برتن کریں۔ برہمنی ہے نا۔ برہمن کا تو راج ہے۔ اسی راج پر تو بے ہوش ہو رہی ہے۔ ایشور کرے اس کی لڑکیاں سڑکوں پر رُلیں۔ اس کی گھر والیاں پانڈے مانجھیں۔

اس نے کہا۔ میں تمھاری خاطر سے چپ رہی ورنہ اسی جگہ سُناتی۔ اور میں نے دل میں کہا ؎

"رکھ لی خدا نے مری بے کسی کی شرم"

اگر کہیں یہ گوہر افشانیاں ان کے گھر ہی میں شروع ہو جاتیں تو میں شاید عمر بھر مسز نہرو کو شرم سے منہ نہ دکھا سکتی۔

میں نے ہر چند سمجھایا مگر وہ سارے راستے کوستی رہی، اور پھر دوسری بار وزیر امداد و بحالیات کے گھر سے پلٹ کر بھی اس نے کوسنوں کی بوچھار کی۔ جب ٹَنگ سنٹر کی مشین اُٹھا کر میں نے اسے عارضی طور پر دیدی تب جا کر مُنہ سیدھا ہوا، اور گالیاں بند ہوئیں۔

پناہ گزیں اپنے نقصانات کا فوراً معاوضہ چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے، ہم نے ہندوستان کے لیے یہ سب قربانیاں کی ہیں۔ ہمیں یہاں سب کچھ بدلہ ملنا چاہیے۔ اور یہاں یہ حالت تھی کہ ان کو گھر تک نہ مل رہا تھا۔ اور سب کچھ ملنا تو بڑی چیز ہے۔ جو کچھ ملتا تھا، وہ ان کی نظر میں نہ آتا تھا۔ دُکانیں مل گئیں تو وہ روتے تھے کہ ہم وہاں اتنی عمدہ سجی سجائی چھوڑ کر یہاں آئے ہیں، یہاں لکڑی کا اسٹال ملا ہے۔ گھر ملتا تو وہ اپنی دو منزلہ بلڈنگ کو روتے۔ کھیت ملتے تو وہ اپنے سونا اُگلنے والے مربعوں کو یاد کرتے۔ بچوں کی پڑھائی کے لیے خرچ ملتا۔ کالج کی تعلیم کے لیے قرض ملتا۔ مگر کوئی چیز بھی ان کے دل کی بھوک کو نہ مٹا سکتی تھی۔ سب کچھ پا کر انھیں اپنی چیز اور زیادہ یاد آتی تھی ؎

"خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر"[1]

بہر حال ہزاروں واقعات دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ اس وقت تک مطمئن نہ ہونگے، جب تک پھر اپنے ٹھکانے نہ واپس جائیں۔ اور یہ ابھی ؎

"خواب ہے، خیال ہے اور شاید جنون بھی ہے"

اس کے علاوہ ان حالات نے مجھے اس عقیدہ پر پختہ کر دیا کہ جو کچھ ہوا ہے، وہ صرف مذہبی یا سیاسی جوش ہی نہ تھا، اس کا بڑا سبب اخلاقی زوال اور تعلیم و تربیت کی خرابیاں بھی تھیں۔ اسکول یا گھر کہیں بھی تو ہمارے دیس میں اخلاق کے سُدھار اور انسانیت کے پرچار کا بندوبست نہیں ہے۔ ماسٹر غنڈہ گردی میں بچوں کی مدد کرتے ہیں اور لوگ گھروں میں اپنی ناجائز رشوت ستانیوں کو بالکل نہیں چھپاتے ہیں۔ ماں بہنیں اور بیویاں فخریہ اوپر کی آمدنی کے تذکرہ کرتی ہیں۔ کھلے خزانہ ایک فرقہ کا آدمی دوسرے فرقہ کی تحقیر، تذلیل یا مالی و جانی نقصان پہنچانے کی کوشش اپنے گھر والوں کی، اپنے دوستوں کی شہ اور ایماسے کرتا ہے جذبات کو بھڑکانے والی اکثر عورتیں بھی ہوتی ہیں۔

ان دنوں میں جب شہر کی گلیوں میں پھر رہی تھی، تو میں نے بے شمار ہندو مسلم ماں بہنیں

---

[1] وطن کے کانٹے پھولوں سے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔

دیکھیں جو اس پر بضد تھیں کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا اور ابھی اور ہونا چاہیے۔ یا ایک بار ہتھیار مل جائیں تو معرکہ ہو جانا چاہیے۔ عورتوں کے اندر یہ درندگی کیسے پیدا ہو گئی؟

شاید ان کی انتہا پسندانہ فطرت ہو یا انتقام کی آگ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ اس صورت حال کو ختم کرنے پر ذرا دیر سے ہی تیار ہوئیں اور مجھے ان کے جذباتی رجحان کو راہ راست کی طرف لانے میں کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔

اور پھر جب ۱۹۴۹ء کی ابتدا میں، میں نے اجمیر کا حال جا کر دیکھا اور وہاں کے حالات جو کچھ سُن رکھے تھے، ان کی تصدیق کی تو اور بھی یقین ہو گیا کہ یہ اخلاقی گراوٹ سارے ہندوستان میں عام تھی۔

۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو جب پہلی مرتبہ اجمیر میں فساد شروع ہوا ہے۔ اور ۱۹۴۹ء تک بھی وہاں صحیح معنوں میں آدمیت نہیں آسکی تھی۔ دہلی سے چل کر مشرقی پنجاب اور الور کے جلے ہوئے گاؤں۔ ویران خطہ دیکھتے ہوئے جب جے پور پہنچو تو ایسا لگتا تھا آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ یہاں خوشی تھی۔ رونق تھی۔ سب کے چہروں پر نرمی اور سکون تھا اور لوگ اس طرح پھر رہے تھے جیسے ابھی ابھی کسی شادی کی محفل سے اُٹھ کر آئے ہوں۔ لیکن جے پور ختم ہوتے ہی کشن گڈھ سے اجمیر تک پھر وہی ہُو کا عالم تھا۔ پھر وہی اضطراب تھا وہی ویرانی تھی۔ اجمیر کا کونہ کونہ آدمیوں سے بھرا ہوا تھا لیکن کُھدے قبرستان۔ ٹوٹی ہوئی مسجدیں مکانات کا ملبہ اور ہولناک بدحواس سہمے ہوئے مسلمان۔ پہلی ہی نظر میں تماشائی کے لیے بے چینی کا باعث بن جاتے تھے۔

اجمیر کے باشندوں میں ۵ دسمبر کو گراموفون پر جھگڑے کی ابتدا۔ کشن گڑھ میں اجمیر کے دولت مند اور پڑھے لکھے شورش پسندوں کا اجتماع۔ راشننگ ڈیپارٹمنٹ اور دوسرے

لہ جے پور کی سرحد پر گنگا نگر تک فسادات کے تھپیڑے آئے مگر لوگوں نے مجھے بتایا کہ ہماری راج ماتا نے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اڑان کی اور ہمیں حکم دیا کہ ریاست کے اندر آجاؤ۔ یوں پوری ریاست محفوظ رہی۔ جے پور کی ریاست میں کوئی بلوہ نہیں ہوا۔ ہندو مسلمان سب امن و امان سے رہتے رہے۔ مہاراجہ اور راج ماتا دونوں نے پوری طرح مدد کی۔

لہ راشننگ ڈیپارٹمنٹ نے جس طرح ۱۹۴۷ء میں بلوائیوں کے ہاتھ مضبوط کیے تھے یہ ایک لانبی داستان ہے۔ شہر کا صحیح نقشہ، محلہ، گلیاں، مسلمانوں کے نام اور (بقیہ اگلے صفحہ پر

افسران کی جانبداریاں اور پھر ۱۴ا کو سات آدمیوں کا زندہ جلنا۔ قتل و غارت لوٹ۔ اور ۷۵ ہزار انسانوں کا موت کے گھاٹ اترنا سب کچھ انھیں یاد تھا۔ وہ کہتے تھے:

سات سات گاؤں کے باشندے اکٹھے ہوکر حملہ کرنے آئے ... دیہاتوں کو لوٹا۔ وہاں بھی ایک توپ کی کہانی تھی، جو بلوائی اپنے ساتھ لائے تھے۔ مغلوں اور مرزائیوں کے گاؤں پر بہادر راجپوتوں نے اس طرح چڑھائی کی جیسے پرانے وقتوں میں مقابلے ہوا کرتے تھے۔

وہ کہتے تھے:

ایک بڑے جاگیردار نے تلوار اٹھا کر دو بڑی قوموں کو شدھ ہوجانے پر مجبور کردیا اور اس سے پہلے اکتوبر کو اجمیر سے ۲۰ میل دور کے فاصلہ پر نارنول اور جے پور کے تباہ حال مسلمانوں کی ایک پوری ریل میں قتل عام انھیں جب یاد آجاتا ہے تو وہ لرز اٹھتے ہیں۔ اونٹوں پر سوار حملہ آور، ویروں اور سورما راجپوتوں کی فوجیں ایک بڑے جاگیردار کی سرکردگی میں نہتے مقید مسلمانوں کو قتل کر رہی تھیں۔

اور اس کے بعد یہ حالت ہوئی کہ مسلمانوں نے داڑھیاں منڈوادیں۔ شیروانیاں ترک کردیں۔ پولیس والا جب چاہے ان کی ٹوپی اترواسکتا تھا اور درگاہ کے لیے بھی بہت ہی کم چیزیں صحیح و سالم جاتی ہیں۔

میں نے ان سے کہا:

حد ہے بزدلی کی، تم یہ سب کرکے اب تک جی رہے ہو، دلی والے تو داڑھی بھی رکھاتے ہیں، اور شیروانی بھی پہنتے ہیں اور ٹوپی بھی اپنی مرضی اور وقت پر پہنتے ہیں۔ تم نے کیوں اپنے کو اتنا بدھو بنا رکھا ہے۔ جوان آدمی اور مجھ سے اتنی بے بسی کا اظہار کر رہا تھا۔ لیکن میری نظر میں وہ ہمدردی کا مستحق نہ ٹھیرا۔ میں کسی انسان کو اس حد تک بے بس بھی تصور نہیں کرسکتی۔ نہ اس بندگی کی قائل ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے ایک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

(حاشیہ بقیہ ص) افراد کی صحیح تعداد۔ لڑکے لڑکیوں کی تفصیل، سب کچھ غنڈوں کو راشننگ آفیسر کی مدد سے معلوم ہوا اور اسی لیے وہ زیادہ وسیع پیمانہ پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکے۔ ہر جگہ فساد سے پہلے اسی محکمہ سے مفصل معلومات حاصل کرکے غنڈوں نے کارروائی شروع کی۔

لیکن اس بحرِ بیکراں کو تلاش والے بلکہ پیدا کرنے ہم خود ہی ہوتے ہیں۔ ایسے ہزاروں حادثات انسان کی زندگی میں پیش آچکے ہیں، اور انھیں بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز راہوں پر اس نے پاؤں ٹکانے کی جگہ پیدا کی ہے۔ اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو کوئی جگہ دے یا نہ دے اپنی جگہ آپ پیدا کرنی ہوگی ؂

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

دہلی پریڈ گراؤنڈ میں ایک جلسہ تھا۔ شانتی دَل امن و امان کے لیے اِن دنوں بکثرت جلسہ، مشاعرہ کر رہا تھا۔ یہ جلسہ بھی اسی سلسلہ کا تھا۔ ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ حکومت کے ایک رُکن اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں تقریر کر رہے تھے اور زبان سے زیادہ ہاتھ پیروں سے معنی و مطالب ادا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بدقسمتی دیکھیے میں بھی مدعو تھی اور صرف تماشائی کی حیثیت سے گئی تھی۔ موصوف بولتے بولتے جب مسلمانوں کی طرف آئے تو کہنے لگے:

"مسلمان اگر گورنمنٹ کا وفادار نہیں رہ سکتا تو تو اس کو چلا جانا چاہیے۔ پاکستان چلا جائے۔ اس مُلک میں تو دیس کا بھلا لوگ رہے گا۔"

بات ٹھیک تھی، لوگوں کی گردنیں ہل گئیں۔ آگے چل کر انھوں نے پھر کہا:

"حیدرآباد کا بات چل رہا ہے۔ کشمیر میں لڑائی ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو بتانا ہوگا۔ کہ وہ کس دیس کا وفادار ہے۔ اس کو ثابت کرنا ہوگا وہ کس ملک کو اپنا ملک سمجھتا ہے؟ وہ دو کرسی پر نہیں بیٹھ سکتا!"

وہ کہتے رہے۔ بہت سے لوگ خوش ہوتے رہے اور میں جلتی رہی۔ ایک دو اور آوازیں آئیں۔ ضرور۔ مسلمانوں سے وفاداری کا مطالبہ ہونا چاہیے۔ اور بھی لوگوں نے کچھ کہا۔ وہ بھی کچھ اور کہتے رہے، اور میں بیٹھی سوچتی رہی۔

تقریر ختم کرتے ہی وہ روانہ ہو گئے۔ شاید ایک صاحب اور بولے اور مسلمانوں سے وفاداری کا مطالبہ انھوں نے بھی کیا۔ اور پھر میرے پاس جلسہ کے مہتمم آئے کہ آپ بھی کچھ کہیے۔

میں بھری بیٹھی تھی، ادھر اتنے بڑے مجمع میں بولنے کی ہمت بھی نہیں پڑ رہی تھی۔ اور سکریٹری صاحب کا اصرار بڑھ رہا تھا۔ آخر کار ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا:

کئی جلسوں میں، میں شریک ہو چکی ہوں۔ آج کل یہ عام بات ہو گئی ہے کہ جو اٹھتا ہے مسلمانوں سے وفاداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ بڑے سے چھوٹے تک سب کو مسلمانوں کی ہی فکر رہ گئی ہے۔ حالانکہ ان سے اگر وفاداری کا مطالبہ کر سکتا ہے تو وہی جو خود اس معیار پر پورا اترتا ہو۔ اُن سے باپو کہہ سکتے تھے۔ جواہر لال جی اور ان کے جیسے دوسرے قوم پرست سوال کر سکتے ہیں لیکن جو خود کھوٹے ہوتے ہیں، وہ کیا کسی دوسرے کو راستہ دکھائیں گے۔ اس وقت تو اپنے گریبانوں میں سر ڈال کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ میں تو کسی کا منہ ایسا نہیں پاتی جو دنیا کو دکھایا جا سکے!

ہندوستان کا نقصان جتنا مسلمانوں کی غیر وفاداری سے ہوا، اتنا ہی وفاداروں[1] کی ناوفاداری سے بھی ہوا ہے۔ وہ مسلمان جنھوں نے پاکستان بنوایا، زیادہ تر جا چکے ہیں، یہاں اب جو باقی ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں جو اس کے شدید ترین مخالف تھے، یا ادھا دھند بلا سوچ سمجھے مذہب کے نام پر اُٹھ کر پیچھے لگ گئے تھے۔

سب ہنگامہ ختم ہونے کے بعد اگر ہندوستان کو نقصان پہنچ رہا ہے، تو وفاداروں ہی سے پہنچ رہا ہے۔ ایسی بات نہ کہیے جس سے دل دکھے، اور غیر وفادار بن جانے کو جی چاہے۔ پاپی ہم اور آپ دونوں ہیں۔ اپنے ہاتھ دیکھیے۔ ہم سب کے ہاتھ خون میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ باپو کی ہتھیا نے ہم سب کی گردنوں پر ہمیشہ کی شرم لاد دی ہے۔ آئیے ہم دونوں مل کر اپنے اپنے ہاتھ صاف کریں، دل صاف کریں۔ ایک دوسرے پر الزام لگانے اور مطالبہ کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا!

پتہ نہیں میں نے کیا کچھ کہا کیا نہیں کہا، پر جی تو ہلکا ہو گیا!

اگست سے ستمبر تک مختلف قسم کے کام ہوتے رہے۔ زمینوں اور مکانوں کا الاٹمنٹ۔ واپسی

---

[1] یہ واقعہ ہے کہ ہمارے لیڈران نے تقسیم ملک کی تجویز منظور کی۔ عوام خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اس تقسیم سے بیزار ہی رہے۔ اور قوم پرست مسلمان تو پہلے ہی سخت ترین مخالف تھے۔

تقاوی۔ زرامداد۔ سب کے لیے شانتی دَل نے کوششیں کیں۔ کچھ میں کامیابی حاصل ہوئی کچھ میں ناکامیابی۔ لیکن اس کی سب بڑی کامیابی یہ تھی کہ دلّی میں باوجود اتنے پریشان حال مضطرب مجمع کے سکون و امن رہا۔ لوگوں کو آئینی جدوجہد کا بھولا ہوا سبق پھر یاد آگیا۔

پانچ ماہ کے سخت انہماک نے کچھ لوگوں کو تھکا دیا کچھ اپنی پارٹی کی بات سوچنے لگے اور میرے جیسے فضول قسم کے لوگ آرام کی بات بھی کرنے لگے۔ اوروں نے تو آہستہ آہستہ کنارہ کشی کی، لیکن میں ستمبر ختم ہوتے ہی لکھنؤ چلدی اور وہاں سے پھر آخر دسمبر یا شروع جنوری میں واپس آئی تو شانتی دل کی سرگرمیاں مدھم پڑ چکی تھیں، اور ہر پارٹی نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ سب کو ایک دوسرے کی طرف سے آگے بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ الکشن کی فکر تھی۔ دلّی میں امن تھا، اور شاید اسی لیے وہ متفقہ محاذ ٹوٹا تو نہ تھا لیکن ڈھیلا پڑ چکا تھا۔

اب کی بار میرا تعلق مغویہ لڑکیوں سے زیادہ رہا جن میں سے دو کو لینے کے سلسلہ میں مجھے میسور[1] بھی جانا پڑا اور میسور کا اتحاد۔ سرسبزی وشادابی و خوش مذاقی دیکھ کر بہت ہی جی خوش ہوا

بنگلور میں مجھے ایک ایسا ادارہ بھی دکھایا گیا جس کے ایک حصہ میں جسمانی نقائص والے ناکارہ مرد رکھے گئے تھے۔ ان کو چھوٹے موٹے کام دیے جاتے تھے، اور کھانا کپڑا، دوا، جائے رہائش سب مُفت تھی۔ بھیک مانگنے والے سارے مفلوج یہاں اسٹیٹ کے وظیفہ خوار بنا دیے گئے تھے، اور وہ سکون و اطمینان سے رہ رہے تھے۔ دوسرے مکان میں صرف لاوارث اپاہج اور ضعیف عورتیں تھیں، ان کو بھی ہلکے پھلکے کام دیے جاتے تھے، اور ضروریات زندگی کا کفیل ادارہ تھا۔ بھیک مانگنے کی ذلیل زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے پر وہ خوش تھیں!

تیسرا حصہ صرف لاوارث بچوں کے لیے مخصوص تھا اور اس میں ایک چھوٹا سا اسکول بھی چل رہا تھا۔ کچھ دستکاریاں بھی سکھائی جا رہی تھیں۔ کھیل کود بھی تھے اور مہتمم کی نگرانی میں سڑک پر ٹکڑے مانگنے والے سارے بچے اچھے شہری بننے کی کوشش کر رہے تھے۔

عمارت کا ایک چھوٹا سا چوتھا حصہ بھی تھا، جہاں روزانہ غریب بچوں کو دودھ مفت تقسیم ہوتا تھا، اور اس حصے میں غریب عورتیں اپنے بچوں کو گھروں سے لے کر آتی تھیں۔ ایک

---

[1] میسور میں دو ملٹری افسروں کے پاس دو مشرقی پنجاب کی لڑکیاں لائی گئیں جنھیں پاکستان ان کے رشتہ داروں کے پاس بھیجدیا گیا۔ ریکوری آسان نہ تھی اگر ہوم منسٹر داس اپکا مدد نہ کرتے۔

لیڈی ڈاکٹر ہفتہ میں دوبار ان کا معائنہ کرتی تھیں، اور ان کو دو بوتل دودھ ملتا تھا۔ ایک فوراً پینے کے لیے اور ایک دوسرے وقت کے لیے۔

میں نے اس قسم کا کوئی ادارہ شمالی ہندوستان میں نہ دیکھا تھا اس لیے ایک ایک چیز کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی اور بے اختیار جی چاہا کہ کاش ہماری سرکار ہر بڑے شہر اور قصبہ میں ایسے ادارے کھول دے تو ملک کی حالت کتنی ہو جائے اور ہزاروں انسان جو کیڑے مکوڑوں کی سی زندگی گزارتے ہیں، انسانیت کی طرف لوٹ آئیں۔

میں ان لیڈی ڈاکٹر سے بھی ملی۔ ان کی مستعدی اور خوش اخلاقی نے مجھے بہت متاثر کیا۔

میسور میں پرائمری اسکولوں کی کثرت بتا رہی تھی کہ واقعی یہاں کی گورنمنٹ تہیہ کر چکی کہ ایک فیصدی انسان بھی جاہل نہ رہنے دیگی اور سب سے زیادہ تو قدرتی حسن کے ساتھ ساتھ مصنوعی آرٹ کی دلکشی نے مجھے موہ لیا۔ کتنے خوبصورت باغ، کتنا حسین شہر اور کیسے شریف لوگ۔ سب طرف میل جول۔ محبت پیار، اس وحشت و بربریت کے دور میں بہت ہی کم ریاستیں تھیں، جو اپنی قدیمی روایات اور آدمیت کو برقرار رکھ سکیں۔ جنوبی ہند کو خیر اتنے مشکل حالات سے بھی دوچار ہونا نہیں پڑا لیکن راجپوتانہ کی ریاستوں میں جے پور اوّل نمبر پر رہے اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں میں مالیر کوٹلہ۔ چند ایسی ہی ریاستیں اور بھی ہیں، جن کے نام سنہری حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ اتنا موقع نہیں جو میں تفصیل بیان کروں۔ لیکن جب کبھی حالات منظرِ عام پر آئیں گے تو ہندوستان خود محسوس کرے گا کہ کہاں کہاں انسان تھے، اور کہاں کہاں حیوان!؟

گڑھ مکتیشر کے فساد میں نوجوانوں کا پنجاب سے آ کر قتل و غارت کرنا۔ راولپنڈی و ملتان کے ہنگاموں۔ مسلم نیشنل گارڈ کی خونریزیاں۔ مشرقی پنجاب اور ریاستوں میں راشٹریہ سنگھ کے جوانوں کے "کارنامے" حکومت اور عوام پر بخوبی روشن تھے۔ لیکن اللہ ہی جانے کیا ہو گیا تھا کہ لوگوں کو ہوش جب بھی نہ آیا جب دلی لٹ گئی اور باپو بھی خاک و خون میں تڑپ گئے۔

اور جب سب کچھ ختم ہو گیا تو دلی کے ایک ذمہ دار افسر نے کہا:

"کہ اب راشٹریہ سنگھ کی ضرورت کیا باقی رہ گئی ہے۔ اس کو تو ہم نے مسلم لیگ کی تنبیہہ کے لیے آگے بڑھایا تھا۔ اب لیگ ختم ہو گئی تو اسے بھی ختم کر دینا چاہیے۔

لیکن آگ لگانے کے لیے تو ایک تیلی دیا سلائی کی کافی ہوتی ہے، مگر جب شعلہ بھڑک اٹھتے ہیں تو بُجھانے کے لیے پانی کی ٹنکیاں اور بیسیوں بالٹیاں درکار ہوتی ہیں۔ اس آگ کو بجھانا کس کے بس میں ہے۔

بہر حال وقت گزر گیا، ایک خونی داستان تاریخ کے صفحات پر اور تحریر ہو گئی۔ اور یہ خوفناک کہانی ہمیشہ نوجوانوں کو دعوت دیتی رہے گی۔

تسبیح کے دانے بکھر چکے ہیں، اور ان بکھرے ہوئے دانوں کو پھر سے ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کرنے والا ابھی جا چکا ہے۔ اب بھی محبت کا تار پروگروہ منسلک کیے جا سکتے ہیں۔ ہمت شرط ہے۔

بدامنی کے اس دور میں جب آدمی ڈھونڈھے سے نہ ملتا تھا اور ہندوستان محبت کو ترس رہا تھا اس اندھیرے میں کہیں کہیں سے پیار و محبت کی روشنی بھی نظر آجایا کرتی تھی جو آفتاب پہلے برلا ہاؤس میں چمک رہا تھا، اس کی کرنوں کی چھوٹ جہاں جہاں پڑتی تھی، اندھیرے کو چیر کر چمکتی ہوئی لکیر چھوڑ جاتی تھی۔ صحرا میں ایک دیا روشن تھا جس کی لَو بھولے بھٹکوں کو منزل کا پتہ بتایا کرتی تھی۔ آج بظاہر وہ بجھ چکا تھا مگر اب بھی گاندھی کے کچھ اچھے بھگت تھے جو دیہاتوں میں بیٹھے ہوئے دکھیاروں کی مدد کر رہے تھے۔ کچھ انسان تھے جو انسانیت کو پکار رہے تھے۔

اب سے پہلے تو مجھے معلوم نہ تھا لیکن جب شہر میں پھری۔ دیہاتوں کا گشت کیا، تو پتہ لگا کہ ابھی ہندوستان کے جسم میں تھوڑا اصلی خون باقی ہے اور اگر اس میں اضافہ کیا جائے تو تندرست خون کی افراط جسم کے زہریلے مادّہ کو فنا کر سکتی ہے۔ یہ طاقت کمزوری پر غالب آسکتی ہے اگر ہم اب بھی سنبھل جائیں!

قیمتی ہیرے آج بھی کوڑے کباڑ میں چھپے ہوئے ہیں۔ ڈھونڈھنے والا چاہیے۔ مجھے تو ایسے بہت سے ملے جن کی آب و تاب اور چمک دیکھ کر امیدیں تازہ ہو گئیں۔ ان میں دو دوست بھی تھے جن میں کا ایک پاکستان آفس میں کسی عہدہ پر تھا۔ بٹوارہ کے بعد اس نے اپنی ملازمت پاکستان منتقل کرا دی تھی لیکن ابھی جانے کی نوبت نہ آئی تھی کہ شملہ میں فساد ہو گیا۔ آدھا بیڑا اسباب لے کر دہلی میں اپنے پرانے ساتھی اور دوست کے پاس آکر پناہ لی کہ جیسے ہی موقع ملے پاکستان چلا جائے یا بال بچوں کو یوپی اپنے گھر بھیج دے لیکن بدقسمتی نے ساتھ نہ چھوڑا۔ آتے کے ساتھ کالرا ہو گیا اور دوست نے اٹھا کر اسپتال میں ڈال دیا۔ ساتھ ہی دلی میں بلوہ ہو گیا۔ پاکستان کے اس افسر اور خاندان کو بچانے والا پرانا دوست گپتا آج بھی نئی دہلی کے

کوارٹروں میں اس کا سب سے بڑا مخلص محسن ہے۔ گپتا نے یہی نہیں کیا کہ اپنے چھوٹے سے کوارٹر کا ایک کمرہ ایک ماں اور بچوں کی رہائش کے لیے وقف کر دیا بلکہ پڑوسیوں کے غصہ اور درندوں کے غول سے ان سب کی جان بچانے کا ذمہ دار بھی وہی تھا۔ دوست اسپتال میں تھا اور اس کی امانت گپتا اپنی جان کے ساتھ رکھ رہا تھا۔ میں ایک دن اسپتال گئی تو ڈاکٹر نے چپکے سے کہا۔ ہمارے ایک مریض کو ساتھ لیتی جایئے۔ دس دن سے وہ اچھا ہو چکا ہے۔ ہر روز تین سے چھ بجے شام تک جب دوسرے مریضوں کے رشتہ دار اسپتال میں آتے ہیں تو مجھے اس کی حفاظت کے لیے مستقل ٹھہرے رہنا پڑتا ہے کہ مسلمان سمجھ کر کوئی مار نہ دے۔

اور وہ مریض گپتا کے دوست تھے، جن کو ڈاکٹر بھی ایسا نیک دل مل گیا تھا۔ ہمارے اصرار پر وہ اسپتال سے آنے کے بعد ہمارے گھر اٹھ کر آ گئے لیکن آفس سے پلٹتے ہی گپتا نے سائیکل پر ہمارے گھر کا رُخ کیا۔ بڑی شکایت بڑا شکوہ اور بہت افسوس کہ "یار تکلیف تو بہت ہوئی، مگر اب واپس چلو!"

مگر ہم سب جانتے تھے، کہ ان کی واپسی گپتا کے خاندان کو اب مصیبت میں ڈال دے گی۔ روانگی کے وقت پڑوسی مشتبہ ہو چکے ہیں، اس لیے اب جیتا نہ چھوڑیں گے۔ آخر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مارنے میں ڈر بھی کوئی زیادہ نہ تھا۔ ہم نے دونوں کو خطرہ سے آگاہ کیا اور سمجھا بجھا کر راضی کر لیا۔ یہاں وہ کافی دن ٹھہر کر شیر شاہ میس اٹھ گئے۔ شاید اب پاکستان میں ہوں گے۔

اسی طرح میں نے ایک بہادر سکھ بھی دیکھا جس کے جسم پر تلواروں کے زخم اس کے اپنے بھائیوں کے لگائے ہوئے تھے۔ پنجاب کا آتش فشاں جن دنوں لاوا اُگل رہا تھا، تو یہ پچاس سالہ سکھ جان ہتھیلی پر لیے جلتی آگ میں گھس کر مصیبت زدہ دوستوں۔ پڑوسیوں اور عورتوں، بچوں کو نکال کر پناہ کی جگہ پر پہنچاتا رہا تھا۔ اپنوں کی تلواروں کے گھاؤ بھی، اس کے جوش کو ٹھنڈا نہ کر سکے۔ اور ایک مہینہ اسپتال میں زخموں کے مندمل ہو جانے کا انتظار کرنے کے بعد وہ اپنا فرض، انسانیت کا فرض نہ بھول سکا۔ اچھا ہوتے ہی اس نے دلی میں قوم پرستوں کے ہاتھ مضبوط کیے!

فرانٹیر کے اکثر پناہ گزیں اپنے مسلم دوستوں اور سرخ پوش ساتھیوں کو یاد کرتے تھے جنھوں نے ان کی جانیں اور عزت بچا کر ان کو ہندوستان پہنچنے میں مدد دی۔ ان کے پاس بے شمار واقعات تھے کہ کس کس طرح آڑے وقت میں ان کا پڑوسی کام آیا۔

وہ دولت نہیں لا سکے۔ لیکن پٹھان کی دولت اور عزت اس کا ہتھیار ہے[1]، اور وہ شکست خوردہ کی طرح ہتھیار چھنوانے کی بے عزتی سے بچ جانے پر اپنے دوستوں کے مشکور تھے، وہ آج بھی خان بادشاہ اور ان کے ساتھیوں کے نام پر آنسو بھر لاتے تھے۔ ان کے دلوں میں آج بھی محبت کی تڑپ تھی۔ اور اب پرانی یادیں ان کا سرمایۂ حیات بن کر رہ گئی تھیں اور اب انھیں گھر بنوانے اور دُکان رکھنے سے زیادہ بندوق کا لائسنس بدلوانے کی فکر تھی۔

---

[1] پٹھانوں کا ایک گروہ کانسٹی ٹیوشن ہاؤس میں مردولا سارا بھائی سے یہ کہنے آیا تھا کہ ہمیں بندوق کے لائسنس دلوا دو۔ میں نے پوچھا کہ تم سب لٹ کر صرف بدن کے کپڑوں میں ہوائی جہاز سے آئے ہو۔ بندوق کہاں سے مل گئی۔ تب انھوں نے بتایا کہ ہم نے ہر چیز چھوڑ دی مگر ہتھیار نہیں چھوڑ سکتے تھے اور ہمارے مسلم پٹھان جانتے تھے کہ یہ پٹھان کی عزت ہے اس لیے اس کو لانے میں ہماری مدد کی۔ انھیں سب نے اکٹھا ہو کر یہاں سُرخ پوش جماعت قائم کی۔ اکبر خاں ان کے لیڈر تھے اور نارنگ، کنھیا لال خنگ، نگینہ صاحب اور خان غازی وغیرہ سب اس گروہ میں شامل تھے۔

21

اغوا شدہ لڑکیوں کے مسائل

مغویہ لڑکیاں ہمارے لیے مستقل پریشانی کا باعث تھیں۔ میرا چونکہ براہ راست[1] اس سے کوئی تعلق نہ تھا اس لیے میں زیادہ تفصیل تو لکھ نہیں سکتی۔ اور چونکہ عورت ہوں اس لیے میرا قلم ہی نہیں اٹھتا کہ کھل وہ تمام فحاشی ناظرین کے سامنے رکھ دوں جو پنجاب کے دونوں حصوں اور ریاستوں میں کی گئی۔ دوسرے ان کے بیان کرنے سے فائدہ بھی کیا ہوگا۔ اپنی عزت گنوانا ہے "یہ گھٹنا کھولو تو لاج وہ گھٹنا کھولو تو لاج" اپنی ہی عزت تھی، اور اپنی ہی بے عزتی۔ اپنوں ہی کے ہاتھوں سب کچھ ہوا۔

البتہ یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اس اخلاقی گراوٹ کا اصلی سبب صرف سیاسی اور مذہبی غصہ نہ تھا۔ کچھ اور وجوہات بھی ہوں گی جس کی چھان بین ان نوجوانوں کو کرنا ہوگی جو نیا ہندوستان بنانا چاہتے ہیں اور نئی قوم کی نئی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

یہ درندگی، وحشت، بدمعاشی اور زنا کی حسرتیں جو اس دور میں پوری ہوئیں۔ کہیں وہ صدی بھر سے تو ماغوں میں پرورش نہیں پا رہی تھیں؟ یہ جراثیم آج کے تو نہ تھے۔ پتہ نہیں کب سے خون میں رچ رہے تھے۔ کمزوری پاتے ہی بیماری پھوٹ پڑی۔ بڑے بڑوں کا دامن بھی تر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ رہتی دنیا تک کلنک کا یہ ٹیکہ مٹنے والا نہیں۔ کونسا ملک ایسا ہے جس میں خانہ جنگی نہیں ہوئی۔ ہار جیت تو اس دنیا میں ہمیشہ ہوتی رہی ہے، اور دھرتی پر اللہ ہی جانے کتنی خونریز لڑائیاں لڑی جا چکی ہوں گی مگر یہ کچھ تو کہیں نہیں ہوا جو ہمارے ویروں

---

[1] بعد کو ۵۰ء سے لے کر ۵۵ء تک میرا پورا تعلق ان سے رہا۔ ہوم اور کیمپ بھی چلائے ان کی امداد و بحالی کی کوشش بھی کی مگر ان کی برآمدگی رکوری آرگنائزیشن کے اسٹاف اور مردولا بہن سے متعلق تھی اور یہ کام فوج اور پولیس کرتی تھی۔

اور سورماؤں نے کیا۔ جنگ کے یہ اصول اور لڑائی کے یہ داؤں پیچ تو دنیا کے کسی جرنیل کے دماغ میں نہ آئے تھے۔ آخر وہ کون تھا؟ یہ طریقہ سکھایا کس نے؟

یہ حرامی بچے جن پر زندگی بھر کے لیے شرم کا بوجھ لادا گیا ہے۔ یہ ۱۱-۱۲ سال کی کنواری لڑکیاں جو مجسم جنسی طلب بن کر رہ گئی ہیں۔ یہ پاگل پھٹی ہوئی آنکھوں والی دوشیزائیں، جو مجسم فریاد ہیں جب تک زندہ رہیں گی اس منحوس دور کو یاد کرتی رہیں گی۔

نارنول ریاست پٹیالہ کے رہنے والے لوگوں نے مجھے بتایا۔ کہ خاص نارنول میں سولہ ہزار آدمی مارے گئے اور تقریباً ڈیڑھ ہزار لڑکیاں اغوا کی گئیں۔ ان میں سے اس وقت تک پانچ سو برآمد ہو چکی ہیں۔ بقیہ ایک ہزار کبھی آسکیں گی؟ اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔

اسٹیٹس میں عوام ہی کا قتل نہیں ہوا۔ کونسل کے ممبر، ریاست کے ذمہ دار افسران، امرا، جاگیر دار سب کا ایک حشر ہوا۔ جیند ریاست کے سردار گرامی بخشی شفقت اللہ ایڈوائزر جیند گورنمنٹ کی بہت بڑی فیملی میں سے صرف ایک[1] چار سال کی بچی خدا جانے کیوں جیتی چھوڑ دی گئی شاید اس لیے کہ بڑی ہو کر کسی سردار کا گھر لبسائے۔ مگر گورنمنٹ کے کارکنوں نے زبردستی حاصل کر کے دلّی میں مقیم رشتہ داروں کے حوالے کر دیا اور ریاست کو سنا ہے اس پر مجبور کیا ہے کہ یتیم کی جائیداد اس کے اخراجات کے لیے محفوظ رکھی جائے بلکہ پنڈت نہرو نے چند سال بعد اس کا دو سو روپیہ مہینہ بھی مقرر کر دیا تھا جو غالباً اب بھی مل رہا ہو گا۔

کسی ریلوے اسٹیشن کا مسلم اسٹیشن ماسٹر جیتا نہ بچا اور اس کی جوان لڑکی رشتہ داروں کو نہ ملی۔ صرف ایک واقعہ کا مجھے علم ہے کہ دو جوان لڑکیاں اور تین بچے رفیع بھائی کی کوشش سے ایک مہاراجہ کے چچا نے اکٹھے کر کے بھجوا دیے اور بچے اپنے رشتہ دار کے پاس یوپی پہنچا دیے گئے۔

مغویہ لڑکیاں سالہا سال تک برآمد ہوتی رہیں گی۔ ایک بار تو شاید اگست ۱۹۴۸ء میں یہ سلسلہ بند کر دیا گیا تھا لیکن عارضی طور پر۔ لڑکیوں کے جو گروہ آتے تھے ان میں گنوارنیں اور غریب غربا کی لڑکیاں ہوتی تھیں۔ بڑے افسروں اور وزیروں تک رسائی کہاں تھی۔ لوٹ کا مال عوام کے گھروں سے تو نکال لیا جاتا تھا لیکن محلوں کی تلاشی لینے کی

---

[1] لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور رامیشوری نہرو کے ذریعہ بچی اغوا کرنے والوں سے چھین کر دہلی لائی گئی اور جناب خلیل باغ والے کو علاقہ جامع مسجد میں پرورش کے لیے سپرد کی گئی۔

کس میں ہمت تھی جس کی اونچی دیواریں خود کارکن کے لیے جیل خانہ بن سکتی تھیں۔ شکسپیر کہتا ہے "گناہ پر سونے کا ملمع چڑھادو تو عدل و انصاف کا زبردست برچھا بھی بغیر گھائل کیے ٹکرا کر لوٹ آئے گا اور فقیر کی گدڑی میں خنجر بھونکو تو وہ اپنا کام کرلے گا۔"
اور ان تمام حالات کی موجودگی میں ذرا بے غیرتی تو دیکھیے۔ ایک گروہ کہتا تھا۔ ہم نے اپنی ہمت، زورِ بازو اور خدا کے فضل و کرم سے پاکستان حاصل کیا۔ دوسرا کہتا ہے۔ آزادی کے لیے جو قربانیاں ہم نے کی ہیں۔ سارا ہندوستان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ سچ ہے۔

جب منہ پر پھیری لوئی[1] تو کیا کرے گا کوئی

چند دن گزرنے پر ایک لڑکی شہر کے معزز گورنمنٹ ملازم کے گھر سے لائی گئی اس نے بتایا کہ کپورتھلہ سے کئی ہزار مردوں عورتوں کا قافلہ فیروز پور کے لیے روانہ ہوا تو ہم اپنا مال اسباب لے کر پیدل چلے تھے۔ مشرقی پنجاب کے ایک تھانیدار نے جو قافلہ کی حفاظت پر مامور تھا لوگوں سے کہا کہ صرف مردوں کو ہم پاکستان بھیجنے کے ذمہ دار ہیں عورتیں ہرگز نہیں جاسکیتں۔ اس پر قافلہ میں سراسیمگی پھیل گئی اور لوگوں نے کہا ہم یہیں مرجائیں گے مگر عورتوں کو نہ چھوڑیں گے۔ آخر کار چھ ہزار رشوت پر معاملہ طے ہوا اور قافلہ کچھ دور اور آگے بڑھا مگر پھر تھانیدار صاحب نے ایک بار حفاظت سے معذوری ظاہر کی اور یہی اصرار کیا کہ عورتوں کو چھوڑدو اور دوسری منزل پر پہنچ کر ۴ ہزار رشوت اور وصول کی۔ فیروز پور پہنچ کر اس نے سب عورتوں کو چھانٹ کر مردوں سے الگ کردیا اور جھگڑا پھر شروع ہوا۔

لوگوں نے پھر اپنی جمع پونجی اکٹھی کی اور چھ ہزار کی رقم تھانیدار صاحب کو اور بھینٹ چڑھائی۔ تھانیدار مان گئے۔ قافلہ لے کر آگے بڑھے۔ اب وہ اسٹیشن جہاں سے ریل پاکستان جانے والی تھی صرف چند میل دور رہ گیا تھا۔ لوگ خوش تھے کہ چلو مال کی

---

[1] لوئی پھرنا۔ شرم و حیا مٹا دینا، محاورہ ہے۔

[2] ہندوستان میں تو خیر کوشش سب سے پہلے شروع ہوئی تھی۔ مگر پاکستان گورنمنٹ سے اس اصول کو منوانے کا سہرا مردولا سارا بھائی کے سر ہے۔ انھوں نے گورنمنٹ کو ہمنوا بنایا۔ پرانے دوستیوں کو اکسایا۔ اور عوام کی حمایت حاصل کی۔ اور امراء و نوابین کے گھروں سے بھی درجنوں ہندو لڑکیاں واپس لائیں۔

خلاصی ہو گئی مگر عزت تو بچ گئی۔

مگر نہیں ابھی بہت کچھ باقی تھا۔ لڑکی کا بیان ہے کہ تھانیدار نے خفیہ سب جگہ خبر کر دی تھی کہ مسلمانوں کا قافلہ پہنچ رہا ہے اور اسٹیشن تک پہنچنے سے پہلے ہی آگے پیچھے دائیں بائیں سب طرف سے حملہ ہو گیا۔ بارہ سو لڑکیاں اس قافلہ سے چھین لی گئیں۔ بے شمار آدمی قتل ہوئے۔ لیکن حسن انتظام کا سہرا تھانیدار صاحب کو اپنے سر باندھنا ضروری تھا اس لیے کچھ ادھیڑ بڈھی عورتیں کچھ مرد کچھ بچے بچا کر ریل پر سوار کر دیے گئے۔ بہت سے قتل ہو گئے، نہر میں زندہ پھینک دیے گئے۔ لڑکیوں نے بھاگنے کی کوشش میں اپنی جانیں گنوائیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی۔ کچھ دور جا کر پاؤں پانی میں ٹک گئے اور زمین سے پیر لگتے ہی کوشش کر کے نکل آئی۔ تین دن بھاگتے رہنے کے بعد وہ فیروز پور پہنچ گئی جہاں اس نیک دل افسر نے رحم کھا کر اسے اپنے گھر نوکر رکھ لیا۔ وہ بچوں کو کھلاتی تھی اور دوسرے کام بھی کرتی۔ معقول تنخواہ پاتی تھی۔ ڈیڑھ سال بعد دہلی پولیس اس کو لائی۔ لڑکی پڑھی لکھی تھی۔ میں نے پوچھا جب تم خط لکھ سکتی تھیں تو پھر اپنے رشتہ داروں کو کیوں نہیں لکھا۔ اس نے کہا بہت خط بھیج چکی ہوں۔ جواب بھی آئے ہوں گے شاید مالک نے چھپا ڈالے ہوں گے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے۔ میں نوکری چھوڑوں یا میرا کوئی عزیز آئے۔ وہ خوش تھی کہ شاید اب بہت جلد اپنے شوہر سے مل سکے گی جس کے متعلق خبر ملی ہے کہ زندہ ہے اور پاکستان میں ہے لیکن اس کا بچہ نہر کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔

آدمیت ہے یہی اور یہی انسان ہونا

مجھے اس وقت ایک بڈھا جاٹ یاد آ رہا ہے۔ دھرم و مذہب کے ٹھیکہ دار جب مہرولی میں ایک دوسرے کے مکانات بم سے اڑا رہے تھے اور عورتوں بچوں تک کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے تو پتھروں کے بیچ میں ایک نوجوان میواتی لڑکی بڈھے کو روتی ہوئی مل گئی اسے پتہ نہ تھا کہ اس کا کوئی عزیز زندہ بچ سکا ہے یا نہیں۔ مہرولی مسلمانوں سے خالی ہو چکا تھا۔ خود یہاں کے مسلمان بھی بڑے سیدھے نہ تھے۔ انھوں نے بھی اپنے ہتھیاروں سرنگوں اور بموں سے فریق مخالف کے مکانات اور دکانیں تباہ کی تھیں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے دو منزلہ پتھر کے مکانات زمین کے برابر کر دیے تھے۔

بہرحال بڈھا لڑکی کو اٹھا لایا۔ وہ اس کے رشتہ دار نہیں تلاش کر سکا مگر اس نے کہا "بیٹی تو میری دھرمی بیٹی ہے۔ اس گھر میں اطمینان سے رہ۔ تیرا یہاں کچھ نہیں

بگڑ سکتا۔ کئی ماہ بعد بڈھے نے دونوں کی رضامندی دیکھ اپنے بھتیجے سے اس کی ہندو دھرم کے مطابق شادی کر دی اور دھرمی باپ دونوں کی راحت و آرام دیکھ کر خوش ہونے لگا۔ جب ہنگامہ فرو ہوا اور سب کو ہوش آیا تو باپو پکار پکار کر نیند کے ماتوں کو جھنجوڑ رہے تھے کہ اس پاپ کو مٹاؤ۔ اس وقت اگر تم نے توبہ اور تلافی نہ کی تو ایشور کے غصّے کا نشانہ بنو گے۔

مہرولی کے تھانیدار صاحب بھی چونکے اور ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ ایک دن یہ لڑکی ان کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس وقت نہ کیمپ تھا نہ باقاعدہ کام شروع ہوا تھا۔ اپنے اپنے طور پر سب ہی فکر اور کوشش کر رہے تھے۔ کچھ کے نام و پتہ میں نے پولیس افسر کو دے رکھے تھے ان میں ایک یہ بھی تھی۔ اس کا باپ میرٹھ میں تھا اس لیے اس کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا گیا۔ اور ایسے تمام کاموں میں ہمیں نظام الدین کے ایک حکیم صاحب[1] امداد دیا کرتے تھے۔ وہ پناہ گزینوں کی مدد سے لڑکیوں کے رشتہ داروں کو بلوانے اور پتہ لگانے میں ہمارا ہاتھ بٹاتے تھے۔

لڑکی کو نہلا دھلا کر کپڑے پہنائے گئے اور اطمینان دلایا کہ بس دو دن سے زیادہ تجھے انتظار نہ کرنا پڑے گا۔ دوسرے دن دیہاتیوں کے گروہ نے گھر گھیر لیا۔ پولیس ان کو اندر آنے نہ دیتی تھی اور وہ بضد تھے۔ میں نے کہا اچھا صرف اس بڈھے کو آنے دو جو اس لڑکی کا باپ بنا تھا۔ بڈھے نے کہا۔ بس مجھے تو ایک نظر لڑکی دکھا دیجیے اور کچھ نہیں چاہتا۔ اس کے آنسو دیکھ کر میرا بھی دل پسیج گیا اور میں نے لڑکی سامنے کر دی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رو دیئے۔ بڈھے نے کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔ بیٹی میں تجھے دھرمی بیٹی بنا چکا ہوں تیرے دم سے میرے گھر رونق تھی۔ بی بی کہتی ہیں۔ تیرا باپ آرہا ہے۔ اس لیے میں سوچتا ہوں کہ جب میں تیرا دھرمی باپ تیرے لیے اتنا دکھی ہو رہا ہوں تو تیرا سگا باپ تیرے لیے کیسا تڑپتا ہوگا؟ اگر وہ مل جائے تو اس کے ساتھ چلی جا۔ راضی خوشی سے رہنا اور مجھے یاد کرتی رہنا۔ اور اگر نہ ملے تو یاد رکھنا کہ جب تک میں زندہ ہوں اور میرے تینوں بیٹے جیتے ہیں، میرے گھر کے دروازے ہر وقت تیرے لیے کھلے

---

[1] حکیم سید حسین صاحب

رہیں گے۔ چاہے تیرا آدمی پھر تجھ کو نہ رکھے لیکن تو بے دھڑک چلی آنا۔ میں تجھے سر آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔

یہ شریفانہ گفتگو۔ بلند کرداری کا یہ نمونہ اور اتنی محبت و انسانیت دیکھ کر میں ایسا متاثر ہوئی کہ بڈھے سے وعدہ کر لیا کہ اگر کسی وجہ سے اس کے رشتہ دار نہ مل سکے تو چاہے مسلمان مجھے گولی کیوں نہ مار دیں لیکن میں ایسے محبت کرنے والے باپ سے بیٹی کو چھڑانا پسند نہ کروں گی اور لڑکی تمھارے پاس پہنچا دوں گی۔ لیکن خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ تیسرے دن اس کا باپ میرٹھ سے آگیا اور وہ خوش خوش اس کے ساتھ چلی گئی۔

اسی طرح ایک دن آسارام نامی ایک کلرک میرے پاس آیا اور اس نے ایک لڑکی کا پتہ دیا کہ اس کو نکلوا دیجیے۔ اس نے بتایا کہ میں اور میرا ایک مسلم دوست دونوں ایک ہی دفتر میں کلرک تھے۔ فساد میں سب کو بچا کر میں پاکستان بھجوانے میں کامیاب ہو گیا مگر ایک جوان لڑکی چھن گئی۔ میرا دوست چلتے چلتے کہہ گیا تھا کہ اس کی ضرور فکر رکھنا اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ تب تک چین سے نہ بیٹھوں گا جب تک تمھاری لڑکی تم تک نہ پہنچا دوں۔ کئی ماہ کی کوشش کے بعد پتہ لگا ہے کہ وہ مشرقی پنجاب کے فلاں گاؤں میں ہے۔ لیکن آدمی کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ میں نے تاکید کی۔ آدمی کا نام معلوم کر کے آؤ اس سے پہلے میں کوئی مدد نہ کر سکوں گی۔ یوں بے پتہ ٹھکانے کام کرنے سے ہر تدبیر بیکار رہو گی۔

کچھ دن بعد وہ پھر آیا۔ نام اور مقام سب اس نے معلوم کر لیا تھا۔ اور میں نے ساری رپورٹ ومین سیکشن[1] کو بھیج دی۔ دو ماہ گذر گئے۔ اس عرصہ میں برابر دوست کے خطوط آتے رہے اور آسارام کی دوڑ دھوپ جاری رہی۔ آخر کار اسے خود ساتھ لے کر میں مسز نہرو سے ملی اور انھیں تمام حالات سے مطلع کیا۔ مسز نہرو نے فوراً کارروائی کی۔ پولیس کی مدد سے آسارام خود ساتھ جا کر لڑکی کو لے آیا اور ہوائی جہاز سے پاکستان پہنچا دیا۔ چند دن بعد مجھے اس کا

---

[1] مسز رامیشوری نہرو انچارج ومین سیکشن وزارت امداد و بحالی۔ مغویہ لڑکیوں کی برآمد کا محکمہ بھی انھیں کے سپرد تھا۔ بعد کو مردولا سارا بھائی رکوری کی انچارج ہو گئیں مگر پاکستان سے آنے والی ہندو لڑکیوں کی امداد و بحالی کا تعلق بدستور مسز رامیشوری نہرو سے رہا۔

خط ملا جس کے ساتھ دوست کا خط بھی نتھی تھا۔ لڑکی بخیریت اپنے باپ کے پاس تھی اور دونوں دوست سرحد کے ادھر اور ادھر محبت کے تاروں میں جکڑے ہوئے ایک دوسرے کے لیے تڑپ رہے تھے۔

محبت کے تیر

اور اب اس وقت مجھے وہ ننھی سی معصوم اختری یاد آ رہی ہے۔ جس کی عمر بمشکل ۱۳ سال کی ہوگی۔ ایک بڈھے دیہاتی نے اتنی پیاری لڑکی کو زخمی پڑے دیکھ کر جھاڑیوں سے نکالا اور اس کی مرہم پٹی کی۔ اپنے گھر لا کر رکھا۔ خوب تازہ تازہ دودھ پلا کر اسے تندرست کیا اور جب وہ اچھی ہوگئی تو اپنے پندرہ سالہ بیٹے سے اس کی شادی کر دی۔

دو بچے ایک دوسرے کے جیون ساتھی بنا دیے گئے۔ ان کی محبت شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ وہ ۷ ماہ میں ایک دوسرے کے ایسے عاشق زار ہو گئے کہ ایک کے بغیر دوسرے کو قرار ہی نہ آتا تھا۔ آخر کار پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور لڑکی کو پولیس پکڑ لائی اسی طرح جس طرح وہ دوسری لڑکیوں کو لا رہی تھی مگر یہ نازک گورے رنگ والی لڑکی تمام دن بھوکی پیاسی زار و قطار روتی رہی۔ ہر چند سمجھایا۔ بہلایا۔ دم دلاسا دیا۔ مگر اس کے آنسو نہ تھمے۔ نہ اس نے ایک قطرہ پانی پیا۔ نہ غسل کرنے اور کپڑے بدلنے پر راضی ہوئی اور روتی چلی جا رہی تھی۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ رات کو اس نے کوئی چیز اپنے آنچل سے کھول کر کھائی اور نل کے پاس جا کر پانی پیا ہے۔ بہت منت سماجت کے بعد اس نے اقرار کیا۔ کہ ہاں میں نے کھایا تھا لیکن اور کچھ نہ بتایا البتہ آج تھوڑا سا کھانا کھا کر اس نے پانی بھی پیا۔

تیسرے دن سہ پہر تک اس کی طبیعت ذرا سنبھلی۔ آنسو تو اب بھی نہ تھمتے تھے لیکن پہلے دن والا حال نہ تھا۔ اس نے بتایا کہ جب لوگ مجھے لینے پہنچے ہیں تو وہ لڑکا یعنی اس کا شوہر دور کھڑا ہو کر رونے لگا۔ اسے بڑی مشکل سے دو چار بات کرنے کی اجازت مل سکی اور تب اس نے جلدی جلدی اپنے ہاتھ سے گھی کا ملیدہ بنا کر اس کے آنچل میں باندھ دیا اور رو کر کہا کہ جب بھوک لگے اس کو کھا لینا اور مجھے یاد کرتی رہنا۔ لڑکی اتنا کہتے کہتے بے قرار ہو گئی۔

میری اس وقت عجیب حالت تھی۔ میں سیاسی کارکن نہ تھی۔ بڈھی ماں نہ تھی صرف

مسلمان عورت ہی نہ تھی میرے اندر تو ایک ادیب کے دل کی دھڑکن بھی تھی میرے پاس ایک حساس دل بھی تھا اور سوچنے والا دماغ بھی۔ یہ معصوم۔ اچھوتی۔ پہلی محبت مجھے تو شبنم کی طرح نازک اور خوشبو کی طرح لطیف و خوشگوار نظر آرہی تھی۔ اس کو کچلنا۔ مٹانا، فنا کرنا۔ دو محبت بھرے دلوں کو جدا کرنا۔ فطرت کے دو پاکیزہ نو شگفتہ پھولوں کو مسل ڈالنا میری تقدیر میں لکھا تھا۔ احساس فرض نے میرے ہاتھ پیر کاٹ رکھے تھے۔ سوجھ بوجھ اور عاقبت بینی نے مجھے مفلوج کر دیا تھا۔

میں نے نوجوان بپھری ہوئی لڑکیاں بھی دیکھی تھیں جو اپنے شہوانی جذبات کے بوجھ میں دبی ہوئی ہمیں گالیاں دیا کرتی تھیں۔ وہ پڑھی لکھی لڑکیاں بھی دو چار ہمارے پاس آئی تھیں جو دھرم مذہب اور قانون کا حوالہ دے کر ہم کو لاجواب کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔

مگر یہ نازک اندام لڑکی اس پہاڑی کی مانند تھی جس سے ابھی ابھی کوئی سوت نہ پھوٹا ہو۔ وہ تو ایک ننھی سی بوند تھی جو بھرے ہوئے بادل میں سے ٹپک پڑی ہو اور اس کھلتی ہوئی کلی کی مثل تھی جو صبح کے پہلے جھونکے سے مسکرا اٹھنے کے قریب ہو۔ اور اس کے دل کی بربادی میرے ہاتھوں ہوئی۔

لیکن میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ اس کا رونا تیسرے دن ختم ہو گیا اور ایک شانِ استغنا اس میں پیدا ہو گئی۔ میں نے اس کے باپ کو اطلاع کی۔ سارے خاندان میں صرف ایک لڑکی اور اس کا باپ بچ رہا تھا۔ خط آ گیا اور لڑکی پاکستان جانے والے لڑکیوں کے قافلہ کے ساتھ روانہ کر دی گئی۔ مگر آنسو! وہ تو موتیوں کی طرح برستے ہی رہے۔

میں نے پولیس افسر سے کہا کہ میرا دل چاہتا ہے۔ اس کی پاکیزہ محبت کا احترام کروں اور اسے پھر واپس دیدوں وہ ہنسے اور کہا۔ آپ ایسی بات کہتی ہیں تعجب ہے؟ لیکن میں ایسا کر بھی تو نہیں سکتی تھی۔ اس کے بعد جو ہنگامہ مچتا اور باپ اپنی اکلوتی لڑکی کے لیے جو آفت کرتا وہ معاملہ دونوں حکومتوں کے درمیان آ سکتا تھا۔ نابالغ لڑکی کو دینے کا اختیار بھی کسے حاصل تھا اور پھر اس کی روانگی کے وقت تو میں مسلمان ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں روتی رہیں میرا دل روتا رہا۔ لیکن مصلحت اندیشی نے مجبور کر دیا کہ اس کو بھیج دوں۔ خدا کرے جہاں ہو خوش رہے اور ماضی کی یاد اس کی زندگی تلخ نہ کرے۔

قارئین میں سے بہت سے ان واقعات کو پڑھ کر چیخ اٹھیں گے کہ اُفوہ کتنا ظلم

یہ سب عورتیں کر رہی ہیں اور ۱۹۴۹ء میں ہمارے خلاف کافی پروپیگنڈا بھی ہوا۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ آخر ہو کیا رہا ہے۔۔ اتنا ظلم کیوں لڑکیوں پر کیا جا رہا ہے۔ اب تو وہ سب اپنی اپنی جگہ ٹھکانے سے بیٹھ چکی ہیں۔ ان کو پھر اکھاڑنے سے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ دوبارہ ان کو بے گھر کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ ایک عورت جو اپنے گھر میں عزت دار گھر والی اور بچّہ کی ماں بن چکی ہے اس کو پھر پرانے گھر اور والدین کے پاس واپس جانے پر مجبور کرنا اس کے حق میں بھلائی نہیں پاپ ہوگا۔ چھوڑو اس قصّہ کو۔ جو ہندوستان میں رہ گئیں اور جو پاکستان میں رہ گئیں۔ سب اپنی جگہ مطمئن ہیں۔ ان کو اِدھر سے اُدھر کرنا اب دو برس کے بعد بہت بڑی بے وقوفی ہے۔

اور یہی خیالات ہیں جن کی بنا پر لوگ ہمیں مدد دیتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ ہم نے ہر فرقہ، طبقہ اور ہر پارٹی سے اور عوام سے اور خود کانگریسی بھائیوں سے مدد کی اپیل کی لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عوام کا تعاون کیسا ہم کو تو ذمہ دار ہستیوں سے بھی پوری مدد نہ مل سکی۔ اس کا بڑا سبب یہ یقین تھا کہ وہ اپنے گھروں میں جم گئی ہیں۔ اور بھئی سچی بات یہ ہے کہ سیاسی ہستیوں سے تو ہم کو شکایت ہونا بھی نہ چاہیے چونکہ وہ اس خطرناک صورت حال کو نفسیاتی طور پر سمجھنے کی نااہل ہیں۔ یہ سیاسی لوگ جب اپنی بیویوں اور بیٹیوں کی نفسیاتی کیفیت کبھی نہ سمجھ سکے تو پرائی بہو بیٹیوں کو کیا جان سکیں گے۔

لیکن ہم سب کام کرنے والی عورتیں ہیں اور عورت ہی عورت کے جی کا حال اس کی مشکلیں اس کی آئندہ زندگی کی دشواریاں اور گھریلو دقتوں کو سمجھ سکتی ہے۔ اس عورت کی نفسیاتی کیفیت کسی مرد کی سمجھ میں کیسے آسکتی ہے جو اتنے خراب اور شرمناک حالات میں نئی نسل اور نئی قوم کو جنم دے رہی ہو۔

اس معاملہ میں ہم سب کی لیڈر مردولا[1] تھیں۔ وہ بہت ہی مستعدی و بے قراری کے ساتھ ہندوستان و پاکستان کے مختلف حصّوں میں دوڑ دھوپ کر رہی تھیں تاکہ

---

[1] مغویہ لڑکیوں کی بازیابی میں الجھتے ہی سبھدرا کے اور میرے و مردولا بہن کے راستے ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ ہماری سوشل اور سماجی دلچسپیاں بڑھ گئیں اور سبھدرا کی سیاسی سرگرمیاں۔

حکومت عوام اور نوکر شاہی کا تعاون حاصل کر سکیں۔ بڑی کوشش سے انھوں نے مہاراجگان کو اپنی بات ماننے پر مجبور کر دیا۔

مارچ ۱۹۴۸ء سے لے کر شاید ستمبر ۱۹۴۸ء تک لڑکیوں کو برآمد کرانے کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ اور ستمبر ۱۹۴۸ء میں ساری لڑکیاں جن کے رشتہ دار نہ مل سکے تھے ان کو پاکستان بھیج کر دہلی میں کیمپ ختم کر دیا گیا تھا۔ پھر مجھے نہیں معلوم کیا ہوتا رہا کیوں کہ تھک کر میں نے بھی دو تین ماہ کے لیے دہلی چھوڑ دی تھی۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں مجھے معلوم ہوا کہ پھر دونوں حکومتیں طے کر رہی ہیں کہ از سر نو کام شروع کیا جائے اور ایک فرقہ کی جو لڑکی دوسرے فرقہ والے کے پاس ہو بلا رو رعایت کے برآمد کر لی جائے۔ دہلی میں اس پروگرام پر دوبارہ فروری ۱۹۴۹ء سے عمل شروع ہوا۔ ویسے تو میرا اندازہ تھا کہ کم از کم پندرہ سو لڑکیاں دلّی کی غائب ہوئی ہیں لیکن یہ صرف قیاس تھا۔ ہمارے پاس نہ تو مکمل اعداد و شمار تھے نہ اب تک کوئی تفصیلی رپورٹ ہمیں ملی تھی۔ دوسرے نئے آنے والے ملک کے مختلف حصوں میں منتشر ہو چکے تھے اس لیے تلاش کرنا آسان کام نہ تھا۔ مگر حکومتوں کا فیصلہ تھا کہ اس سیاسی لوٹ اور اغوا کو کسی حالت میں جائز نہ سمجھا جائے۔

بہت کافی تعداد پہلے واپس لائی جا چکی تھی اور اب دلّی میں بہت قلیل تعداد باقی رہ گئی تھی۔ لیکن ہم سب کو باپو کا کہنا یاد آ رہا تھا۔ وہ تو حاملہ عورتوں اور بچّہ والی عورتوں تک کو واپس لانے کے حق میں تھے۔

دونوں حکومتوں نے طے کر لیا کہ تمام لڑکیاں اکٹھی کر کے جالندھر بھیجی جائیں گی جہاں ہندوستان و پاکستان کے مقرر کردہ افسران کا ٹریبونل بیٹھ کر فیصلہ کیا کرے گا کہ کس کو ہندوستان میں عزیزوں کے سپرد کیا جائے اور کسے پاکستان بھیج دیا جائے۔

بعض اوقات ہمارے پاس ایسی لڑکیاں بھی آ جاتی تھیں جن کے متضاد بیانات کی وجہ سے یہ جاننے میں بڑی دقت پیش آتی کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ ٹریبونل اس پر بھی سوچ وچار کرتا تھا اور ایسی لڑکیاں زیادہ تر وہ ہوتیں جو نانک منڈلی طوائفوں کے اڈہ یا بدمعاش عورتوں کے ہتھے چڑھ گئی تھیں۔ وہ اوباشی کی زندگی میں اتنی رچ بس چکی تھیں کہ ان کے مذہب و قوم حتیٰ کہ جنس تک میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد اخبارات اور عوام نے یہ الزامات بھی لگانا شروع کر دیے کہ

لڑکیاں زبردستی اٹھالائی جاتی ہیں جبکہ وہ آنا نہیں چاہتیں۔ انھیں مجبور کر کے عزیزوں کے پاس بھیجا جاتا ہے حالانکہ وہ اپنے نئے ماحول سے مانوس ہو چکی ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کی کارکن خواتین حکومتوں کو خوش کرنے کے لیے عوام کے بسے ہوئے گھر اجاڑ رہی ہیں۔ ہندوستان میں پروپیگنڈا کیا جاتا تھا کہ مسلم لڑکیوں کے بدلے ہندوؤں کی بیاہتا عورتیں اٹھالائی جاتی ہیں اور پاکستان میں یہ کہ ہندو لڑکیوں کے بدلے مسلم لڑکیاں چھینی جارہی ہیں۔

اس کا جواب گورنمنٹ دیتی یا افسران دیتے۔ جو کچھ ہو رہا تھا یہ دونوں حکومتوں کا سمجھوتہ تھا اس لیے اس پر عمل درآمد کرنے میں مدد کرنے والے کسی حالت میں بھی مورد الزام قرار نہیں پا سکتے۔ لیکن یہ واقعہ تھا کہ پبلک آج بھی اس کام کی اہمیت اور ان واقعات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی خرابیوں سے ناواقف ہے۔

ممکن ہے کبھی کبھار اس سلسلہ میں غلطیاں بھی ہوئی ہوں۔ اور مجھے تو ایک بہت ہی صاف وصریح کا بھی علم ہے جس پر ہمیں آج تک سچے دل سے افسوس ہے۔ اگرچہ تیسرے ہی دن غلطی کی تلافی ہو گئی لیکن بدنامی تو ہو ہی چکی تھی۔ غلطی ہم میں سے کسی کی بھی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ وہ بڑی بھی تھی لیکن اس سے بڑی تو نہ تھی کہ کانگریس کی ذمہ دار ہستیاں گاؤں کی اُس مسلم لڑکی کے نمبر دار کے گھر میں موجود ہونے سے واقف ہوں اور پھر بھی اس کو مسلمانوں کے حوالہ نہ کریں۔ وہ پائی کو پکڑنے میں مدد بھی نہ کریں اور کانگریس کے نام پر دھونس جما کر ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کریں۔

شاید عوام یہ بھول جاتے ہیں کہ برادری کے بندھن توڑ کر کسی بیرونی عورت کو اپنانا ہندوستانیوں کی قدیمی روایات اور نسلی غرور کبھی گوارا نہ کرے گا۔ جوان آدمی سب بے عنوانیاں کر سکتے ہیں لیکن اپنی غیر کفو اولاد کے ساتھ شادی بیاہ کرنے پر وہ سماج کے کسی فرد کو مجبور نہیں کر سکتے۔ نہ اس عورت کو بیاہتا عورت کے برابر رتبہ کبھی اپنے گھر والوں سے دلا سکتے ہیں۔ رواج اچھا ہو یا برا لیکن یہ حقیقت ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج بھی ملک کے تقریباً ہر حصہ میں لوگ اس پر عمل کر رہے ہیں اور اس چیز کو ان کے دل سے نکالنے کے لیے ابھی کم از کم پچیس سال کی ضرورت ہے۔

کام کرنے والی سب مائیں اور بہنیں ہیں اور ان کے سامنے ایسی نظریں موجود

ہیں کہ اگر دو میاں بیویوں میں نا اتفاقی ہوتی ہے تو اولاد زیادہ تر ناکارہ، مخبوط الحواس کند ذہن اور آوارہ بن جاتی ہے۔ اس نا اتفاقی کا اثر صرف مرد اور عورت تک محدود نہیں رہتا۔ زندگی میں ہم آہنگی نہ ہونے کا اثر براہِ راست اولاد پر پڑتا ہے۔ ماں کی دماغی کوفت بچّے کو جسمانی یا روحانی طور پر نااہل بنا دیتی ہے۔

ہم نے ان طوائفوں کا حال بھی دیکھا ہے جو فطری اصولوں سے انحراف کی بدولت خوفناک نقصان اٹھاتی ہیں۔ کتنی جلد وہ جوانی کو مسل کر پیچھے پھینک دیتی ہیں اور ان میں کی زیادہ تعداد اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اکثر وہ گندی جنسی بیماریوں میں مبتلا ہو کر دردناک زندگی گذارتی ہیں۔

اور پھر ہم نے کمسنی کی شادی کے نتائج بھی تو دیکھے ہیں ہمیں معلوم ہے کہ ۱۵ سال سے پہلے شادی ہو جانے والی لڑکیوں میں ۹۵ فیصدی انیمیا۔ دق اور اندرونی بیماریوں کا شکار بن کر "پا بدست دگرے دست بدست دگرے" زندگی کی گاڑی کھینچتی رہتی ہیں۔

ہم نے دیہاتوں اور شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں ایسے واقعات بھی دیکھے ہیں جب اتفاقی حادثات غربت یا بدمعاشوں کے پھندے میں پھنس کر دس بارہ سال کی لڑکیاں ساری عمر کے لیے اپنی نسوانیت، حیا اور فطری جوہر کھو بیٹھتی ہیں اور وہ مستقل جنسی بھوک بن کر رہ گئی ہیں۔

گندم از گندم بروید جوز جو

ہم مائیں ہیں اور ہمارا اپنا تجربہ بھی ہے کہ وہ زمانہ ایک ماں کے لیے کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ جب بچہ پیٹ میں ہو اور ماں دماغی، ذہنی اور روحانی کرب میں سارے وقت مبتلا رہتی ہو۔ دردناک ماضی اور تاریک مستقبل رکھنے والی ماں کبھی دماغی طور پر صحت مند بچہ کو جنم نہیں دے سکتی۔ یہ بچہ ہمیشہ سوسائٹی کے لیے بوجھ اور مصیبت بنتا ہے۔ وہ اپنی قوم کے لیے صرف تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ ماں کا دماغی ہیجان پورے کا پورا بچّہ میں منتقل ہو کر ایک ایسے انسان کو دنیا کے سر پر نازل کر سکتا ہے جو ظالموں اور خونخواروں کا نام لیوا ہو۔

اور پھر آوارہ گرد لاوارث عورتوں اور بدمعاش بہکی ہوئی لڑکیوں کے حرامی بچے دیکھ کر ہم اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکے ہیں کہ یہ صرف چور ڈاکو۔ دغا باز اور بدمعاش ہی بن سکتے ہیں۔ ان کی تخلیق کے وقت والدین کی جو اخلاقی حالت تھی اس کا اتنا

خوفناک اثرات پر پڑتا ہے کہ کوشش کے باوجود ہم میں سے کوئی ان کو سدھار نہیں سکا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے بچے اکثر جنسی حیثیت سے بھی نااہل مجنوں اور مجہول ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہمارے پاس یہ یقین کرنے کی کافی وجوہات تھیں کہ پچھتر فیصدی لڑکیاں اب تک ہاتھوں ہاتھ بیچی جارہی ہیں۔ کمسن لڑکیاں ابھی تک نہ مستقل ہو سکی ہیں اور نہ ابھی کئی سال تک ہو سکیں گی۔ ان کی جوانی سیکڑوں اور ہزاروں کے مول بک رہی ہے اور حریص مرد کچھ دن ان کو رکھنے کے بعد پیسہ کمانے کی بات سوچنے لگتا ہے۔

البتہ بیس سے تیس اور چالیس سال تک کی عورتیں اکثر مستقل ہو گئی ہیں۔ وہ اپنی کوشش شدید مزاحمت یا بچوں کی بدولت گھروں میں جم کر ٹھہر گئی ہیں۔ لیکن کمسن لڑکیاں بچہ پیٹ میں ہو جب بھی بیچ دی جاتی ہیں۔ اور کسی کا بچہ کسی دوسرے کے گھر جاکر پیدا ہوتا ہے۔ اگر پڑھنے والے حساس دل رکھتے ہیں تو اس ماں کی دلی کیفیت کا اندازہ کریں کہ اس پر اس واقعہ سے کیا بیت گئی ہوگی اور اس کسمپرسی نے انتہائی نراشش مایوسی اور کشمکش پیدا کر کے کتنی بار اسے خودکشی کرنے پر مجبور کیا ہو گا۔ کیا بچہ ان اثرات سے بری ہو گا؟ مرد و عورت دونوں بچہ چاہتے ہیں۔ اپنی نسل اور اپنے خاندان کو برقرار رکھنے کے لیے انھیں نئے انسان کی ضرورت ہوتی ہے اور عورت یہ سب مصیبتیں اٹھاتی ہے۔ صرف دو محبت بھری آنکھوں کے سہارے پر شرکت کی تمنا اس کی فطرت ہے۔ ساتھی نہ ہو تو ساتھی کی خوشگوار یادہی۔ ماضی کے خوش کن تصورات سہی۔ یہ بھی اس کا سہارا بن سکتے ہیں لیکن جب خیال اور تصور بھی بھیانک ہو تو اتنا بڑا بوجھ وہ کیسے اٹھائے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں جننا۔ پالنا۔ محبت کرنا سب کچھ اس کی فطرت ہے لیکن یہ بہت بڑا بوجھ ہے اس کو آج تک اس نے تنہا کبھی نہیں اٹھایا ہے اور جب اکیلے یہ مصیبت اس کے سر پڑجاتی ہے تو وہ دوسرے کو دے کر گلو خلاصی حاصل کر لیتی ہے۔ میں نے اکثر دیکھا کہ لڑکیاں آتے کے ساتھ ہم سے کہنا شروع کر دیتی ہیں کہ ان بچوں کو ان کے باپوں کے حوالہ کرو۔ ہم ان کو نہیں رکھ سکتے۔

اس میں بہت کچھ سماج کا خوف اور اپنے کنوارپنے کی حیا بھی ہوتی ہے لیکن یہ کہتے وقت پس منظر میں کوئی محبت دلکشی یا رنگینی تو ہوتی نہیں ہے اس لیے وہ صرف بچہ کو لپٹا کر پیار کرتی ہیں۔ روتی ہیں اور ہم سے کہتی ہیں اس کو دے دو۔ وہ جی جائے۔

بڑا ہوگا تب کبھی ہم سے مل لے گا لیکن ہم اسے لے کر نہ جائیں گے یا تم رکھ لو۔

بدقسمتی سے شروع میں ہم نے اس طرف توجہ نہ کی اور باقاعدہ ریکارڈ نہ رکھا جو صحیح اعداد و شمار ہمارے پاس ہوتے اور اس وقت اندازہ ہو سکتا کہ کتنی عورتیں اب تک عزت دار گھر والی بن سکی ہیں اور کتنی ابھی تک تھالی کا بینگن بنی ہوئی ہیں۔ لیکن دو مہینے کے واقعات اور حالات جمع کر کے میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں اور دماغ میں جو پچھلے اعداد و شمار پڑے ہوئے تھے ان کی بنا پر میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ وقتاً فوقتاً جو مبہم سا ریکارڈ جمع ہوتا رہا اس سے بھی میرے نظریہ کی تصدیق اور اندازہ کی صحت ثابت ہوتی ہے۔

ہمارے سامنے اس وقت بھی دو لڑکیاں موجود ہیں۔ ان میں ایک کی عمر سترہ سال کی ہوگی اور دوسری کی بمشکل چودہ برس کی۔ سترہ سال کی لڑکی بیک وقت دو مردوں کے پیسے سے خریدی گئی اور دونوں کی مشترکہ دلچسپیوں کا کھلونا بنی چودہ برس کی لڑکی اب سے دو سال پہلے اس مصیبت کا شکار ہوئی جب کہ اس کی عمر صرف بارہ سال کی ہوگی اور آج وہ خاموش سوالیہ نشان بنی ہوئی میرے پاس بیٹھی ہے۔ اس کی وحشت انگیز پھٹی ہوئی آنکھیں مجھ سے پوچھتی ہیں اور ہر انسان سے سوال کرتی ہیں کہ بتاؤ میں کیا ہوں؟

اس کے پاس کہنے کے لیے کوئی بات باقی نہیں رہ گئی ہے نہ دل میں کوئی امنگ باقی ہے نہ جسم میں پھرتی ہے۔ نہ دوشیزگی کا الھڑپن۔ نہ جوانی کی رعنائی۔ کیا پڑھنے والے ہمیں بتا سکتے ہیں کہ ان کو واپس لا کر ہم نے پاپ کیا ہے؟ یا نہ لاتے تو گناہ تھا؟

اس میں کوئی شک نہیں اختری اور اس جیسی دوسری لڑکیاں اکثر ہمارے دل میں کھٹک درد اور بے چینی پیدا کرتی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بہت قلیل ہے پھر ہم ان نابالغ لڑکیوں کی مرضی اور خواہش پر ان کے والدین کے ہوتے ہوئے عمل بھی کس طرح کر سکتے ہیں۔ کوئی قانون ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اور سب جانے دیجیے ان حالات کی روشنی میں اس پس منظر کو دیکھتے ہوئے ہمارے پاس اس کے علاوہ اور چارہ کار ہی کیا ہے کہ سختی کے ساتھ اس پاپ کو مٹا کر غنڈہ گردی ختم کریں۔ ورنہ ہمیشہ اندیشہ ہے اور اب روز بروز ایسے اتفاقات بھی پیش آ رہے ہیں کہ یہ بری عادت ترقی کر کے دوسرے فرقہ کے بجائے ایک ہی فرقہ کی عزت و حرمت برباد کرائے گی ہمارے پاس ریلوے اسٹیشن سے کئی لڑکیاں لائی گئیں[1]

---

[1] ان لڑکیوں کو شاید ریلوے اسٹاف یا غنڈوں نے اسٹیشن پر روک رکھا تھا۔

وہ سب کی سب ہندو تھیں۔ اکثر کیمپوں میں ایسے حادثات ہو جاتے ہیں کہ کسی کی بیٹی کو کوئی بھگا لے گیا۔ مصیبت کے زمانہ میں اس اخلاقی گراوٹ کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ حالات نے عوام کو دلیر غنڈہ اور بے رحم بنا دیا ہے اور یہ نہ صرف لیڈروں اور حکومت کا بلکہ ہم سب کا فرض ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے اس صورت حال کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔

عورتیں اس میں بڑا حصّہ لے سکتی ہیں، وہ گھروں سے درستی کا آغاز کریں تو جڑ ٹھیک ہوتے ہی شاخیں آپ ہی ہری ہو جائیں گی اور اسی لیے ہم یہ سب کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا[1] کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن میرا خیال ہے اس وقت تک چلنا چاہیے جب تک کہ ایک بھی لڑکی ان شرمناک حالات میں گرفتار ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ ان میں اکثر اب خطرناک گندی بیماریوں میں مبتلا ہو گئی ہیں جن کا علاج کرنا اور ان کی زندگی سدھارنا بڑی توجہ کا کام ہے۔ لیکن مشکلوں سے گھبرا کر ہندوستان کا مستقبل تو برباد نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں جنون، دق اور دوسری بیماریاں بھی پھیل گئی ہیں اور نیم پاگل تو بہت سی ہیں لیکن عوام اور حکومت مل کر اس بیڑے کو پار لگا سکتے ہیں۔ ان کی زندگیاں اس طرح سدھر سکتی ہیں کہ گورنمنٹ کے اسپتالوں[2] کو ایسی لڑکیوں کے علاج پر خاص توجہ دلائی جائے۔ ایسے اسکول، سلائی کے سنٹر، گھریلو دستکاریاں سکھانے کے ادارہ قائم کیے جائیں جہاں سال دو سال ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد وہ اپنی روزی آپ کما سکیں۔ بچوں کی نگہداشت، نرسنگ اور گھریلو کاموں کی تعلیم ان کو ملے تاکہ وہ عزت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔

انڈین گورنمنٹ نے تو ایسے بہت سے ہوم کھول رکھے ہیں جو اس سلسلہ میں مفید خدمات انجام دے رہے ہیں یقیناً پاکستان گورنمنٹ نے بھی ... یہی سب کر رکھا ہو گا۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی قابلِ وثوق اطلاع نہ مل سکی۔ پتہ نہیں ان لڑکیوں کا کیا حشر پاکستان

---

[1] ۱۹۵۵ء تک اغوا شدہ لڑکیوں کی بازیابی کا سلسلہ چلتا رہا۔

[2] سیکڑوں بیمار لڑکیوں کا بعد کو علاج ہوا اور ایسے سنٹر و ادارہ بھی کھولے گئے۔ اسپتالوں میں پوری توجہ سے ان کا علاج بھی کرایا گیا۔ بعض لڑکیوں کو ایک ایک سال تک انجکشن کے کورس دلوانے پڑے۔

جا کر ہوتا ہے جنھیں ہم بھیج رہے ہیں۔ کم از کم مجھے تو اس خیال سے بے چینی رہتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے باشندے جب اپنے ملکوں سے روانہ ہوتے ہیں تو شاید قسم کھا کر چلتے ہیں کہ اس غیر سرزمین پر ہم ایک لفظ سچ نہ بولیں گے۔ جو بات کہیں گے جھوٹ۔

مجھے اس وقت ایک نیم پاگل لڑکی یاد آرہی ہے۔ پتہ نہیں وہ کہاں کی تھی اور کہاں سے آئی۔ پولیس اسے پکڑ کر یوپی کے کسی حصّہ سے لائی تھی۔ لیکن وہ بمبئی۔ احمد آباد پنجاب اور امرتسر سب کے نام لیتی تھی اور داستان کے مختلف ٹکڑوں کو ان تمام شہروں میں بکھیر کر معنی خیز انداز سے مسکرایا کرتی تھی۔ اس کے پاس ایک ریشمی رومال تھا جسے وہ کبھی سر پر لپیٹتی تھی، کبھی گلے میں۔ کسی وقت اس سے منہ پوچھتی اور کبھی اسے سینہ میں چھپالیتی تھی، اور جب سر میں درد ہوتا تو پٹی بنا کر اس کو ماتھے پر باندھ لیا کرتی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ گلاب بانو یہ رومال تجھے کہاں سے مل گیا۔

گلاب[1] نے اپنی بڑی بڑی پھٹی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں، مسکرائی اور کہا "یہ مجھے نیادر نے دیا تھا"۔

نیادر کون تھا؟ اس سوال پر وہ آنکھ جھپکا کر اس انداز سے "وہی" کہتی جیسے وہی اپنا محبوب نیادر اور کون، ہفتوں تحقیقات کرنے کے بعد میں صرف اتنا جان سکی کہ اس کو بمبئی سے لانے والا ایک شخص نیادر تھا جس نے اس سے شادی کی۔ پھیرے پڑے یا نکاح ہوا اس میں کوئی چیز یقینی نہ تھی۔ دونوں ہوئے یا ایک صورت ہوئی۔ بہر حال فسادات شروع ہوئے اور اس میں وہ دوسرے لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی اور ایک سے دوسرے تک پہنچتی ہوئی ڈیڑھ سال بعد وہ یہاں آگئی۔ کمسن ۱۴ سالہ لڑکی یہ ہیجانی دور برداشت نہ کر سکی اور اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی۔

نیادر کا رومال، پہلی محبت کی یادگار۔ ماضی کی نشانی۔ اس کے گلے سے لپٹا رہ گیا اور باقی سب کچھ کھو گیا۔ ایک سال کے اندر بہت سے لوگ اس کی زندگی میں آئے لیکن وہ نیادر نہ تھے۔ اس لیے وہ تو اب اسی کے پاس جانا چاہتی ہے۔

---

[1] نام بھی مشتبہ تھا۔ وہ اس میں بھی کبھی کبھی تبدیلی کر دیتی تھی لیکن زیادہ تر یہی نام بتایا کرتی تھی۔

وہ بہت ہی اطمینان و سکون سے مسکرا مسکرا کر اپنی کہانی سنایا کرتی تھی اور کہتی تھی۔" نیا در نے کہا" ۔ لگی تو اس طرح کیوں پھر رہی ہے ۔ آ میرے گھر چل میں تیرے ساتھ شادی کر لوں اور پھر جوتی اچھے کپڑے سب لا کر اس نے بیاہ کر لیا اور جب وہ بیمار پڑی تو نیا در نے بہت علاج اس کا کیا ۔ پھر کچھ اور ہو گیا جس کے بعد اسے بہت سے نام یاد آتے ہیں لیکن واقعات اور ان کا تسلسل سب غائب ہو جاتا ہے ۔

ایسی بہت سی نیم پاگل لڑکیاں ہیں ، جو صرف ہنستی رہتی ہیں ۔ شاید ہم سب پر ، ملک پر ، اس دیش کے باشندوں پر ، اس مذہب پر اور مذہب کے علمبرداروں پر ، حکومت پر اور اس کے قانون پر اس آزادی پر اس کی ضوفشانیوں پر ۔ کیا پتہ وہ کس چیز پر ہنستی ہیں ۔

22

روشنی

لیکن میں تو اس ویرانے میں انسانوں کو ڈھونڈھ رہی تھی اور یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ انسانیت بالکل ختم ہو گئی یا باقی ہے اور خوشی ہوئی جب کوڑے کباڑ کے ڈھیر میں مجھے دو چار موتی چمکتے نظر آ گئے۔

گجرات ٹرین کے بچے کھچے مسافروں میں ایک معزز ہندو خاندان کی بیوہ بھی تھی۔ امیر کبیر شوہر کی بیوی۔ کئی جوان بچوں کی ماں۔ اپنا زیور اور روپیہ بدن کے کپڑوں میں چھپا کر پاکستان سے ہندوستان آنے کے لیے سوار ہوئی۔ شوہر ساتھ تھا۔ عزیز تھے بہت سے دوسرے مسافر تھے۔ گجرات اسٹیشن راستہ میں پڑتا نہ تھا بلکہ گاڑی صرف اسی لیے وہاں لے جائی گئی اور پوری گاڑی میں قتل عام ہوا بمشکل چند زندہ یا زخمی بچ سکے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا شوہر اور دوسرے لوگ مارے گئے۔ ذرا اس پچاس سالہ عورت کی مصیبت پر غور کیجیے اس کی آنکھوں کے سامنے لاشیں تڑپتی رہیں اور وہ زندہ رہی۔ اسی پر بس نہیں۔ اس کو گاڑی سے اتار کر زیور اور روپیہ کے ساتھ ہی بدن کے کپڑے بھی پٹھانوں نے چھین لیے۔ بہت خوشامد اور اپنے ساتھیوں میں سے کسی کی سفارش پر تھوڑا سا کپڑا پہننے کو دے دیا گیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے قریب کے گاؤں میں لے گئے۔

ہندوستان کی ماں اپنے بیٹوں کے ہاتھوں گلیوں کوچوں میں بے عزت ہو رہی تھی۔ اب وہ بیچی جانے والی تھی۔ اس بڑھاپے میں اس کے اپنے دیس میں یہ بربادی

---

1. پاکستان سے ہندوؤں کو لے کر آئی ہوئی وہ گاڑی جو گجرات لے جا کر کاٹ دی گئی تھی بمشکل دو چار آدمی لاشوں کے بیچ زندہ رہ گئے تھے۔

ہو رہی تھی۔ برہنہ جسم اور زخمی سینہ لیے ہوئے وہ دیہات کے گلی کوچوں میں پا بدستِ دگرے دست بدست دگرے گھسٹتی رہی اتنا بڑا واقعہ۔ ہزاروں آدمیوں کا قتل عام۔ کیا پاکستان پولیس کو خبر نہ ہوئی ہوگی۔ وہ آئی بھی ضرور ہوگی مگر لٹیروں کو پکڑ نہ سکی عورتوں کی بے عزتی کو روک نہ سکی اور برہنہ جسموں کو کپڑے نہ دلوا سکی۔ لیٹرے پٹھان اسے بیچنے کی کوشش میں بیسیوں گھروں میں گئے۔ دیکھنے والے ہنستے۔ مضحکہ اڑاتے کہ اس بڑھیا کو کون مول لے گا لیکن اس کی فریاد اس کے آنسوؤں کی سرخی کسی کی حسِّ شرافت کو بیدار نہ کر سکی۔ جانوروں کے اس ریوڑ میں ایک بھی تو انسان نہ نکلا۔ انسانیت چیختی رہی۔ مامتا فریاد کرتی رہی اور پٹھانوں کو پیسے نہ ملے اور اب وہ جھنجھلا گئے۔ شاید اب وہ اسے مار دیتے مگر دنیا ابھی انسانوں سے خالی نہ ہوئی تھی۔ تین غریب انسان اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے پٹھانوں سے کہا کہ بھائیو۔ کیوں اس بڈھی مائی کی رسوائی کرتے ہو۔ جو کچھ پیسہ ہمارے پاس ہے۔ لے لو اور اسے چھوڑ دو۔ پٹھانوں نے اس کی حیثیت دیکھ کر صرف بیس روپے مانگے۔

ان غریبوں کے پاس اتنے بھی نہ نکل سکے۔ تینوں نے اپنی جمع پونجی اکٹھی کی تو کل پندرہ روپیہ ٹھہرے، مگر پٹھان نہ راضی ہوئے۔ مجبوراً انھوں نے بقیہ رقم قرض یا چندہ کرکے انھیں دی اور مظلومہ کی گردن چھڑائی۔ یہ تھا وہ گردن چھڑانا جس کا حکم قرآن نے ان الفاظ میں دیا ہے۔

وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ط ۔ (آیۃ قدسی)

اتنوں میں صرف تین بھلے انسان اور سچے مسلمان جنھوں نے آدمیت کی لاج رکھ لی۔

بچاری غمزدہ عورت۔ بھوک تکلیف محنت اور غم کے مارے نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ تین دن ان خدا ترس بندوں نے اس کو اپنے جھونپڑے میں آرام سے رکھا۔ کھلایا پلایا اور تین دن کے بعد اس کو لے جاکر واگہ (سرحد) میں انڈین پولیس کے سپرد کر آئے کہ اسے دہلی پہنچا دیا جائے جہاں وہ اپنے رشتہ داروں سے مل سکے۔ چلتے وقت انھوں نے اس کے ہاتھ پر پانچ یا سات روپیہ بھی رکھے اور بڑے دکھ کے ساتھ کہا کہ مائی ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ تھوڑی سی پونجی تمھارے راستے کے لیے ہے۔ اس کو قبول کر لو۔

اور یہ واقعہ " صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے "چشم بصیرت اگر ہو تو حیوان و انسان کا فرق دیکھ لیں۔ میں نے بے کم و کاست اس کی زبان سے سنا ہوا نقل کیا ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ دلّی کے ایک گاؤں میں پیش آیا۔ حسبِ معمول لڑکیوں کا ایک غول اپنے اعزہ اقربا کے ساتھ ساتھ گاؤں سے دہلی کی طرف چلا مگر پولیس پیچھے رہ گئی اور گاندھی نگر کے سامنے والے میدان میں کئی ہزار گوجروں اور ان کے حمائیتوں نے حملہ کر دیا اور سارا میدان ان کے خون سے لالہ زار بنا دیا گیا۔ لاشیں تو سب اٹھالی گئیں اور کچھ مردوں اور عورتوں کو بچا کر پولیس کیمپ پہنچا آئی۔ مال غنیمت میں ایک کمسن تیز طرار لڑکی کسی گوجر کو بھی ملی۔ اس نے ہاتھ کے ہاتھ اسی وقت دوسرے کے ہاتھ دو سو روپیہ میں بیچ ڈالا۔ لڑکی قبول صورت مہذب اور کچھ پڑھی ہوئی بھی تھی۔ جب گوجر کے پاس یک گروہ پہنچی وہ عام لڑکی سمجھا مگر جب یہ دیکھا کہ کسی طرح ہتھے نہیں چڑھتی۔ ہاتھ بھی چھو لو تو مقابلہ اور ہاتھا پائی پر اتر آتی ہے تو اس نے مار پیٹ شروع کی۔ اس پر بھی قابو میں نہ آئی تو عاجز آ کر اس نے یہی طے کیا کہ گردن کاٹ دے۔ جھلایا ہوا اسے گھسیٹ کر جنگل کی طرف لیے جا رہا تھا کہ وہاں ختم کر دے۔ گاؤں کا ایک نوجوان دور سے یہ تماشا اور چیخ پکار دیکھ کر دوڑا۔ لڑکی کے چہرہ پر نظر پڑی تو دھک سے رہ گیا۔ ارے یہ تو پڑوس کے گاؤں والی لڑکی ہے۔ میرے دوست بابو خان کی بہن۔ دوست کی صورت آنکھوں میں پھر گئی۔ اور بیتے ہوئے دلوں کی یاد نے اس کو بے قرار کر دیا۔

گوجر سے اس نے کہا، یار اسے کیا کرے گا۔ یہ تو میرے دوست کی بہن ہے گوجر نے غصّہ سے جواب دیا " مار ڈالوں گا سسری کو "

نوجوان بولا۔ مجھ سے روپیہ لے لے اور اسے مجھ کو دیدے۔ سودا شروع ہو گیا۔ سو، دو سو سے گذرتا ہوا پانچ سو پر توڑ ہوا۔ نوجوان نے کہا۔ لے پانچ سو لے لے میں یہی سمجھ لوں گا میری ایک بھینس مر گئی۔ تو بھی کیا یاد کرے گا۔

نقدی اس کو دے کر لڑکی اپنے گھر لایا۔ گھر میں صرف اس کی ماں تھی۔ ابھی خود بھی بے بیاہا تھا۔ اس لیے لڑکی کا ہاتھ ماں کو پکڑا دیا اور اس سے کہا کہ اگر تیرا باپ اور بھائی یعنی میرا دوست مل گئے۔ زندہ ہیں تو تجھے ان کے سپرد کر دوں گا اور جو وہ مارے جا چکے ہیں تو پھر میں تیرے ساتھ شادی کر لوں گا۔ بس اب بے فکری سے یہاں رہ کوئی تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

اس کی ماں نے لڑکی کو تسلی دی۔ آرام سے رکھا۔ رات کو اپنے ساتھ لے کر سوتی تھی۔ اسے اپنے کنوارے بیٹے پر اعتماد تھا مگر ڈرتی تھی کہ پرائی بیٹی ہے۔

لیکن لڑکی دو تین ماہ ہوئے بیاہی جا چکی تھی۔ صرف ایک بار وہ اپنی سسرال گئی تھی اور اسے بڑا قلق تھا کہ میکہ سسرال کے وہ اچھے اچھے کپڑے استعمال کرنے کی بھی نوبت نہ آئی اور سب لٹ گئے۔ ۴ ماہ کے بعد پولیس بھیج کر میں نے اسے منگوایا سسرالی خاندان سارا کیمپ اٹھ آیا تھا اور وہی لوگ مطالبہ کر رہے تھے۔ لڑکی ان کے حوالے کر دی گئی۔

جب میں دوبارہ اس سے ملی ہوں تو وہ خوش خوش اپنے خیمہ میں بیٹھی تھی شوہر کا انتظار تھا۔ وہ ابھی پاکستان سے آیا نہ تھا۔

اور پھر کئی ماہ بعد صوبہ کا دورہ کرتے ہوئے میں اس گاؤں میں پہنچی تو دونوں بھائی بہن مجھے ملے۔ میں نے لڑکے سے پوچھا کہ تم اپنے اس دوست سے بھی ملے جس نے تمہاری بہن کو اپنی سگی بہن سمجھ کر چار ماہ عزت کے ساتھ رکھا اور جو بے چینی سے تمہارا منتظر ہے۔ ایسے دوست اس زمانہ میں جسے مل جائیں اس کی خوش قسمتی کا کیا کہنا۔ اس نے جواب دیا کہ میں کل ہی آیا ہوں۔ آج یا کل ملاقات کرنے جاؤں گا۔ مجھ سے بہن سارا حال بتا چکی ہے۔ انتہائی احسان فراموشی ہوگی اگر میں اس سچے کانگریسی کا ذکر نہ کروں جسے لڑکیوں کی تلاش کے سلسلہ میں بساطی منہار اور سبزی فروش کا روپ بھر کر شہر کے خطرناک حصوں میں بیسیوں کا پتہ لگایا اور رشتہ داروں کو اطلاع دی۔ وہ بظاہر بالکل عام کانگریسی تھے لیکن اس میں شک نہیں غیر معمولی خلوص نیک نیتی اور جفاکشی کے حامل تھے۔ وہ مجھ سے ایک مسلمان عورت اپنی مدد کے لیے مانگ رہے تھے تاکہ اپنے کام کو تکمیل تک پہنچا سکیں مگر یہ چیز میرے امکان سے باہر تھی۔ مسلمان عورت اور کام دو متضاد چیزیں تھیں!؟

ایک عورت ایسی نہ مل سکی جو صحیح انسانی جذبہ اور ترقی پسندانہ صحت و نظریہ کے ساتھ ہمارے ساتھ اشتراک عمل کرتی۔ اور اسی لیے ہم اس انتظام میں جس کی خامیاں آئے دن ہم کو نظر آتی تھیں، کوئی مداخلت نہ کر سکے۔ ساتھ ہی مجھے خوشی ہے کہ نوجوانوں نے ہماری مدد کی اور مایوسی جو نوجوانوں کی طرف سے ہمارے دلوں میں پیدا ہو گئی تھی بڑی حد تک ہمیں اس میں ترمیم کرنا پڑی۔ ریلیف کمیٹی کیمپ اور تعلیمی سرگرمیاں اور امن و امان کی پوری کوشش سب اس وقت نوجوانوں کی مرہون منت تھیں۔

23

انسان مر نہیں سکتا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزار کا پریشاں ہونا

"حیات و موت کا فلسفہ کتنے مختصر لفظوں میں چکبست نے بیان کر دیا لیکن یہ نہ سوچیے کہ یہ شعر صرف ایک انسان کی فنا و بقا کی تشریح کرتا ہے جبکہ قوموں کی زندگی اور ملکوں کی حیات بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ ان کی تعمیر بھی مختلف اور منتشر اجزار کے اتحاد سے ہوا کرتی ہے یہ متفرق اجزار بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان کو آپس میں منسلک کرنے والا کو مضبوط رشتۂ اتحاد ایک قوم، ایک ملک اور ایک سوسائٹی کی شکل میں ان کو متحد کر کے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ رشتہ کبھی مذہب و تمدن کا رابطۂ اتحاد ہوتا ہے کبھی کوئی زبردست شخصیت مضبوط تار بن کر ان اجزا کو گوندھ لیتی ہے۔ کبھی کوئی زندہ منصف نظامِ حکومت اور کبھی کوئی غیر ملکی ڈنڈا ان اوراق منتشر ظہور ترتیب کا باعث بنتا ہے۔

ہندوستان کا پرانا فرسودہ سماجی نظام ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔ اب سے پہلے یہاں بھی ایک ایسا نظام تھا اور اس کا ایک قدیمی ڈھانچہ تھا۔ کچھ مستقل اصول تھے۔ انسانیت کے لیے ان کا ایک خاص معیار تھا۔ مختلف نسل اور مذاہب کے لوگ یہاں بستے تھے۔ لیکن سوسائٹی ان سب کا مجموعہ تھی اور باہر کی دنیا میں وہ سب ہندی کہلاتے تھے۔ اگرچہ اپنی داخلی زندگی میں ان کا تخیل۔ مذہب۔ کلچر اور رسم و رواج ایک دوسرے سے جدا تھے لیکن اپنی سوسائٹی کے لیے انھوں نے کچھ انسانی برادری کے حقوق۔ کچھ اخلاقی اصول۔ کچھ آدابِ محفل اور کچھ مختلف تہذیبوں کو سمو کر انوکھی سی چیزیں بنا رکھی تھیں۔ جن کے بل بوتے پر وہ نظام صدیوں تک چلتا رہا۔ بھائی چارہ، انسانی برادری اور انسانیت کی منزلِ اعلیٰ کا ایک خدائی تصور بھی ان کے پاس تھا۔

اس سوسائٹی کا ایک صحیح نصب العین تھا اور اس کے حصول کی خاطر اس کے تمام افراد بہت سے بھلے کام کیا کرتے تھے اور وہ خدا کو پانے کے لیے بھی انسانی خدمت اور پاکیزگیِ اخلاق کو ذریعہ بناتے تھے۔

لیکن آج وہ نظام ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ ہمیشہ سے سنتی آئی تھی کہ جب کسی ملک میں انقلاب آتا ہے تو وہاں یہی ٹکراؤ ہوتا ہے۔ نئے نظریے پرانی قدروں سے ٹکراتے ہیں۔ جوانی بڑھاپے سے دست و گریباں ہو جاتی ہے اور تعمیر و تخریب میں ایسی ہی جوتی بیزار ہوتی ہے لیکن انقلاب اپنی آخری منزلوں سے گزرتے ہوئے بڑھاپے کی سوجھ بوجھ اور تعمیر و تنظیم کی سنجیدگی سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ اس مرحلہ پر ٹھیراؤ کے بعد کوئی جمہوری حکومت اور کوئی ترقی یافتہ سماج شاد و آزاد افراد ابھر آتے ہیں۔ اور بڑھاپا۔ قدامت۔ تخریبی طاقتیں اور سرمایہ سب جوانی کے آگے سرنگوں ہو جایا کرتے ہیں۔

بہت دنوں سے ہمارے ترقی پسند بھی ڈھول پیٹ رہے تھے کہ انقلاب آ رہا ہے۔ کمیونسٹ جوانی کا لال پرچم اڑا رہے تھے اور کانگریس جمہوریت کا راگ الاپ رہی تھی۔ روحانیت اور اخلاق کا درس ہندوستان کو دے رہی تھی۔ اور اب وہ سارے نئے ادبی رجحانات۔ وہ ترقی پسندی کی اڑانیں۔ وہ خون تھوک اور گولی بارود والی شاعری وہ زندگی سے قریب اور ادب برائے زندگی والے روشن تصورات صرف مرثیہ خوانی کر رہے ہیں اور دکھا رہے ہیں کہ ؎

فسانہ در فسانہ ہیں یہ سرخیاں حیات کی

لیکن آج رہ رہ کر یہ سوال دل میں اٹھتا ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ یہ انقلاب تو نہیں ہے انقلاب کا آغاز ہے نہ انجام اس کو کیا کہنا چاہیے ؎

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

انقلاب میں تو زندگی ہوتی ہے اور اس ہنگامہ میں زندگی سے زیادہ موت کی جھلک ہے۔ انقلاب جوان سرفروش اور ترقی پسند ہوتا ہے۔ یہاں تو بڑھاپے کا رعشہ، بزدلی اور قدامت پسندی نظر آ رہی ہے۔

کچھ لوگ اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگے ہیں "کہ خیر بھئی شکر ہے۔ اب تو امن نصیب ہوا" لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ صرف ان کی خوش فہمی ہی نہ ثابت ہو مجھے تو ایسا لگتا ہے ابھی اس کا ردِعمل اور اس کرنی کا پھل بھی ہمیں بھوگنا باقی ہے۔ اس جرم

کی سزا ابھی تو بھگتنا ہے اپنی اولاد اور اس کے بگڑے ہوئے بہکے ہوئے دماغوں کی بدولت گھروں کا امن وسکون بھی درہم برہم ہونا ہے اس نئی نسل کے ہاتھوں انسانیت کی بچی کھچی عمارت کے آثار بھی منہدم ہوں گے۔ اگر ہم نے جلد توجہ نہ کی۔ فوراً خبر نہ لی اور شدت کے ساتھ اسے محسوس نہ کیا تو ہمارے بوئے ہوئے کانٹے جھاڑیاں بن کر انسانیت کا دامن سالہا سال تک تار تار کرتے رہیں گے۔ اس باغ کے اندر اب گلاب نہیں صرف کیکر اور کٹیلے ہی اگیں گے۔

پچھلے حادثات کا ذہن انسانی پر بُرا اثر پڑا ہے۔ بڑوں اور امیروں سے لے کر متوسط طبقہ اور عوام تک سب کی دماغی اور اندرونی ساخت میں فرق آچکا ہے یہ فرق ہرگز نظر انداز کر دیے جانے کے لائق نہیں ہے بلکہ یہ خامی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں مذہب کی بنیاد پڑتی ہے جہاں سے انسانیت کی ابتدا ہوتی ہے۔

کوئی محکمہ۔ ادارہ۔ گھر اور مقام ایسا نہیں ہے جہاں تک اس دور کے ناقص اثرات نہ پہنچے ہوں۔ جیسے کالرا کے موسم میں ہوا پانی ہر چیز مسموم ہو جایا کرتی ہے اس وقت بالکل یہی حال سارے ملک کا ہے۔ نظم وترتیب کا ہر شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے۔ مذہب کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔ تہذیب وتمدن کی چولیں ہل چکی ہیں۔ پرانا سماجی نظام ختم ہو گیا۔ بڑا اچھا ہوا، آخر وہ کب تک زندہ رہتا۔ کوئی حد ہے۔ اس کو تو مرنا ہی تھا۔ لیکن اندیشہ اور افسوس تو یہ ہے کہ اب جو سماج بن رہا ہے وہ آدمیوں کی سوسائٹی نہیں، جانوروں کا جنگل ہوگا۔ انسانی برادری وحشیوں کے غول میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔

یہ صرف قیاس آرائی نہیں ہے۔ میں نے دِلّی کی گلیوں میں پھر کر۔ ریل کے مسافروں میں گھل مل کر۔ مسموم شہروں اور آدمیوں کی روداد سُن کر۔ گھروں میں عورتوں سے جی کی بات پوچھ کر اور بچوں سے ننھے منے سوال کر کے یہ نتائج اخذ کیے ہیں۔ اندازہ تھوڑا غلط ہو سکتا ہے لیکن واقعات کو جھٹلانا اور حقیقت کو غلط ثابت کرنا ناممکن ہے۔

شاید دسمبر ۱۹۴۷ء میں ایک روز پٹرول ٹنکی کے پاس اجمیری دروازہ کی طرف کار روکی گئی تو پاس ہی بہت سارے بچے ہاتھوں میں لانبی لانبی لکڑیاں لیے ہوئے گھیرا بنائے کسی کھیل میں مصروف تھے۔ میں نے سمجھنے کی کوشش کی کہ کونسا نرالا کھیل ہو رہا ہے۔ دیکھتی

۱؎ آج ستائیس سال بعد ان الفاظ پر غور کیجیے۔

ہوں تو تمام لڑکے مل کر اپنی لکڑیوں سے کسی فرضی شے کو پیٹ رہے ہیں اور چلاتے جاتے ہیں "مارلو، مارلو" "مرگیا" "ختم کردو" اور لگاؤ" "جلادو" وغیرہ وغیرہ

بیسیوں آدمی اس جگہ تھے، کسی نے نظر اٹھانے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ لیکن میرا احساس دل اور گہری آنکھیں اس پردہ میں کوئی اور ہی سین دیکھ رہی تھیں۔ ماردو۔ جلادو ختم کردو۔ وہ خود نہیں کہہ رہے تھے ان کے باپ بھائی رشتہ دار ان دنوں اسی کام میں مصروف تھے اور ان کے ننھے معصوم دماغ فرضی چیز کو پیٹ کر اپنے تصور میں جلاکر ختم کر کے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

عوام کا اخلاق جس سطح پر پہنچ گیا تھا اس کے بہتیرے نمونے قارئین اس کتاب میں دیکھیں گے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر میں ایک ذاتی واقعہ کا اور تذکرہ کردوں یہ واقعہ ۱۹۴۷ء کا نہیں ہے۔ فساد سے پورے دس ماہ بعد پیش آیا۔ اس وقت جب دنیا جانتی تھی کہ دلّی میں سب ٹھیک ٹھاک ہوچکا ہے اور گورنمنٹ بالکل مطمئن تھی کہ اس کا اسٹاف بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے۔ دلّی میں نئے چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر آگئے تھے۔

حتی الامکان کتنی ہی مشکلیں کیوں نہ پڑیں کسی افسر کو فون نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اکثر اوقات دوسروں کے اصرار سے یا ضرورت سے مجبور ہو کر کبھی کبھار خط لکھنا یا فون کرنا ہی پڑتا تھا۔ پولیس کے محکمہ میں چند بھلے افسران تھے جن کو کبھی کبھی متوجہ کرنے کی ضرورت پڑا کرتی تھی۔ لیکن دوبار کے سوا میری کبھی ہمت نہ پڑی تھی کہ دہلی کے ڈپٹی کمشنر یا چیف کمشنر کو فون کروں۔ ایک بار تو کیمپ کی ہڑتال کے سلسلہ میں دونوں افسروں کا دروازہ کھٹکھٹایا اور سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ایک مرتبہ کسی اور ضرورت سے ڈپٹی کمشنر کو فون کر کے اس کا حشر دیکھ لیا۔ کسی بات کی شنوائی کی امید نہ تھی اس لیے کچھ کہنا بیکار تھا۔ یہ بھی اندیشہ رہتا تھا کہ دونوں جگہ اسٹاف جس کی بدتمیزیوں سے عوام نالاں ہیں اور جس کی بدتہذیبی اور لاپروائی کی خود مجھے بھی شکایت تھی اور جن کے متعلق عام طور پر لوگ کہتے تھے کہ مسلمانوں کا نام سن کر گالی گلوچ پر اتر آتے ہیں کہیں مجھ سے بھی کوئی بدتمیزی ہی نہ کر بیٹھے۔ اس لیے اپنی عزت اپنے ہاتھ، کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ یہاں کے چپراسی زیادہ تر یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب دھوپ کھا رہے ہیں، ڈپٹی صاحب آرام کر رہے ہیں۔ سو رہے ہیں۔

میں یہ تو کسی طرح نہیں کہہ سکتی تھی کہ ان کو فوراً جگا دو۔ صرف حیرت کا اظہار کر کے رہ جاتی۔ کہ ارے ۴ بجے شام کو آرام کر رہے ہیں۔ گیارہ بجے دن تک دھوپ کھا رہے ہیں۔ لیکن اب تو نئے چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر صاحبان تشریف لائے تھے اور مجھے خیال ہوا کہ غالباً ان دونوں کو سونے کی عادت کم ہوگی۔ اجمیر اور سہارنپور[1] میں کچھ بہت چین کی نیند سونے کا موقع تو ان کو ملا نہ ہوگا اس لیے فون کر بیٹھی۔ چپراسی نے کہا وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔

ایک گھنٹہ بعد پھر فون کیا تو چپراسی نے سوال کیا۔ تم کون ہو؟ ... میری شامت میں نے کہہ دیا

..... بیگم شفیع ..... کہنے لگا اچھا ٹھیرو۔ دس پندرہ منٹ گذر لیے اور کوئی جواب نہ ملا تو میں نے پھر نمبر ملایا۔ اب کی بار بھی وہی بولا کہ وہ تو آرام کر رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ تم جا کر ان کو خبر تو کرو۔ بھلا ۷ بجے شام کو سونے کا کوئی وقت ہے نئے چیف کمشنر اس وقت نہیں سوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے .... کہنے لگا اچھا ٹھیرو ...... اب کی بار اس نے بیس پچیس منٹ انتظار کرایا۔ کام ضروری تھا اور مجھے آج ہی بات کہدینی تھی اس لیے پھر کوشش کی تو جواب ملا۔ میٹنگ میں چلے گئے۔

اپنی غرض تھی۔ اتنی ناکامی کے بعد بھی تھکی نہیں اور ایک گھنٹہ ٹھیر کر پھر نمبر ملایا۔ لیکن اب کی بار چپراسی مصر تھا کہ مجھ سے کہدو جو کچھ کہنا ہو کمشنر صاحب نہیں مل سکتے ہیں نے پوچھ اور تم کون ہو ...... کہنے لگا .... صاحب کا اردلی ..... مجھے جھلاہٹ آگئی۔ انتہا ہے کس قدر بدتمیز انسان ہے لیکن پھر بھی میں یہی کہتی رہی۔ بھلا تم سے کیوں کہدوں، بیکار دیر لگا رہے ہو۔ فون چیف کمشنر صاحب کو دے دو۔ اتنا کہنا تھا کہ اس نے پنجابی اور اردو میں بے نقط سنانی شروع کر دیں۔ دو چار کے سوا میں سب کے معنی بھی نہ سمجھ سکی۔ لیکن اتنی بے ہودہ و مکروہ مغلظات سُن کر جیسے کان جلنے لگے۔ جسم تھرّا گیا۔ ہاتھ کانپ گئے۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ یہ پتھر کانوں سے ٹکرا رہے تھے۔ رسیور پٹخ کر بیس پچیس منٹ مجھے اپنے ہوش و حواس درست کرنے میں لگے۔

اور اب تو بہت ہی ضروری ہو گیا۔ کہ چیف کمشنر صاحب کو حالات سے مطلع کروں

---

[1] اس سے پہلے ان دونوں مقامات پر ان کی پوسٹنگ رہ چکی تھی۔

اب کی بار میں کمیونی کیشن منسٹر[1] کے گھر سے بول رہی تھی اور اسے سُن کر تو ایک منٹ کا توقف نہیں ہو سکتا تھا۔ بولنے والے کی آواز کا فرق محسوس کر کے میں نے سوال کیا کہ اس سے پہلے ڈیوٹی پر کون تھا؟۔۔۔۔۔اس کا نام کیا ہے؟۔۔۔۔۔تمہارا نام کیا ہے؟ یہ دوسرا چپراسی تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی ڈیوٹی بدل چکی تھی۔ اگرچہ وہ پہلے والا چپراسی بھی باہر ہی موجود تھا مگر نیا اردلی اب ٹیلی فون کے پاس آگیا۔ قدوائی صاحب کے گھر کا فون جلد ہی چیف کمشنر کو سُنا دیا گیا اور اب وہ بول رہے تھے۔ میں نے ان کو سارا حال بتایا۔ یہ بھی کہہ دیا کہ یہ گالیاں اس کوٹھی سے نئی نہیں ہیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب اور آپ کے چپراسی بہت دنوں سے مسلمان کا نام سُن کر ایسی گہر افشانیاں کرنے کے عادی ہو چکے ہیں جس قدر جلدی ہو سکے اس شرمناک حالت کو ختم کیجیے۔ ان سب کو تمیز و تہذیب سکھانا بھی بہت ضروری کام ہے۔

وہ بیچارے بہت ہی شرمندہ۔ معذرت، اظہار افسوس کہ کچھ خیال نہ کیجیے میں ابھی ان سب کی خبر لیتا ہوں اور اس کو معطل کرتا ہوں۔ لیکن میں ایک کے متعلق کیا خیال کرتی۔ خود اپنے گھر کے چپراسیوں کا حال بھی تو ابتر تھا۔ کسی آنے والے کو دیکھ کر اخلاقاً اٹھنے تک کی زحمت نہ کرتے تھے۔ سلام کرنا تو بڑی چیز ہے۔ میں تو خیر ٹال گئی لیکن میری بھتیجی کو ایک دو بار بہت ہی ناگوار ہوا اور اس نے ایک دن جب میں پاس نہ تھی ان سب کو بری طرح ڈانٹا۔ پولیس والوں کو بھی اسے ان کی بدتہذیبی پر للکارنا پڑا اور اسی کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ذرا ان سب کی حالت سدھری انتہا تو یہ ہے کہ سکریٹریٹ تک کے چپراسیوں کی بے عنوانیوں پر خود وزیر اعظم کو تنبیہہ کرنا پڑی تھی۔

اسی عام حالت کا تذکرہ میں اس لیے کر رہی تھی کہ یہ بچارا ایک اردلی تو اس سارے گروہ کی بگڑی ہوئی ذہنیت کا نمائندہ تھا جس کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ آوے کا آوا خراب تھا۔ ایک اینٹ کی خرابی کا کیا رونا؟

مجھے نہیں معلوم پھر کیا ہوا لیکن اس کے بعد سے آج تک دونوں افسروں کے یہاں کی کسی بدتمیزی کی شکایت نہیں سنی گئی اور نہ اب غرض مند ان کے ملازمین کی

---

[1] رفیع صاحب کے گھر سے

بد زبانیوں کا نشانہ بنتے ہیں۔ جب کبھی ضرورت پڑی۔ فون کیا تو جواب ٹھیک ملا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب نے دھوپ کھانا چھوڑ دیا اور چیف کمشنر صاحب کو وقت بے وقت اب نیند بھی نہیں آتی۔ نہ آفس کے اوقات میں آرام کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کوئی ایک واقعہ نہ تھا۔ بیسیوں شکایتیں تھیں کہ گورنمنٹ کے دفاتر میں پبلک کے ساتھ انتہائی ذلت اور بے رخی کا برتاؤ ہوتا ہے اور یہ شکایت اب تک باقی ہے۔ بد تہذیبی تو جیسے نوکر شاہی کا فیشن بن گئی ہے۔ معمولی چپراسی سے لے کر بڑے افسروں تک سب ہی کج خلقی سے پیش آنا ضروری سمجھتے ہیں اور اس میں اب ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔۔ کوئی بھی ہو یہ تو عام برتاؤ کا ڈھنگ ہے۔

عوام کی عزت و خودداری کا لحاظ کرنا ضروری سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اسپتالوں تک کا یہی حال ہے۔ ان تمام مقامات پر عوام بالکل گداگروں کی طرح اکھٹے ہوتے ہیں اور اسٹاف کو پورا حق حاصل ہے کہ شریف انسان کو بھی جس وقت چاہیں گردن میں ہاتھ دے کر نکال دیں۔ اول فول سنا دیں یا ذلیل کر دیں۔

میں نے عوام کے گروہ میں شامل ہو کر غریبوں کے ساتھ جا کر یہ تجربے کیے ہیں۔

اسکول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں " لڑکے " ماسٹروں کا مذاق اڑانا، ان کے خلاف ایجی ٹیشن کرنا اور کلاسوں میں ان کے ساتھ بد تہذیبی سے پیش آنا معیوب نہیں سمجھتے اور ماسٹر یا پروفیسر بھی لڑکوں کی خودداری کو ٹھیس پہنچانے اور انھیں رسوا یا ذلیل کرنے سے باز نہیں رہتے۔

پچھلے دو سالہ تلخ حادثات کا یہ ماحصل بہت ہی عبرت ناک ہے۔ گورنمنٹ، لیڈر اور ہر پڑھا لکھا آدمی یہی کہتا ہے " جو ہو چکا اس پر خاک ڈالو۔ پرانی باتیں بھول جاؤ " لیکن میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ بھلایا کیسے جا سکتا ہے۔ عوام کیسے گذرے ہوئے واقعات کو محو کر سکتے ہیں۔ جب آج بھی ملک میں ہر جگہ اور ہر قدم پر وہ تمام نقوش بکھرے پڑے ہیں۔ یہ گندگی دماغ سے کیسے نکل سکتی ہے جب نجی صحبتوں میں بھی ایک دوسرے کی بدی اور پچھلے تذکرہ سے بات کی ابتدا ہوتی ہے۔

ہم نے بچوں سے اس چیز کو مٹانے کی کوشش کی لیکن ایک دو ماہ کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ یہ برسوں کا کام ہے۔ اتنی جلدی ذہنیت بدلی نہیں جا سکتی۔ ہمارا

سب کیا دھرا ان کے ماں باپ چند منٹ میں ملیامیٹ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اب سے پہلے ہندوستان کا غیرت دار باپ اگر اس کی لڑکی کو کوئی چھیڑ دے یا اس پر آوازہ کسے تو اس راستہ جانے سے لڑکی کو ہمیشہ کے لیے روک دیتا تھا۔ چپکے چپکے اچھی خاصی لڑائی لڑ لیتا تھا۔ مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ محلہ والے کیسے پڑوسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہو۔ لیکن آج یہ حالت ہے کہ لڑکیاں بلا بن کر ملک پر نازل ہو گئی ہیں۔ جدھر دیکھو لڑکی سے چھیڑ خانی کرنے پر ہندو مسلم فساد کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی راہ چلتے چھیڑ دی جاتی ہے اور غیرت دار ہم قوم جمع ہو جاتے ہیں۔ بے حیا چھیڑنے والا اپنی قوم کو پشت پناہ بنا کرلے آتا ہے۔ ملزم حوالات میں جاتا ہے۔ لڑکی معہ اپنے ایرے غیرے نتھو خیرے گواہوں کے عدالت میں پیش ہوتی ہے اور یہ سب حال دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ مائیں کوئی ایسی دوا کھا لیں جو اب سو برس تک اس ملک میں عورت پیدا ہی نہ ہو۔ کیا کیا جائے۔ آخر اس ملک اور ان قوموں پر کیسے فاتحہ پڑھی جائے جو ان بے شرمیوں کو قومی غیرت کا نام دے کر بازار میں ناک کٹوا رہی ہیں۔

اخلاقی معیار کا حلیہ تو ہر زمانہ میں بدلتا رہتا ہے لیکن ڈھانچہ اور بنیاد تو دوسری نہیں ہو جایا کرتی۔ خدا ہی جانے ہم کس دور سے گذر رہے ہیں کہ جب حقیقتیں بنیادی طور پر غلط ہوئی جا رہی ہیں۔

کونسا مسئلہ ہے جو ان دنوں نہیں اٹھ کھڑا ہوا اور ہر مسئلہ گذرے ہوئے حالات سے متاثر ہو کر ایک نئے رنگ میں سامنے آ گیا ہے۔ زمیندار اور کسان کی جنگ مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش۔ امیر اور غریب کا الجھاؤ۔ یہ کوئی نہیں چیزیں نہیں ہیں۔ ہندوستان کیا ساری دنیا اس کشاکش میں گرفتار ہے۔ لیکن واہ رے ہندوستان کیا بات ہے تیرے اونچے آدرشوں اور قدیم فلسفہ کی۔ اس میں بھی ایک نئی جدت پیدا ہو گئی ہے اور یہاں ابھی تک عورتوں اور لڑکیوں کی کھینچا تانی ہو رہی ہے۔

مشرقی پنجاب اور اس کی ریاستوں سے جو رپورٹیں ہمارے پاس آتی تھیں ان سے اخلاقی زوال کی اس حالت کا پتہ چلتا تھا کہ گھروں کا امن و سکون ختم ہو گیا ہے۔ سیاسی معاملات میں بھی ذاتی بے عزتی اور انفرادی بد معاشیاں اپنا رنگ دکھا

رہی ہیں۔

پٹیالہ سے ایک بار ایک زمیندار بھاگے ہوئے آئے اور یہاں کانگریسی حکومت اور ذمہ دار ہستیوں سے مل کر اپنے مصائب کی کہانی سنائی۔ وہ کہتے تھے کہ کسان ہماری زمینوں پر زبردستی قبضہ کر رہے ہیں۔ ہمارے کارندوں کو لگان وصول کرنے سے روکتے ہیں اور ہم پر گولیاں چلاتے ہیں۔ ہماری لڑکیاں اٹھالے جاتے ہیں اور ہر طرح بے عزتی پر تل گئے ہیں۔

یہ سن کر ایک بڑے لیڈر[1] نے کہا " اچھا تو یہ کہیے :۔ جو کچھ آپ نے دوسروں کے لیے ان کو سکھایا تھا وہی سب وہ آپ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ یہ گولی جو وہ آپ پر چلاتے ہیں، وہی تو ہوگی جو آپ نے مسلمانوں کو مارنے کے لیے انھیں مہیا کی تھیں اب چونکہ مسلمان باقی نہیں اس لیے بچی کھچی گولیاں آپ کے حصہ میں آرہی ہیں۔ اور پھر چند ہی ہفتہ بعد دوسرا گروہ کسانوں کا آیا۔ ان کی شکایتیں اور زیادہ شدید تھیں۔ ہریجنوں پر مظالم۔ بے دخلیاں۔ بے انصافیاں۔ جبر بیگار۔ شراب پی پی کر عورتوں کی بے عزتی۔ مکانوں پر زبردستی قبضہ اور مار پیٹ۔ گولیوں کی بوچھار سارے ہی الزامات انھوں نے زمینداروں پر لگائے۔

اس کے ساتھ ہی مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کا جھگڑا۔ لوہے کے پرمٹوں کا قضیہ، رشوت ستانیوں کی کہانی۔ یہ سب کیا ہے اسی زنجیر کی تو کڑیاں ہیں۔ اسی کرنی کا تو پھل ہے۔ یہی تو دو برس میں بویا گیا۔ تھوہڑ کا درخت آم کے پھل تھوڑی پیدا کرے گا۔ کسی ایک دن کا ملاپ یا پرتاپ اٹھا کر دیکھ لیجیے خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ آٹھ دس خبریں تو امرتسر، جالندھر، بھٹنڈہ، لدھیانہ کی دھوکا، فریب، اغوا، قتل، ڈاکہ اور عصمت دری کی آپ ضرور ہی دیکھ لیں گے۔

پاکستان کے اخبارات دیکھیے۔ والٹن کیمپ کی حالت سنیے۔ رقص و سرود شراب و کباب کی محفلوں، مینا بازار اور تفریحات کے پروگرام پر غور کیجیے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے اخراج پر ایک نظر ڈالیے اور وہاں کے اسلامی مجاہدوں کے پاس سے واپس لائی ہوئی عورتوں سے چند منٹ بات کیجیے۔ ہر چیز میں ہر بات میں آپ پچھلی غنڈہ گردی کے اثرات کی جھلک اور اس کا مظاہرہ دیکھیں گے۔ ایک اخبار[2] نے تو ان الفاظ میں

---

[1] بابو راجندر پرشاد پریسیڈنٹ

[2] پاکستان کے اخبار نے

صاف صاف اقرار کیا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ پچھلے حادثہ کے اثرات ہیں۔ دلیس ماندہ عوام کے اخلاقی اقدار کا خون کچھ اس طرح پنچڑ رہا ہے کہ اسی جماعت میں سے وہ طائفہ پیدا ہوتا ہے جسے زنان بازاری کہا جاتا ہے۔ آغاز، رجولائی ۱۹۴۸ء)

آگے چل کر یہی اخبار صرف "مشرقی پنجاب کے سانحہ" کو اس صورت حال کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور اس کی ہمت نہیں پڑتی کہ سانحہ کے مغربی پہلو کو بھی ذمہ داری میں شریک کر سکے لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ

گناہ کی دیمک نے ان خاندانوں کو چاٹنا شروع کر دیا ہے۔ (آغاز، رجولائی)

ساتھ ہی لاہور کی عام حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے کہ "لاہور کی اخلاقی حالت اس قدر گر چکی ہے کہ خود خان ممدوٹ نے کہا شراب کی کھپت مگنی ہوگئی ہے۔ حرام کاری اور اخلاقی گراوٹ اتنی عجیب وغریب اور افسوسناک ہے کہ اب سوال صرف چھلکے اٹھا دینے تک محدود نہیں ہے بلکہ لاہور کی مجلسی زندگی کے بیشتر تہذیبی دائرے چھلکے کا لباس اوڑھے ہوئے ہیں۔ گناہ ہماری مجلسی زندگی میں اوپر سے لے کر نیچے تک اس حد تک پھیلتا جا رہا ہے کہ اب صرف نوعیت اور درجے کا فرق باقی رہ گیا ہے۔ ورنہ پوری زندگی اس میں محصور ہے۔

آغاز، رجولائی

پولیس اور عمال کی زیادتیاں۔ رشوت ستانیاں، عام زندگی میں سچائی اور لین دین میں دیانت کا فقدان۔ بدعہدی، لاقانونی، غرض گذری ہوئی مجرمانہ زندگی کے گہرے نقوش ہر شعبہ میں نمایاں ہیں۔

میرا مقصد صرف عیب جوئی نہیں ہے۔ نہ ہندوستان یا پاکستان کے عیوب پر پردہ ڈالنا چاہتی ہوں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں، مقصد صرف اندرونی جھلک دکھا کر یہ بتانا ہے کہ "ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ہم کہاں جا رہے ہیں" اور اگر اس راستہ سے جلد ہی ہم سب نہ مڑے تو تباہی و بربادی کا غار اپنا خوفناک منہ کھولے ہوئے ہمارا منتظر ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر پنجاب کے دونوں حصوں اور دہلی کی دردناک حالت پر نوحہ پڑھنے کے ساتھ ہی ناظرین کو ان دوسرے مقامات کی بھی حالت دکھا دوں جہاں انھیں سالوں اور انھیں دنوں میں فسادات برپا ہوئے۔ کلکتہ اور بہار کا حال مجھے معلوم نہیں، وہ سب پہلے کی باتیں تھیں۔ مجھے تو صرف ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء سے غرض ہے۔

اس دوران میں مسوری، دہرہ دون، سہارنپور، آگرہ، کانپور اور اجمیر سب

جگہ بلوہ ہوئے۔ اور جگہ تو خیر اس مناسبت سے ہلکا پھلکا ہوا لیکن مسوریؔ، ڈیرہ دون اور اجمیر میں تو کٹائی پٹائی بھی ہوئی اور لوٹ مار بھی۔ اور مسلم آبادی کو بالکل شہر خالی کر دینے پر مجبور کیا گیا۔ ڈیرہ دون اور مسوری مسلمانوں سے خالی ہو گئے لیکن کسی عورت کے اغوا یا بے عزتی کی داستان مجھ تک نہیں پہنچی۔ ایک نوجوان عورت اور اس کی بچی کے متعلق مجھے اور اس کے عزیزوں کو شبہ تھا کہ شاید وہ اغوا کی گئی ہے لیکن ڈیڑھ سال کی کوشش کے باوجود مجھے آج تک اس کی زندگی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس لیے یقین ہوتا ہے مر گئی۔ اتنے عرصہ میں صرف ایک لڑکی میرے پاس ضلع ڈیرہ دون سے لائی گئی جس کے والدین مارے جا چکے تھے اور گاؤں کے ایک برہمن نے اس کو پکڑ کر سہارنپور میں کسی مسلمان کے ہاتھ بیچ دیا تھا جہاں اس مسلمان نے اپنے بھائی کے ساتھ مجسٹریٹ اور علماء کی اجازت سے اس کا نکاح کر دیا۔ وہ لڑکی بالکل مطمئن تھی۔ سوا اپنے ماں باپ کی جان کو رونے کے اس کے پاس اپنی بے عزتی کی کوئی کہانی نہ تھی۔ ان دونوں شہروں میں سرفروش کانگریسی تھے جنھوں نے جان پر کھیل کر جانیں بچائیں۔ مال نہیں بچا سکے مگر جان و عزت بچانے کی کوشش ضرور کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح کے ذلیل واقعات نہ پیش آسکے جیسے کہ دہلی اور پنجاب وغیرہ میں ہوئے۔

اور شہروں میں ہلکا پھلکا جھگڑا ہوا لیکن اجمیر میں تو بہت بڑے پیمانہ پر ہنگامہ ہوا۔ اسی ہزار کی آبادی گھٹ کر آٹھ ہزار باقی رہ گئی۔ لوگوں کے بیان کے مطابق ساڑھے چار ہزار آدمی قتل ہوئے۔ باقی لوٹے گئے۔ بھگائے گئے۔ ہزاروں شدھی کیے گئے۔ مکانات دکانیں چھن گئیں۔ قبرستان کھد گئے۔ مسجدیں منہدم ہو گئیں سب کچھ ہوا لیکن ننگی عورتوں کا جلوس نہیں نکلا۔ ایک بھی واقعہ اغوا کا نہیں ہوا۔ کسی نے بھی مجھ سے علانیہ عصمت دری اور بدمعاشی کی داستان نہیں بیان کی۔ عین فساد کے دوران میں دکانوں کی لوٹ کے ساتھ ساتھ عورتوں کی لوٹ نہیں ہوئی۔ اور ان تمام مقامات پر دو چار مخلص کانگریسی ان بدمعاشیوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کے لیے ضرور نکل پڑے۔

پنجابی بھائی مجھے معاف کریں۔ میرا مقصد صوبائی غرور یا صوبجاتی تعصب پھیلانا نہیں صرف حقیقت کا اظہار بڑے دکھ کے ساتھ کر رہی ہوں کہ اخلاقی تنزل کی جس سطح پر پنجاب[1] کے دونوں حصے پہنچ گئے اب سے دو چار سال پہلے شاید انسان کا خیال

---

[1] مشرقی و مغربی یعنی پاکستانی و ہندوستانی دونوں

بھی وہاں نہ پہنچ سکتا تھا۔ رہی دلّی تو وہ بیچاری تو ہمیشہ پنجاب کی دم چھلاّ بنی رہی پنجاب میں ڈگڈگی بھی بجے تو آواز دلّی کی گلیوں میں گونجتی تھی۔ وہ تو ہمیشہ سے پنجاب کی محبت میں تباہ رہی۔

"گناہ کبیرہ" "گناہ صغیرہ" کے الفاظ سنے تو بچپن سے تھے۔ مگر نہ اس کی تفصیل کبھی نظر کے سامنے آئی تھی اور نہ کبھی میں نے اس کی تفصیلات پر شرفا کو بحث کرتے سنا تھا لیکن آج جس محفل میں دیکھ لو اسی صغیر و کبیر کا قصہ چھڑا ہوا ہے۔ ہر فریق اپنے گناہ کو کم کرنے اور دوسرے کو بڑھا کر دکھانے کی فکر میں مبتلا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مسلمان لڑکیاں جب ہندوؤں کے پاس پہنچیں تو انھوں نے کچھ تو بدلہ لینے کے خیال سے کچھ غصہ میں اور کچھ ان کو ہندو لڑکی ظاہر کرنے کے ارادہ سے ان کو گدوانا ضروری سمجھا اور جب یہ ہندو لڑکیاں ہندوستان سے نکال کر پاکستان گئیں تو وہاں سے بھی ہاتھوں پر مجاہدوں کے نام لکھائے ہوئے مسلم لڑکیاں واپس آئیں۔ لیکن اس ایک جرم میں بھی "زندہ دلانِ پنجاب" نے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی ہے۔ دہلی صوبہ سے برآمد کی ہوئی لڑکیاں اپنے ہاتھوں پر بیل بوٹے اور "ادم" گدوائے ہوئے ہمارے پاس لائی گئیں اور پنجاب یا ریاستوں سے آنے والیاں جسم کے پوشیدہ حصوں پر پاپیوں کے نام کندہ کرائے سینہ پر مجرموں کی مہر لیے ہوئے ہمارے سامنے لائی گئیں۔

بظاہر دونوں نے ایک جیسے کام کیے لیکن بداخلاقی کی منزلیں بھی مختلف رکھی گئیں کسی ایک لڑکی کا بیک وقت دو اور چار مردوں کے تصرف میں رہنا پنجاب کے لیے شاید انوکھی بات نہ تھی لیکن دہلی کے دیہاتوں میں ہمیں کوئی ایسی عورت نہ ملی جو دو آدمیوں نے مل کر خریدی ہو۔ یوں تو وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دو تین جگہ بیچی گئیں مگر پیسہ لگانے والا ایک ہی مالک ہوتا تھا۔

اس وقت مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ دیہات کے ایک بدمعاش ادھیڑ آدمی کے پاس سے ایک گیارہ بارہ سال کی معصوم سی چھوکری لائی گئی تو میں سوچنے لگی کہ اس سے کیا پوچھوں۔ اتنے بھولے معصوم چہرے اور اتنے ننھے سے کمزور جسم پر کیا نہ بیت گئی ہوگی لیکن مجھے

لہ ۱۹۴۹ء میں ہمیں اس کی تصدیق ہو گئی تھی۔

حیرت کی انتہا نہ رہی جب لڑکی نے الھڑ پنے کے ساتھ جواب دیا۔ ابھی تو میری بالی عمر تھی۔ ابھی میں جوان کہاں تھی۔ میں تو اپنے پتی کو کھانا پکا کر کھلاتی تھی۔ اس کی دوا دارو بناتی تھی۔ اور جب میری بیٹی آتی تھی تو اس کے ساتھ پوا بنا کر گٹھری میں باندھتی تھی۔ میرا پتی کہتا تھا۔ کہ تو جلدی سے بڑی ہو جا......

یہ چھوٹی سی لڑکی گھر کی مالکن تھی۔ ادھیڑ آدمی کی خدمت کرتی تھی اور گھر میں ہنستی کھیلتی پھرا کرتی تھی۔

بہر حال انسانی فطرت کے بہتیرے سین اور بہیمیت کی سیکڑوں داستانیں ہیں۔ یہاں مخلص پڑوسی، سچے دوست، بے نظیر انسان اب بھی ہیں۔ اگرچہ ایسے پڑوسی بھی تھے جن کا ڈنڈا سب سے پہلے اپنے ہمسایہ کے سر پڑا اور ایسے ساتھی بھی تھے جنھوں نے گھر سے باہر نکلتے دیکھ کر پہلے جوان لڑکی ہتھیانے کی فکر کی۔ مگر ایسے دوستوں سے بھی دنیا خالی نہیں ہے جو دوست کے بال بچوں کی حفاظت اس وقت تک کرتے رہے جب تک بچے باپ تک نہ پہنچ گئے۔

یہ متضاد سین دیکھنے کے بعد ہی تو مجھے یقین ہو چکا ہے کہ "انسان نہیں مرا وہ کبھی نہیں مر سکتا"، جس دن انسان مرے گا۔ یہ نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ اس عمارت کا ستون تو یہی ہے۔

ہاں انسان کو مارنے کی کوششیں ہمیشہ سے ہو رہی ہیں اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی آفرینش عالم سے اب تک بدی کی بے پناہ طاقت انسانیت کا سر کچل دینے کی فکر میں ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اتنی شدت اور طاقت کے ساتھ ——— اور اس قدر بڑے پیمانہ پر یہ حملہ کبھی نہیں ہوا تھا۔

اب سے پہلے بھی "مردان حق" نے سر دے دیا ہے مگر ہار نہیں مانی ہے۔ اس دور میں بھی ایک حق پرست نے انسانیت کو زندہ رکھنے کے لیے، سچائی کو اجاگر کرنے کے لیے اپنا خون بہایا۔ لیکن آج جب پچھلے واقعات کو دو سال ہونے آتے ہیں رہ رہ کر یہ سوال دل میں اٹھتا ہے کہ کیا ہم کو اسی سطح پر ٹھہرنا ہے یا آگے بڑھنا ہے۔ کیا انسان کو زندہ رکھنے کے لیے ہماری کوششیں جاری رہیں گی یا ہم تھک کر بیٹھ جائیں گے۔ کیا روحانیت و اخلاقیات کی طاقت

لہ آٹے اور گھی کی میٹھی ٹکیاں

سے ہم اپنے سسکتے ہوئے سماج کو ایک نیا جنم دے سکتے ہیں ؟

اور پھر یہ تو پوچھنا ضروری ہے کہ ہماری سرکار کو اپنی مشین کے لیے صرف پرزوں کی ضرورت ہے یا جیتے جاگتے عملی انسانوں کی کیوں کہ حکومت کی تعمیر و تشکیل تو زندہ انسانوں سے ہوتی ہے۔ قانون بنانے والے اس پر عمل کرنے والے اس کا احترام کرنے والے شیر اور بھیڑیے تو نہیں ہوا کرتے۔ اگر حکومت کو اپنی زندگی باقی رکھنا ہے، اگر ہندوستان کو پھر غلام نہیں بننا ہے تو ان بکھرے ہوئے دانوں کو سمیٹ کر ایک کڑی میں پرونا ہوگا۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان اور سماج کی اخلاقی قدروں کو۔ انسانیت کے معیار کو تہذیب و تمدن کے جدید نظریہ کو اور پرانے روحانی اصولوں کو سمو کر ایک ایسا نظام حیات تیار کیا جائے جس کی بنیاد انسانیت پر ہو اور جس کی تعمیر و ترقی نئے علم کی روشنی میں ہو جس کا پھیلاؤ زمین سے اوپر مگر عرش سے نیچے ہو۔

پراچین بھارت اور قدیم اسلامی دور کا خواب دیکھنے والے نئی دنیا سے دامن بچا کر آخر کیسے چل سکیں گے ؟

مذاہب کو ان کے اصلی اور فطری روپ میں دیکھے بغیر روح کا اجلاپن ناممکن ہے اور موجودہ دور کے انسان کا دماغ پر سکون ہونا دشوار ہے۔ آخر روح کے بغیر جسم کا وجود کیسے قائم رہ سکتا ہے۔

یہ بے روح سماج، یہ غنڈہ تہذیب، یہ لٹیا پاجامہ والا تمدّن —— اور یہ ایک کلچر اور ایک قوم کا خواب دیکھنے والے دماغ ان سب کو نئے ہندوستان کے کھیتوں کی کھاد بنانا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر زمین میں طاقت کیسے پیدا ہوگی۔

لیکن یہ سب کیسے ہو؟ نئے دماغ ہی اس کو سوچ سکتے ہیں۔ جوانی ہی ان پتھروں سے کھیلتی ہوئی آگے بڑھ سکتی ہے۔ اور صرف

عشق بدوش می کشد دامن کوہسار را[1]

ہم عمر رسیدہ لوگ! ہم نے اپنی زندگی بھلی بری گذار دی۔ اپنے کرم کا پھل بھی دیکھ لیا تھکے مارے دماغ اور جسم اپنا وقت گذار چکے ہیں۔ دیا ٹمٹما رہا ہے۔ رات ختم ہو رہی ہے اور کچھ دیر نہیں کہ نسیم سحر کا جھونکا ہمیشہ کے لیے ہمارے زمانہ کا چراغ گل کر دے۔

---

[1] عشق ہی اس پہاڑ کو اپنے کاندھوں پر اٹھا سکتا ہے۔

لیکن "کار دنیا کسے تمام نہ کرد[1]"

سارا بوجھ نئی نسل کے کاندھے پر پڑے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس بوجھ کو اٹھائیں، یہ کتاب ان کے ہاتھوں میں پہنچ جانا چاہیے تاکہ وہ ہوا کا رخ دیکھ کر اپنی کشتی دریا میں ڈالیں انھیں پتہ لگ جائے کہ کہاں چٹانیں حائل ہیں اور کہاں بھنور تاکہ ان کی ناؤ بھی عین منجدھار میں پھنس کر ہماری طرح تباہ نہ ہو جائے۔

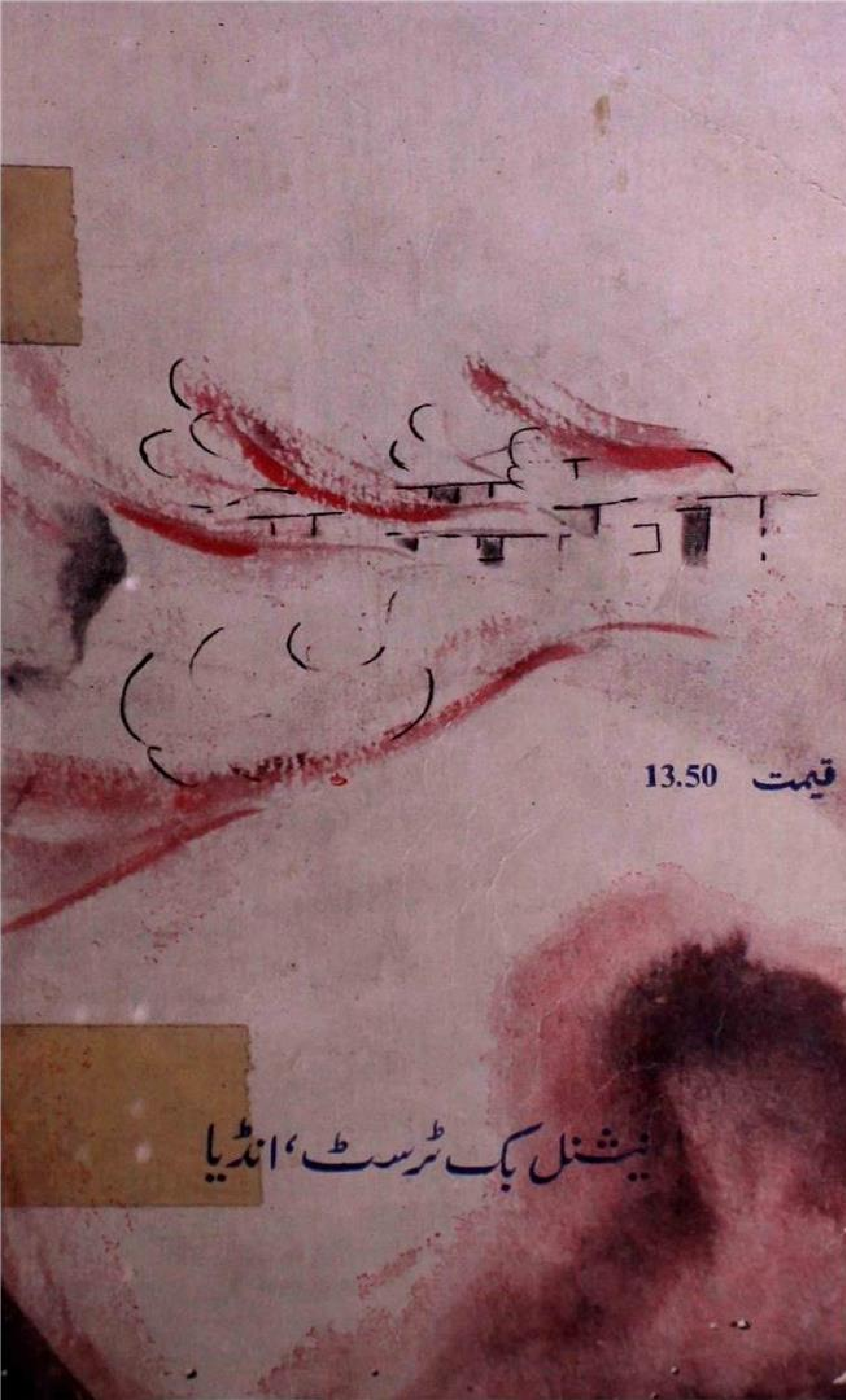
کشتی شکستگانیم اے بادِ شرطہ برخیز
شاید کہ باز بینیم آن یار آشنا را[2]

ختم شد

---

[1] دنیا کا کام کبھی کوئی ختم نہ کر سکا۔

[2] کشتی ٹوٹی ہوئی ہے۔ اے موافق ہوا چل۔ شاید ہم اپنے محبوب تک پہنچ ہی جائیں



قیمت 13.50

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا